بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ

اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے
تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟

معالم العرفان

فی

دروس القرآن

افادات

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی

خطیب جامع مسجد نور

بانی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

مرتب

الحاج لعل دین، ایم۔اے [علوم اسلامیہ]

ناشر

مکتبہ دروس القرآن

فاروق گنج ○ گوجرانوالہ

روزانہ درس قرآن پاک

تفسیر

سُورۃ البقرۃ

جلد ۲

افادات

حضرۃ مولانا صوفی عبدالحمید صاحب سواتی

خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ

چھبیسواں ایڈیشن

نام کتاب .... معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ البقرہ آیت نمبر 1 تا 141) جلد ۲

افادات .... حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتی رحمۃ اللہ علیہ

مرتب .... الحاج لعل دین رحمۃ اللہ علیہ۔ ایم اے (علوم اسلامیہ) شالامار ٹاؤن لاہور

تعداد طباعت .... پانچ سو (۵۰۰)

سرورق .... سید الخطاطین حضرت شاہ نفیس الحسینی رحمۃ اللہ علیہ

کتابت .... محمد امان اللہ قادری، گوجرانوالہ

ناشر .... مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ

قیمت .... -/۲۳۰ (دوسوتیس روپے)

تاریخ طبع چھبیسواں ایڈیشن ...... رمضان المبارک، ۱۴۳۴ھ بمطابق اگست ۲۰۱۳ء

ملنے کے پتے

(۱) کتب خانہ صفدریہ 0300-4257988 لاہور

(۲) مکتبہ دروس القرآن، محلہ فاروق گنج گوجرانوالہ (۳) کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی

(۴) مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر اردو بازار لاہور (۵) کتب خانہ مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

(۶) مکتبہ قاسمیہ، الفضل مارکیٹ لاہور (۷) مکتبہ حلیمیہ نزد جامعہ بنوریہ سائٹ نمبر ۶ کراچی

(۸) مکتبہ سید احمد شہیدؒ، اردو بازار، لاہور (۹) اسلامیہ کتب خانہ اڈا گامی، ایبٹ آباد

(۱۰) مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ (۱۱) مکتبہ العلم ۱۸ اردو بازار لاہور

فہرست مضامین

دروس القرآن پارہ ۱ جلد ۲

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
پیش لفظ (از الحاج لعل دین صاحب ایم۔اے علوم اسلامیہ لاہور)	۱۵	استقامت کی ضرورت	۳۲
سخنہائے گفتنی (از محمد اشرف فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ)	۱۹	مجاہدہ	؍؍
درس اوّل (آیت ۱ تا ۲)	۲۳	معاد	۳۳
سورۃ اور آیت	؍؍	درس دوم (آیت ۱ تا ۲)	۳۴
آیت کے مختلف معانی	؍؍	محکمات، متشابہات، مقطعات	؍؍
سورتوں اور آیتوں کی ترتیب	۲۵	احکام خداوندی اور ان کی حکمتیں	۳۵
سورتوں کی اقسام بلحاظ طوالت	۲۶	حروف مقطعات پر مفسرین کے مباحث	؍؍
وجہ تسمیہ	۲۷	حضرت صدیق اکبرؓ	۳۶
مکی اور مدنی سورتیں	؍؍	حضرت علی مرتضیٰؓ	؍؍
ترتیب تلاوت کی حکمت	۲۸	حضرت امام شعبیؒ	؍؍
فضیلت سورۃ	؍؍	حضرت ابن مسعودؓ	؍؍
مضامین سورۃ	۲۹	حضرت امام رازیؒ	۳۷
نام اور کوائف	۳۰	مقطعات اسمائے الٰہی ہیں	؍؍
سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ میں ربط	۳۱	مقطعات اسمائے قرآنی ہیں	۳۸
مہمات دین	؍؍	مقطعات بحیثیت چیلنج	؍؍
معرفت الٰہی	؍؍	امام اخفشؒ کی رائے	۳۹
ثبوت نبوت	۳۲	عبداللہ بن عباسؓ کا قول	

امام ماوردیؒ کی تحقیق	۴۰
شیخ ابن عربیؒ کا قول	〃
نزول مقطعات معجزہ سرور کائنات	۴۱
امام بیضاویؒ کا قول	〃
امام شاہ ولی اللہؒ کا فلسفہ	〃
مولانا مودودی کا نظریہ	۴۲
مفسر فراہیؒ کا قول	〃
حرف آخر	〃
درس سوم ۳ (آیت ۱ تا ۵)	۴۴
لفظ ذٰلک کی حکمت	〃
لفظ لا ریب کا مفہوم	۴۵
مولانا شیخ الہندؒ کی تفسیر	۴۶
متقین کے لیے ہدایت	۴۷
تقویٰ کی تعریف	۴۸
تقویٰ کے تین درجات	۴۹
متقی کون ہیں	〃
ایمان بالغیب	۵۱
اقامت صلوٰۃ	۵۲
انفاق فی سبیل اللہ	〃
کتب سماوی پر ایمان	۵۳
ایمان بالآخرت	〃
ہدایت یافتہ لوگ	۵۴
درس چہارم ۴ (آیت ۶ تا ۷)	۵۵

انسانوں کے تین گروہ	۵۵
کفر کا معنیٰ	۵۶
کفر کی مختلف اقسام	〃
کفر انکار	〃
کفر جحود	۵۷
کفر عناد	۵۸
کفر نفاق	〃
کفر شک	〃
کفر جہالت	۵۹
کفر تاویل	〃
عملی کفر	۶۰
کفر دہریت	۶۱
ایک اشکال اور اس کا جواب	۶۲
درس پنجم ۵ (آیت ۶ تا ۷)	۶۳
گذشتہ سے پیوستہ	〃
ان آیات کا مصداق کون ہیں	〃
مہر لگانے کا مطلب	۶۵
دلوں کی سیاہی	۶۶
اعضائے رئیسہ کے بارے میں باز پرس ہوگی۔	۶۷
اعضائے رئیسہ میں سے قلب کی اہمیت	۶۸
عذاب عظیم کی وعید	۶۹
اعضائے رئیسہ کا مرکز ایک ہے۔	〃
درس ششم ۶ (آیت ۸ تا ۱۲)	۷۱

گذشتہ سے پیوستہ	٧١
منافقین کا گروہ	٧٢
منافقین کی قسمیں	//
نفاق دینی بیماری ہے	٧٣
فساد فی الارض	٧٤
منافقین کی دھوکہ دہی	٧٥
حکومتی سطح پر نفاق	٧٦
عذابِ عظیم اور عذابِ الیم میں فرق	٧٧
درسِ ہفتم ٧ (آیت ١٣ تا ١٦)	٧٩
گذشتہ سے پیوستہ	//
حقیقی ایمان	٨٠
معیارِ حق	٨١
انسان اور اس کا دل	٨٢
حقیقی انسان کون ہیں	٨٣
بیوقوف کون ہیں	//
منافقوں کی دورُخی پالیسی	//
استہزاء من اللہ کا مفہوم	٨٤
ہدایت کے بدلے گمراہی	٨٦
درسِ ہشتم ٨ (آیت ١٧ تا ١٨)	٨٨
گذشتہ سے پیوستہ	//
کتبِ آسمانی اور امثلہ	//
تفاسیر احکام القرآن	٨٩
مثال کی حکمت	٩٠
منافقین کی مثال	٩٠
اندھیروں کی مختلف قسمیں	٩١
منافقین کی بدبختی	٩٣
درسِ نہم ٩ (آیت ١٩ تا ٢٠)	٩٥
گذشتہ سے پیوستہ	//
منافقوں کی دوسری مثال	٩٦
اعتقادی اور عملی منافق	//
دل کی چار قسمیں	//
ایمان اور نفاق کی مثال	٩٧
قلب کی چھ حالتیں	//
بارش کی مثال	٩٨
منافقین کی بے بسی	٩٩
درسِ دہم ١٠ (آیت ٢١ تا ٢٢)	١٠١
گذشتہ سے پیوستہ	//
مخاطبینِ قرآن	//
چار اہم مضامین	١٠٢
توحید	//
صفاتِ الٰہی	١٠٣
معرفتِ الٰہی	//
عبادتِ الٰہی	١٠٥
وجودِ الٰہی پر دلائل	١٠٦
درسِ یازدہم ١١ (٢١ تا ٢٢)	١٠٩
توحید عبادت کے لیے شرط ہے	//

دلائل توحید	۱۱۰
ایک اشکال اور اس کا جواب	۱۱۱
عبادت کیوں ضروری ہے	〃
عبادت کے لائق صرف ذاتِ باری ہے	۱۱۲
زمین کے فوائد	〃
آسمان اور پانی کی نعمت	۱۱۴
لفظ ند کا معنیٰ	〃
ند ٹھہرانے کی مختلف صورتیں	۱۱۵
شرک فی المشیّت	۱۱۶
شرک فی العادت	〃
شرک کی دوسری قسمیں	۱۱۷
شرکِ خفی	۱۱۸
اطاعت لغیر اللہ	۱۱۹
درس دوازدہم ۱۲ (آیت ۲۳ تا ۲۵)	۱۲۱
گذشتہ سے پیوستہ	〃
قرآن پاک خاص معجزہ ہے	۱۲۲
عہد باعزت لفظ ہے	۱۲۴
قرآن بطورِ چیلنج	〃
منکرین قرآن کی سزا	۱۲۷
ایمانداروں کے لیے بشارت	۱۲۸
پھلوں میں مشابہت	〃
پاکیزہ بیویاں	۱۲۹
درس سیزدہم ۱۳ (آیت ۲۶ تا ۲۷)	۱۳۰

گذشتہ سے پیوستہ	۱۳۰
حقیر چیزوں کی مثالیں	۱۳۱
حیا کی مختلف قسمیں	۱۳۲
ہدایت اور گمراہی	۱۳۳
فاسق کا معنیٰ	۱۳۴
یہود و منافقین کی عہد شکنی	۱۳۵
قطع رحمی	۱۳۶
صلہ رحمی	〃
فساد فی الارض	〃
فاسقین کی ناکامی	۱۳۷
درس چہاردہم ۱۴ (آیت ۲۸ تا ۲۹)	۱۳۸
گذشتہ سے پیوستہ	〃
اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر	۱۳۹
موت و حیات تصرفِ الٰہی میں ہے	۱۴۰
محاسبے کا عمل	۱۴۱
میت دفن کرنے کے آداب	۱۴۲
تمام چیزیں انسان کے لیے ہیں	〃
موت سامانِ عبرت ہے	۱۴۳
اشیاء میں اصل اباحت ہے	〃
آسمانوں کی تخلیق	۱۴۴
علیمِ کل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے	۱۴۵
عبادت الٰہی لازم ہے	〃
درس پانزدہم ۱۵ (آیت ۳۰)	۱۴۷

گذشتہ سے پیوستہ	۱۴۷
موضوع سع	〃
ہر متقی بادشاہ ہوگا	۱۴۸
تخلیق انسانی سے قبل کے ادوار	〃
فرشتوں کا مادہ تخلیق	۱۴۹
جنات اور شیاطین	۱۵۰
انسان کا مادہ تخلیق	〃
حضرت آدم علیہ السلام خلیفۃ اللہ ہیں	〃
مسئلہ خلافت	۱۵۱
درس شانزدہم ۱۶ (آیت ۳۱ تا ۳۳)	۱۵۵
گذشتہ سے پیوستہ	〃
آدم علیہ السلام کو کن چیزوں کے نام سکھائے گئے	۱۵۶
ملائکہ کا امتحان	۱۵۹
آدم علیہ السلام کی کامیابی	۱۶۰
درس ہفدہم ۱۷ (آیت ۳۴ تا ۳۶)	۱۶۲
فرشتوں کی سجدہ ریزی	〃
خدا تعالیٰ کے سوا کو اب ہر سجدہ حرام ہے	۱۶۳
فرشتوں کے سجدہ کی بعض توجیہات	۱۶۴
ابلیس کا انکار	۱۶۵
حسد اولین گناہ ہے	۱۶۷
حضرت آدم علیہ السلام اور حواؑ جنت میں	〃
شجر ممنوعہ	۱۶۸
شیطانی وسوسہ	۱۶۹
جنت سے خروج	۱۷۰
زمین ہی اصل ٹھکانا ہے	〃
درس ہشدہم ۱۸ (آیت ۳۷ تا ۳۹)	۱۷۲
گذشتہ سے پیوستہ	〃
حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ	۱۷۳
حضور علیہ السلام کی حضرت آدم علیہ السلام پر فضیلت	۱۷۴
زمین پہ اُترنے کا حکم	〃
حضرت آدم علیہ السلام اور حواؑ کی حاجات	۱۷۵
جنت کے تحفے	۱۷۶
حضرت آدم علیہ السلام کا مقام نزول	۱۷۷
بعض انبیاء علیہم السلام کے پیشے	〃
توبہ کی قبولیت	〃
توبہ کی تین شرائط	۱۷۸
زمین پہ اتارنے کی حکمت	۱۷۹
خوف محشر کی حقیقت	۱۸۰
ہدایت کے متبعین	〃
کفار و مکذبین	۱۸۱
درس نوزدہم ۱۹ (آیت ۴۰ تا ۴۲)	۱۸۲
تاریخ بنی اسرائیل	〃
بنی اسرائیل پر انعامات	۱۸۶
بنی اسرائیل کی عہد شکنی	۱۸۷
ایمان بالقرآن	۱۸۸

دنیا کی محبت	۱۸۹
تلبیس اور کتمانِ حق	//
درسِ بستم [۲۰] (آیت ۴۳ تا ۴۶)	۱۹۲
گذشتہ سے پیوستہ	//
قبولِ حق سے انکار کی وجوہات	۱۹۳
حبِ مال و جاہ کی بیماریاں	//
بیماریوں کا علاج	۱۹۴
نماز جامع عبادات ہے	//
نماز باجماعت	۱۹۵
قول و فعل میں تضاد	۱۹۶
صبر و صلوٰۃ کی برکات	۱۹۸
رجوع الی اللہ	//
درس بست و یک [۲۱] (آیت ۴۷ تا ۵۰)	۲۰۰
ربط آیات	//
بنی اسرائیل کی فضیلت	۲۰۱
اسلامی تاریخ کی حفاظت	۲۰۲
امت مسلمہ کی برتری	//
برتری کا معیار تقویٰ ہے	۲۰۳
مسئلہ شفاعت	//
فرعون سے نجات	۲۰۵
فرعون کی غرقابی	۲۰۷
درس بست و دو [۲۲] (آیت ۵۱ تا ۵۴)	۲۰۹
نزول تورات	۲۰۹
حکمت خاص نعمت ہے	۲۱۲
عدد چالیس کی اہمیت	//
بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی	۲۱۳
مختلف قوموں کے ایک دوسرے پر اثرات	۲۱۴
مسئلہ حلول	۲۱۵
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی	۲۱۶
بچھڑے کے پجاریوں کا قتلِ عام	//
درسِ بست و سہ [۲۳] (آیت ۵۵ تا ۵۷)	۲۱۸
ربط آیات	//
رویت الٰہی کی خواہش	//
بنی اسرائیل کو سزا	۲۱۹
رویتِ الٰہی اس جہان میں ممکن نہیں	۲۲۰
بنی اسرائیل کو ہلاک کرنا اور دوبارہ زندہ کرنا	۲۲۱
جہاد سے فرار	۲۲۳
بادل کا سایہ	۲۲۴
منّ اور سلویٰ	//
اپنے آپ پر ظلم	۲۲۶
درس بست و چہار [۲۴] (آیت ۵۸ تا ۵۹)	۲۲۸
ربط آیات	//
بستی میں داخلہ	۲۲۹
سجدہ شکر	۲۳۰
استغفار کی برکات	۲۳۱

حکم خداوندی میں تبدیلی	۲۳۱	آیاتِ الٰہی کا انکار	۲۵۰
عائلی قوانین اور حق شفعہ	۲۳۲	انبیاء علیہم السلام کا قتل	//
وراثت میں لڑکی کا حصہ	۲۳۳	نافرمانی اور حد سے تجاوز	۲۵۱
ظالموں کا حشر	//	**درس بست و ہفت** ۲۷ (آیت ۶۲)	۲۵۳
زمین کی آبادی اور بربادی	۲۳۴	قانونِ نجات	//
درس بست و پنج ۲۵ (آیت ۶۰)	۲۳۵	مذاہبِ عالم	//
ربط آیات	//	اہل ایمان	۲۵۴
بنی اسرائیل کا طلب آب	//	ھَادُوا کا مفہوم	//
استسقا کی حقیقت	۲۳۶	یہود کی وجہ تسمیہ	۲۵۵
استسقا کا طریقہ	//	یہودی عقائد	//
ضربِ کلیمی	۲۳۷	نصاریٰ کی وجہ تسمیہ	۲۵۷
پانی کی تقسیم	۲۳۹	نصاریٰ کے عقائد باطلہ	۲۵۸
ایک اعتراض اور اس کا جواب	۲۴۰	صابی کون ہیں	۲۵۹
معجزہ اور کرامت	۲۴۱	صابیوں کے عقائد	//
ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر	۲۴۲	حنیفی بمقابلہ صابی	۲۶۱
فساد فی الارض	۲۴۳	ایمان باللہ	//
درس بست و شش ۲۶ (آیت ۶۱)	۲۴۵	ایمان بالآخرت	۲۶۲
ربط آیات	//	اعمالِ صالحہ	//
غلامی کے اثرات	۲۴۶	**درسِ بست و ہشت** ۲۸ (آیت ۶۳ تا ۶۴)	۲۶۴
طعام کی تبدیلی	//	بنی اسرائیل کا عہد	//
کاشتکاری مشقت طلب کام ہے	۲۴۷	ارتفاع طور	۲۶۵
پیشے بلحاظ فضیلت	۲۴۸	دین میں جبر نہیں	۲۶۶
یہودیوں کی ذلت و رسوائی	//	استمساک بالکتاب	۲۶۷

قوانین کی پابندی	۲۶۸	مصلحتِ الٰہی	۲۹۰
بنی اسرائیل کی عہد شکنی	۲۷۰	گائے کی نشانیاں	۲۹۱
درس بست و نہ ۲۹ (آیت ۶۵ تا ۶۶)	۲۷۱	بالآخر مجبور ہو گئے	۲۹۳
یہود کا مقدس دن ہفتہ	//	فضول رسومات کا شاخسانہ	//
جمعہ کی فضیلت	//	واقعہ قتل	۲۹۴
یہود کی قانون شکنی	۲۷۲	احیائے موتیٰ بطور معجزہ	//
یہود کے تین گروہ	۲۷۳	قاتل وراثت سے محروم ہے	۲۹۵
انسان بندر بن گئے	۲۷۴	**درس سی و دو ۳۲** (آیت ۷۴)	۲۹۷
حیلہ سازی بری خصلت ہے	۲۷۵	قساوتِ قلبی	//
جائز حیلہ سازی	۲۷۶	پتھروں سے زیادہ سخت دل	۲۹۸
تبدیلی اشکال کی توجیہ	۲۷۷	پتھروں کے فوائد	۲۹۹
نشانِ عبرت	۲۷۹	سجدہ تقرب الی اللہ کی علامت ہے	//
درس سی ۳۰ (آیات ۶۷)	۲۸۱	بعض اکابرِ دین	۳۰۰
ربط آیات	//	مسلمانوں کی ناکامی کی وجہ	۳۰۲
واقعاتی ربط	//	**درس سی و سہ ۳۳** (آیت ۷۵ تا ۷۹)	۳۰۳
وجہ قتل	۲۸۲	ربط آیات	۳۰۴
قانونِ قسامت	۲۸۳	یہود کی طرف سے ناامیدی	//
کثرتِ سوال سے بچو	۲۸۴	احکام میں تحریف	۳۰۵
نبی سے قطع تعلقی	۲۸۵	یہود کی ہٹ دھرمی	۳۰۶
ٹھٹھا حرام ہے	//	یہود کے ساتھ موافقت اور ان کی مخالفت	//
خوش طبعی جائز ہے	۲۸۶	منافقین کی چالاکیاں	۳۰۷
درس سی و یک ۳۱ (آیت ۶۸ تا ۷۳)	۲۸۸	یہود کی موہوم آرزوئیں	۳۰۸
ربط آیات	۲۸۹	تورات میں تحریف	۳۰۹

تحریف اور مسلمان	٣٠٩
تحریف کرنے والوں کو وعید	٣١١
درس سی وچہار[٣٤] (آیت ٨٠ تا ٨٢)	٣١٢
یہودیوں کے باطل عقائد	″
عہد خداوندی	٣١٣
باطل عقائد کی بنیاد	٣١٤
مسلمانوں کے باطل عقائد	٣١٥
فائز بخات	″
کافر اور مشرک دائمی جہنمی ہیں	٣١٦
جنّت کی چابی	٣١٧
درس سی و پنج[٣٥] (آیت ٨٣)	٣١٨
ربط آیات	″
توحید کے دو پہلو	″
بنی اسرائیل کے مختلف عہد	٣١٩
معرفتِ الٰہی	″
والدین سے حسنِ سلوک	٣٢١
قرابتداروں کے حقوق	٣٢٢
یتیم، مسکین اور فقیر	٣٢٤
درس سی وشش[٣٦] (آیت ٨٤)	٣٢٥
گذشتہ سے پیوستہ	″
تہذیبِ اخلاق	٣٢٦
حسنِ کلام	″
نماز اور زکوٰۃ	٣٣٠
درس سی وہفت[٣٧] (آیت ٨٤ تا ٨٦)	٣٣٢
گذشتہ سے پیوستہ	٣٣٣
خونِ ناحق اور جلاوطنی	″
بنی اسرائیل کی عہد شکنی	″
یہودیوں کی باہمی لڑائیاں	٣٣٥
مسلمانوں کی حالتِ زار	٣٣٦
اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے	٣٣٧
درس سی وہشت[٣٨] (آیت ٨٧ تا ٩٠)	٣٣٨
کتاب اور رسول	٣٣٩
حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور معجزات	″
روح القدس	٣٤٠
انبیاء علیہم السلام کے ساتھ سلوک	٣٤١
یہودیوں کا زعم باطل	٣٤٢
یہود پر اللہ تعالیٰ کی لعنت	″
یہود اور نزولِ قرآن	٣٤٣
نظریہ توسل	٣٤٤
نبی آخر الزمان علیہ السلام سے حسد	″
غضب پر غضب	٣٤٥
درس سی ونہ[٣٩] (آیت ٩١ تا ٩٦)	٣٤٦
گذشتہ سے پیوستہ	٣٤٧
دعوتِ ایمان	″
انبیاء علیہم السلام کا قتل	٣٤٨
گوسالہ پرستی	٣٤٩

موت کی آرزو	۳۵۰
طویل العمری کی خواہش	۳۵۱
موت وحیات کی طلب	۳۵۲
درس چہل ۴۰ (آیت ۹۷ تا ۱۰۱)	۳۵۳
شانِ نزول	۳۵۴
نزول وحی کی مختلف صورتیں	۳۵۶
مقرب فرشتے	۳۵۷
جبرائیل علیہ السلام سے دشمنی	۳۵۸
اہل ایمان کے لیے بشارت	″
فرشتوں سے دشمنی اللہ تعالیٰ سے دشمنی ہے	۳۵۹
مقربین کا عنادی لعنتی ہے	۳۶۰
واضح نشانیاں	″
کتاب اللہ سے روگردانی	۳۶۱
درس چہل و یک ۴۱ (آیت ۱۰۲ تا ۱۰۳)	۳۶۲
شیطان کا اتباع	۳۶۳
حضرت سلیمان علیہ السلام پر جادوگر ہونیکا الزام	″
جادو کے ذرائع	۳۶۴
ہاروت اور ماروت کون تھے	″
ہاروت اور ماروت کی عینی شہادت	۳۶۶
ہاروت اور ماروت کے واقعہ سے انکار	۳۶۷
سحر کیا ہے ؟	۳۶۸
کیا ہاروت ، ماروت انسان تھے ؟	۳۶۹
کیا سارا جادو کفر ہے ؟	″
جادوگر کی سزا	۳۷۰
میاں بیوی میں جدائی	۳۷۱
نافع اور ضار علم	″
یہودیوں سے موافقت	۳۷۲
درس چہل و دو ۴۲ (آیت ۱۰۴ تا ۱۰۷)	۳۷۵
ربط آیات	″
بنی اسرائیل کی اخلاقی پستی	۳۷۶
حضور علیہ السلام کی نظر التفات	″
اہل ایمان کو خطاب	۳۷۷
مشتبہ الفاظ کے استعمال کی ممانعت	۳۷۸
پیغمبر کے لیے لفظ لیڈر کا استعمال درست نہیں	۳۷۹
بنو اسماعیل سے حسد	۳۸۰
تنسیخ آیات کی وجوہات	۳۸۱
بادشاہی اللہ تعالیٰ کی ہے	۳۸۳
درس چہل و سہ ۴۳ (آیت ۱۰۸ تا ۱۱۰)	۳۸۴
ربط آیات	″
یہودیوں کے سوالات	۳۸۵
مشرکین کے سوالات	۳۸۶
صریح گمراہی	″
کثرتِ سوالات کی ممانعت	۳۸۷
اہلِ کتاب کے باطنی ارادے	۳۸۹
حسد بدترین بیماری ہے	″
غیر مسلم حاسد اقوام	۳۹۰
حدِ رجم پر اعتراضات	۳۹۱

قرآن پاک کے خلاف سازش	۳۹۱	خشوع و خضوع	۴۱۱
نماز اور زکوٰۃ	۳۹۲	استقبال قبلہ	۴۱۲
نیکی کا بدلہ نیکی	۳۹۳	درس چہل و شش ۴۶ (آیت ۱۱۶ تا ۱۱۹)	۴۱۳
درس چہل و چہار ۴۴ (آیت ۱۱۱ تا ۱۱۲)	۳۹۴	اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے	″
ربط آیات	″	تشبیہ اور شرک	۴۱۵
یہود و نصاریٰ	″	سُبحانَہٗ کا معنیٰ	″
نجات کا دارومدار	۳۹۶	مالک اور مملوک	″
اتباع خداوندی	۳۹۷	صفت ابداع	۴۱۶
نیک نیتی	۳۹۸	اللہ تعالیٰ کی طرف غلط نسبت	″
اعمال صالحہ	۳۹۹	اللہ تعالیٰ سے کلام کی خواہش	۴۱۷
فرقہ بندی ذریعہ نجات نہیں ہے	″	حضور علیہ السلام کے معجزات	۴۱۸
قانون نجات	۴۰۱	حضور علیہ السلام کے لیے تسلی	″
اجر عظیم	″	درس چہل و ہفت ۴۷ (آیت ۱۲۰ تا ۱۲۳)	۴۲۰
درس چہل و پنج ۴۵ (آیت ۱۱۳ تا ۱۱۵)	۴۰۳	گذشتہ سے پیوستہ	۴۲۱
یہود اور نصاریٰ آمنے سامنے	″	رضامندی کے لیے اہل کتاب کی شرط	″
کتب سماویہ برحق ہیں	۴۰۴	ہدایت الٰہی ہی اصل ہدایت ہے	″
حضرت سلیمان علیہ السلام پر الزام تراشی	″	اہل کتاب میں سے اہل ایمان حق تلاوت	۴۲۳ ″
مشرکین کا نظریہ	۴۰۵	منکرین کے لیے خسارہ	۴۲۴
آخری فیصلہ عدالت الٰہی میں ہوگا	″	حق و باطل کی پہچان	″
تحویل قبلہ	۴۰۷	بنی اسرائیل پر انعامات	۴۲۵
عبادت میں رکاوٹ	″	قیامت کا نقشہ	۴۲۶
تمام عبادت خانے قابل تعظیم ہیں	۴۰۹	درس چہل و ہشت ۴۸ (آیت ۱۲۴)	۴۲۷
	۴۱۰	گذشتہ دروس پر ایک نظر	″

امتحان کی غرض و غایت	۴۲۸
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وطن مالوف	۴۲۹
پہلی آزمائش - قوم سے مقابلہ	۴۳۰
دوسری آزمائش - وطن سے ہجرت	۴۳۱
تیسری آزمائش - بیوی بچے سے جدائی	۴۳۲
چوتھی آزمائش - بیٹے کی قربانی	〃
احکام القرآن	۴۳۳
امتحان میں کامیابی	〃
حضرت ابراہیم علیہ السلام امام الناس ہیں	۴۳۴
ظالم محروم ہے	〃
درس چہل و نہ ۴۹ (آیت ۱۲۵ تا ۱۲۶)	۴۳۵
گذشتہ سے پیوستہ	〃
شیعہ امامیہ کا غلط استدلال	۴۳۶
بیت اللہ - مقام ثواب و امن	۴۳۷
مقام ابراہیم	۴۳۸
بیت اللہ شریف کی صفائی	۴۴۰
مساجد کی صفائی	〃
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خصوصیات	۴۴۱
مناسک کا پس منظر	۴۴۲
حج کی فضیلت	۴۴۳
طواف کا اجر و ثواب	۴۴۴
حرم پاک	〃
درس پنجاہ ۵۰ (آیت ۱۲۷ تا ۱۲۸)	۴۴۶
ربط آیات	〃
تاریخ کعبہ	〃
خبرگیری کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آمد و رفت	۴۴۸
تعمیر کعبہ	۴۴۹
تعمیر کعبہ کے مختلف ادوار	〃
دعا کی قبولیت	۴۵۱
قبولیت دعا کی شرائط	۴۵۲
اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری	〃
امت مسلمہ کی تاسیس	۴۵۳
مناسک حج کی تعلیم	〃
درس پنجاہ و یک ۵۱ (آیت ۱۲۹)	۴۵۶
گذشتہ سے پیوستہ	〃
حضور علیہ السلام کی بعثت کے لیے دعا	۴۵۷
عظیم الشان رسول	〃
نبی انسان ہوتا ہے	۴۵۸
کوئی امتی نبی کی شان کو نہیں پہنچ سکتا	۴۶۰
تلاوت قرآن پاک	〃
نزول وحی	۴۶۱
کتاب کی تعلیم	〃
حکمت کی تعلیم	۴۶۳
تزکیہ نفس	۴۶۵
بیعت اور تزکیہ	〃
اختتام دعا	۴۶۷
درس پنجاہ و دو ۵۲ (آیت ۱۳۰ تا ۱۳۴)	۴۶۸
گذشتہ سے پیوستہ	۴۶۹
حضور علیہ السلام کی بعثت کے آثار	〃
آیت کا شان نزول	۴۷۰
ملت ابراہیمی سے اعراض	۴۷۱
دین، ملت، شریعت	〃
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مرتبہ ذیشان	۴۷۲
حضرت ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام کی وصیت	۴۷۳
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فرمانبرداری	〃
ہر امت اپنے افعال کی ذمہ دار ہے	۴۷۵
درس پنجاہ و سہ ۵۳ (آیت ۱۳۵ تا ۱۳۸)	۴۷۷
گذشتہ سے پیوستہ	۴۷۸
راہ ہدایت	〃
لفظ حنیف کا معنی	۴۷۹
ایمان باللہ	۴۸۰
کتاب پر ایمان	〃
رسولوں پر ایمان	۴۸۱
معیار حق	۴۸۲
اہل ایمان کی کامیابی	۴۸۳
ملوکیت کی خرابیاں	〃
صبغۃ اللہ	۴۸۵
درس پنجاہ و چہار ۵۴ (آیت ۱۳۹ تا ۱۴۱)	۴۸۶
گذشتہ سے پیوستہ	〃
اہل کتاب کے ساتھ جھگڑا	۴۸۷
اخلاص فی الدین	۴۸۸
انبیائے سابقین کا عقیدہ	۴۸۹
کتمان شہادت ظلم ہے	۴۹۰
جھوٹی نسبت مفید نہیں ہوتی	〃
اہل اسلام کے لیے لمحۂ فکریہ	۴۹۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اما بعد

اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ○

یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ کہ قرآن پاک ہی وہ ضابطہ حیات ہے جس پر عمل پیرا ہو کر انسان اِس دنیا میں بھی امن وچین کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اور آخرت میں بھی جنت کی بے پایاں نعمتوں سے مالامال ہو سکتا ہے۔ یہی وہ لائحہ عمل ہے۔ جس نے عرب کے صحرا نشینوں کو قعر ذلت سے نکال کر بام عروج تک پہنچایا۔ تاریخ اٹھا کر دیکھئے زمانۂ نزولِ قرآن میں پورا عرب کس قسم کے ماحول میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ کون سی بُرائی ہے۔ جو قرآن پاک کے اولین مخاطبین میں نہ پائی جاتی تھی، وہ کونسا غیر فطری امتیاز ہے، جو امیر و غریب، کالے اور گورے، آقا و غلام اعرابی و عجمی کی صورت میں موجود نہ تھا۔ منڈیوں میں عورتوں اور غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ بچیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا، وہ لوگ سیاسی نظم و نسق کے نام سے ناآشنا تھے، وہاں نہ کوئی باقاعدہ حکومت تھی، نہ کوئی ضابطہ اور قانون تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار تھا۔ کسی کی جان و مال محفوظ نہ تھے، جنگل کا قانون رائج تھا اور جس کی لاٹھی اُس کی بھینس والا معاملہ تھا۔

اخلاق و تہذیب نام کی کوئی چیز اُن کے ہاں نہ تھی، وہ لوگ جائز ناجائز، پاک، ناپاک اور حلال و حرام سے ناآشنا تھے۔ زنا، جوا، چوری، قتل و غارتگری کے دلدادہ تھے۔ ایک دوسرے سے کوئی پردہ نہ تھا۔ ننگے طواف ہوتے۔ اخلاقی گراوٹ کا یہ حال تھا۔ کہ باپ کی موت کے بعد اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کر لیتے تھے۔ بت پرستی زوروں پر تھی، توحید نام کی کوئی چیز اُن کے پاس نہ تھی، طرح طرح کے توہمات

کا شکار تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کے دعویدار اُن کی تعلیمات سے کوسوں دور تھے۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب حضور نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پاک ہوئی۔ نزول قرآن کا سلسلہ شروع ہوا، اور جب اسی ماحول کی پروردہ جاہل اور ناخواندہ قوم نے قرآن پاک کو سینے سے لگایا تو دیکھتے ہی دیکھتے یہ بے لگام قوم دنیا کی مہذب ترین قوم بن گئی، قیصر و کسریٰ اس کے سامنے سرنگوں ہو گئے، راہزن راہنما بن گئے، ــــــ چور اور ڈاکو امین بن گئے، حسب و نسب پر فخر کرنے والے کالے کلوٹے حبشی غلام کو سیّدنا کہنے لگے، سیاست سے نابلد قوم۔ مہذب ترین قوموں کو سبق سکھانے لگی۔ ضرب و حرب کے وہ معرکے دکھائے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے تک اسلام کا پرچم بائیس لاکھ مربع میل پہ لہرانے لگا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں قرآنی تعلیمات کے ثمرات دنیا کے گوشے گوشے میں نظر آنے لگے، مگر مقام افسوس ہے۔ کہ گذشتہ چند صدیوں سے مسلمان پوری دنیا میں ذلیل ہو رہے ہیں، ایک ارب کی آبادی اور دنیا میں چالیس سے زیادہ ملکوں پر حکمرانی کے باوجود مسلمان قوم ذلت و مسکنت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ وہ قومیں جو اِن کے نام سے کانپا کرتی تھیں۔ آج ان پہ مسلط ہیں مسلمان سپر پاورز کے دستِ نگر ہو کر رہ گئے ہیں۔ حتیٰ کہ اسرائیل جیسا بزدل بھیڑیا جب چاہتا ہے ان کے گلے میں گھس کر انہیں شکار بنا لیتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ بقول علامہ اقبال؛

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر   اور ہم خوار ہیں تارکِ قرآں ہو کر

جب سے مسلمانوں نے قرآنِ پاک کا دامن چھوڑا ہے، ذلیل ہو کر رہ گئے ہیں، مسلسل ناکامیوں کا شکار ہیں۔ بلاشبہ تمام غیر مسلم اقوام ملتِ واحدہ ہیں، اُن کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے۔ کہ مسلمان قوم مفلوج اور ان کی دستِ نگر بن کر رہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اُن کے پاس ایک ہی نسخہ ہے کہ کسی طرح مسلمان قرآن کریم سے دست بردار ہو جائیں وہ خوب جانتے ہیں کہ مسلمان قرآنی پروگرام پہ عمل کر کے ہی غالب آئے تھے اور اس پروگرام کے چھن جانے سے ہی مغلوب ہیں۔ نزول قرآن کے وقت بھی وہ یہی کہتے تھے وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝ دیکھنا تمہارے کانوں میں قرآن کی آواز نہ پہنچنے پائے۔ بلکہ خوب شور مچاؤ تاکہ کوئی دوسرا بھی سُن کر اس کا گرویدہ نہ ہو جائے۔ تمہاری کامیابی کا یہی راز ہے۔ آج بھی وہ لوگ یہی نسخہ آزما رہے ہیں۔ مگر ہم خوابِ غفلت میں پڑے ہیں، قرآنِ پاک کی تعلیمات سے بے بہرہ ہو چکے ہیں۔ یہ کلام مقدس کتابی صورت میں تو ہم سے دور نہیں، ہم اِسے ریشمی غلافوں میں لپیٹ۔

کر اُونچے طاقوں میں سجاتے ہیں، کبھی کبھی تلاوت بھی کر لیتے، حسن قرأت کی محفلیں بھی جماتے ہیں، مگر کبھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ قرآنِ پاک سے دریافت کریں کہ تیرے نزول کا مقصد کیا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری ذمہ داری قرآنِ پاک کے ادب و احترام تک ہی محدود ہے۔ اس کو سمجھ کر اس پر عمل کرنا کسی اور قوم کا کام ہے، یاد رکھئے، اگر آج ہم نے قرآن پاک کو سینے سے نہ لگایا تو بارگاہ رب العزت میں کتنی ذلت و رسوائی اٹھانا پڑے گی جب خود رسول شکایت کریں گے۔ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا یعنی اے مولا کریم! میری قوم نے قرآن پاک کو نظر انداز کر دیا تھا۔

قرآن پاک کا پیغام گھر گھر پہنچانے کے لیے مفسرین کرام نے ہر زمانے میں اپنی ذمہ داری پوری کی ہے۔ اور زبانی اور تحریری صورت میں قرآن پاک کی تفسیر و تشریح کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اور قیامت تک جاری رہیگا ضرورت صرف اُن لوگوں کی ہے۔ جو قرآنی پروگرام کو لے کر اٹھیں اور دنیا میں ایک دفعہ پھر اسلامی انقلاب برپا کر دیں۔

دروس القرآن کا یہ سلسلہ بھی اپنی بساط کے مطابق قرآنِ پاک کے علوم و معارف کو آسان اور عام فہم زبان میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ آیئے ہم قرآنِ پاک کی آواز کو کانوں کے ذریعے دل میں جگہ دیں، اس پر غور و فکر کر کے اس سے راہنمائی حاصل کریں اور پھر عمل پیرا ہو کر اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لیں، نہ صرف دنیا کو امن کا گہوارہ بنا دیں بلکہ آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں سرخرو ہو جائیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

الحمد للہ سلسلہ دروس القرآن کی دوسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے پہلے جلد اوّل جو کہ سورۃ فاتحہ پر مشتمل ہے شائع ہو چکی ہے۔ جلد دوم پارہ اوّل مکمل پر مشتمل ہے ________ دعا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس منصوبے کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ ایسے کام کے لیے پوری زندگی درکار ہوتی ہے۔ کام وسیع اور کٹھن ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ اس کام کے لیے آج جس طرح وسائل مہیا ہیں اور کارکنان کی پوری ٹیم جس طرح قرآنِ پاک کے ساتھ والہانہ محبت اور دلی لگاؤ کے ساتھ مصروفِ کار ہے، ہم اُمید کرتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مہربانی سے یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچے گا۔

اس جلد پہ کام شروع کرتے وقت اس کی ضخامت کے متعلق تردد تھا۔ کہ آیا یہ جلد پوری سورۃ بقرہ

پر مشتمل ہو گی یا اسے پارہ اول تک محدود کرنا پڑے گا ________________

______ پارہ اول کے مسودے کی ضخامت اور اس پر صرف ہونے والے وقت کے پیش نظر آخر یہی فیصلہ ہوا، کہ سورۃ بقرہ کو دو حصوں میں شائع کیا جائے، پہلا حصہ مکمل پارہ اول پر مشتمل ہوا اور دوسرے حصہ میں پارہ دوم اور سورۃ کا بقیہ حصہ از پارہ سوم آجائے۔ ہمیں پورا پورا احساس ہے کہ اس جلد کی اشاعت میں ایک سال سے زیادہ عرصہ لگ گیا ہے اور قارئین کو اندازے سے کچھ زیادہ ہی انتظار کرنا پڑا اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

دوسرے پارے پر کام جاری ہے۔ ہمارا اندازہ یہ ہے۔ کہ سورۃ بقرہ کے ہر دو حصص تقریباً برابر برابر ضخامت کے ہوں گے۔ اور اس کے بعد ہر جلد ایک یا ایک سے زائد مکمل سورتوں پر مشتمل ہوا کریگی اس طریقے سے ہر جلد مکمل پارہ جات پر مشتمل تو نہیں ہوگی، تاہم مکمل سورتیں اس میں آسکیں گی اسلف صالحین نے اسی طریقہ کو پسند فرمایا ہے۔

اگرچہ وقت کے لحاظ سے تو نہیں مگر کام کی نوعیت کے اعتبار سے ہمیں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ کام جس قدر وسیع اور کٹھن ہے، اس کے لیے اسی قدر مسلسل محنت کی ضرورت ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ کام کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے اسے مزید وقت دیا جائے تاکہ ہر آمدہ جلد کے لیے انتظار کی گھڑیاں کم سے کم ہو سکیں، قارئین کرام سے التماس ہے۔ کہ اس سلسلہ اشاعت سے وابستہ جملہ کارکنان خصوصاً صوفی صاحب محترم کی درازئ عمر اور صحت اور اس عظیم کام پر استقامت کی دعا کریں۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ

احقر العباد

(الحاج) لعل دین، ایم اے (علوم اسلامیہ)

شالامار ٹاؤن، لاہور

سخنہائے گفتنی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ خَاتَمِ الۡاَنۡبِیَآءِ وَالۡمُرۡسَلِیۡنَ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَاَزۡوَاجِہٖ وَاَتۡبَاعِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ۔ اَمَّا بَعۡدُ

"خَیۡرَ اُمَّۃٍ" کا خطاب پانے والی قوم آج جس قدر دگرگوں حالات، پستی اور اور تنزل کے جس خطرناک دور سے گذر رہی ہے۔ وہ کسی گوش شنوا اور چشم بینا سے مخفی نہیں۔ اعمال و اخلاق اسلام کی قید سے تقریباً آزاد ہو چکے ہیں۔ ایثار و ہمدردی، مشترک اجتماعی مقاصد اور ملّی ترقی کی کوشش کے بجائے، نفس پرستی، خود غرضی، اور ذاتی تفوق مقصد حیات بن چکا ہے، دفتروں میں رشوت کی عمومیت اور استحصال اس قدر عام ہے کہ پناہ بخدا ہر دولت والا شخص جس کی عزت پر چاہے ہاتھ ڈال دے اور کمزور آدمی کے لیے جائز حقوق کا حصول بھی تقریباً ناممکن ہے۔ اور حصولِ انصاف عنقا ہے۔ دوسروں کو سچائی کا سبق دینے والی قوم نے آج خود جھوٹ کو روزی کمانے کا ذریعہ بنا لیا ہے، عریانی و فحاشی عروج پر ہے، فرقہ وارانہ کشمکش، فوجی استبداد، مارشل لار کی طاغوتی حکومتیں، جدید آلات و انکشافات کا غلط استعمال تصویری فتنہ، حد سے زیادہ آرام طلبی اور رفاہیتِ بالغہ کا فساد، کھیل و تماشا کی کثرت، اسلام کو اپنے غلط مقاصد کے لیے استعمال کرنا، ملوکیت کی عشرت پسندیاں، اسراف اور جدت طرازیاں، اللہ تعالیٰ کی کتاب کی غلط تفسیریں اور باطل تاویلیں، رسومات و بدعات کی فراوانی، اور دھوکا بازی اور فریب دہی میں دوسری تمام قوموں کو مات کر دیا ہے۔ اور ان کے ماضی کا تمام ریکارڈ توڑ دیا ہے، قوم کی دیانت،

شرافت، صداقت اور امانت کا حال کسی سے مخفی نہیں، اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں) کی تعلیم پانے والی قوم کے ممالک اور افراد آپس میں نبرد آزما ہیں۔ آئے دن قتل میں اضافہ، گھر کے اندر عزت اور باہر جان محفوظ نہیں، اشتراکیت، سرمایہ داری کی لعنت کے عروج عیسائیت، یہودی ازم کی تباہ کاریوں، ہندو ازم کی تنگ نظری سے متاثرہ قوم، زبان پر اسلام اسلام اور عمل اس کے برعکس اور اسلام کی پیٹھ میں ایک زہر آلود خنجر ہے۔

بایں ہمہ مسلم معاشرہ میں ایسے افراد بھی موجود ہیں۔ جو کہ صحیح معنوں میں قرآنی تعلیمات سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔ اور اسلام کی صحیح تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تمنّا رکھتے ہیں، ان حالات میں مسلمانوں کے ساتھ دلی ہمدردی اور ان کی اس حالتِ زار پہ درد دِل رکھنے والے حضرات کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ کہ وہ ان کو صحیح قرآنی تعلیمات سے روشناس کرائیں۔

رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا صوفی عبد الحمید صاحب دام مجدہم کا انداز بیان سادہ اور دلپسند ہے۔ تلبیس، بناوٹ اور تکلف سے دور لیکن پُر مغز، جامع اور مسلک سلف کے مطابق منشاء قرآن کا صحیح مظہر ہے۔ اور داعی الی العمل ہے برصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے قرآن کریم کا ترجمہ فارسی زبان میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کیا۔ اس کے بعد شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبد القادرؒ نے اردو میں بے حد مفید ترجمے کیے۔ شاہ عبد العزیزؒ نے حکیمانہ تفسیر لکھی۔ اور دیگر بزرگانِ دین نے بھی اپنی اپنی طاقت کے مطابق اس میں حصہ لیا۔ متأخرین میں حضرت تھانویؒ، کا بیان القرآن، حضرت شیخ الہند کا ترجمہ اور تفسیر، تفسیر عثمانی اور حضرت لاہوریؒ کا ترجمہ، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی تفسیر معارف القرآن اور اس قسم کے دیگر تراجم اور تفاسیر مستند اور ہر اعتبار سے خلق خدا کے لیے نافع ہیں۔ اور دِل میں کلام الٰہی پہ عمل کا سچا جذبہ پیدا کرنے والے ہیں۔

معالم العرفان فی دروس القرآن بھی اسی پاکیزہ سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اور چند وجوہ کے اعتبار سے ممتاز بھی ہے۔ عام فہم طرز، انداز بیان میں مخاطبین کے ذہنوں کا لحاظ، واقعات کا سلسلہ انتہائی مربوط اور دورِ حاضر کی دینی ضرورتوں کو پورا کرنے کی رعایت، مسلمانوں کی بنیادی خامیوں کی واضح نشاندھی تفسیری سلسلہ کے شبہات اور جدید دور میں پیدا ہونے والے بڑے بڑے شبہات کا بڑے لطیف انداز میں حل، تحقیق کے نام پر تحریف کرنے والوں اور جدت پسند حضرات کی ٹھوکروں کی نشاندھی، سیاسی، اقتصادی، معاشی، فقہی مسائل اور جدید دور کے مسائل کی الجھی ہوئی گتھیوں کا قرآن و سنّت اور سلف صالحین کے

مسلک کے مطابق سلجھانا، تاریخی واقعات اور کہیں کہیں مفسرین سلف اور ان کی کُتب کا تعارف، فلسفۂ ولی اللّٰہی اور تصوف کا افادی پہلو، ویسے بھی حضرت صوفی صاحب دام مجدہم کا نام نامی ہی کسی کتاب کے مستند ہونے کے لیے کافی ہے۔

آجکل مسلمانوں کے باہمی اتفاق کے لیے بڑی پر زور کوششیں ہو رہی ہیں۔ تقاریر، جلسے، اخباری مضامین لٹریچر، مباحثے، لیکچر اور تصنیفات کے ذریعے باہمی اتفاق، پر زور دیا جا رہا ہے۔ لیکن اصل میں جو چیز نااتفاقی کی جڑ ہے۔ اُدھر کوئی توجہ نہیں کرتا۔ یعنی مخالف پر تنقید میں حدِ اعتدال سے تجاوز، آپس کے اختلافات کی شدت اور ایک دوسرے سے بُعد کا ایک بہت بڑا سبب زبان کی درشتگی اور تیزی ہے۔ بحمد اللّٰہ تعالیٰ دروس القرآن میں باطل مذاہب کی پوری پوری تردید، اور گمراہ فرقوں کے غلط عقائد و مسائل اور نظریات پر شستہ انداز میں تنقید ہے۔ لیکن اعتدال کو کسی حالت میں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور عام آدمی پر بھی حقیقت حال واضح ہو جاتی ہے۔ اور قرآن و سنّت کا صحیح منشا سامنے آجاتا ہے۔ اور حق کا متلاشی حق کو پا لیتا ہے

سلسلہ دروس القرآن کی دوسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے پیشتر سورۃ فاتحہ پر مشتمل جلد اوّل شائع ہو چکی ہے۔ یہ جلد سورۃ بقرۃ کے سولہ رکوعات یعنی پارہ "الٓمّٓ" پر مشتمل ہے۔ سورۃ بقرہ میں سینکڑوں مضامین بیان ہوئے ہیں۔ لیکن اس کا مرکزی مضمون یہود کے غلط عقائد کا بیان اور ان کی تردید، ان کی خباثت اور تنزلی کے اسباب، ان کی سیاسی غلطیاں اور روحانی بیماریاں اور ان کی اصلاح ہے۔ اُمتِ مسلمہ بھی آج انہیں حالات سے دوچار ہے۔ جس میں بنی اسرائیل تھے۔ مخبر صادق صلی اللّٰہ علیہ وسلّم نے انہی حالات کی پیشین گوئی آج سے چودہ سو سال پہلے فرمائی تھی۔ لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِىْ كَمَا اَتٰى عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ البتہ ضرور میری امت پر بھی ایسا دور آئیگا حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ (ترمذی ۳۷۹)

جس طرح بنی اسرائیل پر آیا جیسا کہ جوتے کے ساتھ جوتا ملتا ہے۔ تو اس طرح آج کے جملہ مسائل کا حل بھی صرف اور صرف قرآن پاک میں ہی ہے۔ قرآن پاک کا منشا و مراد سمجھنے اور اذہان کو کتاب الٰہی کے قریب تر کرنے کے لیے دروس القرآن یقیناً بہترین راہنما ہو سکتی ہے۔ علماء، طلباء، خطباء، اور عوام بلکہ ہر طبقے کے لیے یکساں مفید ہے۔ تفسیر کے ساتھ ساتھ عام فہم، سلیس اُردو اور معنی خیز ترجمہ بھی سامنے آرہا ہے۔

آخر میں دلی دعا ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ ان دروس کو صاحب درس حضرت صوفی صاحب دام مجدہم اور انجمن محبان اشاعت قرآن کے جملہ اراکین جو کہ دروس القرآن کی طباعت اور ان دروس کو کیسٹوں

کے ذریعے ہر خاص و عام تک پہنچانے کے لیے دن رات کوشاں ہیں۔ خصوصاً جناب الحاج لعل دین صاحب ایم اے علوم اسلامیہ اور اس میں حصہ لینے والے تمام حضرات کی بخشش کا ذریعہ بنائے ان کی اس سعی کو قبول فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس سے فیضیاب ہونیکی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

فقط

محمد اشرف (فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم)

۵ صفر ۱۴۰۵ھ مطابق ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء

سورة البقرة

الٓمّٓ ۱ البقرۃ ۲

درس اول (آیت ۱ تا ۲)

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ مِائَتَانِ وَسِتٌّ وَّثَمَانُوْنَ اٰيَةً وَّاَرْبَعُوْنَ رُكُوْعًا

سورۃ بقرہ مدنی ہے اور یہ دو سو چھیاسی ۲۸۶ آیتیں اور چالیس ۴۰ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

الٓمّٓ ۝۱ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲

ترجمہ: الٓمّٓ ۝۱ یہ کتاب، نہیں شک اس میں، یہ راہنمائی کرتی ہے متقیوں کی ۝۲

سورۃ کے موضوع اور نام سے پہلے قرآن کریم کی سورتوں سے متعلق چند بنیادی باتوں کا ذکر ضروری ہے، اس کے بعد سورۃ بقرہ کے نام کے بارے میں کچھ بیان ہوگا۔

سورۃ اور آیت

لفظ سورۃ س کے ساتھ آیا ہے۔ اور اس کا معنیٰ ہے قِطْعَةٌ مِّنَ الْاٰيَاتِ یعنی آیتوں پر مشتمل ایک ٹکڑا یا حصہ۔ گویا چند یا زیادہ آیتیں مل کر ایک ٹکڑا بن جائے تو اسے سورۃ کہا جاتا ہے۔ کسی سورۃ کے لیے کم از کم تین آیات کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ سورۃ عصر، سورۃ کوثر اور سورۃ نصر تین تین آیات پر مشتمل ہیں۔ سورۃ بقرہ سب سے لمبی سورۃ ہے۔ اور اس کی دو سو چھیاسی ۲۸۶ آیات ہیں۔

سورۃ کے ہر ٹکڑے کو آیت کہتے ہیں۔ جس طرح سورتیں چھوٹی بڑی ہوتی ہیں۔ اسی طرح آیتیں بھی چھوٹی بڑی ہوتی ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی آیت ایک لفظ کی بھی ہو سکتی ہے جیسے الٓمّٓ یا حٰمٓ۔ اور ایک حرف بھی ایک آیت ہو سکتا ہے جیسا قٓ۔ نٓ وغیرہ۔ اور بعض آیات اتنی لمبی ہوتی ہیں کہ پورے ایک رکوع پر مشتمل ہوتی ہیں۔ جیسے سورۃ مزمل کے دوسرے رکوع والی آیت ہے۔

آیت کے مختلف معانی

آیت کا معنیٰ علامت اور اس کا دوسرا معنیٰ دلیل ہے۔ قرآن کریم میں آیت کا لفظ

ان دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں زمین و آسمان کی پیدائش، دن رات کے اختلاف، پانی میں چلنے والی کشتی، بارش اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے پھلوں وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا "لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ" اس میں عقلمندوں کے لیے قدرت کی نشانیاں یا علامات ہیں۔ سورۃ روم میں فرمایا "وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا" یہ بات اللہ تعالیٰ کے دلائل قدرت میں سے ہے کہ اس نے تمہارے نفسوں میں سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے۔

قرآن میں آیت کا لفظ عبرت کے معنوں میں بھی آتا ہے جیسا کہ سورۃ سجدہ میں فرمایا کیا یہ بات لوگوں کو ہدایت نہیں کرتی کہ "كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ" ہم نے اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا "يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ"، جو اپنے مکانوں میں چلتے پھرتے تھے۔ "اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ" اس میں درس عبرت ہے۔

اسی طرح آیت کو معجزے کے طور پر بھی پیش کیا گیا ہے۔ بہت سے انبیاء علیہم السلام نے معجزات پیش کئے۔ جن کا مطالبہ قوم کے لوگ کرتے تھے۔ سورۃ رعد میں دو مقامات پہ آیا ہے "وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ" کفار کہتے ہیں کہ اس کے رب کی طرف سے اس پہ کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل ہوتا گویا آیت کا معنی معجزہ بھی ہوتا ہے۔

آیت کا معنی حکم بھی آتا ہے۔ جیسے "يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ" پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے احکام پڑھ کر سناتا ہے۔ یا جیسا کہ سورۃ عنکبوت میں فرمایا "وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ" اور ہمارے احکام سے کافر ہی انکار کرتے ہیں۔

تاہم ان تمام تر معانی کے باوجود جب آیت کا لفظ سورۃ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ تو اس کا معنی سورۃ کا ایک حصہ یا جزو ہوتا ہے۔ کیونکہ بہت سی آیات مل کر سورۃ ترتیب پاتی ہے

سورتوں اور آیتوں کی ترتیب

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا تھا قرآن پاک کی کل ایک سو چودہ سورتیں ہیں۔ سب سے پہلی سورۃ فاتحہ ہے۔ دوسرے نمبر پر سورۃ بقرہ ہے۔ پھر آل عمران اور سورۃ نساء ہے۔ یہ ترتیب اجتہادی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔ یعنی یہ ترتیب صحابہ کرامؓ کی دی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ یہ

حضور علیہ السلام کی مقرر کردہ ترتیب ہے[1]۔ اسی طرح ہر سورۃ میں آیات کی جو ترتیب ہے مثلاً پہلے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" اس کے بعد "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" اور پھر "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" یہ ترتیب بھی توقیفی ہے[2]۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[3] ضَعُوْا ھٰذِہِ الْاٰیَۃَ فِی السُّوْرَۃِ الَّتِیْ یُذْکَرُ فِیْھَا کَذَا وَکَذَا یعنی اس آیت کو فلاں مقام پہ رکھ دو، تو صحابہ کرامؓ نے آپ کے فرمان کے مطابق آیات کو ترتیب دے لیا۔ انہوں نے اپنی طرف سے آگے پیچھے نہیں کیا، بلکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تعمیل کی۔ احادیث میں صاف طور پر آتا ہے[4] کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو حضور علیہ السلام ارشاد فرماتے اسے فلاں مقام پہ رکھ دو۔ تو صحابہ کرامؓ ویسے ہی کرتے۔ البتہ سورتوں کی ترتیب کے متعلق کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض مفسرین محققین فرماتے ہیں[5] کہ سورتوں کی ترتیب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قطعی فرمان نہیں ہے تاہم جمہور کہتے ہیں کہ سورتوں[6] کی ترتیب بھی حضور علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ہی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ہی موجودہ ترتیب کو قائم کیا۔

سورتوں کے اقسام بلحاظ طوالت

قرآن پاک کی پہلی سات سورتوں یعنی سورۃ بقرہ سے لے کر سورۃ یونس تک کو سبع طوال یعنی سات لمبی سورتیں کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد چودھویں پارے میں سورۃ نحل تک کو مثانی یعنی طوال کے بعد دوسرے نمبر والی سورتیں کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد حجرات تک کی سورتوں کو مئین کہا جاتا ہے۔ مئین سے مراد وہ سورتیں ہیں۔ جو کم و بیش ایک سو آیات پہ مشتمل ہوں اس کے بعد والناس تک سورتیں مفصلات کہلاتی ہیں۔ آگے مفصلات کے بھی تین گروپ ہیں۔ حجرات سے لیکر سورۃ بروج تک کو طوال مفصل، بروج سے لے کر سورۃ بینہ تک اوساط

---

1 تفسیر اتقان فی علوم القرآن للسیوطیؒ ص ۶۲ ج ۱ مطبوعہ سہیل اکیڈیمی لاہور۔

2 تفسیر اتقان ص ۶۰ ج ۱   3 ترمذی ص ۱۴۲ ج ۲۔

4 ترمذی ص ۱۴۲، تفسیر اتقان ص ۶۰ ج ۱، مسند احمد ص ، مستدرک حاکم ص ۲۲۱ ج ۲)

5 روح المعانی ص ۶۲ ج ۱   6 روح المعانی ص ۶۲ ج ۱)

مفصل اور پھر آخر تک کو قصار مفصل کہا جاتا ہے۔ قصار کا معنی چھوٹی سورتیں ہے۔

وجہ تسمیہ

قرآن کریم کی مختلف سورتوں کے ناموں کی مختلف وجوہات ہیں۔ بعض سورتوں کے نام ان کے ابتدائی حروف ہیں قٓ۔ صٓ۔ طٰہٰ۔ یٰسٓ وغیرہ بعض سورتوں کے اسماء انکے پہلی آیت کے کسی لفظ پر رکھے گئے ہیں۔ جیسے سورۃ کوثر کا نام اس کی پہلی آیت "اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ" سے لیا گیا ہے۔ کسی سورۃ کا نام اس سورۃ میں مذکور و مشہور واقعہ سے ماخوذ ہے۔ جیسے بقرہ کہ اس میں گائے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ اسی طرح اسراء میں معراج کا واقع آیا ہے۔ سورۃ اعراف میں اعراف کا واقعہ ہے۔ جو کہ ایک جگہ کا نام ہے۔ سورۃ آل عمران کا نام بھی واقعہ آل عمران کی وجہ سے ہے۔ سورۃ یونس کا نام یونس اس لیے ہے کہ اس میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ہے۔

مکی اور مدنی سورتیں

زمانہ نزول کے لحاظ سے سورتوں کی دو قسمیں ہیں۔ یعنی مکی اور مدنی سورتیں جو سورتیں ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں وہ مکی کہلاتی ہیں۔ خواہ وہ مکہ معظمہ میں قیام کے دوران نازل ہوئیں یا طائف میں یا کسی اور سفر کے دوران۔ مدنی سورتیں وہ ہیں، جو ہجرتِ مدینہ کے بعد نازل ہوئیں۔ ہجرت کے بعد جو بھی سورتیں نازل ہوئیں۔ خواہ وہ قیام مدینہ کے دوران یا تبوک یا خیبر یا کسی اور مقام پر وہ سب مدنی سورتیں کہلاتی ہیں[1]۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے زمان و مکان کے لحاظ سے کئی قسمیں بیان کی ہیں[2]۔ مثلاً جو سورۃ حضر یعنی اقامت کی حالت میں نازل ہوئی۔ وہ حضری کہلاتی ہے۔ اور جو سفر کی حالت میں اتری اس کو سفری سورۃ کہتے ہیں۔ اسی طرح رات کے وقت نازل ہونے والی سورۃ لیلی اور دن کے وقت اترنے والی نہاری کہلاتی ہے۔

بعض سورتیں دفعۃً یعنی یکدم نازل ہوئی ہیں۔ ان کو دفعی سورتیں کہتے ہیں اور بعض سورتیں تدریجی کہلاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ تدریجاً نازل ہوئی ہیں۔ کبھی چند آیتیں نازل ہوگئیں۔ پھر درمیان میں وقفہ آگیا پھر کچھ نازل ہوگئیں۔ یہ تدریجی سورتیں ہیں۔

بعض سورتیں ایسی ہیں جو کہلاتی تو مدنی ہیں، مگر ان کے کچھ حصے مکی دور میں نازل ہوئے مثلاً

---

[1] تفسیر اتقان صہ ۹/ ج۱ [2] تفسیر اتقان صہ ۱۸/ ج۱ تا صہ ۲۲/ ج۱

یہی سورۃ "بقرہ" مدنی سورۃ ہے۔ مگر "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ" سے لے کر آخر تک کی آیتیں مکی زندگی کا حصہ ہیں۔ مشہور روایت میں آتا ہے[1] کہ معراج کے دوران حضور علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے تین تحفے دیے گئے۔ یعنی پانچ نمازیں۔ سورۃ بقرہ کی آخری آیتیں۔ اور ان لوگوں کے لیے خوشخبری جو شرک میں ملوث نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ آپ کا معراج مکی زندگی میں ہوا۔ لہٰذا یہ آخری آیتیں مکی زندگی کی ہیں۔ اگرچہ سورۃ بقرہ مدنی سورۃ ہے۔

ترتیبِ تلاوت کی حکمت

مفسّرین کرام فرماتے ہیں کہ ترتیبِ نزول کا تقاضا تو یہ تھا کہ پہلے مکی سورتیں آتیں اور اس کے بعد مدنی سورتوں کا بیان ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم تمام نوعِ انسانی کے لیے نازل ہوا ہے۔ اور مختلف انسانوں کے مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ تو اللہ تعالےٰ نے انسانی مزاج کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے پہلے وہ سورتیں رکھی ہیں جو جامع اور مانع ہیں اور ان میں ہر قسم کے احکام پائے جاتے ہیں۔ اور یہ عام طور پر مدنی سورتیں ہیں۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر بنیادی عقائد کا ذکر ہے۔ ان میں ہر قسم کے احکام نہیں پائے جاتے۔ تو گویا پہلے مدنی اور لمبی سورتوں کو لانے میں حکمت یہ ہے۔ کہ لوگ ہر قسم کے احکام سے مانوس ہو جائیں۔

فضیلتِ سورۃ

حدیث پاک میں سورۃ بقرہ کے بہت سے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ ترمذی شریف[2] کی روایت میں نبی علیہ السلام کا فرمان ہے۔ لَا تَجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ مَقَابِرَ یعنی اپنے گھروں کو قبروں کی طرح سنسان نہ بنالو۔ بلکہ وہاں نمازیں بھی پڑھا کرو۔ نیز یہ بھی فرمایا وَاِنَّ الْبَیْتَ الَّذِیْ تُقْرَءُ الْبَقَرَۃُ فِیْہِ لَا یَدْخُلُہُ الشَّیْطٰنُ یعنی جس گھر میں سورۃ بقرہ کی تلاوت ہوتی ہو، وہاں شیطان داخل نہیں ہوتا۔ مسلم شریف[3] کی روایت میں اس طرح آتا ہے یُؤْتٰی بِالْقُرْاٰنِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَاَھْلِہِ الَّذِیْنَ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ بِہٖ تَقْدُمُہٗ سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ وَاٰلِ عِمْرَانَ یعنی قیامت کے روز قرآن پاک اور اس کے اہل کو لایا جائے گا۔ ان کے آگے آگے سورۃ بقرہ اور سورۃ آلِ عمران ہوگی۔

---

[1] مسلم ص ۹۷ ج ۱
[2] ترمذی ص ۴۰۸
[3] مسلم ص ۲۷۰ ج ۱

یہاں پر یہ بات یاد رہے۔ کہ اہل قرآن سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن پاک پر عمل کرتے ہیں۔ آج کل تو چکڑالوی اور پرویزی وغیرہ اہل قرآن کہلاتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ گمراہ اور منکرین قرآن ہیں۔

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں[۱] تَعَلَّمُوا سُورَةَ الْبَقَرَةِ فَإِنَّ أَخْذَهَا بَرَكَةٌ یعنی سورۃ بقرہ سیکھو، کیونکہ اس کا سیکھنا باعث برکت ہے۔ وَتَرْكَهَا حَسْرَةٌ اور اس کا ترک کرنا باعث حسرت ہوگا۔ نیز فرمایا[۲] لِكُلِّ شَيْءٍ سَنَامٌ وَسَنَامُ الْقُرْآنِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ ہر چیز کی ایک کوہان یا بلندی ہوتی ہے۔ اور قرآن کی کوہان سورۃ بقرہ ہے یعنی یہ سورۃ قرآن پاک میں اس طرح نمایاں ہے جس طرح اونٹ کی پشت پر کوہان نمایاں ہوتی ہے

فرمایا[۳] سورۃ بقرہ میں ایک ایسی آیت ہے هِيَ سَيِّدَةُ آيِ الْقُرْآنِ آيَةُ الْكُرْسِيِّ یہ قرآن پاک کی تمام آیتوں کی سردار ہے۔ یعنی آیۃ الکرسی۔ گویا سب سے بڑی اور سب سے فضیلت والی آیت اسی سورۃ میں ہے۔ ایک اور روایت میں آتا ہے[۴]۔ کہ سورۃ بقرہ فُسْطَاطُ الْقُرْآنِ یعنی قرآن کا خیمہ ہے، جس میں ہر چیز آجاتی ہے۔ فرمایا[۵] اِقْرَءُوا الزَّهْرَاوَيْنِ الْبَقَرَةَ وَآلَ عِمْرَانَ دو روشن سورتیں پڑھو۔ یعنی سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران۔ یہ قیامت کے روز اس طرح آئیں گی، جس طرح دو بادل ہوتے ہیں۔ اور ان کے درمیان بڑی چمک ہوگی یہ سائبان کی طرح اُوپر آئیں گی۔

مسند احمد کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے[۶]۔ اَلْبَقَرَةُ سَنَامُ الْقُرْآنِ سورۃ بقرہ قرآن کریم کی کوہان ہے۔ اس کی ہر آیت کے ساتھ اسّی۔ اسی[۸۰] فرشتے اترتے رہے ہیں۔ یعنی ہر آیت کے نزول کے وقت ملائکہ کا نزول ہوتا تھا۔ فرمایا اس کی آیت "اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ" کو اللہ تعالیٰ نے عرش کے نیچے سے نکال کر سورۃ میں شامل کیا ہے اسی آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کا اسمِ اعظم بھی ہے۔

اس سورۃ مبارکہ میں مختصر طور پر بہت سے مضامین آجاتے ہیں۔ مثلاً اس میں اللہ تعالیٰ — مضامین سورۃ

۱؎ مسند احمد ص ۳۴۸ ج ۵، دارمی ص ۳۲۲ ج ۲، ۲؎ مستدرک حاکم ص ۲۵۹ ج ۲، ترمذی ص ۴۰۸ ۳؎ ترمذی ص ۴۰۸، مستدرک حاکم ص ۲۵۹ ج ۲
۴؎ تفسیر در منثور ص ۲۰ ج ۱ بحوالہ دیلمی ۵؎ مسلم ص ۲۷۰ ج ۱، تفسیر در منثور ص ۱۸ ج ۱، مستدرک حاکم ص ۲۸۷ ج ۲ ۶؎ مسند احمد ص ۲۶ ج ۵

نے منعم علیہم لوگوں کے بکثرت اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ اور ان کے نتائج سے آگاہ کیا ہے اسی طرح گمراہ کرہ لوگوں کے اوصاف اور ان کی نشانیاں بیان کی ہیں۔ جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں اس سورۃ مبارکہ میں توحید باری تعالیٰ اور رسالت کا ذکر دلائل عقلیہ اور نقلیہ کے ساتھ آیا ہے ختم نبوت کا بیان ہے۔ اور وحی کی ضرورت کو واضح کیا گیا ہے۔ انسان کے مکلف ہونے کا بیان ہے۔ اور پھر وحی الٰہی کی احتیاج کا ذکر ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر انسان اپنے تمام تر مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔ انہیں زندگی کے ہر موڑ پر وحی الٰہی کی دستگیری کی ضرورت ہے۔

اس سورۃ میں عبرت حاصل کرنے کے لیے مختلف ذرائع کو بیان کیا گیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور ان کے فضائل کا ذکر ہے۔ بنی اسرائیل کے اسلاف پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا بیان ہے۔ اور موجودہ بنی اسرائیل کی خباثتوں، شرارتوں، ان کے عناد اور ضد کا ذکر ہے۔ اس سورۃ میں ملت ابراہیمی کا ذکر ہے۔ بیت اللہ شریف کے کعبہ ہونے کا ذکر ہے۔ تہذیب، اخلاق اور تعلیم کے ارکان، تدبیر منزل اور سیاست مدن کا ذکر ہے۔ غیر اللہ کی نذر و نیاز کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس میں قوانین مملکت اور خلافت کبریٰ کے اصول بیان کیے گئے ہیں کہ امیر کیسا ہونا چاہیئے۔ اور فوج کے لیے کیا قوانین ضروری ہیں۔

اس سورۃ مبارکہ میں اولیاء اللہ اور اولیاء الشیطان کی پہچان کرائی گئی ہے۔ سخاوت کی ترغیب دی گئی ہے۔ بخل کی مذمت بیان ہوئی ہے۔ سود کی حرمت اور تجارت کے قوانین کا بیان ہے جملہ عبادات نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل ہیں۔ معاشرتی امور سے متعلق نکاح، طلاق، قسم، ایلاء وغیرہ کے احکام ہیں۔ دیوانی اور فوجداری مقدمات کا بیان ہے۔ عقوبات میں قصاص اور دیت کے احکام ہیں۔ اصلاح معاشرہ، جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ، غرض اس سورۃ مبارکہ میں اسینکڑوں، ہزاروں مضامین بیان ہوئے ہیں

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ بقرہ رکھا گیا ہے۔ بقرہ عام طور پہ گائے کے لیے بولا جاتا ہے تاہم عربی زبان میں یہ لفظ گائے اور بیل دونوں کے لیے مشترک ہے۔ اگر وضاحت کرنی ضروری ہو تو بیل کے لیے ثور کا لفظ بھی بولا جاتا ہے۔ بہر حال اس سورۃ مبارکہ میں جس بقرہ کا ذکر ہے کہ وہ نر ہو یا مادہ ہو۔

قرآن پاک کے الفاظ و حروف کے اعداد و شمار جمع کرنے والے لوگوں[1] کے مطابق اس سورۃ کی دو سو چھیاسی ۲۸۶ یا دو سو ستاسی ۲۸۷ آیتیں اور چالیس ۴۰ رکوع ہیں۔ اس میں چھ ہزار دو سو اکیس ۶۲۲۱ کلمات اور پچیس ہزار پچیس ۲۵۰۲۵ حروف ہیں۔

سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ میں ربط

سورۃ فاتحہ کے پہلے حصے میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے۔ دوسرے حصے میں بندے کی طرف سے اس بات کا اقرار ہے۔ کہ وہ صرف اسی کا عبادت گذار ہے۔ اور اسی کی اعانت کا طالب ہے۔ تیسرے حصے میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝" اے پروردگار! ہمیں سیدھے راستے کی طرف راہنمائی فرما۔ چنانچہ اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ جس ہدایت اور راہنمائی کی تمہیں ضرورت ہے " ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ " یہ کتاب ہے، جو مرکز و منبع ہدایت ہے۔ اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ میں یہ ربط ہے۔

مہمات دین

قرآن پاک میں بیان کردہ واقعات عام طور پر کئی سورتوں میں آئے ہیں۔ مثلاً فرعون کا واقعہ قرآن پاک میں تقریباً پچاس مرتبہ بیان ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات مختلف مقامات پر بیان ہوئے ہیں۔ تاہم یہ گائے کا واقعہ صرف سورۃ بقرہ ہی میں بیان ہوا ہے۔ قرآن پاک کے کسی دوسرے مقام پر اس واقعہ کا کوئی حصہ نہیں آیا۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[2] کہ اس واقعہ میں دین کے تمام مہمات یعنی اہم باتیں سمجھا دی گئیں ہیں

معرفت الٰہی

اس واقعہ کی اہم ترین بات اللہ وحدہٗ لاشریک کی پہچان اور شناخت ہے۔ جب بنی اسرائیل کا ایک آدمی قتل ہوگیا، تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اس سلسلہ میں دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ گائے ذبح کرو اور اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا مردے کے جسم پر مارو تو وہ خود بخود بتائے گا کہ اس کا قاتل کون ہے۔ بنی اسرائیل نے ایسا ہی کیا تو مردہ زندہ ہوگیا۔ اور اس نے اپنے قاتل کی نشاندہی کر دی۔

---

[1] تفسیر اتقان ص۶۸/۱ج، تفسیر عزیزی فارسی ص۵۹ پارہ ۱، [2] تفسیر عزیزی ص۶۹۰ پارہ ۱

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ مردہ گوشت لگانے کی وجہ سے زندہ ہوگیا تھا یا خود بخود ہی کھڑا ہوگیا تھا۔ اگر خود بخود زندہ ہوگیا۔ تو دوسرے سینکڑوں ہزاروں مُردے خود بخود کیوں نہیں زندہ ہوجاتے۔ اور اگر وہ مردہ گائے کا گوشت لگانے کی وجہ سے زندہ ہوا۔ تو گائیں بھی بیشمار ذبح ہوتی ہیں۔ مردوں کو زندہ کرنے کا یہ آسان نسخہ ہے۔ ہر مُردے کو زندہ کرنے کے لیے ایسا کیا جاسکتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کا وہ مردہ نہ تو خود بخود زندہ ہوگیا۔ اور نہ ہی محض گائے کا گوشت لگانے سے، بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ ہوا۔ جو صانع اور قادر مطلق ہے لہذا اللہ رب العزت کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت سمجھ میں آتی ہے۔ اور یہ سورۃ مبارکہ کی سب سے اہم بات ہے۔

ثبوتِ نبوت

اس سورۃ میں دوسری اہم بات نبوت کا ثبوت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے قاتل کا پتا لگانے کے لیے جو طریقہ بتایا، وہ کامیاب ہوا۔ لہذا موسیٰ علیہ السلام کی نبوت ثابت ہوگئی جب ایک نبی کی نبوت ثابت ہوگئی۔ تو تمام انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا یقین ہوگیا۔ نیز یہاں پر یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ نبی کی بات کو بغیر تفتیش کے تسلیم کر لینا چاہیئے۔ اس میں حیل و حجت نہیں کرنی چاہیئے۔ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کے بتائے گئے طریقے میں چھان بین شروع کر دی۔ کہ جس گائے کو ذبح کرنے کے لیے کہا گیا ہے وہ کیسی ہونی چاہیئے اور اس کا رنگ کیسا ہونا چاہیئے، وغیرہ وغیرہ۔

اگر وہ لوگ اپنے نبی کے حکم کے مطابق فوراً عمل کرتے ہوئے گائے ذبح کر دیتے، تو مسئلہ فوراً حل ہوجاتا۔ انہوں نے اپنے اوپر جس قدر سختی کی، اُسی قدر قیدیں بڑھتی چلی گئیں۔

استقامت کی ضرورت

اس واقعہ میں تیسری اہم چیز استقامت ہے۔ انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے عقیدے عمل اور اخلاق پہ قائم رہے۔ اگر استقامت میں لغزش آجائے گی۔ تو کئی قسم کے فساد پیدا ہوجائیں گے۔ بنی اسرائیل کے آدمی کے قاتل نے اس جرم کا ارتکاب اس لیے کیا تھا۔ تاکہ مقتول کو راستے سے ہٹا کر چچا کا سارا مال حاصل کرلے۔ گویا اُس نے استقامت کو چھوڑ دیا، تو اللہ تعالےٰ نے اُسے ذلیل و رسوا کر دیا معلوم ہوا کہ استقامت بڑی چیز ہے اس کو چھوڑنے سے ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مجاہدہ

اس واقعہ کی چوتھی بات مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ دین اور ایمان کے راستے میں کوشش

اور جدوجہد کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ جوانی کے عالم میں انسان کی عقل مغلوب ہوتی ہے۔ انسان پر خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس عمر میں اکثر لوگ مجاہدہ میں ناکام رہتے ہیں۔ جب انسان پر بڑھاپا آجاتا ہے۔ تو ظاہری قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں، اور دوسری طرف جہالت انسان کے قلب و ذہن میں پختہ ہو چکی ہوتی ہے لہٰذا اس عمر میں بھی انسان مجاہدہ سے محروم رہ جاتا ہے حالانکہ اس کی بڑی اہمیت اور بہت زیادہ ضرورت ہے۔

معاد اس واقعہ کی پانچویں اہم چیز معاد یعنی حیات بعد الممات کا ثابت ہونا ہے۔ یہ پورا واقعہ ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کَذٰلِکَ یُحۡیِ اللّٰہُ الۡمَوۡتٰی یعنی جس طرح اس مردے کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کر دیا، اسی طرح معاد میں سب کو دوبارہ زندہ کرے گا۔

یہ تمام دین کے بنیادی اور اہم اصول ہیں۔ باقی چیزیں ان کے ضمن میں آتی ہیں اس ایک واقعہ میں خدا تعالےٰ نے دین کے بنیادی مسائل اور معارف سمجھائے ہیں۔ اس لیے اس سورۃ کا نام سورۃ بقرہ رکھا گیا ہے۔

اس درس میں سورۃ بقرہ کے فضائل اور اس کے مجموعی مضامین کا مختصراً بیان ہوا۔ آئندہ درس میں انشاء اللہ الٓمّٓ کے متعلق بیان کیا جائے گا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

الٓمّٓ ۝۱ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲

ترجمہ:۔ الٓمّٓ ۝۱ یہ کتاب نہیں شک اس میں۔ یہ راہنمائی کرتی ہے متقیوں کی ۝۲

محکمات، متشابہات مقطعات

گذشتہ درس میں سورۃ بقرہ کی فضیلت، اس کے نام اور اس کے موضوعات کا اجمالی تذکرہ ہوا تھا۔ اس درس میں حروف مقطعات میں سے الف، لام، میم کے متعلق بیان ہوگا۔

اصولی طور پر یہ بات معلوم کرلینی چاہیئے۔ کہ قرآن کریم میں تین قسم کی آیات ہیں پہلی قسم کی آیات محکمات ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی آیات کے الفاظ بھی معلوم ہیں اور ان کا مطلب اور مراد بھی معلوم ہے۔ گویا یہ آیات بالکل واضح ہیں۔ قرآن پاک کی اکثر آیتیں محکمات ہیں۔

آیات کی دوسری قسم متشابہات ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے، کہ ان کے الفاظ کا معنیٰ تو معلوم ہے۔ مگر ان کی حقیقت پوشیدہ ہے۔ مثلاً آیت کریمہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى میں رحمٰن۔ عرش اور استوٰی کے معانی معلوم ہیں مگر اس کی حقیقت انسانی ذہن میں نہیں آسکتی۔ وہ غامض اور دقیق ہے۔ گویا معنیٰ تو معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر جلوہ گر ہے۔ مگر جلوہ گر ہونے کی کیفیت ذہن انسانی کے بس کی بات نہیں۔ ایسی آیات متشابہات کہلاتی ہیں۔

تیسری قسم کی آیات مقطعات کہلاتی ہیں۔ یہ مفرد حروف ہیں۔ جو قرآن پاک کی انتیس سورتوں کے ابتداء میں آتے ہیں۔ سورۃ بقرہ بھی انہیں میں سے ہے۔ جو الٓمّٓ سے شروع ہوتی ہے۔ دوسرے مقامات پر نٓ۔ صٓ۔ قٓ۔ الٓرٰ۔ یٰسٓ۔ طٰسٓمّٓ وغیرہ کے حروف آتے ہیں۔ مقطعات کا مطلب یہ ہے۔ کہ نہ ان کا معنیٰ واضح ہے۔ اور نہ ان کی مراد معلوم ہے۔

احکامِ خداوندی اور ان کی حکمتیں

تاہم ہر قسم کی آیات کے احکام پر ایمان لانا ضروری ہے۔ خواہ ان احکام کی حکمتیں واضح ہوں یا غیر واضح۔ مثلاً نماز پڑھنے میں حکمت یہ ہے۔ کہ انسان اپنے معبود کے سامنے تواضع کرتا ہے۔ اور اپنے منعم کا شکر یہ ادا کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے۔ جو کہ عبدیت کا تقاضا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے حضور مناجات پیش کرنے کی حکمت بالکل واضح ہے۔ اسی طرح روزہ کا مقصد نفس کو دبانا شہوت کو مغلوب کرنا ہے۔ تاکہ انسان میں تقویٰ کی روح پیدا ہو سکے۔ بھوک اور پیاس سے خواہشاتِ نفسانی پر غلبہ حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ بھی واضح حکمت ہے۔ زکوٰۃ کے متعلق شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[۱]۔ کہ اس میں دو بڑی حکمتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ مساکین کی حاجت پوری کی جاتی ہے تاکہ کوئی غریب بھوکا پیاسا نہ رہے۔ اور دوسری یہ کہ انسان بخل کے مادہ سے پاک ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے مال سے زکوٰۃ نکالتا رہے گا اس میں بخل کی بجائے سخاوت کا مادہ پیدا ہو گا۔ لہٰذا زکوٰۃ کی حکمت بھی واضح ہے۔

اب بعض احکام ایسے ہیں، جن کی حکمتیں بڑی گہری ہیں۔ اور ہر آدمی انہیں نہیں سمجھ سکتا۔ مثلاً حج کے ارکان منجملہ ان کے بیت اللہ شریف کا طواف منیٰ اور عرفات کا وقوف ہے۔ جمرات کی رمی ہے۔ ان احکام کی حکمتیں غامض اور دقیق ہیں۔ مگر ان پر ایمان لانا اور اس کے مطابق عمل کرنا ہر مکلف کے لیے لازم ہے۔ اور جن احکام کی حکمت واضح نہیں۔ ان کے متعلق زیادہ کرید نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ ان احکام کی ہر حالت میں تعمیل کرنی چاہیئے۔ خواہ وہ احکام آیات محکمات کے ہوں یا آیات متشابہات کے ہوں۔

حروفِ مقطعات پر مفسرین کے مباحث

اسی طرح حروف مقطعات کے بارے میں بھی زیادہ کرید کرنے کا حکم نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[۲]۔ کہ صحابہ کرامؓ میں سے کوئی بھی ایسا معلوم نہیں ہوا۔ جس نے حروف مقطعات کی کرید کی ہو۔ جس طرح حضور علیہ السلام نے فرمایا صحابہؓ نے تسلیم کر لیا مگر بعض ذہن تحقیق پسند ہوتے ہیں۔ وہ معاملہ کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن حروف کے معانی ہی معلوم نہیں۔ ان کے نازل کرنے کا کیا فائدہ ہے چنانچہ

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ صـ ۴۲ و ۴۳ ج ۱

۲۔

صحابہ کرامؓ کے دور میں بھی بعض عجمی ذہن کے لوگ تھے۔ جو ان کے متعلق سوال کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں بھی بعض لوگوں نے ان الفاظ کے معانی پوچھے۔ بعض نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے الٓمٓ [۱] کا مطلب دریافت کیا۔ تو انہوں نے تقریب ذہن یعنی ذہن کو قرآن کریم کے قریب کرنے کے لیے کچھ معانی بتا دیے۔ اس کے بعد دوسرے مفسرین کرام نے بھی اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان الفاظ کے معانی بیان فرمائے مگر ان میں سے کوئی بھی معنیٰ قطعی نہیں ہے۔ محض احتمال اور ظن غالب سے کچھ معانی بیان کر دیے ہیں تاکہ ذہن قرآن پاک سے مانوس رہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بعض صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کے اقوال ملتے ہیں۔

حضرت صدیق اکبرؓ

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قول [۱] ہے لِکُلِّ کِتَابٍ سِرٌّ یعنی ہر کتاب میں کوئی نہ کوئی راز کی بات ہوتی ہے۔ یعنی ہر کتاب کی ہر چیز واضح نہیں ہوتی بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی چیز پوشیدہ بھی ہوتی ہے۔ جو عام انسانوں کی سمجھ سے بالا ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں وَسِرُّ الْقُرْاٰنِ اَوَائِلُ السُّوَرِ یعنی قرآن پاک کے اسرار اس کی ابتدا میں حروف مقطعات ہیں

حضرت علی المرتضیٰؓ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول [۲] ہے۔ کہ لِکُلِّ کِتَابٍ صَفْوَۃٌ یعنی ہر کتاب میں کوئی نہ کوئی چھانٹی ہوئی یا منتخب بات ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم میں ایسی بات حروف تہجی الٓمٓ وغیرہ ہیں۔ جنہیں ہر آدمی کا سمجھنا ضروری نہیں۔

حضرت امام شعبیؒ

امام عامر بن شرحبیل المعروف شعبیؒ نے پانچ سو صحابہ کرامؓ کی زیارت کی ہے۔ اور ان سے علم حاصل کیا ہے۔ آپ امام ابوحنیفہؒ کے استاذ ہیں۔ جب آپ سے حروف مقطعات کا مطلب پوچھا گیا تو فرمایا [۳] سِرُّ اللّٰہِ فَلَا تَطْلُبُوْا یہ اللہ کے راز ہیں۔ ان کے پیچھے مت پڑو۔ ہو سکتا ہے تم انہیں سمجھنے میں ناکام رہو اور کسی غلط چیز میں مبتلا ہو جاؤ۔ لہٰذا تم انہیں صرف پڑھ لیا کرو۔

حضرت ابن مسعودؓ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں [۴] کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک کے ہر حرف کی تلاوت پر

۱۔ تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۹۴ پ۱، تفسیر کبیر صفحہ ۳ ج۲ ۔ ۲۔ تفسیر کبیر صفحہ ۳ ج۲، تفسیر عزیزی صفحہ ۷۴ پ۱

۳۔ تفسیر عزیزی صفحہ ۷۵ پارہ ۱، تفسیر کبیر صفحہ ۳ ج۲ ۔ ۴۔ تفسیر کبیر صفحہ ۲ ج۲

دس نیکیاں عطا فرماتے ہیں۔ جو مومن ان حروف کو پڑھے گا۔ اسے تیس نیکیاں حاصل ہوں گی یہی بہت بڑی غنیمت ہے۔ لہذا اُن کے معانی تلاش کرنے میں کوشش نہ کرو۔

حضرت امام رازیؒ

امام رازیؒ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے بڑے عظیم مفسّر قرآن گذرے ہیں۔ جس طرح تیسری صدی میں امام ابن جریر طبریؒ اور چوتھی صدی میں ابوبکر جصاصؒ ہوئے ہیں اسی طرح آپ کا مقام تھا۔ ابوبکر جصاصؒ حنفی تھے۔ اور امام رازیؒ شافعی تھے۔ امام ابن جریر خود مجتہد صاحب مذہب تھے۔ اور کسی کے مقلد نہیں تھے۔ ابوبکر جصاصؒ نے صرف احکام کی تفسیر کی ہے۔ یعنی قرآن پاک کی صرف ان آیات کی تفسیر لکھی ہے، جن میں احکام بیان ہوئے ہیں۔ البتہ امام رازیؒ نے چھبیسویں۲۶ پارے تک مکمل تفسیر کی ہے۔ اس کے بعد آپ وفات پا گئے۔ چنانچہ بقیہ تفسیر آپ کے نہایت قابل شاگردوں نے کی۔ اس تفسیر کی آخری دو جلدیں امام رازیؒ کی اپنی تالیف نہیں۔ بلکہ آپ کے تلامذہ کی ہے۔ ان آخری جلدوں کا مقابلہ پہلی جلدوں کے ساتھ کرتے ہیں، تو کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ شرف عطا فرمایا۔

حروف مقطعات کے متعلق امام رازیؒ کا قول یہ[1] ہے کہ الٓمّٓ سورۃ بقرہ کا دوسرا نام ہے۔ ایک نام بقرہ ہے۔ اور دوسرا الٓمّٓ ہے۔

مقطعات اسمائے الٰہی ہیں

بعض فرماتے ہیں[2] کہ الٓمّٓ اور دیگر حروف مقطعات کٓھٰیٰعٓصٓ، حٰمٓ عٓسٓقٓ وغیرہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے پاک ہیں۔ امام رازیؒ نے ایک روایت ذکر کی ہے[3]۔ کہ اللہ تعالیٰ کے چھ ہزار نام ہیں۔ اس نے اپنے تمام نام آسمانی کتابوں میں نازل فرمائے ہیں۔ سوائے ایک کے جو اُس نے مخصوص کر لیا ہے۔ اور کسی کو نہیں بتایا۔ تو وہ فرماتے ہیں کہ الٓمّٓ بھی اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ جیسا کہ حٰمٓ کے متعلق امام ابن کثیرؒ نے لکھا ہے[4] یُذَکِّرُنِیْ حٰمٓ وَالرُّمْحُ شَاجِرٌ وہ حٰمٓ کا واسطہ دے کر کہتا ہے۔ کہ لڑائی چھوڑ دو۔ فَھَلَّا تَلَا حٰمٓ قَبْلَ التَّقَدُّمِ۔

---

[1] تفسیر کبیر صـ۲ ج۲

[2] تفسیر کبیر صـ۶ ج۲

[3] تفسیر کبیر صـ۵ ج۲

[4] تفسیر ابن کثیر صـ۶۹ ج۴

اس کے جواب میں کہتا ہے۔ کہ اب جب کہ نیزے کھٹک رہے ہیں۔ اب واسطہ پیش کرتا ہے۔ حٰمٓ کا واسطہ پہلے کیوں نہ دیا تا کہ ہم لڑائی شروع نہ کرتے۔ اب ہم لڑائی نہیں چھوڑ سکتے

اس مقولے سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ حٰمٓ جو حروف مقطعات میں سے ہے یہ اللہ کا نام ہے۔

بعض اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں۔ کہ حروف مقطعات اللہ کا پورا نام نہیں بلکہ بعض اسماء کی طرف اشارات ہیں مثلاً الف کا اشارہ اس کے ذاتی نام اللہ کی طرف ہے۔ رٓ سے مراد رحمٰن ہے۔ اور اسی طرح کٓ کا اشارہ کافی کی طرف ہے لٓ کا اشارہ اسم لطیف کی طرف ہے۔ اور مٓ سے مراد مالک اور اسم مجید ہے۔

مقطعات اسمائے قرآنی ہیں

بعض علمائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ حروف مقطعات قرآن پاک کے نام ہیں جیسے حٰمٓ یٰسٓ۔ الٓمٓ وغیرہ۔ حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب الفوز الکبیر، خیر کثیر، اور ہوامع میں حروف مقطعات پر بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کشفی طور پر یہ فہم دیا ہے۔ کہ جس سورۃ کی ابتداء میں یہ حروف آتے ہیں اس سورۃ کا خلاصہ اور عنوان ان حروف میں مذکور ہے۔ ان حروف سے سورۃ کے مضامین کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ الفاظ ایسے ہی ہیں۔ جیسے کسی شخص کے لیے مفتی، قاضی، امیر سلطان یا حاکم وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یا اس طرح سمجھ لیں۔ جیسے تعلیمی ڈگری بی۔اے، ایم۔اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ (ڈاکٹر آف لٹریچر) وغیرہ کے الفاظ ہوتے ہیں۔ انہی سے کسی کی شخصیت کی علمی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ بالکل اسی طرح حروف مقطعات کے ذریعے کسی سورۃ کا خلاصہ یا اس کی سرخی بیان کی جاتی ہے۔

مقطعات بحیثیت چیلنج

امام مبرد تیسری صدی کے بڑے صرفی، نحوی اور لغت و ادب کے امام تھے آپ کی مشہور کتاب "کامل" ہے تو وہ فرماتے ہیں کہ "ان فصیح و بلیغ حروف مقطعات میں چیلنج ہے

۱؎ تفسیر جریر طبری ج۱ ص۸۸، تفسیر کبیر ج۱ ص۵   ۲؎ تفسیر طبری ج۱ ص۸۷ تفسیر کبیر ج۲ ص۶

۳؎ الفوز الکبیر ص۱۰۹، ۱۰۸ مطبوعہ لاہور   ۴؎ تفسیر کبیر ج۲ ص۶

کہ اے دنیا والو! یہ اللہ تعالےٰ کا نازل کردہ کلام ہے تم بھی اس جیسا کلام بنا کر لاؤ۔ اللہ تعالےٰ نے انہی حروف میں قرآن پاک نازل کیا ہے۔ اگر تم اس کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ "فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ" تو اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ اگر تم بھی ایسا کر سکو تو مان لیں گے کہ قرآن بھی خدا تعالیٰ کا نازل کیا ہوا نہیں ہے۔

عربی زبان بڑی فصیح و بلیغ زبان ہے۔ نزول قرآن سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے عربی زبان کی ترقی شروع ہوئی اور اس عرصہ میں وہ اپنے کمال تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ عرب لوگ اس زبان کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اسی لیے وہ غیر عربوں کو عجمی یعنی گونگے کہتے تھے۔ عربی زبان کا شعر و ادب کا ذخیرہ کمال درجے کا ہے۔ ہمارے درسوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ تو اسی ترقی یافتہ زبان میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک نازل فرمایا ہے "قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ" عربوں کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا امام اور استاذ بنایا تھا۔ انہی اہل زبان کے سامنے الٓمّٓ کٓھٰیٰعٓصٓ کا چیلنج پیش کیا گیا۔ کہ اگر کوئی ہے تو اس جیسا کلام بنا کر لائے۔ مگر کوئی بھی اہل زبان اس چیلنج کا جواب نہ دے سکا۔

امام اخفش رح کی رائے

امام اخفش رح اور مفسر تفسیر خازن رح کہتے ہیں[1] کہ ہو سکتا ہے۔ کہ حروف مقطعات قسم کے معنوں میں استعمال ہوتے ہوں۔

بعض فرماتے ہیں[2] کہ ان حروف کو قرآن کے انقطاع کے لیے لایا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ فاتحہ "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" پر ختم ہوئی۔ تو دوسرا کلام شروع کرنے کے لیے الٓمّٓ لایا گیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رض کا قول

حضرت عبداللہ بن عباس رض کے زمانے میں ہی بحث و تمحیص کرنے والے لوگ پیدا ہو گئے تھے۔ جو اس قسم کے معاملات میں تحقیق کرتے تھے۔ چنانچہ آپ سے الٓمّٓ کا معنیٰ دریافت کیا گیا۔ تو فرمایا[3] اس کا معنیٰ یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ

---

[1] تفسیر کبیر ص ۷ ج ۲، تفسیر خازن ص ۲۶ ج ۱
[2] تفسیر طبری ص ۸۹ ج ۱، تفسیر کبیر ص ۷ ج ۲
[3] تفسیر طبری ص ۸۸ ج ۱

یعنی میں تمہارا اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہوں. گویا اَ سے مراد اَنَا لٓ سے مراد اللہ اور مٓ سے مراد اَعْلَمُ ہے۔ اسی طرح الٓمّٓصٓ سے مراد اَنَا اللہُ اُفَصِّلُ ہے یعنی میں تمہارا اللہ ہوں، جو تمہارے لیے ہر چیز تفصیل سے بیان کرتا ہوں. الٓرٰ کا مطلب ہے اَنَا اللہُ اَرٰی میں تمہارا اللہ ہوں جو تمہاری ہر بات کو دیکھتا ہوں۔

امام ماوردیؒ کی تحقیق

امام ماوردیؒ صاحب "احکام السلطانیہ" اپنے زمانے کے بہت بڑے محقق ہوئے ہیں. وہ فرماتے ہیں[۱] کہ الٓمّٓ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اَلَمْ یَکُمْ اور اس کی تفصیل ہے نَزَّلَ عَلَیْکُمُ الْکِتَابَ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر کتاب نازل کی ہے۔

بعض علماء کرام فرماتے ہیں[۲]۔ الٓمّٓ کا معنیٰ اَوَّلُ لَازِمٍ لِلْمُؤْمِنِیْنَ ذٰلِكَ الْکِتٰبُ یعنی ایمانداروں کے لیے اولین ضروری چیز یہ کتاب ہے۔ اس کے اندر غور و فکر کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہدایت کا منبع و مرکز یہی کتاب ہے۔

بعض فرماتے ہیں[۳]۔ کہ اَ سے مراد اللہ ہے۔ لٓ سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہے اور مٓ سے مراد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب جبرائیل علیہ السلام کے توسط سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی۔

شیخ ابن عربیؒ کا قول

شیخ ابن عربیؒ اس کا معنیٰ یہ کرتے ہیں[۴]۔ کہ کل وجود خداوند تعالیٰ ہے۔ جبرائیل علیہ السلام درمیان میں ایک واسطہ ہے۔ جو اللہ سے فیض لے کر اُدھر پہنچاتا ہے۔ اور آخر الوجود حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان تک فیض پہنچانے کا واسطہ جبرائیل علیہ السلام ہیں۔

بعض فرماتے ہیں[۵]۔ کہ "الٓمّٓ" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے انسانیت کی تکمیل کے لیے" ذٰلِكَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ" اس عظیم کتاب کو نازل فرمایا۔

۱۔ تفسیر کبیر ص ۷ ج ۱ ۲۔
۳۔ تفسیر کبیر ص ۶ ج ۲ ۴۔ احکام القرآن لشیخ ابن عربیؒ ص ۹ ج ۱ ۵۔

بعض فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے ہر ہر لفظ کی تلاوت کی جانی چاہیئے تاکہ برکت اور ثواب حاصل ہو۔ خواہ اس کا مطلب سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ تاہم ثواب تو ہر ایماندار کو حاصل ہوگا[1]

نزول المقطعات معجزہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

بعض فرماتے ہیں[2]۔ کہ حروف مقطعات کو نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کا ایک معجزہ ظاہر فرمایا ہے۔ حضور علیہ السلام تو اُمّی ہیں۔ آپ نے کوئی نوشت و خواند نہیں کی جب تک کوئی تعلیم حاصل نہ کر سکے، ایک اُمّی حروف تہجی کیسے پڑھ سکتا ہے۔ مگر پیغمبر آخر الزمان علیہ السلام کے اُمّی ہونے کے باوجود ان الفاظ کا پڑھنا ایک غیر معمولی معجزہ تھا۔ حالانکہ نہ آپ نے کسی مکتب میں داخلہ لیا۔ اور نہ کسی اُستاد سے پڑھا۔ لہٰذا اس معجزے کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ حروف مقطعات نازل فرمائے۔

امام بیضاوی کا قول

امام بیضاویؒ صدی کے عظیم مفسر ہوئے ہیں۔ مختصر تفسیروں میں امام صاحبؒ کی تفسیر سب سے اہم ہے۔ آپ کا زمانہ مسلمانوں کی ترقی کا دور تھا۔ آپ الٓمّٓ کی تاویل اس طرح کرتے ہیں۔ کہ حرف الف حلق کے انتہائی آخری حصّے سے نکلتا ہے۔ لام درمیان سے م ہونٹوں سے نکلتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ حروف۔ آخر، اوسط اور ابتدائی حصے سے ادا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کے کلام کی ابتداء اوسط اور آخر بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہونی چاہیئے گویا امام بیضاویؒ نے حروف الٓمّٓ کو اللہ کے ذکر کے ساتھ مربوط کیا ہے۔[3]

حضرت امام شاہ ولی اللہ کا قول

حضرت امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ مجھے کشفی اور ذوقی طور پر معلوم ہوا ہے کہ الٓمّٓ کا مطلب وہ غیر مادی فیض مجرد ہے۔ جو اس مادی اور متحیز مکان والے عالم میں آکر مقید ہو گیا ہے اور لوگوں کے اداب اور علوم وغیرہ کے مطابق اُن کی سنگدلی سے متصادم ہے۔ یہ فیض مجرد اعمال فاسدہ، اقوال کاسدہ کی تذکیر کرتا ہے۔ اور بدعات اور اخلاق ردیہ کا رد کرتا ہے۔ یہ [4] الٓمّٓ تشریح اور تحقیق قدسی پیش کرتا ہے۔

ظاہر ہے۔ کہ ساری سورۃ بقرہ میں الٓمّٓ کا یہی اجمالی معنیٰ نظر آتا ہے۔ اس سورۃ میں

---

۱ تفسیر درمنثور ص۲۲ ج۱، بیضاوی ص۹ ج۱ ۔ ۲ تفسیر مظہری ص۱۳ ج۱، تفسیر عزیزی فارسی ص۲۰ پارہ ۱

۳ تفسیر بیضاوی ص۱۳ ج۱ ۔ ۴ الفوز الکبیر ص۸۳ مطبوعہ کراچی

لوگوں کی تنگ دلی کا مقابلہ، قوانین کی تشریح اور تحقیق اور بُرے اقوال و عقائد اور بُرے اخلاق کی اصلاح کے متعلق ہی مضامین پائے جاتے ہیں۔

بعض محققین فرماتے ہیں[۱] کہ الف کا اشارہ استقامت علی الشریعۃ کی طرف ہے۔" اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا یعنی شریعت پر استقامت اختیار کرنی چاہیئے۔ فرماتے ہیں کہ لام کا اشارہ مجاہدہ کی طرف ہے۔ یعنی وہ چیز جو ریاضت اور مجاہدہ کرنے سے حاصل ہو۔ جیسے" وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا" یعنی جو لوگ ہماری طرف مجاہدہ کریں گے۔ ہم ضرور ان کو راہ بتلائیں گے۔ اسی طرح حرف میم میں یہ اشارہ ہے۔ کہ انسان کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت موجزن ہونی چاہیئے۔

مولانا مودودی صاحب کا نظریہ

مودودی صاحب نے اپنی کتاب تفسیر تفہیم القرآن میں ایک نہایت ہی غلط بات لکھی ہے[۲] جس کا مفہوم یہ ہے کہ الٓمٓ کا معنیٰ پہلے زمانے میں معلوم تھا مگر بعد میں سارے لوگ بھول گئے۔ اسکا مطلب ہے کہ کچھ لوگ انکے معانی جانتے تھے بعد میں اسکے سارے لوگ بھول گئے۔ یہ تو بالکل ہی غلط بات ذکر کر دی کہ کسی کو بھی اسکا معنیٰ نہ آتا ہو۔ مفسرین کرام نے جو معانی بیان کیے ہیں وہ میں نے عرض کر دیے۔

مفسر فراہیؒ کا قول

مفسر قرآن فراہیؒ کہتے ہیں[۳] کہ قدیم مصری زبان میں الف کو مہر کی شکل میں لکھا جاتا تھا۔ بعض زبانوں میں حروف جانور یا درخت کی شکل میں لکھے جاتے تھے۔ اور الف کے دو معنے استعمال ہوتے تھے۔ ایک معنیٰ گائے ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس سورۃ کو گائے کے ساتھ مناسبت ہے کیونکہ اس میں گائے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ الف کا دوسرا معنیٰ اللّٰہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ تو فراہیؒ لکھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ حروف اس محاورے کے مطابق استعمال کیے گئے ہوں۔

تعریف آخر

امام جلال الدین سیوطیؒ اور بہت سے مفسرین آخری بات یہ فرماتے ہیں[۴] ۔ اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ کہ الٓمٓ اور دیگر حروف مقطعات کی مراد اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

---

۱ تفسیر عزیزی فارسی ص۷۷ پارہ ۱
۲ تفہیم القرآن ص۴۹ / ۱۷۰
۳ نظام القرآن ص۱۷۰
۴ تفسیر جلالین ص۳

اٰمَنَّا بِذٰلِکَ وَصَدَّقْنَا ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں ہماری عقل ناقص ہے۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ ہم ان کے معانی ضرور ہی معلوم کر سکیں۔ اس کا احسن طریقہ یہ ہے کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سونپ دینا چاہیئے۔ کہ ان حروف سے اللہ تعالیٰ کی جو بھی مراد ہے، وہ برحق ہے۔ اور ہمارا اس پر ایمان ہے۔

اٰمَنَّا وصَدَّقْنَا

الجزء الاول ۱ — مع ۱ — صفات المتقین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

الٓمّٓ ۝۱ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚۖۛ فِیۡہِ ۚۛ ہُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۝۲
الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ
یُنۡفِقُوۡنَ ۝۳ وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَ مَاۤ
اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ وَ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ۝۴ اُولٰٓئِکَ
عَلٰی ہُدًی مِّنۡ رَّبِّہِمۡ ٭ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۝۵

ترجمہ:۔ الٓمّٓ ۝۱ یہ کتاب۔ نہیں شک اس میں۔ یہ راہنمائی کرتی ہے متقیوں کی ۝۲ جو ایمان رکھتے ہیں غیب پر اور قائم کرتے ہیں نماز کو۔ اور جو روزی ہم نے ان کو دے رکھی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ۝۳ اور وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اُس چیز پر جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور اُس چیز پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئی ہے اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں ۝۴ یہی لوگ ہیں ہدایت پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ہے اور یہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں۔ ۝۵

لفظ ذٰلک کی حکمت

عربی میں ذٰلِکَ اشارہ بعید کے لیے اور ھٰذَا اشارہ قریب کے لیے استعمال ہوتا ہے یہاں پر گفتگو اس کتاب یعنی قرآن پاک کے لیے ہو رہی ہے۔ لہٰذا اسم اشارہ ھٰذَا استعمال ہونا چاہیے تھا یعنی یہ کتاب، نہ کہ ذٰلِکَ یعنی وہ کتاب۔ اس اشکال کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں[۱] کہ یہاں پر اشارہ بعید استعمال کرنے کا مقصد اس کتاب کی عظمت اور شان

---

۱ تفسیر روح المعانی ص۱۰۵ ج۱ ، تفسیر عزیزی فارسی ص۹۷ پارہ ۱

کا اظہار ہے۔ لہٰذا ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کا معنیٰ یہ ہوگا۔ کہ یہ وہ کتاب ہے۔ جو اپنے کمال حقائق، دقائق، اسرار اور درجے کی بلندی کی وجہ سے مخاطبین کے فہم سے غائب اور انسانی افکار کی جولانگاہ سے بہت بلند ہے لہٰذا اس کے لیے ذٰلِكَ کا اشارہ استعمال کیا گیا ہے۔

مفسرین کرام ایک دوسری وجہ یہ بیان کرتے ہیں[1]۔ کہ پہلی آسمانی کتابوں میں قرآن پاک کے متعلق پیشن گوئیاں موجود تھیں۔ چنانچہ تورات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا تھا۔ کہ "میں تیرے بھائیوں میں سے تیرے جیسا ایک نبی برپا کروں گا۔ اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا" اور وہ کلام یہی وحی الٰہی قرآن پاک ہے۔ تو یہاں پہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کا معنیٰ ہے کہ یہ وہی کتاب ہے۔ جس کی پیش گوئی پہلی کتابوں میں کی گئی تھی۔

یا اس کا معنیٰ یہ بھی ہو سکتا ہے[2]۔ کہ یہ وہ کتاب ہے جسے پہلے لوح محفوظ سے بیت العزت میں نقل کیا گیا۔ اور پھر وہاں سے تیئس ۲۳ سال کے عرصہ میں بتدریج نبی علیہ السلام پہ نازل کیا گیا یاد رہے کہ بیت العزت آسمانوں میں ایک مقام ہے۔ جہاں پہ قرآن پاک اوّلاً بیک وقت منتقل کیا گیا تھا۔

لفظ لَا رَيْبَ کا مفہوم

لَا رَيْبَ فِيهِ کا عام فہم معنیٰ یہی ہے۔ کہ اس میں کوئی شک نہیں۔ مگر اس سے مراد یہ نہیں لینی چاہیئے۔ کہ کوئی دوسرا شخص اس کلام میں شک وشبہ نہیں رکھتا۔ بلکہ بلاشبہ کفار ومشرکین قرآن پاک کی صداقت پہ شک کرتے تھے۔ اسی لیے تو تیسرے رکوع میں ان لوگوں کو چیلنج کیا "وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا" یعنی اگر تمہیں اس چیز میں کوئی شک ہے۔ جو ہم نے اپنے بندے پہ اتاری ہے "فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ" تو اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ۔ تمہاری قابلیت کا پتہ چل جائے گا۔ مطلب یہ کہ مشرکین مکہ لازماً اس کلام میں شک کرتے تھے۔ تو یہاں پہ لَا رَيْبَ کا معنیٰ یہ ہے کہ واقعہ اور نفس الامر میں اس کلام میں شک وشبہ والی کوئی بات نہیں۔ اگر کوئی شک کرتا ہے۔ تو یہ اس کی اپنی غلطی اور دماغ کی خامی ہے۔ وہ شخص تعصب اور عناد کی وجہ سے شک کرتا ہے۔ ورنہ اس کتاب

---

[1] تفسیر خازن ج۱ ص۲۶، تفسیر مدارک ج۱ ص۱، تفسیر کبیر ج۲ ص۱۳ [2] تفسیر کبیر ج۲ ص۱۳

میں تو کوئی خامی نہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کی تفسیر

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ فرماتے ہیں[1] کہ کسی چیز کے بارے میں شک وشبہ کی دو وجوہات ہوتی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اُس چیز میں واقعی کوئی نقص ہوتا ہے جس کی وجہ سے شک پیدا ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُس چیز میں تو کوئی شک وشبہ یا نقص نہیں ہوتا مگر شک کرنے والے کے اپنے دماغ کی خرابی اور خلل کی وجہ سے اُسے وہ چیز مشکوک نظر آتی ہے ظاہر ہے کہ قرآن پاک کی ایک ایک آیت اس کا ایک ایک لفظ شک وشبہ سے پاک ہے۔ اس میں نہ کوئی کذب بیانی ہے اور نہ ہی کوئی خلاف واقعہ چیز ہے۔ یہ تو محض شک کرنے والے کے اپنے ذہن کا فتور ہے۔ جو اس کلام پاک میں شک کرتا ہے۔ مشرکوں اور منافقوں کے دماغ خراب تھے جو قرآن پاک پر اعتراض کرتے تھے۔ آج کل کے ملحدوں کے ذہن بھی پراگندہ ہیں جو قرآن پاک کے احکام پر اعتراض کرتے ہیں۔ ورنہ قرآن پاک کی کوئی بات مشکوک نہیں۔ بلکہ یہ تو منبع رشد وہدایت ہے۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ برصغیر کی جانی پہچانی شخصیت ہیں یہ میرے[2] پاس انہیں کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ آپ نے مالٹا کی جیل میں اسیری کے دوران کیا تھا۔ تقریباً دو سورتوں کا حاشیہ بھی لکھا تھا مگر زندگی کے ایام پورے ہوگئے۔ حاشیہ کا باقی کام آپ کے شاگرد رشید شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے آپ ہی کی حسب منشا انجام دیا۔ آپ کا کیا ہوا ترجمہ قرآن بامحاورہ ہے۔ اور بلند ترین تراجم میں سے ہے۔

قرآن پاک کے اردو ترجمے بہت سے بزرگوں نے کیے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلا ترجمہ شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ کا ہے۔ یہ سب سے آسان لفظی ترجمہ ہے۔ اس کے ذریعے الفاظ کے معانی سمجھنا نہایت سہل ہے۔

آپ کے بعد دوسرا بامحاورہ اردو ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا ہے۔ یہ بہترین بامحاورہ ترجمہ ہے۔ آج تک علماء ایسا ترجمہ پیش نہیں کر سکے۔ اس کے بعد درجہ بدرجہ شیخ الہندؒ

---

[1] ترجمہ قرآن ص۲ مطبوعہ دار التصنیف کراچی

[2] صاحب درس حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب سواتی کے پاس دوران درس

کا ترجمہ پھر حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ آپ نے قرآن پاک کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ فن تجوید کے متعلق اور پھر ربط کے بارے میں، اور اصول کے بارے میں آپ کی کتب موجود ہیں۔ آپ کی تفسیر علمی ہونے کی بنا پہ ذرا مشکل ہے۔ تاہم یہ بلند پایہ اردو تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے علماء کرام نے تراجم کیے ہیں یہ آپ[1] کے پاس جو ترجمہ ہے۔ یہ مولانا احمد علی لاہوریؒ کا ہے۔ انہوں نے نہایت آسان اور عام فہم ترجمہ کیا ہے اور اس پہ حاشیہ لکھا ہے۔

متقین کیلئے ہدایت

فرمایا یہ وہ کتاب مقدس ہے۔ جو شک و شبہ سے بالا ہے اور ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ قرآن پاک متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔ یہاں پہ یہ اشکال وارد ہوتا ہے۔ کہ ہدایت تو گمراہوں کے لیے ہونی چاہیئے تھی متقی تو پہلے ہی ہدایت یافتہ ہیں، اُن کے لیے ہدایت ہونے کا کیا معنیٰ؟

اس ضمن میں شاہ عبد القادرؒ اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں[2] کہ متقین سے مراد ہیں، بچنے والے اور ڈرنے والے لوگ اور تقویٰ کی طرف جانے والے لوگ۔ یعنی جن میں ضد اور عناد نہیں پایا جاتا۔ بلکہ وہ تقویٰ اختیار کرنے والے لوگ ہیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں کہ اس قرآن کو پڑھیں گے، تو اُن میں تقویٰ پیدا ہوگا، یہ متقی بن جائیں گے، مقصد یہ کہ اگرچہ آج یہ لوگ متقی نہ بھی ہوں مگر اس قرآن پاک کی برکت سے آئندہ زندگی میں تقویٰ اختیار کرلیں گے۔

شاہ عبد العزیزؒ اس کا معنیٰ سمجھانے کے لیے ایک مثال بیان فرماتے ہیں[3] کہ اگر کوئی بڑا صحتمند، نوجوان، بڑے مضبوط جسم والا شخص ہو۔ تو اس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس نوجوان نے فلاں ماں کا دودھ پیا ہے۔ دیکھو کتنا طاقتور ہے۔ گویا اس کی ماں کے دودھ میں وہ طاقت اور تاثیر ہے۔ جس سے اس قسم کے کڑیل جوان پیدا ہوتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[4] کہ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کا مطلب یہی ہے۔ کہ اس قرآن پاک میں ایسی تاثیر ہے کہ جو اس سے

---

[1] حاضرین درس کے سامنے
[2] تفسیر جلالین ص۴
[3] تفسیر عزیزی فارسی ص۸۳ پارہ ۱
[4] تفسیر ابن کثیر ص۴۵ ج۱

قریب ہوں گے۔ اس پر عمل کریں گے وہ متقی بن جائیں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کتاب صرف متقیوں کو ہدایت دیتی ہے۔ کیونکہ خود اسی میں دوسری جگہ "ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ" بھی آیا ہے۔ کہ یہ تمام جہاں والوں کو ہدایت کا راستہ دکھاتی ہے۔

تقویٰ کی تعریف

حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک میں حضرت ابی بن کعبؓ بڑے قاری تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ان سے پوچھا۔ حضرت تقویٰ کا کیا معنیٰ ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا[۱] اَمَا سَلَکْتَ طَرِیْقًا ذَا شَوْکٍ کیا آپ کو کبھی ایسے راستے پر چلنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جس میں ہر طرف کانٹے دار جھاڑ ہوں۔ تو انہوں نے جواب دیا ہاں! بہت دفعہ ایسے راستے پر چلنے کا اتفاق ہوا ہے تو حضرت ابی بن کعبؓ نے کہا، پھر آپ نے وہاں کیا کیا؟ حضرت عمرؓ نے کہا شَمَّرْتُ وَاجْتَهَدْتُ میں نے دامن سمیٹ لیا اور پوری کوشش کی کہ کانٹے میرے جسم کے کپڑوں میں نہ الجھنے پائیں اور میں سلامتی سے ایسے راستے سے نکل گیا۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا فَذٰلِکَ التَّقْوٰی[۲] تقویٰ اسی کو کہتے ہیں۔ کہ دنیا میں پھیلے ہوئے کفر، شرک، گمراہی، بدعت اور دیگر خرابیوں سے انسان بچ کر نکل جائے۔ جو شخص ان چیزوں سے دامن بچا کر نکل گیا۔ وہی متقی ہے۔

حضرت حسن بصریؒ سے تقویٰ کا مطلب پوچھا گیا، تو فرمایا اللہ کے حکم کے سامنے کسی اور کا حکم نہ مانے اور یقین رکھے کہ تمام کام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ لہذا جس شخص کا اعتقاد اور عمل یہ ہو، وہ متقی ہے۔ کسی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے دریافت کیا کہ تقویٰ کس کو کہتے ہیں تو انہوں نے فرمایا[۳] اَلَّا تَرٰی نَفْسَکَ خَیْرًا مِّنْ اَحَدٍ۔ یعنی تم اپنے نفس کو کسی دوسرے سے بہتر نہ سمجھو۔ تم یہی سمجھو کہ میں ہی کمزور ہوں اور میرا ہی قصور ہے جب تمہارے اندر یہ چیز پیدا ہو جائے تو متقی بن جاؤ گے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا قول ہے[۴]

بر آں کس معرفت خدا حرام است — کہ خود را از کافر فرنگ بہتر داند

یعنی جو شخص اپنے آپ کو انگریز کافر سے بھی بہتر سمجھتا ہے۔ اس پر خدا کی معرفت حرام ہے آپ نے بہت بڑی بات کہی ہے۔ کہ اپنے آپ کو انگریز کافر سے بھی بہتر نہ سمجھے۔ کیونکہ ہو

---

۱ تفسیر ابن کثیر ص ۵/۴۶۰ ج — ۲ تفسیر کبیر ص ۲۱/۲ ج

۳ تفسیر مظہری ص ۱۸/۱ ج

۴ ؎

سکتا ہے کہ انگریز کافر کسی وقت ایمان لے آئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہو جائے۔ اور تمہارا نفس موٹا موٹا ہوتے ہوتے شیطان ہی بن جائے لہٰذا جب تک اپنے آپ کو اس سے حقیر نہ سمجھو گے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں ہو گی۔ اگر یہ حاصل نہ ہوئی تو متقی کیسے بن سکتے ہو (حجۃ الاسلام) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے شجرہ مبارکہ[۱] میں ایک شعر آتا ہے۔

زمن دارد سگے نصرانیاں عار — کہ او بے گناہ و من گنہگار

یعنی مجھ سے تو نصرانیوں کا کتا اچھا ہے۔ کیونکہ وہ گنہگار نہیں اور میں گنہگار ہوں عاجزی اور انکساری کا یہ معیار ہے۔ اور اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔

تقویٰ کے تین درجات

علمائے کرام فرماتے ہیں[۲] کہ تقویٰ کے تین درجے ہیں۔ پہلا یہ کہ انسان شرک کی تمام اقسام سے پاک ہو۔ اگر ایسا ہو گا تو عذاب سے خلاصی پائے گا، ورنہ نہیں "وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ" کا یہی معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر تقویٰ کا کلمہ لازم کر دیا ہے۔

تقویٰ کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان کبیرہ گناہوں سے بچتا ہے اور چھوٹے گناہوں پر اصرار نہ کرے۔ اور تیسرا درجہ تقویٰ کا یہ ہے کہ انسان مشکوک اور شبہات والی باتوں سے بچتا ہے۔ جو شخص تقویٰ کے ان تینوں درجات پر پورا اترے گا وہی کامل درجے کا متقی ہو گا۔

متقی کون ہیں؟

حدیث شریف میں آتا ہے[۳] کہ حسرت کے دن یعنی قیامت کے روز آواز آئے گی کہ متقی لوگ کہاں ہیں۔ متقی لوگ اٹھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی تجلی کے سایہ میں چلے جائیں گے۔ وہ تجلی اُن پر ہر وقت سایہ فگن ہو گی اور کسی وقت ان سے علیحدہ نہیں ہو گی کسی نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ حضرت! متقی کون ہیں۔ تو آپ نے فرمایا[۴] کہ متقی وہ لوگ ہیں، جنہوں نے اپنے آپ کو انواعِ شرک سے محفوظ رکھا اور اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کرتے رہے۔ متقیوں کی علامت یہ ہے کہ اگر انہیں مصیبت آئے تو صبر کریں۔ اور خدا کے فیصلے پر راضی ہوں۔ اگر راحت آئے تو خدا کی نعمت کا شکر ادا کریں قرآن پاک کے احکام کے سامنے ہمیشہ مطیع و فرمانبردار رہیں یہی لوگ متقی ہیں۔

۱۔ قصائد قاسمی ص — ۲۔ تفسیر عزیزی فارسی ص۸۱ پارہ ۱

۳۔ تفسیر ابن کثیر ج۱ ص۴۲، تفسیر عزیزی فارسی ص۸۳ پ۱ — ۴۔ تفسیر عزیزی فارسی ص۸۲ پارہ ۱

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق منقول ہے[1]۔ کہ کسی نے ان سے دریافت کیا۔ کہ انسان متقی کس طرح ہو سکتا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ متقی وہ شخص ہو سکتا ہے۔ جو

اوّلاً اپنے دلی جذبات کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا ہو۔

ثانیاً اپنی پوری طاقت کے ساتھ اللہ کے لیے عمل کرنے والا ہو۔

ثالثاً یہ کہ اپنے ابنائے جنس پر اسی طرح رحم کرنے والا ہو۔ جس طرح اپنے آپ پر رحم کرتا ہے۔

گویا جس طرح خود اپنے آپ کو ہر تکلیف سے بچانے کی کوشش کرتا ہے، یہی جذبہ دوسروں کے لیے بھی موجود ہو۔ جس شخص میں یہ تین علامتیں پائی جائیں گی وہ متقی بن جائے گا۔

محمد بن یوسف فریابیؒ ایک بزرگ ہوئے ہیں وہ فرماتے ہیں[2]۔ کہ میں نے حضرت سفیان ثوریؒ سے پوچھا کہ کیا بات ہے جہاں جائیں آپ ہی کا چرچا ہوتا ہے۔ لوگ آپ کے اس قدر مداح ہیں۔ حالانکہ میں نے تو آپ کو رات کے وقت سوتے ہوئے دیکھا ہے۔ یعنی آپ کو ساری رات عبادت کرتے ہوئے نہیں پایا ہے۔ آپ نے فرمایا، چپ رہو۔ یہ بات تقویٰ پر مبنی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ تقویٰ عطا کر دے، اُسے مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔

امام سفیان ثوریؒ نے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی طرح حکومت کے معتوب رہے حتیٰ کہ منصور نے آپ کے لیے سزائے موت کا حکم جاری کر دیا کہ سفیان جہاں ملے اُسے سولی پر لٹکا دو۔ وجہ یہ تھی کہ آپ حکومت کے غلط احکام پر تنقید کرتے تھے۔ انہیں ظلم سے منع کرتے تھے۔ ایک موقع پر ساتھیوں نے عرض کیا، حضرت! منصور آرہا ہے آپ کو گرفتار کر لے گا۔ وہ آپ کے لیے سزائے موت کا حکم پہلے ہی جاری کر چکا ہے۔ لہذا آپ یہاں سے چلے جائیں۔ آپ نے خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر دعا کی کہ اے پروردگار! اگر منصور مکے میں آجائے تو میں کعبہ سے بری ہو جاؤں گا۔ آپ نے ایسی سخت دعا کی کہ منصور راستے میں ہی ہلاک ہو گیا۔ آپ کو بادشاہ نے بڑا لالچ دیا۔ پچاس۔ پچاس ہزار روپے بطور عطیہ

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۸۲ پارہ ۱

[2] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۸۲ پ ۱

بھیجے مگر آپ نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کہتے تھے یہ رقم ان کو دو جن کا حق چھین رکھا ہے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ان کے تقوے کی بات تھی۔

خلیفہ عبدالملک بن مروان نے کسی حکیم سے پوچھا کہ بھائی! متقی کون ہوتا ہے تو اس حکیم نے جواب دیا متقی وہ ہوتا ہے جو خدا کو مخلوق پر اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دے۔ وہ متقی ہوتا ہے۔

ایمان بالغیب

کتاب الٰہی کا ابتدائی تعارف کرانے کے بعد کہ یہ متقین کے لیے ذریعہ ہدایت ہے ارشاد ربانی ہے کہ متقین وہ لوگ ہیں۔ اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ غیب وہ چیز ہوتی ہے[1]۔ جو ادراک، حواسِ ظاہرہ وباطنہ، عقل وفہم اور خیال کی دسترس سے باہر ہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات ہیں۔ فرشتے ہیں۔ برزخ اور آخرت کا دن ہے۔ اس میں آخرت کے تمام معاملات شامل ہیں۔ یہ سب غیب ہیں۔ اس کی تشریح سورۃ بقرہ کی آخری آیات" اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ‌ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓٮِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ میں آچکی ہے۔ ان تمام چیزوں پر ایمان ہونا چاہیئے۔ البتہ غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ بندوں کے لیے سوائے وحی۔ الہام یا کشف وغیرہ کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ جبتک اللہ تعالےٰ کسی پر الہام نہ کرے۔ تب تک کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ جب تک کسی نبی یا رسول پر وحی نہ کرے یا کشف کے ذریعے کسی پر کوئی بات منکشف نہ کرے، اس وقت تک کوئی نہیں جان سکتا۔ اور جب کسی کو کسی بات کی اطلاع دے دی جائے، یا کوئی چیز ظاہر کر دی جائے، تو وہ غیب نہیں رہتا۔ غیب وہ ہوتا ہے۔ جو عقل وحواس یا کسی اور ذریعے سے منکشف نہ ہو۔ علم غیب اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہے۔ اسی کو عالم الغیب والشہادۃ کہا گیا ہے۔ جو بغیر کسی حواس، قوت یا آلے کے جانتا ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں[2]۔ علم کا معنیٰ ہوتا ہے۔ جاننا اور معرفت کا معنیٰ ہے پہچاننا اور ایمان کا معنیٰ ہے ماننا۔ یہ الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہودی حق کو جانتے بھی ہیں اور پہچانتے بھی ہیں

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی پارہ ۱ صفحہ ۸۶، احکام القرآن لابن العربی المالکی ج ۱ ص ۸ [2] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۲۴

مگر مانتے نہیں۔ وہ ایمان نہیں لاتے تھے۔ قرآن پاک کہتا ہے۔ کہ یہودی نبی آخر الزماں کو "یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ" اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ مگر ایمان نہیں لاتے۔ ہاں! ایماندار اور پھر متقی وہ ہیں۔ جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ ملائکہ، برزخ، آخرت وغیرہ تمام چیزیں غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے یہ چیزیں نبی علیہ السلام کو بذریعہ وحی بتلائی ہیں۔ لہٰذا متقی وہ ہیں جو ان سب پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ چیزیں برحق ہیں۔ اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا

اقامت صلوٰۃ

متقین کی دوسری صفت ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ فرمایا متقین وہ ہیں وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ جو نماز کو قائم کرتے ہیں۔ یہاں پر یُؤَدُّوْنَ الصَّلٰوۃَ یعنی نماز ادا کرتے ہیں۔ نہیں فرمایا۔ بلکہ اقامت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو کہ بڑا گہرا لفظ ہے۔ اقامت کا مطلب یہ ہے کہ قیام رکوع، سجود، تلاوت، فرائض، سنن، واجبات اور مستحبات وغیرہ کو احسن طریقے سے ادا کیا جائے۔ جو لوگ ان تمام چیزوں کا خیال رکھتے ہیں اور پورے خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں، اقامتِ صلوٰۃ کرنے والوں سے وہی لوگ مراد ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اقامت صلوٰۃ کا معنیٰ یہی کیا ہے[۲]۔ کہ نماز کے تمام ارکان کو ٹھیک طور پر ادا کیا جائے۔

انفاق فی سبیل اللہ

ایمان بالغیب اور اقامت صلوٰۃ کے بعد متقین کی تیسری صفت یہ بیان فرمائی وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ یعنی متقین وہ لوگ ہیں جو ہماری دی ہوئی روزی سے خرچ کرتے ہیں خرچ کرنے سے مراد اللہ تعالےٰ کے راستے میں خرچ کرنا ہے اور خرچ کی مختلف مدات میں سے پہلے نمبر پہ زکوٰۃ ہے۔ دوسرا صدقہ فطر تیسرا قربانی چوتھا عام خیرات۔ اس کے بعد سائلین۔ محتاجوں۔ مہمانوں۔ کمزوروں۔ یتامیٰ اور بیوگان کی حاجت روائی ہے۔ اس کے بعد وقف کی مد آتی ہے۔ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو وہ اس کے نام پر وقف کر جائے تاکہ اُس کو آخرت میں فائدہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے اپنی بہترین زمین کے متعلق حضور علیہ السلام سے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ اس کا فائدہ مجھے آخرت میں پہنچے۔ آپ نے فرمایا[۳] وقف کردو۔ چنانچہ وہ وقف کر دی گئی۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج۱ ص۴۲ تفسیر در منثور ج۱ ص۲۷ [۲] ترمذی ص۲۱۸، مسلم ج۲ ص۴۱

اسی طرح مسجدیں بنانا اور ان میں ضروریات فراہم کرنا، اور دینی مدارس کا قیام بھی مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ میں آتا ہے۔ کسی نالے پر پل تعمیر کرنا پانی کے لیے کنواں یا نل لگوانا، مسافر خانہ تعمیر کرنا۔ حج اور عمرہ خود کرنا یا کسی دوسرے کو کروانا۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد پر مال صرف کرنا، یہ سب مدّات ہیں۔ جن پر خرچ کرنا انفاق فی سبیل اللہ میں آتا ہے۔ اور باعث اجر و ثواب ہے۔ نیک کام کے لیے اخلاص کے ساتھ ایک پیسہ خرچ کرنے کا اجر دس گنا ملتا ہے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے[1] کہ جہاد میں خرچ کرنا جہاں دشمن اور کافر دین کو توڑنا چاہتے ہوں۔ ان کے مقابلے کے لیے جو مال خرچ کیا جائے۔ اس کا ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ سات سو گنا ہے۔ نفقات واجبہ یعنی گھر کے ضروری اخراجات وہ بچوں کے لیے ہوں یا بیوی کے لیے، نوکر چاکر یا رشتہ داروں پر خرچ کیا جائے، یہ سب انفاق فی سبیل اللہ میں آتا ہے اور مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کا مصداق بنتا ہے۔

کتبِ سماوی پر ایمان

اس کے بعد فرمایا متقین وہ لوگ ہیں وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ یعنی آپ پر جو کتاب ہدایت اور جو احکام نازل ہوئے ہیں ان پر ایمان رکھتے ہیں وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ اور جو پہلے پیغمبروں پر وحی نازل ہوئی ہے۔ اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں یہ بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ پہلی کتابوں پر صرف ایمان رکھنا ضروری ہے۔ ان پر عمل کرنا ضروری نہیں، عمل ان احکام پر ہوگا۔ جو آخری کتاب قرآن پاک میں نازل ہوئے ہیں۔ قرآن پاک کے نزول اور حضور علیہ السلام کی شریعت کے نفاذ پر پہلے تمام احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ ان کا ترک کرنا ضروری ہے۔ ان پر عمل ضروری نہیں تاہم ان پر ایمان ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے جو کچھ نازل فرمایا وہ برحق ہے۔ یہ اجزائے ایمان میں سے ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ تمام آسمانی کتابیں برحق ہیں۔ تاہم قابلِ عمل احکام صرف قرآن پاک کے ہیں۔

ایمان بالآخرت

متقین کی آخری صفت یہ بیان فرمائی وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ وہ آخرت

---

[1] ترمذی صـ۲۵۲ ابن ماجہ صـ۱۹۸

کے دن پر یقین رکھتے ہیں آخرت کے دن سے مراد قیامت کا دن یا دنیا کا آخری دن (LAST DAY OF THE W") ہے۔ اسی لیے اس کو آخرت کہتے ہیں۔ اسے دارالآخرت یا آخرت کا گھر بھی کہتے ہیں۔ گویا یہ بھی ایمان کے اجزاء میں سے ہے۔ اسی طرح فرشتے، آسمانی کتابیں، اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات اور توحید یہ سب ایمان کے اجزاء ہیں۔ تقدیر بھی ایمان ہی کا حصہ ہے۔ کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے یا آئندہ ہو گا اللہ تعالیٰ کے علم ارادے اور مشیّت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس پر بھی ایمان رکھنا ضروری ہے۔

ہدایت یافتہ لوگ

فرمایا جو لوگ مذکورہ صفات کے حاملین ہوں گے اُولٰٓئِكَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ فلاح کے معنی مراد کو پہنچنے والے ہیں تو مطلب یہ ہوا۔ کہ قرآنِ کریم کے جس پروگرام کو لوگ نمازیں میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کہہ کر مانگتے ہیں وہ سارا پروگرام یہاں تک بتا دیا گیا ہے۔ جو لوگ اس پروگرام کو تسلیم کر کے اس پر عمل کریں گے۔ فلاح پائیں گے۔ اور جو قوم اس سے روگردانی کرے گی۔ وہ فلاح حاصل نہیں کر سکے گی۔ اگرچہ وہ دنیوی لحاظ سے جس قدر بھی آسودہ حال ہو جائے۔ پروگرام کو واضح کر دیا گیا ہے یعنی ایمان، تقویٰ، انفاق فی سبیل اللہ۔ پھر اس کے بعد سابقہ کتابوں اور آخرت پر ایمان، اور پھر ان اصولوں پر استقامت ہی فلاح کا دارومدار ہے۔ اسی کی وجہ سے دائمی عذاب سے نجات حاصل ہو گی اور آخرت میں اعلیٰ درجات نصیب ہوں گے۔

الٓمّٓ ۱ — البقرۃ ۲

درس چہارم — (آیت ۶ تا ۷)

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۞ ۶ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۞ ۷ ع

ترجمہ:- بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، ان کے لیے برابر ہے کہ آپ انکو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے ۶ اللہ تعالےٰ نے مہر لگا دی ہے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ ۷

انسانوں کے تین گروہ

ہدایت (اور گمراہی) کے اعتبار سے انسان تین گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں پہلا گروہ مومنین کا ہے۔ جو ہدایت کو ظاہراً اور باطناً قبول کرتے ہیں اور اسے اپناتے ہیں۔ یہ مومن متقی کہلاتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی پہلی چار آیتوں میں ان کا حال، ان کے اوصاف اور ان کا انجام بیان ہوا ہے۔ انسانوں کا دوسرا گروہ وہ ہے، جو ہدایت الٰہی کا ظاہراً بھی انکار کرتے ہیں اور باطناً بھی انکار کرتے ہیں۔ یہ لوگ کسی طور پر ہدایت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، لہٰذا کافر کہلاتے ہیں۔ ان ۲ آیتوں میں اللہ تعالےٰ نے انہیں لوگوں کا حال اور ان کا انجام بیان فرمایا ہے۔ ان کا تیسرا گروہ زبان سے تو ہدایت ربانی کا اقرار کرتا ہے۔ مگر دل سے تسلیم نہیں کرتا۔ یہ لوگ منافق ہوتے ہیں۔ آئندہ تیرہ ۱۳ آیات میں انہی لوگوں کا حال بیان ہوا ہے۔

ان میں سے پہلا گروہ جو متقین اور مومنین کا گروہ ہے، وہ فلاح پانے والا گروہ ہے البتہ دوسرے دونوں گروہ ناکام ہیں۔ پھر ان میں سے کافروں کا حال مختصر طور پر بیان ہوا ہے۔ کیونکہ انہوں نے علی الاعلان ہدایت کو قبول نہیں کیا۔ اور کفر پر اڑے ہوئے ہیں۔ البتہ منافقین کا گروہ چونکہ زیادہ خطرناک ہے اس لیے اس گروہ کا حال زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ ان کی مثالیں بھی دی ہیں تشبیہات کے ساتھ بھی سمجھایا ہے، کیونکہ منافقین کا یہ گروہ

بڑا خطرناک گروہ ہے۔

کفر کا معنیٰ

عربی زبان میں کفر کا معنیٰ کسی چیز کو چھپا دینا یعنی مخفی اور پوشیدہ کر دینا ہے۔ اسی لیے امام بیضاوی کہتے ہیں[1]۔ کہ جس ڈوڈی کے اندر پھل بند ہوتا ہے۔ اُسے کافور کہتے ہیں۔ اور کسان جو بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ اُسے کافر کہتے ہیں۔ جیسے سورۃ الحدید میں آتا ہے "کَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ" گویا کافر کا لفظ کسان پہ بھی بولا گیا ہے۔ بادل اور اندھیرا جو سورج کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے۔ اس کو بھی کافر کہتے ہیں ع

فِي لَيْلَةٍ كَفَرَ النُّجُومَ غَمَامُهَا

یعنی بادل اور اندھیرا ستاروں کو چھپا لیتا ہے۔ تو لغوی اعتبار سے اس کا معنیٰ یہ ہوگا۔ جیسا کہ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں[2]۔ إِنَّ الَّذِينَ سَتَرُوا الْحَقَّ عِنَادًا بے شک وہ لوگ جنہوں نے عناد کی وجہ سے حق کو چھپا دیا۔ مدارک والے اور دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں یعنی حق کو چھپا دیا۔ ظاہر ہی نہیں کیا۔

جب کفر کا اطلاق شریعت کی اصطلاح میں کیا جاتا ہے تو اس کا خاص مفہوم ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جو چیز حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے قطعی اور یقینی طور پہ ثابت ہو۔ شک و شبہ والی بات نہ ہو، اُس چیز کا منکر کافر کہلاتا ہے۔ اور یہ انکار کفر کہلائے گا۔ خواہ کسی ایک چیز کا انکار ہو یا تمام چیزوں کا۔

کفر کی مختلف اقسام

جس طرح شرک نفاق، الحاد، ارتداد، زندقہ، فسق، ایمان، توحید وغیرہ قرآن کی مختلف اصطلاحات ہیں۔ اور ان سب کا الگ الگ مفہوم ہے اسی طرح کفر بھی ایک اصطلاح ہے اور اس کی مختلف اقسام ہیں۔ جو کہ مفسرین، محدثین، فقہاء اور علماء نے بیان کی ہیں۔

کفرِ انکار

منجملہ ان کے کفرِ انکار ہے۔ اس کا معنیٰ یہ ہے۔ کہ کوئی شخص دل اور زبان دونوں سے شریعت کی قطعی چیز کا انکار کرے إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا میں دل اور زبان دونوں سے انکار ہے۔ ایسا شخص حق کی بات کو جاننے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ لہٰذا یہ کفرِ انکار ہے

---

[1] تفسیر بیضاوی ج۱ ص۱۱، [2] معالم التنزیل ج۱ ص۱۴، تفسیر مدارک ج۱ ص۱۴، تفسیر منار ج۱ ص۱۴۰

کفر جحود

قرآن پاک میں کفر کی جس دوسری قسم کا ذکر آتا ہے۔ وہ کفر جحود ہے۔ جحد کا معنیٰ انکار ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ "وَجَحَدُوْا بِھَا" سے ظاہر ہے۔ کفر جحود کی تعریف یہ ہے کہ آدمی دل سے پہچانتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ بات سچی ہے۔ مگر وہ اس کا زبان سے اقرار نہیں کرتا۔ جیسا کہ فرعونیوں کے متعلق فرمایا "وَجَحَدُوْا بِھَا وَاسْتَیْقَنَتْھَآ اَنْفُسُھُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا" دل میں سمجھتے تھے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کا دین سچا ہے۔ مگر وہ اس کا انکار کرتے تھے یہ انکار ظلم اور تعدی کی بناء پر تھا۔ اس کو کفر جحود کہا جاتا ہے۔ ابلیس کا کفر یہی ہے۔ کیونکہ وہ دل میں حق بات کو سمجھتا ہے۔ مگر اقرار کی بجائے انکار کرتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص بلعم بن باعور اہوا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے مردود ہوا تھا۔ اس کا ذکر سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ایک بڑا حکیم شاعر امیہ بن ابی الصلت ہوا ہے۔ اس کا کفر بھی ایسا ہی تھا۔ اس نے حق کو جانتے پہچانتے ہوئے قبول نہیں کیا تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں وحی نازل کی۔ مجھ پر کیوں نہیں کی۔ عربی زبان میں اس کا کلام موجود ہے۔ وہ شخص نیکی، بدی اور قیامت تک کا تصور رکھتا تھا۔ وہ تورات اور انجیل کا قاری اور ہدایت کا طلب گار تھا۔ مگر جب حضور علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو وہ حسد میں مبتلا ہو گیا۔ اور آپ کی رسالت کا انکار کر دیا۔ حالانکہ وہ دل سے برحق سمجھتا تھا۔ وہ اتنا قابل آدمی تھا کہ اس کے اشعار پڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ کہ یہ کوئی بڑا مومن آدمی ہو گا۔ حضور علیہ السلام نے اس کے متعلق فرمایا[1] اَنَّہٗ مِمَّنْ اٰمَنَ لِسَانُہٗ وَلَمْ یُؤْمِنْ قَلْبُہٗ یعنی زبان تو اس کی مومنوں جیسی ہے مگر دل کافر ہے۔

ہمارے زمانہ میں ایک افسانہ نویس انگریز برنارڈ شا گذرا ہے، بڑا صاحب علم تھا، اسلام کو وہ بھی سچا سمجھتا تھا۔ مگر کم بخت نے اقرار نہیں کیا۔ یہی حال مسٹر گاندھی کا تھا۔ وہ اسلام کو سچا مذہب کہتا تھا۔ مگر دل سے تسلیم نہیں کیا۔ وہ عیسائیت اور ہندو مت کو بھی سچے مذاہب ہی

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۲۶۵ ج ۲

سمجھتا تھا۔ حالانکہ سچا مذہب تو صرف اسلام ہی ہے " اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ "
باقی سب ادیان باطل ہیں۔ یہی کفر جحود ہے۔ کہ کسی چیز کو دل سے صحیح سمجھ کر پھر زبان سے
اس کا اقرار نہ کیا جائے۔

کفرِ عناد

کفر کی تیسری قسم کفرِ عناد ہے۔ اس کا معنیٰ یہ ہے۔ کہ دل سے پہچانتا بھی ہے۔ زبان
سے اقرار بھی کرتا ہے کہ یہ دین درست ہے۔ مگر قبول نہیں کرتا۔ اس کی مثال ابوطالب کا
کفر ہے[1]۔ وہ حضرت علیؓ کے والد اور حضور علیہ السلام کے چچا تھے۔ وہ مانتا تھا۔ کہ میرا بھتیجا سچا ہے
صادق اور امین ہے۔ جو کہتا ہے۔ سچ ہے۔ مگر اس نے ایمان اور توحید کو قبول نہیں کیا۔
اس کا خاتمہ کفر پر ہی ہوا۔ وہ عجیب قسم کے وہم کا شکار تھا۔ محض اس ڈر سے اسلام قبول
نہیں کیا۔ کہ عورتیں ملامت کریں گی کہ موت کے ڈر سے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا۔ یہ کفرِ عناد ہے

کفرِ نفاق

کفر کی چوتھی قسم کفرِ نفاق ہے۔ اس کا ذکر اگلی آیتوں میں آرہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے
کہ انسان زبان سے اسلام کی سچائی کا اقرار کرتا ہے۔ کلمہ بھی پڑھتا ہے۔ نمازیں بھی ادا کرتا ہے
زکوٰۃ دیتا ہے۔ بسا اوقات جہاد میں بھی شریک ہوتا ہے۔ مگر دل سے تکذیب کرتا ہے۔ یہ
کفرِ نفاق ہے۔ اور پھر نفاق بھی دو قسم سے ہے یعنی اعتقادی نفاق اور عملی نفاق۔ یہاں پر
جس نفاق کا ذکر ہوا ہے۔ یہ اعتقادی نفاق ہے کہ اعتقاداً دل سے تسلیم نہیں کرتا عملی نفاق
کا ذکر بعد میں آئے گا۔ وہ اور چیز ہے۔

محدثین کرام فرماتے ہیں[2]۔ کہ یہ چاروں کفر خطرناک ہیں۔ ان میں سے کسی میں بھی مبتلا ہو
گیا۔ وہ اللہ کے ہاں کبھی نجات نہیں پا سکتا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب میں مبتلا ہوگا۔ یہ قطعی
بات ہے۔

کفرِ شک

اس کے علاوہ بھی کفر کی کئی قسمیں ہیں۔ منجملہ ان کے کفرِ شک ہے۔ قرآن پاک میں
بعض منافقوں کے بارے میں آتا ہے " فَهُمْ فِىْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ "۔ دوسری
جگہ فرمایا " بَلْ هُمْ فِىْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ "، یعنی ایسے لوگ شک میں ہی کھیل رہے ہیں۔

---

[1] تفسیر معالم التنزیل ص۱۴ ج۱ [2] معالم التنزیل ج۱ ص۱۴ فتح الملہم ص۲۴۳ ج۱

یہ کفرِ شک کہلاتا ہے۔

کفرِ جہالت — اسی طرح کفر کی ایک قسم کفرِ جہالت ہے۔ علم حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے ساری عمر جہالت میں گذر جاتی ہے۔ نہ علم ہوتا ہے اور نہ وہ راہِ راست پہ آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی جگہ جگہ پہ مذمت بیان کی ہے۔ "اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ" ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے یعنی علم نہیں رکھتے۔ دوسری جگہ فرمایا "ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ" کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟ مطلب یہ کہ برابر نہیں ہوتے۔ اس قسم کا کفر کفرِ جہالت ہے۔ جس میں اکثر لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔

کفرِ تاویل — کفرِ تاویل کو الحاد اور زندقہ بھی کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ کسی شئی کو غلط مطلب پہنا دیا جائے۔ اصل مقصد کچھ اور ہو مگر تاویل کے ذریعے کچھ سے کچھ بنا دیا جائے۔ مثلاً غلام احمد پرویز قرآن پاک کی آیت "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ" کا مطلب مرکزِ ملّت یا سنٹرل گورنمنٹ مراد لیتا ہے۔ کہ مرکزی حکومت کا حکم ماننا لازمی ہے۔ اسی طرح حج کا معنی اس نے عالمی کانفرنس کیا ہے۔ حالانکہ حج ایک عبادت کا نام ہے۔ اس کے ارکان ہیں، جن کو پورا کرنا ضروری ہے اس لیے محض عالمی کانگرس یا عالمی کانفرنس کا نام دینا بالکل غلط ہے۔ پرویز نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ خدا کے محکوم ہونے کا مطلب اپنی فطرت کا محکوم ہونا ہے۔ یہ بھی کفرِ والا معنی ہے۔ اس نے ترجمۃ القرآن میں لکھا ہے کہ اللہ کا معنی قانون ہے۔ جہاں بھی اللہ کا لفظ آیا ہے۔ اس سے مراد قانون ہے۔ گویا خدا تعالیٰ کی ذات یا ہستی نہیں ہے۔ اسی طرح اس نے حُوْرٌ عِیْنٌ کا معنی پاکیزہ فکر کیا ہے۔ گویا جنتیوں سے مراد پاکیزہ فکر والے لوگ ہیں۔ حالانکہ حُوْرٌ عِیْنٌ کی اصطلاح کو تمام مسلمان سمجھتے ہیں کہ وہ عورتوں کی ایک پاکیزہ مخلوق ہے۔

غلام احمد قادیانی نے اپنی کتاب ازالۂ اوہام میں محمد رسول اللہ کے متعلق لکھا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے قرآن میں میرا نام محمد بھی رکھا ہے اور رسول بھی۔ العیاذ باللہ۔ یہ کفرِ والا معنی ہے۔ اس سے پہلی آیت "وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ" کا معنی قادیانی یوں کرتے ہیں۔

ا — ۲ مفہوم القرآن ص ۱۱۶۳/۳ — ۲ ۵

بِالنُّبُوَّةِ الْاٰخِرَةِ یعنی متقی وہ لوگ ہیں جو آخری نبوت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور آخری نبوت مرزا غلام احمد مرتد کی لیتے ہیں حالانکہ آخرت سے مراد دار الآخرت یا یوم آخرت ہے۔ یہ مرزائیوں کی تاویل کی مثال ہے۔ اسی طرح انہوں نے "وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ" کا معنی یہ کیا ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے مہر لگانے والے ہیں۔ یعنی اب جو نبی آتے ہیں، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر سے آتے ہیں۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم مہر لگا لگا کر دوسروں کو نبی بنا رہے ہیں (العیاذ باللہ)

الغرض کفر تاویل سے مراد یہ ہے۔ کہ کوئی ایسا معنی کرنا جو نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو، نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اور نہ سلف صالحین سے ثابت ہو، وہ کفر تاویل، زندقہ یا الحاد میں شمار ہو گا۔

سر سید احمد خاں نے بہشت کا معنی مسرت اور خوشی کیا ہے۔ دوزخ کو غم اور پریشانی سے تعبیر کیا ہے۔ خوشی اور مسرت اچھے اعمال کا صلہ ہوتی ہے۔ اور رنج و غم برے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک جنت اور دوزخ کسی خاص جگہ کا نام نہیں۔ یہ بھی کفر یہ معنی ہے۔

عملی کفر

کفر کی ایک قسم عملی کفر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ کسی نعمت کی قدر دانی کی بجائے اس کی ناشکری کی جائے۔ کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، حضور! کفر سے کیا مراد ہے۔ فرمایا ناشکر گزاری اور ناقدری۔ اکثر عورتیں اس قسم کے کفر میں مبتلا ہوتی ہیں۔ عورتوں کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے[۱] تَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ یعنی تم خاوند کا کفر کرتی ہو۔ ناشکر گزاری کرتی ہو۔ یہی عملی کفر ہے۔ فرمایا کہ خاوند زمانہ بھر راحت و آرام مہیا کرتا ہے اگر ایک مرتبہ بھی تمہاری مرضی کے خلاف کوئی بات ہو جاتی ہے۔ تو کہتی ہو، تیرے گھر آکر مجھے کبھی سکھ نصیب نہیں ہوا کفرانِ نعمت اکثر عورتوں کے مزاج میں داخل ہوتا ہے۔ یہ اعتقادی کفر نہیں بلکہ عملی کفر ہے۔

محدثین اور فقہائے کرام عملی کفر کی دو قسمیں بتاتے ہیں[۲]۔ بعض عملی کفر ایمان کے بالکل منافی ہوتے

---

[۱] بخاری ص۹ ج۱ مسلم ص۶۰ ج۱ [۲]

ہیں۔ اگر کوئی شخص ایسے کفر کا ارتکاب کرے تو ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ مثلاً کوئی بت کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے، یا قرآن کریم کی توہین کا مرتکب ہو اُسے گندی جگہ پہ پھینک دے یا مثلاً کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دے یا کسی نبی کو قتل کرے تو ایسا آدمی ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔

عملی کفر کی دوسری قسم وہ ہے۔ جس کی وجہ سے انسان ایمان سے خارج نہیں ہوتا مثلاً کوئی شخص نماز کا تارک ہو، شراب پی لے۔ کسی کو قتل کر ڈالے۔ زنا کا مرتکب ہو یا کسی سے ناحق لڑائی کی۔ یہ سب کفر ہی کی قسم سے ہیں مگر یہ ایمان کے منافی نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[1] لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ کُفَّارًا میرے بعد کفار کی طرح نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔ ان امور سے انسان اسلام سے تو باہر نہیں نکلتا مگر کام کافروں والے ہیں۔ مومن کی شان نہیں کہ یہ کام کرے قِتَالُہٗ کُفْرٌ[2] مومن سے مقاتلہ کفر ہے۔ مومن کو گالی دے فسق کی بات کرے، ناحق لڑائی یہ سب کفر کی باتیں ہیں۔ کیونکہ کافر مسلمان کی جان کا دشمن ہوتا ہے جب کہ مومن، مومن کی جان کا محافظ ہوتا ہے۔ فرمایا[3] شَارِبُ الْخَمْرِ کَعَابِدِ وَثَنٍ یعنی شراب پینے والا ایسا ہی ہے۔ جیسا بت پرستی کرنے والا۔ گویا شرابی کو بت پرست کے ساتھ تشبیہ دی۔ نسائی شریف میں آتا ہے[4] مَنْ اَتٰی عَرَّافًا اَوْ کَاھِنًا جو کاہن یا عراف کے پاس غیب کی خبریں پوچھنے کے لیے گیا فَقَدْ کَفَرَ اس نے کفر کیا۔ اس کی مزید تفصیل آتی ہے۔ کہ اگر نجومی کی بات کو بالکل سچا سمجھ رہا ہے تو اسلام سے خارج ہو گیا۔ اور اگر سچا سچا تو نہیں سمجھتا، ویسے ہی اس کی رائے لینا چاہتا ہے۔ تو یہ عملی کفر ہے، اسلام سے خارج تو نہیں ہوتا مگر سخت گنہگار ہوتا ہے۔

کفر دہریت کفر دہریت بھی اسی قبیل سے ہے۔ قرآن پاک میں اسی کفر کے متعلق مذکور ہے کہ بعض کافر یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ "وَمَا یُھْلِکُنَآ اِلَّا الدَّھْرُ" یعنی ہمیں زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے ایسے لوگ زمانے کے تمام حادثات کو زمانے ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی ذات

---

[1] مسلم ج۱ ص۵۸، [2] مسلم ج۱ ص۵۸، [3] جامع صغیر مع شرح فیض القدیر ج۴ ص۱۵۲، [4] مستدرک حاکم ص۸

کا اقرار نہیں کرتے کہ وہی ہر چیز کرنے والا ہے۔ بلکہ زمانے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ یہ کفر دہریت کہلاتا ہے

ایک اشکال اور اس کا جواب

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ میں یہ اشکال وارد ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ کہ کفار کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اگر ایسا ہے تو پھر انہیں ایمان کی تبلیغ و دعوت سے کیا حاصل ؟

مفسرین کرام وضاحت فرماتے ہیں[1]۔ کہ اس مقام پر لفظ سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ یعنی ان کفار کے لیے برابر ہے۔ خواہ آپ تبلیغ کریں یا نہ کریں۔ سَوَآءٌ عَلَیْكَ کے الفاظ نہیں آتے۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ان کو تبلیغ کرنا یا نہ کرنا آپ کے لیے برابر ہے۔ یہ تو ان کے لیے برابر ہے۔ کہ انہیں کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ آپ کا تو فرض ہے۔ کہ آپ فریضہ تبلیغ انجام دیتے رہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔ یہ اس کی اپنی صوابدید پر ہے۔ آپ کے لیے حکم یہی ہے " فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى " آپ نصیحت کرتے چلے جائیں، چاہے وہ انہیں فائدہ دے یا نہ دے۔ آپ کو اس تبلیغ کا ہر حالت میں اجر ملے گا۔

---

[1] بیان القرآن صہ ۱۴ مطبوعہ مجتبائی دہلی

الٓمّٓ ۱ — البقرۃ ۲

درسِ پنجم ۵

(آیت ۶ تا ۷)

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶﴾ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَعَلٰی سَمۡعِہِمۡ ؕ وَعَلٰۤی اَبۡصَارِہِمۡ غِشَاوَۃٌ ۫ وَّلَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۷﴾ ع

ع/۱

ترجمہ: بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، ان کے لیے برابر ہے کہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿۶﴾ اللہ تعالیٰ نے مہر لگادی ہے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ﴿۷﴾

گذشتہ سے پیوستہ

ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے اعتبار سے انسانوں کے دوسرے گروہ یعنی کفار کا ذکر کیا ہے۔ پہلے گروہ متقین کا بیان ہو چکا ہے۔ یہ دوسرے گروہ کا بیان ہے، اور تیسرے گروہ منافقین کا تذکرہ اگلے رکوع میں آئے گا۔ یہ دوسرا گروہ کفار کا ہے۔ جو ظاہراً اور باطناً اللہ تعالیٰ کی توحید کا انکار کرتے ہیں۔ اور ہدایت کو قبول نہیں کرتے۔ کفر کی تشریح اور اس کی مختلف اقسام گذشتہ درس میں مختصراً بیان کر دی گئی تھیں۔

ان آیات کے مصداق کون ہیں

گذشتہ درس میں اس اشکال کا تذکرہ ہوا تھا۔ کہ اگر کافروں نے ایمان ہی نہیں لانا، خواہ انہیں ڈرایا جائے یا نہ ڈرایا جائے، تو پھر انہیں تبلیغ کرنے کا فائدہ کیا ہے۔ اس کا جواب بھی دیا گیا تھا۔ کہ ڈرانا یا نہ ڈرانا کفار کے لیے برابر ہے۔ نہ کہ خود مبلغ کے لیے، کیونکہ مبلغ تو ہر حالت میں اجر کا مستحق ہے، خواہ کوئی ایمان لائے یا نہ لائے۔

دوسرا سوال یہاں پر یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد تو یہ ہے۔ کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، کفار ایمان نہیں لائیں گے۔ حالانکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ بہت سے کافر

اگرچہ ایمان نہیں لائے۔ مگر دوسرے بہت سے ایمان لائے۔ ابوسفیانؓ کافر ہی تو تھے۔ وہ ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے۔ ابوجہل جیسے بدترین دشمن کا بیٹا عکرمہؓ ایمان لایا۔ مشہور جرنیل خالدؓ بن ولید بھی بڑی دیر کے بعد ایمان کی دولت سے مالامال ہوئے۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ یہاں پہ کفار سے مراد وہ کفار ہیں۔ جن کے متعلق اللہ تعالےٰ کے علم میں ہے کہ ان کی استعداد خراب ہے۔ ان کا خاتمہ کفر پہ ہونے والا ہے۔ ان سے عتبہ، شیبہ، ابولہب اور ابوجہل جیسے کافر مراد ہیں۔ جن کا خاتمہ حالتِ کفر پہ ہوا۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں[1]۔ کہ ان آیات میں یہودیوں کی طرف اشارہ ہے۔ جب قرآن کریم نازل ہوا تو انہیں اسلام کی دعوت پیش کی گئی۔ مگر وہ جانتے بوجھتے ہوئے ایمان نہ لائے۔ ماسوائے اکا دکا آدمی کے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ وہ کہتے تھے۔ کہ ہم پہلی کتابوں پر ایمان لاچکے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس کتاب یعنی قرآن پاک پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں ہے وہ انتہائی درجے کے متعصب لوگ تھے۔ یہ روش انہوں نے عناد کی وجہ سے اختیار کی۔ چنانچہ اس سورۃ مبارکہ میں کثرت سے یہود کا ذکر آئے گا۔ بلکہ اس سورۃ کا موضوع ہی یہود کی اصلاح ہے۔ یہود کا ذکر "یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ" سے شروع ہو کر اختتام پارہ اور پھر دوسرے پارے تک چلا گیا ہے۔

ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے، تو پھر انہیں اسلام کی دعوت دینے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ بلکہ انہیں دعوت دینا تو خلافِ انصاف معلوم ہوتا ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں[2]۔ کہ یہود کے رویہ کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے۔ کہ وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے وہ ایمان سے محروم رہیں گے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے۔ جیسے کوئی ماہر ڈاکٹر یا طبیب کسی مریض کو دیکھ کر بتائے کہ اسے ٹی بی کا مرض لاحق ہے۔ اور اب یہ تین درجے عبور کر کے چوتھے درجے میں داخل ہو گیا ہے۔ اب مریض کی موت

---

[1] ... [2] بیان القرآن صہ ۱/۲۴

یقینی ہے۔ ظاہر ہے کہ مریض کی ہلاکت ڈاکٹر کے کہنے سے نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کی موت کا سبب تو وہ بیماری ہے جس میں وہ مبتلا ہے۔ یا اس میں مزید دخل اس کی بدپرہیزی یا بے احتیاطی کو ہوگا جو اس نے اختیار کی، اسی طرح کفار کے ایمان نہ لانے کا سبب ان کی اپنی روش ہے، نہ کہ اللہ کا فرمان۔

الغرض! فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے برابر ہے ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں لَا یُؤْمِنُوْنَ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

مہر لگانے کا مطلب

انہیں کفار کے متعلق ارشاد ہوتا ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ط یعنی اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے وَعَلٰٓی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ یہاں پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے خود ہی اُن کے دلوں پر اور کانوں پر ٹھپے لگا دیے ہیں، اور آنکھوں پر پردے ڈال دیے ہیں۔ تو پھر اُن سے کہنا ایمان لاؤ یا ہدایت اختیار کرو، کہاں تک درست ہے۔ اس کا حل مفسرین کرام یہ بیان کرتے ہیں۔ کہ مہر لگانا یا پردہ ڈالنا بطور سزا کے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے عناد اور سرکشی کی وجہ سے ٹھپے لگائے ہیں۔ کسی کو ماں کے پیٹ میں ہی مہر لگا کر ہدایت کا راستہ بند نہیں کر دیا۔ قرآن و حدیث میں اس بات کی تصریح موجود ہے حدیث شریف میں آتا ہے[1] کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ ہر بچہ فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ ماحول اور تربیت کے مطابق یہودی، مجوسی یا سکھ عیسائی وغیرہ ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر تغیر و تبدل واقع ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی فطرت سلیمہ کو بگاڑ لیتا ہے۔ اور کفر، شرک اور نفاق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے "بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْهَا بِکُفْرِهِمْ" اللہ تعالیٰ نے اُن کے کفر اور اس پر اصرار کی وجہ سے ٹھپہ لگا دیا نہ کہ روز اول سے ہی انہیں بلا وجہ مہر بند کر دیا۔ قرآن پاک کی آیت بتاتی ہے۔ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی" آدمی جس

---

[1] مسند احمد ص ۲۲۳ ج ۲، بخاری ص ۹۷۶ ج ۲، مسلم ص ۳۳۶ ج ۲

طرف جانا چاہتا ہے۔ خدا اسی طرف کی توفیق دے دیتا ہے۔ توفیق تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ مگر ارادہ تو انسان کا ہوتا ہے۔ اور ارادے کی حد تک انسان کو اختیار دیا گیا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسے کسب کہتے ہیں۔ گویا ارادہ انسان کا اپنا ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ توفیق دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ آخر کار اس کو جہنم میں داخل کریں گے۔

اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اختیار کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک تندرست آدمی اپنے ارادے اور اختیار سے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اور دوسرا شخص رعشہ کا مریض ہے۔ اور اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر حرکت کرتا رہتا ہے۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر کوئی تندرست آدمی اپنے ہاتھ سے کوئی نقصان کر دے، کوئی برتن توڑ دے کسی کو تھپڑ مار دے تو وہ اس فعل کا ذمہ دار ہوگا۔ اور قابلِ گرفت ہوگا۔ برخلاف اس کے کسی رعشے والے آدمی سے غیر ارادی طور پر کوئی نقصان ہو جائے تو وہ قابلِ مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ وہ تو بیچارہ مجبور ہے۔ اس کے ہاتھ سے تلوار گر کر کسی کی ہلاکت کا سبب بھی بن جائے، تو اس کے ذمے قصاص نہیں ہوگا بلکہ دیت ہوگی۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو جو محدود اختیار دیا گیا ہے۔ اسی کو شریعت میں کسب کہا جاتا ہے چنانچہ جو شخص بقائمی ہوش و حواس اپنے ارادے سے صحیح راستے سے روگردانی کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ سزا کے طور پر اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دیتے ہیں اور آنکھوں پر پردہ حائل کر دیتے ہیں۔ مہر لگانے کا یہی مطلب ہے۔

دلوں کی سیاہی

مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے[۱] تُعْرَضُ الْفِتَنُ عَلَى الْقُلُوبِ كَالْحَصِيرِ عُودًا عُودًا دلوں پر فتنے وارد ہوتے ہیں جس طرح تنکا تنکا جوڑ کر چٹائی تیار ہو جاتی ہے اسی طرح دلوں پر فتنے یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ انسان گمراہ ہو جاتا ہے اور اس کے دل پر ٹھپہ لگ جاتا ہے۔ یہ فتنے گمراہی کی باتیں ہیں جو ایک ایک کر کے انسان پر حملہ آور ہوتی رہتی ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص ان فتنوں کو قبول کر جاتا ہے اس کا دل سیاہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ پورے کا پورا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور انسان اس سٹیج

۱۔ مسلم صفحہ ۸۲ ج ۱

پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں نیکی کو نیکی نہیں سمجھتا اور برائی کو برائی نہیں جانتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے لوٹے کو الٹا کر کے رکھ دیا جائے یعنی پیندا اوپر اور منہ نیچے کی طرف کر دیا جائے۔ تو اس میں کوئی چیز نہیں سما سکتی۔ اسی طرح انسان کا دل بھی الٹا ہو جاتا ہے۔ نیکی کی کوئی بات اسمیں جگہ نہیں پاتی۔

برخلاف اس کے جو شخص دل پہ وارد ہونے والے فتنوں کو قبول نہیں کرتا، اس کا دل سنگ مرمر کی طرح سفید ہو جاتا ہے۔ اُسے کوئی فتنہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

ایک دوسری حدیث میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا[1] کہ جب بندہ پہلی مرتبہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ تو اس کے دل پہ سیاہ داغ پڑ جاتا ہے اگر بندہ توبہ کر لے، اللہ تعالےٰ سے اپنے گناہ کی معافی مانگ لے تو سیاہ داغ دھل جاتا ہے اور دل پھر سفید ہو جاتا ہے۔ اور اگر توبہ کرنے کی بجائے دوبارہ گناہ کا مرتکب ہوا تو سیاہ داغ بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح ہر گناہ کے ارتکاب پہ دل کی سیاہی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا" اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ" اس کے گناہوں نے اس کا احاطہ کر لیا ہے۔ اس کا دل معصیت، کفر اور شرک میں گھر گیا ہے۔ اسی حالت کے متعلق فرمایا كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ" خبردار! سُن لو! ان کے دل پہ زنگ چڑھ گیا ہے۔ اور اس کی وجہ ان کا اپنا کیا دھرا ہے۔ یہی وہ سٹیج ہے جس کے متعلق فرمایا خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ یعنی اللہ تعالےٰ نے بطور سزا ان کے دلوں پہ مُہر لگائی ہے۔

اعضائے رئیسہ کے بارے میں باز پرس ہوگی

اس مقام پہ اللہ تعالےٰ نے انسان کے تین اہم اعضاء یعنی دل، کان اور آنکھوں کا ذکر کیا ہے۔ دل محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہی نہیں بلکہ اس کو عقل قلب اور فواد سے بھی تعبیر کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ سوچ کا تعلق دماغ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور قوتِ ارادہ کا تعلق قلب کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی قوت ارادی کو فواد کہا گیا ہے قرآن پاک میں موجود ہے "اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا" یاد رکھو! کان، آنکھ اور دل سب کے متعلق سوال ہوگا۔ یہ اعضا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہیں۔ انسانی جسم میں یہی چیزیں علم کے ذرائع ہیں۔ اگر یہ

---

[1] ترمذی ص ۱۸۴، ابن ماجہ ص ۳۱۳

چیزیں نہ ہوں تو انسان کی کچھ حقیقت نہ ہو۔ یا اگر اللہ تعالیٰ یہ اعضاء عطا کر دے اور پھر انسان اُن سے کام ہی نہ لے تو اُس کی مثال قرآن پاک نے یہی بیان فرمائی "صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ" ایسے لوگ بہرے ہیں، گونگے ہیں اور اندھے ہیں" فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ" کہ یہ عقل سے کام ہی نہیں لیتے۔ گویا کافروں کی مذمت کی ہے۔ کہ ان کی حالت یہ ہے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں دی ہیں۔ کہ انسان دِل کے ساتھ سمجھے اور غور کرے۔ کیونکہ یہ دل ہی منبع اخلاق ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سزا کے ذکر میں" تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ" فرمایا۔ یعنی جہنم کی آگ کا اثر سب سے پہلے ایسے لوگوں کے دلوں پہ ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے قلب جیسے مرکزِ اخلاق کو بگاڑا، تو جہنم کی آگ کا اثر بھی پہلے دِل پر ہی ہوگا۔ جسم کے باقی حصوں یعنی ہاتھ پاؤں پہ آگ کا اثر دوسرے نمبر پہ ہوگا۔

اعضائے رئیسہ میں سے قلب کی اہمیت

حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا ارشادِ گرامی ہے[1]۔ کہ انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے اگر وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہوگا اور اگر یہ لوتھڑا بیمار ہے تو سارا جسم بیمار ہوگا فرمایا اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ سنو! وہ لوتھڑا دل ہے۔ حسن و قبح کا سارا دارومدار دل پر ہے۔ محبت اور نفرت کے تمام جذبات دِل میں پیدا ہوتے ہیں۔ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا سارا معاملہ دل سے تعلق رکھتا ہے۔ دِل کے ذریعے انسان سمجھتا ہے۔ اور کان کے ذریعے اللہ تعالیٰ معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت۔ نبی کی حدیث، واعظ کا وعظ وغیرہ سب چیزیں کانوں کے ذریعے سے سنی جاتی ہیں۔ لہٰذا کان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح آنکھ بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ انہیں کے ذریعے انسان قدرت کی عظیم نشانیاں دیکھتا ہے۔ کتابیں پڑھتا ہے۔ اگر آنکھیں نہ ہوں تو ساری دنیا گھپ اندھیرا ہو جاتی ہے۔ دِل کی اہمیت کے متعلق علامہ اقبال مرحوم کہتے ہیں[2]

؎ غافل ترے زمردِ مسلماں ندیدہ ام — دِل درمیانِ سینہ و بیگانہ دل است

کہ میں نے مسلمان سے زیادہ غافل کسی کو نہیں دیکھا۔ کہ دِل جیسی عظیم دولت اس کے سینے میں موجود ہے۔ مگر وہ اس سے غافل ہے۔ اُسے شعور ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کتنی بڑی نعمت اس کو عطا کی ہے۔

---

[1] مسلم صفحہ ۲۸/ ج۲
[2] پیامِ مشرق ص

الغرض ! اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم نعمتیں انسان کو ودیعت کی ہیں۔ یہ اس کے لیے حصول علم کے ذرائع ہیں۔ جو شخص ان ذرائع کو ضائع کرتا ہے۔ اس کی مثال حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے یوں دی ہے۔ جیسے کوئی امیر کبیر کسی کی تنخواہ مقرر کر دے۔ کہ بھائی تم غریب ہو ہر ماہ یہ وظیفہ وصول کر لیا کرنا۔ وہ شخص ہر مہینے اپنا مشاہرہ وصول تو کر لیتا ہے۔ مگر کسی مصرف میں لانے کی بجائے اُسے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔ یا پانی میں ڈبو دیتا ہے۔ امیر دیتا رہتا ہے اور غریب ضائع کرتا رہتا ہے۔ آخر کار اس امیر کو کہنا پڑتا ہے۔ کہ یہ شخص کس قدر نمک حرام ہے۔ کہ میں نے اس پر رحم کرتے ہوئے اس کا وظیفہ مقرر کیا ہے۔ مگر یہ اُس سے فائدہ نہیں اٹھاتا چنانچہ اس کا وظیفہ بند کر دیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اُس شخص کو افسوس بلکہ احساس تک نہیں ہوتا کہ اُس کی آمدنی ختم ہو گئی ہے۔ تو اس قسم کے شخص کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جائے گا کہ یہ بیوقوف سزا کا ہی مستحق ہے۔

عذاب عظیم کی وعید

یہی حالت اُس شخص کی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے دل عطا کیا۔ کان اور آنکھیں دیں مگر وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ان کو بروئے کار نہیں لاتا۔ تو آخر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ نعمتیں سلب کر لی جائیں گی، اور ایسا شخص نمک حرام قرار پائے گا۔ یہی وہ حالت ہے۔ جسکے متعلق فرمایا کہ اُن کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔ اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے لہٰذا اُن کے لیے عذاب عظیم مقرر کر دیا گیا ہے۔ یہ اسی کے مستحق ہیں۔

اعضائے رئیسہ کا مرکز ایک ہے

یہاں پر جن تین اعضاء کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں قلوب جمع ہے۔ سمع واحد اور ابصار پھر جمع کا صیغہ ہے۔ کہتے ہیں[1] کہ قلب کی حالت تو ہر شخص کی الگ الگ ہے۔ لہٰذا بہت لوگوں کی وجہ سے اُسے جمع فرمایا۔ اور کان اگرچہ ہر انسان کے دو ہیں مگر ان دونوں کی سماعت اکھٹی ہوتی ہے۔ ان کا مرکز ایک ہے۔ لہٰذا اس کے لیے واحد کا صیغہ بولا۔ اور آنکھیں دونوں الگ الگ ہیں ان دونوں سے اکٹھا بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ اور ایک کو بند کر کے کسی ایک سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ان کے لیے جمع کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ پہلے دو اعضاء یعنی دل اور

---

[1] بیان القرآن صفحہ ۴ ج ۱ [2] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۹۶ ج ۱

کانوں کے متعلق فرمایا کہ ان پر ٹھپہ لگا دیا گیا ہے۔ اور آنکھوں کے متعلق فرمایا کہ جو لوگ ان کو استعمال نہیں کرتے اُن پر پردہ ڈال دیا ہے۔ ان کو کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ یہ کفر، شرک اور برائی کا پردہ ہے، جو آنکھوں پر پڑا ہوا ہے۔ صحیح بات نظر ہی نہیں آتی۔ جب کسی شخص کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ تو ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد باری تعالےٰ ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ان کے لیے بہت بڑی سزا ہے۔ جو آگے چل کر انہیں ملے گی۔

ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے دوسری قسم کے گروہ انسانی کا حال بیان فرمایا۔ جنہوں نے ظاہراً اور باطناً کفر کو اختیار کیا۔ اور ہدایت سے محروم رہے۔ ان کی سزا کا ذکر بھی اجمالاً کر دیا۔ اور الفاظ کے ضمن میں وجوہات بھی ذکر کر دیے۔ ان کا حال مختصر طور پر بیان فرمایا ہے۔ آگے منافقین کا ذکر آئے گا۔ چونکہ یہ زیادہ خطرناک گروہ ہے۔ اس لیے ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ یہ تیسرا گروہ ہے۔

درس ششم ۶ (آیت ۸ تا ۱۲)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ
بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ وقف لازم
اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹﴾ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ
فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا
يَكْذِبُوْنَ ﴿۱۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا
اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ
لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

ترجمہ:۔ اور بعض لوگوں میں سے وہ ہیں، جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں ﴿۸﴾ وہ دھوکا دیتے ہیں اللہ کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور حقیقت میں وہ نہیں دھوکا دیتے مگر اپنی جانوں کو، اور وہ سوچتے بھی نہیں ﴿۹﴾ ان کے دِلوں میں بیماری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں ﴿۱۰﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں بیشک ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ﴿۱۱﴾ سنو! بیشک یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں۔ مگر یہ سمجھتے نہیں ﴿۱۲﴾

گذشتہ سے پیوستہ

ہدایت کے اعتبار سے انسانوں کے تین گروہوں کا ذکر آچکا ہے۔ پہلا گروہ وہ ہے جو ظاہراً اور باطناً ہدایت کو قبول کرتے ہیں، وہ مومن اور متقی کہلاتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی پہلی چار آیتوں میں ان کا حال بیان ہوا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے۔ جو ظاہراً اور باطناً ہدایت الٰہی کا انکار کرتا ہے۔ وہ کافروں کا گروہ ہے۔ اگلی دو آیات میں ان کا حال بیان ہو چکا ہے اب ان آیات میں تیسرے گروہ منافقین کا تذکرہ ہے۔ جو ظاہر میں تو ہدایت کو تسلیم کرتے ہیں مگر ان

کے باطن میں کفر ہوتا ہے۔ اگلی تیرہ آیات میں منافقین کی خرابیاں، ان کی سازشوں اور چال بازیوں کا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مثالوں کے ذریعے سارا معاملہ سمجھایا ہے۔

منافقین کا گروہ

قرآن کریم میں منافقین کا حال مختلف سورتوں میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ بعض سورتیں صرف منافقین کے نام پر ہیں، مثلاً سورۃ منافقون۔ اسی طرح نزول کے اعتبار سے آخری سورۃ توبہ میں بھی منافقین کی سازشوں سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اور ان سے خبردار رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

امام ابوبکر حصاصؒ بہت بڑے مفسّر قرآن ہوئے ہیں۔ امام یزید بن مبردؒ بھی بہت بڑے عالم گزرے ہیں انہوں نے علوم عربیہ میں "کامل" نامی عظیم کتاب لکھی ہے۔ یہ دونوں حضرات فرماتے ہیں[1] کہ نفاق کا اشتقاق نَافِقَاءُ الْيَرْبُوع سے ہے جس کا معنیٰ ہے جنگلی چوہے کا بل مشہور ہے کہ گوہ یا جنگلی چوہے کے چار بل (سوراخ) ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہ شکاری کو دھوکا دیتا ہے یہ کسی ایک سوراخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ شکاری اس کو کھوجتے ہیں، تو وہ کسی دوسری طرف غائب ہو جاتا ہے۔ منافق کا حال بھی یہی ہے۔ یہ شرک کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ اور ایمان کو ظاہر کرتا ہے جنگلی چوہے کی طرح یہ بھی خَدَّاع یعنی دھوکے باز ہوتا ہے۔ شریعت میں منافق کی تعریف اس طرح کرتے ہیں لِمَنْ يُّظْهِرُ الْاِيْمَانَ وَيُسِرُّ الْكُفْرَ جو ایمان کو ظاہر کرتا ہے۔ اور کفر کو چھپاتا ہے۔

منافقین کی قسمیں

اب منافق کی کئی قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کا منافق وہ ہے۔ جو ایمان کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر باطن میں کفر بھرا ہوا ہے۔ اور وہ اس پر مطمئن ہے۔ دوسری قسم کا منافق وہ ہے جو ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے متذبذب ہوتا ہے۔ وہ ظاہراً اور باطناً شک میں ہوتا ہے ایسا منافق "مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ" کا مصداق ہوتا ہے۔ ان دونوں قسم کے منافقین کا نفاق شدید ہوتا ہے ان کا اعتقاد فاسد ہوتا ہے۔ اور اس مقام پر جن منافقین کا ذکر ہے، وہ یہی اعتقادی منافق ہیں۔ جن کے عقیدے میں کفر بھرا ہوا ہے۔

---

[1] احکام القرآن ص ۲۶ ج ۱

تیسری قسم کا منافق وہ ہے، جو اخلاقی اور عملی منافق ہوتا ہے ایسا شخص اپنے گناہوں کی وجہ سے آخرت کے نقصان کو دنیا کے نقصان پر ترجیح دیتا ہے۔ اور دنیا کے نفع کو آخرت کے نفع پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ ایسے منافق ہوتے ہیں۔ کہ اگرچہ ان میں ایمان موجود ہوتا ہے۔ مگر یہ لوگ آخرت کو دنیا پر ترجیح نہیں دے سکتے۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ بعض لوگ ایسے ہیں۔ جو کہتے ہیں۔ کہ ہم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ ایسے لوگ دھوکے باز ہیں۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ اللہ تعالیٰ اور ایمانداروں کو دھوکا دیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ کہ یہ اپنی جانوں کو دھوکا دے رہے ہیں۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ یا ایمان والوں کا کیا بگاڑیں گے۔ یہ تو اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ اور اپنا ہی انجام خراب کر رہے ہیں۔ اور یہ سوچتے بھی نہیں وَمَا يَشْعُرُوْنَ یہ اتنا شعور بھی نہیں رکھتے کہ خود اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ آخرت کو برباد کر رہے ہیں فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ان کے دلوں میں بیماری ہے۔ اور یہ بیماری شک کی بیماری ہے۔ اکثر صحابہ کرامؓ خصوصاً حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے یہی معنی کیا ہے[1]۔ کہ ان لوگوں کے دلوں میں شک ہے۔

نفاق دینی بیماری ہے

نفاق کی بیماری جسمانی بیماری نہیں بلکہ دین کی بیماری ہے۔ جس طرح اجسام کی بیماریاں ہوتی ہیں، اسی طرح دین اور عقیدے کی بھی بیماریاں ہوتی ہیں۔ تو اس بیماری سے مراد عقیدے کی بیماری ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں[2]۔ کہ جو شخص اعتدال کی حالت سے نکل جاتا ہے۔ وہ بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جسم کے مختلف عناصر اور اجزاء جب تک اعتدال پر قائم رہیں انسان کی صحت درست رہتی ہے۔ اور جب یہ اعتدال خراب ہو جائے تو جسم بیمار ہو جاتا ہے۔ عقیدے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ جب آدمی اعتدال کا راستہ چھوڑ دیتا ہے۔ تو پھر بد عقیدگی، حسد، کینہ، اور گناہوں کے ساتھ محبت کا راستہ کھل جاتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو انسانوں کو

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص۴۸ ج۱ [2] تفسیر بیضاوی ص۲۱ ج۱

فضیلت کی باتوں سے روکتی ہے۔ اور ابدی اور حقیقی زوال کا باعث بنتی ہے۔ اسی لیے عربی زبان میں مَرَض کا لفظ نفاق پر بھی بولا جاتا ہے۔ کینے اور حسد کو بھی نفاق کہتے ہیں۔ نفاق کا کام یہ ہے کہ خیر کو ظاہر کرتا ہے اور شر کو چھپاتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان اچھائی کا کام کر رہا ہے۔ مگر باطن میں فتنہ پوشیدہ ہوتا ہے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رح فرماتے ہیں[1]۔ کہ اس آیت سے دل کی بیماریوں کا پتہ چلتا ہے۔ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ان کے دلوں میں بھی بیماری ہوتی ہے۔ اور یہ بیماری خون، صفرا وغیرہ کی ظاہری بیماری نہیں ہوتی جو ظاہری جراثیم سے پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے محرک باطنی جراثیم یعنی گناہ ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑے گناہ شرک، کفر، نفاق، شک، تردد اور الحاد وغیرہ ہیں۔ اور ان سے پیدا ہوتے والی روحانی بیماریاں ہوتی ہیں۔

فرمایا فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ج اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو بڑھا دیا کیونکہ اللہ کی سنت اسی طرح جاری ہے۔ کہ جب علاج نہیں کیا جاتا تو بیماری بڑھ جاتی ہے دیکھ لیجیے، اسلام کو ترقی نصیب ہو رہی ہے۔ مگر منافقوں کی بیماری روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کے باطن میں پوشیدہ حسد اور کینہ، اسلام کی مخالفت اور بد عقیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی کو فرمایا فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا اب اس بیماری کا نتیجہ یہ ہوگا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ اور یہ سزا انہیں اس جرم کی پاداش میں ملے گی۔ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ زبان سے حق کا اقرار کرتے تھے۔ اہل ایمان کی رفاقت کا دم بھرتے تھے۔ مگر دل سے کفر کے ساتھ ہوتے تھے۔ گویا وہ زبان سے جھوٹ بولتے تھے۔ چنانچہ فرمایا ان کے اس جھوٹ کی وجہ سے انہیں دردناک عذاب کا مزہ چکھنا ہوگا۔ یہ ان کے نفاق یا حسد یا کفر کی سزا ہے۔

فساد فی الارض

فرمایا حقیقت یہ ہے۔ کہ منافقین اپنے نفاق کی وجہ سے فساد فی الارض کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اس سلسلے میں جب ان سے کہا جاتا ہے وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا

---

[1] بیضاوی ص

فِی الْاَرْضِ[۱] کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔ تو کہتے ہیں کہ ہمیں فسادی کون کہہ سکتا ہے۔ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔

فساد اور اصلاح متضاد چیزیں ہیں۔ اعتدال کی حالت کو اصلاح اور اعتدال سے خروج کو فساد کہتے ہیں۔ لڑائی بھڑکانا، فتنہ برپا کرنا، کافروں سے دوستی، مسلمانوں سے دھوکا، ان کے رازوں کا افشا، گناہوں کا اظہار، دین کی اہانت، قوانین شریعت کی خلاف ورزی یہ سب فساد فی الارض کے کام ہیں[۲]۔ ان لوگوں کے نزدیک فلاح اور اصلاح محض معاش کی درستگی ہے۔ یہ لوگ نظام حق کو بگاڑتے ہیں۔ عبادتِ الٰہی کی بجائے کفر و شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ یہی فساد ہے۔

امام طبریؒ اور ابن کثیرؒ متعدد مفسرین کرام سے ــــ روایت کرتے ہیں[۲]۔ کہ اِصْلَاحُ الْاَرْضِ وَالسَّمَآءِ بِالطَّاعَۃِ زمین و آسمان کی اصلاح اطاعت کے ذریعے سے ہو سکتی ہے اطاعت ہو گی تو ارض و سما کے معاملات درست ہوں گے۔ اگر اللہ تعالےٰ کے قانون اور اس کے رسول کی اطاعت نہیں ہو گی، تو زمین پر فساد کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ اور منافق یہی کچھ کرتے ہیں۔

منافقین کی دھوکہ دہی

اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ یہ اللہ کو دھوکا دیتے ہیں۔ حالانکہ دھوکا تو وہاں دیا جا سکتا ہے۔ جہاں کوئی حالات سے ناواقف ہو۔ اللہ تعالیٰ تو علیم کل ہے۔ اسے دھوکا کیسے دیا جا سکتا ہے۔ اس اشکال کے متعلق امام بیضاویؒ اور دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں[۳]۔ کہ اللہ کو دھوکا دینے کا مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں اور وہ اس طرح کہ زبان سے کہتے ہیں، ہم آپ کے ساتھ ہیں آپ کے پیروکار اور فدائی ہیں، مگر قلب کفر سے بھرپور ہے۔ ایمان کی مقدار ایک رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے۔ اور ویسے محاورے کے طور پر بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو اہل اللہ کو دھوکا دیتے ہیں۔ وہ گویا خدا تعالیٰ کو دھوکا دیتے ہیں۔ مقصد یہ کہ اللہ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں۔ قرآن پاک میں اس کی مثال موجود ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یعنی اے پیغمبر! جو لوگ آپ کے دست مبارک

---

[۱] بیضاوی صفحہ 22/1
[۲] تفسیر طبری صفحہ 125/1، تفسیر ابن کثیر صفحہ 49/1
[۳] تفسیر بیضاوی صفحہ 21/1

پر بیعت کرتے ہیں، وہ گویا اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا "مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ کیونکہ رسول خدا کا نائب اور اس کا پیغام مخلوق تک پہنچانے والا ہوتا ہے۔ اور وہ تمام امور اسکی رضا کے لیے انجام دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ کو دھوکا دینے کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ لوگ اللہ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں۔

منافقین کا طریقہ واردات بھی وہی ہے۔ جو ایک عام دھوکا باز کا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ اس طریقہ سے ہم اپنے مفاد بھی حاصل کر لیں گے۔ اور ہمیں نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔ اس طرح ہم اس بدعقیدگی پہ قائم رہ سکیں گے۔ گویا اسلام کا دعوےٰ بھی کرتے رہیں۔ اور کفر کے پروگرام کو بھی ساتھ ہی جاری رکھتے ہیں

حالانکہ یہ دو متضاد پروگرام ہیں اور کسی صورت ہیں ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسلام کا پروگرام نہایت ترقی یافتہ پروگرام ہے۔ جب کہ کفر انتہائی رجعت پسندانہ نظام ہے۔ یہ دونوں اکٹھے نہیں چل سکتے۔

ایک طرف توحید، ایمان، اور تقویٰ کا پروگرام ہے۔ اور دوسری طرف کفر، شرک اور باطنی بیماریوں کا نظام ہے۔ معاصی اور جنگ وجدل کا نظریہ رکھنے والے یہی لوگ فساد فی الارض کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے واضح کہہ دیا اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ اصل فسادی یہی ہیں۔ جو زبان سے اسلام کا نام لیتے ہیں وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ مگر یہ لوگ سمجھتے نہیں ان کا نفاق ظاہر ہو چکا ہے اور فساد ثابت ہو گیا ہے۔

حکومتی سطح پہ نفاق

غور سے دیکھا جائے تو آجکل کی حکومتیں بھی اسی نفاق کا شکار ہیں۔ یہ بھی حق و باطل کو یکجا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں۔ خود ہماری حکومت کا کیا حال ہے۔ اسلام کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ اور یورپ کے غیر اسلامی پروگرام بھی ساتھ چل رہے ہیں انگریز کا قانون بھی رائج ہے۔ اور اسلامی قوانین بھی جاری کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ دونوں پروگرام اکٹھے نہیں چل سکتے، صرف ایک نظام کو اپنانا ہو گا۔ ورنہ فساد فی الارض کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اسی طرح اسلام کے نظام تعلیم اور انگریزی تعلیم کو یکجا چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے ایک

نظام کا مبنیٰ ہی فساد ہے اور دوسرے کا ایمان، تو یہ اکٹھے کیسے ہو سکتے ہیں۔ جب تک تمام باطل نظاموں کو ختم کر کے صرف اسلامی نظام کو قائم نہیں کریں گے۔ کبھی فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔ میں نے یہ بات اشارۃً کر دی ہے۔

عذاب عظیم اور عذاب الیم میں فرق

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس سے قبل کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں فرمایا "وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ" اور منافقوں کے متعلق فرمایا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ یعنی کافروں کے لیے بڑا عذاب ہے۔ اور منافقوں کے لیے دردناک عذاب۔ اس کے متعلق شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ کافر مردود اور محروم ازلی ہے۔ اس کی استعداد تو ابتدا ہی سے خراب ہے۔ کافروں نے اپنی استعداد کو بگاڑ کر بالکل محرومی کی حالت اختیار کر لی ہے۔ لہٰذا ان کے لیے عذاب اول سے آخر تک بڑا ہی ہوگا۔

جہاں تک منافقین کا تعلق ہے۔ اُن میں استعداد تو موجود تھی مگر انہوں نے اس استعداد میں بگاڑ پیدا کر کے اپنے اندر خود محرومی پیدا کر لی۔ جب سزا کی نوبت آئے گی، تو ان کو اس کا احساس ہوگا اور دکھ پیدا ہوگا۔ کہ افسوس ہمارے اندر استعداد تو موجود تھی مگر ہم نے اس کو نظر انداز کر دیا لہٰذا ان کو مولم عذاب ہوگا۔ یعنی جس قدر احساس ہوگا۔ اسی قدر تکلیف ہوگی۔

اس کے علاوہ مفسرین کرام ایک اور بات بھی بیان فرماتے ہیں[2]۔ کہ کافروں نے تو ایمان کا ذائقہ چکھا ہی نہیں۔ وہ تو اوّل و آخر کافر ہی رہے۔ برخلاف اس کے منافقین نے اگرچہ دل سے حق کو قبول نہیں کیا، مگر زبان سے تو ایمان کا ذائقہ چکھا ہے۔ اور جو آدمی کسی چیز کا ذائقہ چکھ لیتا ہے۔ اس کا حکم اور ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کے لیے عذاب الیم مقرر کیا گیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بکثرت پھل پیدا کرنے والے علاقے کے لوگ کسی ایسی جگہ جاتے ہیں۔ جہاں ایسے پھل نہیں ہوتے۔ تو انہیں احساس محرومی ہوتا ہے۔ اور بڑی تکلیف پہنچتی ہے۔ بڑا مشہور واقعہ ہے کہ ابدالی نے جب پانی پت کا معرکہ سر کیا۔ تو دلی کے بعض لوگوں نے کہا کہ آپ یہیں ٹھہر جائیں۔ تو انہوں نے یہ تاریخی جملہ کہا تھا۔ "ایں جا انار قندھار کجا است"۔ یعنی یہاں قندھار کا انار کہاں ہے۔

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۰۳ پارہ ۱
[2] تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۰۳ پارہ ۱

جو میں یہاں قیام کر لوں۔ وہ قندھاری انار کے ذائقہ سے واقف تھا۔ اس لیے وہ وہاں ٹھہر کر اس ذائقے سے محروم نہیں ہونا چاہتا ہے۔

منافقین کا حال بھی یہی ہوگا۔ چونکہ انہوں نے زبان سے ایمان کا ذائقہ چکھا تھا۔ اس لیے آخرت میں انہیں محرومی کا سخت احساس ہوگا۔ اور اس احساس کی وجہ سے ان کے دکھ اور درد میں اضافہ ہوگا، اسی لیے اس کو عذاب الیم کہا گیا ہے۔

الٓـمّٓ ۱ — البقرة ۲

درس ہفتم ۷ — (آیت ۱۳ تا ۱۶)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ
السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِذَا
لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا
اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ
وَيَمُدُّهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا
كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: اور جب اُن سے کہا جاتا ہے۔ ایمان لاؤ اس طرح جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں۔ کیا ہم اس طرح ایمان لائیں، جس طرح بیوقوف لوگ ایمان لائے ہیں سنو! بیشک یہی لوگ بیوقوف ہیں، لیکن یہ جانتے نہیں ﴿۱۳﴾ اور جب یہ ملتے ہیں اُن لوگوں سے جو ایمان لائے، تو کہتے ہیں، ہم بھی ایمان لائے ہیں۔ اور جب یہ تنہا ہوتے ہیں۔ اپنے شیطانوں (سرداروں) کے پاس، تو کہتے ہیں، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ بیشک ہم تو ہنسی کرتے ہیں ﴿۱۴﴾ اللہ ان کے ساتھ ہنسی کرتا ہے۔ اور مہلت دیتا ہے ان کو اُن کی سرکشی میں وہ سرگرداں ہوتے ہیں ﴿۱۵﴾ یہ وہی لوگ ہیں، جنہوں نے خریدا ہے گمراہی کو ہدایت کے بدلے۔ پس نہیں فائدہ دیا ان کو اُن کی تجارت نے۔ اور نہیں تھے یہ لوگ ہدایت پانے والے ﴿۱۶﴾

گذشتہ سے پیوستہ

ہدایت کے اعتبار سے تیسرا گروہ منافقین کا ہے۔ کل بھی ان کا ذکر ہوا تھا۔ اور آج کی آیات میں بھی منافقین کا ہی ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کی خرابیوں کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ پہلی آیات میں آیا تھا، کہ بعض لوگ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کی نفی فرما دی ہے۔ کہ یہ لوگ مومن نہیں ہیں۔ اللہ تعالےٰ

اور ایمانداروں دونوں سے دغابازی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو تو دھوکا نہیں دے سکتے اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو بھی ان کے دھوکے سے بچائے گا۔ کیونکہ ان کا دھوکا ان کی اپنی ہی جانوں پر ہے اور یہ ان باتوں کو سوچتے تک نہیں۔ ان کے دلوں میں شک، تردد اور نفاق کی بیماری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا ہے۔ اور ان کے لیے عذاب الیم ہے۔ کیونکہ یہ جھوٹ بولتے تھے ظاہر اسلام کرتے تھے مگر ان کے باطن میں کفر تھا۔ ان کی ایک اور بیماری فساد فی الارض تھی۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو، تو اکڑ جاتے اور کہتے کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ہمیں کوئی فسادی کیسے کہہ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہی لوگ فسادی ہیں مگر یہ سمجھتے نہیں۔

حقیقی ایمان

اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی ایک اور خرابی کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ جب ان منافقوں سے کہا جاتا ہے۔ کہ تم بھی اسی طرح ایمان لاؤ، جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں قَالُوْٓا۔ تو جواب میں کہتے ہیں اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح یہ بیوقوف ایمان لائے ہیں فرمایا اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ سن لو! بیوقوف خود وہی ہیں وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ مگر یہ جانتے نہیں۔

یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے۔ کہ منافقین تو برملا ایمان کا انکار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ بظاہر تو وہ ایمان لا چکے تھے۔ تو پھر وہ یوں کیسے کہہ سکتے تھے۔ کہ ہم بیوقوفوں کی طرح کیسے ایمان لائیں۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے۔ کہ ایسی بات وہ برملا مسلمانوں کے سامنے نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنے خاص معتمد آدمیوں کے روبرو کرتے تھے جنہیں اپنا رازداں سمجھتے تھے۔ کہ وہ ایسی بات کا برا نہیں منائیں گے۔

اس مقام پر ایک اور نکتہ قابل غور ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے۔ ایمان لاؤ، حالانکہ ایمان کا دعوے تو وہ پہلے ہی کر رہے ہیں۔ تو ایمان لانے کا مطلب یہ ہے۔ کہ محض زبانی طور پر ایمان نہ لاؤ بلکہ حقیقی اور صحیح ایمان لاؤ جیسے دوسرے مسلمان ایمان لائے ہیں۔ کیونکہ فلاح کا دارو مدار اسی ایمان پر ہے۔ لذات فانیہ۔ شہوات نفسانیہ ریاکاری، طلب جاہ وغیرہ حقیقی ایمان کی بدولت ہی دفع ہوتی ہیں۔ کسی باطل مقصد کے لیے خالی ایمان کا اظہار ہرگز مفید نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے فرمایا کہ حقیقی ایمان لاؤ۔ یعنی دل کی پوری تصدیق اور اخلاص کے ساتھ ایمان کو قبول

کرو۔ دوسرے مقام پر آتا ہے "یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا" اے ایمان والو! ایمان لاؤ یعنی محض زبانی کلامی ایمان کافی نہیں بلکہ حقیقی اور مخلصانہ ایمان اختیار کرو۔

اسی لیے منافقین سے کہا گیا ہے۔ کہ دوسرے لوگوں کی طرح ایمان لاؤ۔ وہ دوسرے لوگ کون ہیں۔؟ بلاشبہ وہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرام رضؓ ہیں۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اخلاص کے ساتھ ایمان لائے۔ ابن عساکرؒ جو بہت بڑے مؤرخ ہیں۔ انہوں نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے[1]۔ کہ آیت پاک کا مطلب یہ ہے۔ کہ تم اُس طرح ایمان لاؤ کَمَا اٰمَنَ اَبُوْبَکْرٍؓ وَعُمَرُؓ وَعُثْمَانُؓ وَعَلِیٌّؓ یعنی جس طرح حضرت ابوبکر صدیق رضؓ، حضرت عمر رضؓ، حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی رضؓ ایمان لائے ہیں، اس طریقے پر تم بھی ایمان لاؤ۔ ان کا ایمان خلوص اور حقیقت پر مبنی ہے۔ ان کے معیار پر پورے اترو محض زبانی دعوے سے بات نہیں بنے گی تم تو جھوٹے ہو "وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ" یہ لوگ قطعاً مومن نہیں ہیں۔

معیارِ حق

اسی سورۃ میں آگے چل کر یہودیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں "فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا" اگر یہ لوگ بھی تمہاری طرح ایمان لے آئیں۔ تو یہ بھی ہدایت پاجائیں گے۔ یہاں سے معیارِ حق ہونے والی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ کہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرام خصوصاً خلفائے راشدین معیارِ حق ہیں۔ یہ اصحاب کبار اگرچہ نبی کی طرح معصوم تو نہیں ہیں۔ مگر امت کے لیے نمونہ ہیں۔ وہ اپنے اخلاص اور حقیقی ایمان کی وجہ سے ان خرابیوں سے محفوظ تھے۔ جو ایمان کے باوجود انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور جن کی وجہ سے آدمی ناکام ہو جاتا ہے معیارِ حق اسی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر قرآن پاک میں فرمایا ہے۔ "لِتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَهِیْدًا" شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اس کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں[2] "تاکہ ہو جاؤ تم لوگوں کو بتانے والے اور معلم اور اللہ کا رسول تمہیں بتانے والا ہے۔"

---

[1] تفسیر درِ منثور ص۳ ج۱ بحوالہ ابن عساکر و تفسیر عزیزی فارسی پارہ ۱ ص۱۰۷
[2] قرآن مجید مترجم شاہ عبدالقادرؒ ص۲۶ مطبوعہ تاج کمپنی

گویا اللہ تعالےٰ نے صحابہ کرامؓ کو نمونے کی جماعت تیار کر کے اُن سے خدمت اسلام کا کام لیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے متعلق یہ بھی فرمایا[1] اَنْتُمْ شُھَدَاءُ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ خدا کی زمین پر تم اللہ کے گواہ ہو۔ یعنی جس کی اچھائی کی گواہی تم دو گے وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہوگا اور جس کی تم بُرائی کی گواہی دو گے وہ اللہ کے ہاں بھی بُرا ہوگا۔ اے صحابہ! تم اللہ کے گواہ ہو اور خصوصاً اے خلفائے راشدین! تم اللہ کے گواہ ہو۔ آپ نے یہ جملہ تین دفعہ فرمایا۔

ترمذی شریف کی روایت میں ہے[2]۔ کہ حضور علیہ السلام نے امیر المؤمنین عمر فاروقؓ کے متعلق فرمایا اِنَّ اللّٰہَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِہٖ یعنی اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کی زبان اور دل پر حق رکھ دیا ہے۔ یعنی وہ حق کے سوا کوئی بات نہیں کرتا۔ ظاہر ہے۔ کہ جس شخص کے قلب و زبان پر اللہ تعالیٰ نے حق رکھ دیا ہے، کیا وہ معیارِ حق نہ ہوگا؟

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت پہلے بیان ہو چکی ہے۔ کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ اور ان کے ساتھی ایمان لائے ہیں۔ ان کا ایمان حقیقی ایمان ہے۔ جو خلوص سے بھرپور ہے۔ ایسا ہی ایمان انسان کی فلاح کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

انسان اور اس کا دل

اَلنَّاس یعنی انسان اُنس کے مادے سے ہے۔ انسان اس لیے انسان ہے۔ کہ اس میں الفت اور مانوس ہونے کا مادہ پایا جاتا ہے۔ عربی میں اسے مَا سُمِّیَ الْاِنْسَانُ اِلَّا لِاُنْسِہٖ کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے قلب کو قلب اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اُلٹا ہوتا ہے مَا الْقَلْبُ اِلَّا اَنَّہٗ یَتَقَلَّبُ ایک تو یہ اپنی وضع کے اعتبار سے اُلٹا ہوتا ہے۔ یعنی اس کا پیندا اوپر اور سر نیچے ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ دل میں پلٹیاں آتی رہتی ہیں۔ اسی لیے تو اللہ تعالےٰ نے خبردار کیا "وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ" اللہ تعالیٰ انسان اور اس کے دل کے درمیان رکاوٹ ڈال دیتا ہے۔ اس لیے محتاط رہنا چاہیے۔ ذرا سی غلطی پر خدا تعالیٰ دل بدل سکتا ہے۔ اسی لیے دعا میں سکھایا گیا ہے[3]۔ یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ اے دلوں کو پلٹنے والے اللہ کریم! ہمارے دلوں کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھ۔ بہر حال انسان

---

[1] مسلم ص ۳۰۸ ج ۱ [2] ترمذی ص ۵۲۸ [3] ترمذی ص ۳۱۲

کو انسان اس لیے کہا جاتا ہے۔ کہ اس کے اندر اُنس کا مادہ ودیعت کیا گیا ہے۔

حقیقی انسان کون ہیں؟

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ یہاں پر ایک نکتہ بیان فرماتے ہیں[1] کہ اس مقام پر منافقوں کو کہا جا رہا ہے۔ کہ تم بھی اسی طرح ایمان لاؤ، جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان کہلانے کے وہی لوگ مستحق ہیں، جو حقیقی ایمان سے معمور ہیں۔ یہی لوگ انسانیت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں، اور انہی کی وجہ سے دنیا کا نظام درست رہتا ہے۔ جو لوگ حقیقی ایمان سے محروم ہیں۔ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ ط" یہ تو جانوروں کی مانند ہیں یا ان سے بھی بدتر۔ یہ انسان کہلانے کے حقدار نہیں ہیں۔ یہ لوگ جانوروں کی طرح کھانے پینے اور جفتی کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ لہٰذا حقیقی انسان وہ ہیں، جو حقیقی ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں۔

بیوقوف کون ہیں؟

پہلے گذر چکا ہے۔ کہ جب اُن سے کہا جاتا ہے۔ کہ دوسرے لوگوں کی طرح راسخ ایمان لاؤ۔ تو وہ کہتے ہیں۔ کہ کیا ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں حالانکہ حقیقت میں منافق ہی بیوقوف ہیں۔ مگر انہیں علم نہیں۔ یہ لوگ ایمانداروں کو اس لیے بیوقوف سمجھتے ہیں۔ کہ یہ دنیا کے نقد سودے کو چھوڑ کر آخرت کی فکر کرتے ہیں۔ اس کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ مگر وہ بیوقوف یہ بات نہیں سمجھتے کہ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان نقصان سے بچ جائے اور فائدہ حاصل کرے ایماندار دنیا کے اس عارضی فائدے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آخرت کے ابدی فائدے کو حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا صحیح معنوں میں عقلمند یہی ہیں اور منافق بیوقوف ہیں۔ جو آخرت کو چھوڑ کر یعنی حقیقی اور ابدی فائدہ کی بجائے دنیا کا عارضی اور فانی فائدہ تلاش کرتے ہیں۔ مگر یہ اپنے آپ کو عقلمند سمجھتے ہیں۔ اور دوسروں کو بیوقوف جانتے ہیں۔ اور اس طرح اس فریب سے دنیا کا مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَآءُ حقیقت میں یہی بیوقوف ہیں وَلٰکِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ مگر یہ حقیقت حال کو نہیں جانتے۔

منافقوں کی دورخی پالیسی

اللہ تعالیٰ نے منافقوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے فرمایا وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی پارہ ا صـ۱۰۱

جب یہ ایمانداروں سے ملتے ہیں تو خوشامد کرتے ہیں قَالُوْٓا اٰمَنَّا ج کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لے آئے ہیں۔ تاکہ مسلمان انہیں اپنی پارٹی کے آدمی سمجھیں مگر حقیقت یہ ہے وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ جب یہ اپنے شیطانوں کے پاس جاتے ہیں۔ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ یہ تو ہم مسلمانوں کا محض تمسخر اڑا رہے ہیں۔ گویا ہم ان کی حمایت کا دعویٰ کر کے انہیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ یہاں پر شیاطین سے مراد منافقوں کے بڑے بڑے سردار اور سرغنے ہیں۔ جو نفاق کے پروگرام کے بانی تھے۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ تبلیغی نقطہ نظر سے ان لوگوں کو بیوقوف یا شیطان کا لقب دینا کسی قدر زیادتی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو یہ القاب اس وقت دیے گئے ہیں۔ جب تبلیغ کے تمام تقاضے پورے ہو چکے ہیں۔ اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنی کرتوتوں سے باز آنے والے نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تبلیغ کے ابتدائی دور میں اس قسم کے القاب دینا درست نہیں مگر اتمام حجت کے بعد ایسا کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں

استہزاء من اللہ کا مفہوم۔

منافقین نے کہا تھا کہ مسلمانوں کا تمسخر اڑا رہے ہیں تو اس کے جواب میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہنسی کرتا ہے وَيَمُدُّهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ اور مہلت دیتا ہے، ان کی سرکشی میں يَعْمَهُوْنَ وہ اندھے اور سرگرداں ہو رہے ہیں۔ یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کسی کے ساتھ ہنسی کرنا، اس کا تمسخر اڑانا تو فعل عبث اور ناجائز ہے۔ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام عیوب سے مبرا ہے۔ اس کے جواب میں بعض مفسرین فرماتے ہیں[1] کہ یہ استہزاء نہیں بلکہ مشاکلت ہے۔ یعنی جو سلوک منافقین نے مسلمانوں کے ساتھ کیا، ویسا ہی سلوک اللہ تعالےٰ نے ان کے لیے پسند کیا۔ اس قسم کی مثالیں دوسرے مقامات پر بھی ملتی ہیں۔ مثلاً "جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ" برائی کی جزا برائی ہے حالانکہ جزا تو عدل کا نام ہے۔ اور عدل برائی نہیں ہوتی۔ تو یہاں پر بھی مراد یہی ہے۔ کہ جیسا سوال ہے اس کا ہم شکل جواب ہے۔ یہی بات ہے" وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا" میں

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۵۱ ج ۱، معالم التنزیل ص ۱۶ ج ۱، روح المعانی ص ۱۵۸ ج ۱

بھی پائی جاتی ہے۔ یہ عربی زبان کی لطافت، بلاغت اور فصاحت ہے۔ اور اسے مشاکلت کہتے ہیں

اس طرز کلام کا دوسرا مطلب یہ ہے۔ کہ منافقین کے استہزاء کا نقصان انہی کی طرف لوٹتا ہے۔ اللہ خود ٹھٹھا نہیں کرتا بلکہ منافقین کے تمسخر کا ضرر خود انہی کی طرف جاتا ہے۔ وہ خدا کو کیا ضرر پہنچا سکیں گے۔ نبی علیہ السلام اور مومنین کو اللہ تعالیٰ ان کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ مومنین کو منافقین کی چالوں سے آگاہ کر دے گا، تاکہ وہ انکے ضرر سے بچ سکیں اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ کا یہی مطلب ہے۔ استہزاء منجانب اللہ کا ایک اور مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ منافقین کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہے۔ جیسا ٹھٹھا مذاق کرنے والوں کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ جو منافقین محض زبانی دعوے کی بنا پر جماعت المسلمین میں شریک ہوتے ہیں اور مفاد حاصل کرتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ بھی کہتا ہے۔ اچھا ان کو ایسا کرنے دو۔ وہ نمازیں پڑھیں، صدقہ دیں، جہاد میں شرکت کریں۔ مگر ان کا کوئی عمل قبول نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ دل سے تو ایمان لائے نہیں لہٰذا ان کے ساتھ بھی وہی سلوک ہو گا جو مذاق کرنے والے کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ یہ بھی گویا ان کے ساتھ ایک قسم کا تمسخر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت[1] سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قیامت کے دن منافقین دوزخ کے گڑھے میں پہنچ جائیں گے۔ تو جنت کا دروازہ کھولا جائے گا۔ گویا انہیں جنت میں جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ جنتی ان منافقوں کی طرف دیکھیں گے، تو وہ محسوس کریں گے کہ واقعی انہیں جنت میں داخلے کی اجازت مل گئی ہے۔ چنانچہ وہ دوڑ کر جنت کے دروازے پر پہنچیں گے مگر اتنے میں دروازہ بند ہو جائے گا۔ اور منافق نامراد رہ جائیں گے۔ اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ کی یہ بھی ایک صورت ہے۔ یہ لوگ اس دنیا میں اس قسم کی چالاکی کر رہے ہیں، تو کل قیامت کے دن ان کے ساتھ بھی تمسخر ہوگا۔

گائے کا واقعہ اس سورۃ میں آ رہا ہے۔ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہمارا آدمی قتل ہو گیا۔ مگر قاتل کا پتہ نہیں چلتا تو موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا کہ گائے ذبح کریں، تو اس

---

[1] معالم التنزیل ص ۱۶ ج ۱، تفسیر خازن ص ۲۵ ج ۱

موقع پر ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کیا آپ ہمارے ساتھ ٹھٹھا کرتے ہیں۔ تو آپ نے جواب دیا" اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ" میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں تم سے ٹھٹھا کر کے جاہلوں میں شمار ہو جاؤں۔ خدا کے بندو! میں تو اللہ کا حکم تم کو سنا رہا ہوں کہ گائے ذبح کرو۔ اس کے گوشت کا ٹکڑا مردے پہ مارو۔ تو قاتل کا پتہ چل جائے گا۔ میں تم سے ٹھٹھا نہیں کر رہا ہوں۔

الغرض! فرمایا، اللہ تعالیٰ اُن کی سرکشی میں ان کو مہلت دیتا ہے۔ اور وہ اندھے ہو رہے ہیں یہاں پر یَعْمَھُوْنَ سے مراد دل کا اندھا ہونا ہے۔ جیسا کہ سورۃ حج میں ہے۔ کہ دیکھو ظاہری آنکھیں اکثر اندھی نہیں ہوتیں" تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ" وہ دل اندھے ہوتے ہیں۔ جو سینوں میں موجود ہیں۔ نہ وہ صحیح بات کو دیکھتے ہیں نہ اُسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے پہلی آیت میں کافروں کے دلوں پر مہر لگانے کا بھی ذکر آیا ہے۔ آگے اُن کی مثالیں بھی آ رہی ہیں۔

ہدایت کے بدلے گمراہی

فرمایا اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْھُدٰی یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لیا ہے گمراہی کو ہدایت کے بدلے میں۔ ظاہر میں انہوں نے زبان سے یہی کہا تھا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ مگر افسوس کہ اس ہدایت کو چھوڑ کر انہوں نے باطن کی بدعقیدگی اور گمراہی کو اختیار کیا فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُھُمْ پس ان کی تجارت نے ان کو کوئی فائدہ نہ دیا وَمَا کَانُوْا مُھْتَدِیْنَ اور نہیں تھے وہ ہدایت یافتہ۔

یہ تجارت کا لفظ بھی بڑا معنی خیز ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1] اللہ تعالیٰ جب انسان کو دنیا میں بھیجتا ہے۔ تو عمر اور تمام اسباب دیکر بھیجتا ہے۔ کہ یہ تمہاری پونجی ہے۔ اس کے ساتھ اعمال خرید لو۔ اس سے تمہیں آخرت کی دائمی زندگی میں فائدہ پہنچے گا۔ عمر کی یہ پونجی برف کی مانند ہے۔ اُوپر سے بھادوں کی تپش پڑ رہی ہے۔ اور یہ برف پگھلتی جا رہی ہے۔ اگر اس کے پگھلنے سے پہلے اس سے قیمتی اشیاء ایمان اور اعمال صالحہ خرید لوگے۔ تو یہ عمر

[1] تفسیر عزیزی فارسی صـ ۱۰۹ پارہ ۱

کی پونجی ٹھکانے لگے گی۔ اور تم ہمیشہ کے لیے راحت پاؤ گے۔ اور اگر تم نے عمر عزیز کے بدلے کفر، شرک، بدعقیدگی، معاصی اور لہو و لعب خریدا، تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خسارے میں مبتلا ہو جاؤ گے، اسی لیے فرمایا کہ منافقین کی تجارت نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ اس کی ایک اور مثال ایسی ہے کہ انسان تریاق کے بدلے زہر ہلاہل خریدے۔ اگر تریاق حاصل کر لیا تو ہر قسم کی تکلیف سے بچ جائے گا۔ زندگی آسودہ ہو جائے گی۔ اور اگر خدانخواستہ اس نے زہر کو پسند کیا۔ تو تباہ ہو جائے گا۔ اس قسم کی تجارت نے کوئی نفع نہ دیا۔ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ اور یہ لوگ ہدایت یافتہ نہ تھے۔ بلکہ ابدی خسارے میں مبتلا ہوئے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی بعض خرابیاں بیان فرمائی ہیں۔ اگلی آیات میں مثال کے ذریعے ان کی مزید خرابیاں اور ان کا انجام بیان فرمایا۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ
مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا
يُبْصِرُونَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿۱۸﴾

ترجمہ:- اِن منافقوں کی مثال اُس شخص جیسی ہے جس نے آگ جلائی۔ جب آگ نے اس کے ـــــ آس پاس کو روشن کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی روشنی زائل کر دی اور اُن کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ بھی نہیں دیکھتے ﴿۱۷﴾ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، پس وہ نہیں لوٹیں گے ﴿۱۸﴾

گذشتہ سے پیوستہ

بدبختی اور شقاوت کے لحاظ سے دوسرا گروہ منافقین کا ہے اللہ تعالیٰ نے منافقین کا حال بیان فرمایا ہے۔ کہ ان کا کام جھوٹ بولنا، فریب دینا، زمین میں فساد کرنا ہے وہ ایمانداروں کو بیوقوف کہتے تھے۔ اور اپنے آپ کو اصلاح کرنے والے سمجھتے تھے۔ جب انہیں حقیقی مومنوں کی طرح ایمان لانے کی دعوت دی جاتی تو کہتے کہ ہم بے وقوفوں کی طرح کیوں ایمان لائیں۔ مسلمانوں کی جماعت کے روبرو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے۔ تاکہ اُن کی جان و مال محفوظ رہے۔ اور اُن کے حقوق کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ مگر جب اپنے سرداروں کے پاس جاتے تو کہتے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تو مسلمانوں کے ساتھ تمسخر اور ہنسی کرتے ہیں حقیقت میں ہم اُن کے ساتھ نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کی ایک نشانی یہ بھی بتائی۔ کہ انہوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی کو خریدا۔ اور اس تجارت نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ بلکہ ایسے لوگ ابدی نقصان میں مبتلا رہے۔

کتب آسمانی اور امثلہ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے منافقین کی دو مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ جن سے منافقوں کے حالات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ کسی مسئلہ میں مثال بیان کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ معاملہ واضح اور قریب الفہم ہو جائے۔ جو چیز غامض اور باریک ہو اُسے واضح کر دیا جائے۔ ایسی مثالیں تمام آسمانی کتب میں بیان

کی گئی ہیں۔ توراۃ، زبور اور انجیل میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے صحیفہ اور دیگر تمام آسمانی صحیفوں میں مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ خود قرآن پاک میں ہزاروں مثالیں موجود ہیں، جن سے بات کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کا اپنا بیان ہے "وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ" یعنی ہماری ان مثالوں سے اہل علم ہی صحیح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور مقصد کو پا لیتے ہیں۔

شیخ ابوبکر ابن العربی مالکیؒ نے تفسیر احکام القرآن مکمل کی ہے۔ آپ کی تفسیر میں تین چار کتابیں ہیں۔ حدیث کی شروحات، فتوی، نحو اور دوسرے علوم وفنون میں بھی بے شمار کتابیں ہیں وہ فرماتے ہیں۔ کہ صرف سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار مثالیں بیان کی ہیں۔ گویا قرآن کریم، دیگر آسمانی کتب اور تمام حکماء کے کلام میں مثالیں موجود ہیں۔ حضرت لقمانؒ ان کی طرف منسوب کتب، نیز ہر زبان کے فصیح و بلیغ لوگوں کے کلام میں مثالیں پائی جاتی ہیں۔

تفاسیر احکام القرآن

احکام القرآن کے نام سے بہت سے مفسرین نے کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں قرآن پاک کی صرف انہیں آیات کی تفسیر و تشریح کی گئی ہے۔ جن میں حلال و حرام کے احکام بیان ہوئے ان میں سب سے اہم کتاب ابوبکر جصاص رازیؒ کی احکام القرآن ہے۔ دوسرے نمبر پر ابوبکر ابن العربی اندلسیؒ ہیں۔ آپ کی احکام القرآن مالکی مسلک کے مطابق ہے۔ اسی طرح کشف و تصوف کے بہت بڑے امام شیخ ابن عربیؒ کی تفسیر احکام القرآن ہے۔ اس میں زیادہ تر تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ امام جلال الدین سیوطیؒ نے بھی ایک چھوٹی سی تفسیر لکھی ہے جس کا نام اکلیل فی استنباط التنزیل ہے۔ اس میں قرآن کریم کی اُن آیات کی مختصر تفسیر ہے۔ جن سے احکام مستنبط ہوتے ہیں۔ آپ نویں اور دسویں صدی کے حافظ الحدیث ہوئے ہیں۔ عمر بھی کوئی زیادہ نہیں پائی۔ باسٹھ ۶۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ مگر پانچسو ۵۰۰ کتابوں کے مصنف ہیں، آپ کے بعد کوئی حافظ الحدیث نہیں ہوا۔ حافظ الحدیث وہ بلند پایہ ہستی ہوتی ہے۔ جسے ایک لاکھ حدیث مع سند زبانی یاد ہو۔

آپ کے بعد بڑے بڑے محدثین ہوئے ہیں۔ مگر حافظ الحدیث کوئی نہیں ہوا۔ البتہ

لے

آپ سے پہلے ہزاروں کی تعداد میں حافظ الحدیث گذرے ہیں۔ جن میں بخاری شریف کے شارح ابن حجر شافعیؒ اور علامہ عینی حنفیؒ وغیرہ ہیں۔ اسی طرح صحاحِ ستہ کے تمام مؤلفین حفاظ حدیث تھے۔ انکو کم از کم ایک لاکھ حدیث بمع سند اور رجال کے زبانی یاد تھی۔

مثال کی حکمت

الغرض مثال بیان کرنے کی حکمت یہ ہوتی ہے۔ کہ کسی باریک چیز کو انسانوں کے ذہن کے قریب تر کر دیا جائے۔ اور عقلی چیز کو محسوس بنا دیا جائے۔ مثال کے ذریعے کہیں کسی چیز سے نفرت دلانا مقصود ہوتا ہے، تو کہیں کسی چیز کو ثابت کرنا مطلوب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہودیوں کی بُرائی اور قباحت اس طرح بیان فرمائی ہے" مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا"[ط] حاملین توراۃ نے توراۃ کو بگاڑ دیا۔ انہوں نے اُسے اس طرح نہ اٹھایا۔ جس طرح اٹھانے کا حق تھا۔ تو اُن کی مثال گدھے کی سی ہے، جس پر کتابوں کا دفتر لاد دیا گیا ہو۔ جو اُن سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ گدھے کو علم ہی نہیں کہ اس کی پشت پر کتابوں کا بوجھ ہے یا لکڑیوں کا گٹھا۔ تو یہی مثال اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی بیان فرمائی۔ کہ توراۃ کے حاملین ہونے کے باوجود اس سے مستفید نہیں ہو سکے۔

منافقین کی مثال

منافقین کی دو مثالوں میں پہلی مثال آج کے درس میں بیان ہوئی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[۱]۔ کہ یہ مثال اُن منافقوں کے بارے میں ہے جن کے دل میں کفر پختہ ہو چکا ہے۔ اور دوسری مثال جو آگے آ رہی ہے، اُن منافقوں کے متعلق ہے جو ابھی متردد ہیں اور شک میں مبتلا ہیں۔ الغرض! اس پہلی مثال کے مصداق پختہ کفر والے منافقین ہیں۔ جن کے ہدایت پانے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اور جن کے متعلق پہلی آیات میں گذر چکا ہے کہ انہوں نے اپنی کوتاہ نظری اور غلط فہمی کی بنا پر ہدایت کے بدلے میں گمراہی کو خرید لیا۔

فرمایا مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ج ان منافقوں کی مثال اس شخص کی طرح ہے۔ جس نے جنگل میں سخت اندھیرے کی حالت میں آگ جلائی۔ تاکہ اس سے روشنی اور گرمی حاصل کرلے۔ یہ دونوں چیزیں ضروریات زندگی میں سے ہیں جن کے بغیر گذارا نہیں۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ص ۵۶ ج ۱

چنانچہ ان منافقوں نے بھی اپنی فطری استعداد کے مطابق اپنے اندر ایمان کی شمع روشن کی۔ اور پیغمبر علیہ السلام کی صحبت اختیار کی ان لوگوں نے اہل ایمان کی رفاقت بھی حاصل کی۔ اور زبان سے اقرار کیا" اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ ایمان کی اس روشنی سے اُن پر تمام حقائق روشن ہو جاتے۔ مگر انہوں نے تو صحیح معنوں میں ایمان قبول ہی نہیں کیا تھا۔ محض وقتی مفاد حاصل کرنے کی خاطر ایمان کا دعویٰ کیا تھا۔ اگر وہ دل سے نورِ ایمان کی آگ کو روشن کرتے۔ تو ان میں اطاعتِ الٰہی کا جذبہ پیدا ہوتا۔ اور ان کے دل میں ذکرِ الٰہی کا شوق پیدا ہوتا۔ اُن کے دل بھی توحید خالص سے منور ہو جاتے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ تو وقتی طور پر ایمان کا اعلان کر کے اپنے مال و جان کی حفاظت چاہتے تھے۔ کیونکہ اسلام کا قانون یہ ہے مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَقَدْ عَصَمَ مِنِّيْ مَالَهٗ وَنَفْسَهٗ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے زبان سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا اقرار کر لیا اس کا جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ ہو گئی۔ اسی لیے یہ منافقین اپنی فطری صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے زبانی ایمان لے آئے، ان کا یہ ایمان لانا گویا جنگل کے اندھیرے میں آگ جلانے کے مترادف تھا۔

فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ جب اُس آگ نے آگ جلانے والے شخص کے ارد گرد کو روشن کر دیا۔ اُسے تھوڑا بہت گرد و پیش کا پتہ چل گیا۔ تو پھر کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس آگ کو بجھا دیا۔ یہاں پر اَطْفَاَهَا اللّٰهُ محذوف ہے۔ اس طرح کہ موت طاری ہو گئی۔ جب وہ آگ بجھ گئی جس کی روشنی میں یہ لوگ اپنی جان و مال کی حفاظت کر رہے تھے۔ تو پھر ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ اللہ تعالیٰ ان کی روشنی کو لے گیا۔ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ اور انہیں بے پناہ اندھیروں میں چھوڑ دیا، پھر اُن کی حالت یہ ہو گئی کہ لَا يُبْصِرُوْنَ کچھ بھی دیکھ نہیں سکتے۔ روشنی تو عارضی تھی جب وہ منقطع ہو گئی۔ تو وہ اپنی اختیار کردہ برائیوں کے اتھاہ اندھیروں میں گم ہو گئے۔

اندھیروں کی مختلف قسمیں

اس مقام پر جن اندھیروں کا ذکر ہے۔ اور جن میں منافقین سرگرداں ہیں اُن کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اور وہ ساری کی ساری منافقین کی جماعت پر صادق آتی ہیں۔

---

[1] مسلم ص ۳۷ ج ۱

سب سے پہلا اندھیرا کفر کا ہے۔ یہ لوگ صرف زبان سے ایمان کا اقرار کرتے تھے مگر ان کے باطن میں کفر کا اندھیرا بھرا ہوا تھا۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے "اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ" یعنی اللہ تعالیٰ ایمانداروں کا ولی اور کارساز ہے وہ انہیں اندھیروں سے نکال کر ایمان اور ہدایت کی روشنی کی طرف لاتا ہے۔ جس کی وجہ سے دل میں روشنی اور بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ روشنی آگے چل کر حقیقی روشنی میں تبدیل ہو جائے گی۔

فرمایا دوسرا اندھیرا جو منافقین میں پایا جاتا ہے۔ وہ مکر و فریب کا اندھیرا ہے۔ "يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" یہ وہی دھوکے اور فریب کا اندھیرا ہے۔ جو وہ اہل ایمان کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔

اسی طرح تیسرا اندھیرا دروغ گوئی افترا کا ہے۔ جیسا فرمایا "بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ" یہ کہتے ہیں ہم مومن ہیں۔ حالانکہ یہ صریح جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ لوگ ہرگز مومن نہیں۔ ان کے دل میں کفر رچا ہوا ہے۔ لہٰذا یہ ایمان کے دعوے میں جھوٹے ہیں۔

منافقین کا چوتھا اندھیرا طعن و تشنیع کا اندھیرا ہے۔ یہ لوگ اہل ایمان کو احمق اور بیوقوف کہتے تھے۔ حالانکہ ایمان والے آخرت کے طلبگار ہیں۔ انہوں نے دنیا کو چھوڑ کر آخرت کو اختیار کیا ہے۔ مگر منافق اُن کو بیوقوفی کا طعنہ دیتے ہیں، یہ ان کا چوتھا اندھیرا ہے۔

جہالت دو قسم کی ہے۔ جہل بسیط اور جہل مرکب۔ کوئی شخص کسی چیز سے ناواقف ہو یہ جہل بسیط ہے۔ جب کبھی ایسا شخص متعلقہ چیز سے واقفیت حاصل کر لے گا، وہ اس جہل سے نکل جائے گا۔ دوسری قسم کا جہل، جہل مرکب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان غلط بات کو صحیح سمجھنے لگے۔ بُرے عقیدے کو اچھا خیال کرے۔ یہ بہت خطرناک جہالت ہے کیونکہ اس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ ایسا شخص نہ غلط کو غلط سمجھے گا اور نہ وہ اس جہالت سے نکلے گا۔

منافقین کا پانچواں اندھیرا یہی جہل مرکب ہے۔ وہ اپنے دھوکے اور فریب کو بڑا اچھا سمجھ رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو دھوکا دے رہے ہیں۔ حالانکہ وہ پانچویں قسم کے اس اندھیرے میں مبتلا ہیں۔

چھٹا اندھیرا معاصی اور شہوات کا اندھیرا ہے۔ اطاعت روشنی ہے اور معاصی اندھیرے ہیں جن خواہشات کی تکمیل میں یہ لوگ سرگرداں ہیں۔ وہ اندھیرا ہی اندھیرا ہیں۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1]۔ ساتواں اندھیرا قبر کا اندھیرا ہے۔ مسلم شریف، کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے[2]۔ اِنَّ ھٰذِہِ الْقُبُوْرَ مَمْلُوْءَۃٌ ظُلْمَۃً عَلٰی اَھْلِھَا یہ قبریں اپنے مکینوں کے لیے اندھیروں سے بھری پڑی ہیں۔ ہاں جو شخص اپنے دل میں نورِ ایمان رکھتا ہوگا۔ اس کو وہاں بھی روشنی میسّر ہوگی۔ جس نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر نماز پڑھی اس کی قبر میں روشنی ہوگی۔ ایمان والوں کے دل سے روشنی کی لاٹ نکلے گی، نیز ان کے اعمال صالحہ کی روشنی انہیں حاصل ہوگی۔

بخاری شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے[3] اَلظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اس دنیا میں کسی پر کیا گیا ظلم قیامت کے دن اندھیروں کی شکل میں سامنے آئے گا۔ یہ قبر میں جاکر پتہ چلے گا۔ کہ ظلم کا اندھیرا کس قدر شدید ہے۔ پل صراط سے گزرتے وقت حشر کے میدان میں اور پھر دوزخ کی گہرائیوں میں اندھیروں کا احساس ہوگا۔ الغرض! یہ تمام اندھیرے ہیں جو منافقین پر وارد ہوں گے۔ اور یہ لوگ غضب الٰہی کا شکار ہوں گے۔

منافقین کی بدبختی

ان لوگوں کی بدنصیبی کی حالت یہ ہے کہ صُمٌّ یہ بہرے ہیں۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو اس قدر خراب کر لیا ہے۔ کہ صحیح بات کو سننے کے لیے تیار نہیں۔ یہ لوگ اس بدبختی کی بنا پر بُکْمٌ یعنی گونگے ہیں۔ ان کی زبان سے کبھی سچی بات نہیں نکلتی۔ دھوکے فریب اور جھوٹ کے سوا ان کی زبان پر کچھ نہیں آتا۔ پھر یہ بھی ہے۔ کہ یہ لوگ حسن و قبح میں، اچھائی اور برائی میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے یہ لوگ عُمْیٌ یعنی اندھے بھی ہیں۔ ان کی ظاہری آنکھیں تو موجود ہیں، مگر ان کے دل اندھے ہیں۔ جو حق و باطل میں فرق نہیں کر سکتے۔ ایمان و شرک، سنت اور بدعت ان کے نزدیک برابر ہیں۔ ان کے نزدیک ان میں کوئی امتیاز نہیں۔

فرمایا یہ لوگ کفر و شرک اور معاصی میں اس قدر آگے نکل چکے ہیں۔ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ کہ اب ان کے نیکی کی طرف واپس پلٹ آنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ نے پچھے منافقوں کا یہ حال بیان فرما دیا۔

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۱۱۰ پارہ ۱، [2] مسلم صفحہ ۳۱۰ ج ۱، [3] بخاری صفحہ ۳۳۱ ج ۱

لَا يَرْجِعُوْنَ کا معنیٰ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ جو شخص مر گیا اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ کہ واپس آکر کوئی نئی کمائی کر لے گا۔ انسان جو اعمال دنیوی زندگی میں کما گیا۔ ان میں تغیر تبدل نہیں ہو سکے گا۔ دنیا میں تو کئی چیزیں منسوخ بھی کر دی جاتی ہیں۔ مگر آخرت میں پہنچ کر دنیا میں کیے گئے اعمال میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہو سکے گا۔ اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے۔" وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ" ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لٹکا دیا جاتا ہے اور پھر مرنے کے بعد "وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا" قیامت کے دن ہم نکال کر سامنے کر دیں گے۔ کہ یہ تیرا اعمال نامہ ہے۔ لو خود پڑھ لو۔ لطف یہ ہے۔ کہ پڑھنے کی صلاحیت بھی اُس وقت پیدا ہو جائے گی اللہ تعالیٰ فرمائیں گے لو خود پڑھ لو۔ الغرض فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ کا مطلب یہی ہے۔ کہ یہ پلٹ کر نہ ہدایت کی طرف آسکتے ہیں۔ اور نہ ہی دنیا کی طرف آسکتے ہیں۔ اور نہ ہی کوئی کمائی کر سکیں گے۔ یہ اُن منافقوں کا حال ہے جن کے دل کفر میں راسخ ہو چکے ہیں۔

درس نہم ۹ (آیت ۱۹ تا ۲۰)

اَوۡ کَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیۡہِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعۡدٌ وَّبَرۡقٌ ۚ یَجۡعَلُوۡنَ
اَصَابِعَهُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِهِمۡ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الۡمَوۡتِ ؕ وَاللّٰهُ
مُحِیۡطٌۢ بِالۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۹﴾ یَکَادُ الۡبَرۡقُ یَخۡطَفُ اَبۡصَارَهُمۡ ؕ
کُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمۡ مَّشَوۡا فِیۡهِ ۙ وَاِذَاۤ اَظۡلَمَ عَلَیۡهِمۡ قَامُوۡا ؕ
وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمۡعِهِمۡ وَاَبۡصَارِهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۰﴾ ع ۲ ۱۳ ۲

ترجمہ: یا ان کی مثال آسمان کی طرف سے اُترنے والی اُس بارش کی ہے۔ جس میں تاریکیاں، گرج اور بجلی کی چمک ہے۔ یہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈالتے ہیں۔ بادل کی کڑک سے موت کے ڈر سے۔ اور اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے ﴿۱۹﴾ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں کو اچک لے۔ جب وہ ان کے لیے روشنی کرتی ہے۔ تو اس میں چلتے ہیں۔ اور جب ان پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر اللہ تعالےٰ چاہے تو ان کے کانوں اور آنکھوں کو لے جائے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ﴿۲۰﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اللہ تعالیٰ نے منافقین کی برائی میں دو مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ پہلی مثال گذشتہ درس میں گذر چکی ہے کہ منافقوں کی مثال اس شخص جیسی ہے۔ جس نے جنگل میں آگ جلائی ہو۔ اور جب اُس نے ارد گرد کو روشن کر دیا۔ تو اللہ تعالےٰ اس کی روشنی کو لے گیا۔ اور آگ کو بجھا دیا۔ منافقین کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں پس وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

یہ پہلی قسم کے وہ منافق ہیں، جو اپنے نفاق میں پختہ ہیں اور جہل مرکب میں مبتلا ہیں۔ ان کی اصلاح کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ کیونکہ وہ غلط بات کو صحیح سمجھ رہے ہیں۔ ایسے لوگ محض چال بازی اور فریب کاری کی بنا پر کلمہ اسلام پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالےٰ

اور قیامت پر ایمان لے آئے ہیں۔ حالانکہ ان کے اندر ایمان کا شائبہ تک نہیں۔

منافقوں کی دوسری مثال

دوسری مثال اللہ تعالے نے ان منافقین کی بیان کی ہے جن کا کفر راسخ نہیں ہے، بلکہ وہ لوگ متردّد ہیں۔ ان کا رحجان کبھی اسلام کی طرف ہوتا ہے، اور کبھی باطل عقیدے کی طرف تو ایسے لوگوں کی تشبیہ اللہ تعالیٰ نے بارش کے ساتھ دی ہے۔ جس طرح بارش کے نتیجے میں بہت سی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، اسی طرح ظہورِ اسلام کے ساتھ منافقین کے لیے بھی کئی ایک چیزیں پیدا ہوئی ہیں۔ تو یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر فرمایا ہے۔ اور ان متردّد قسم کے لوگوں کے متعلق فرمایا کہ ان کی طرف سے بالکل مایوسی نہیں ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے۔ کہ کسی وقت ان کے ذہن میں صحیح چیز آجائے۔ اور یہ نفاق سے باز آجائیں۔

اعتقادی اور عملی منافق

حدیث پاک میں آتا ہے[1] کہ اعتقادی منافق کفر ہی کی ایک قبیل سے ہے۔ بلکہ کفار میں سے بھی بدترین قسم کا کافر ہے۔

منافق کی ایک اور قسم عملی منافق ہے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں۔ کہ دل میں نورِ ایمان موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، پیغمبر علیہ السلام کی رسالت اور قیامت پر ایمان ہے۔ مگر ظاہر اور باطن میں مطابقت نہیں پائی جاتی۔ حضور علیہ السلام نے عملی منافق کی بہت سی نشانیاں بتائی ہیں[2] مثلاً اِذَا اُؤْتُمِنَ خَانَ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرتا ہے۔ اِذَا خَاصَمَ فَجَرَ جب کسی سے جھگڑا کرتا ہے۔ تو گالی گلوچ پر اتر آتا ہے۔ اور اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ جب وعدہ کرتا ہے، تو خلاف ورزی کرتا ہے ایسا شخص اعتقادی نہیں بلکہ عملی منافق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عاید کردہ فرائض نماز، روزہ وغیرہ کو فرض سمجھتے ہوئے انہیں بجا نہیں لاتا۔ ایسے عملی منافقوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔

دل کی چار قسمیں

مسند احمد کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی[3] ہے۔ اَلْقُلُوْبُ اَرْبَعَۃٌ یعنی دل چار قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے متعلق فرمایا قَلْبٌ اَجْرَدُ ایسا دل جو صاف و شفاف ہو۔ فرمایا اس کی مثال روشن چراغ جیسی ہے۔ جس میں کسی قسم کی کوئی خرابی نہ ہو۔

---

[1] ۳۶۹/۲   [2] بخاری صفحہ ۱۰/ج ۱، مسلم صفحہ ۵۶/ج ۱   [3] مسند احمد صفحہ ۱۷/ج ۳

دوسرا دل اَغلف ہے۔ جو غلاف میں بند کر دیا گیا ہو اور پھر اوپر سے دھاگے کے ساتھ باندھ دیا گیا ہو۔ فرمایا تیسری قسم کا دِل معکوس ہے یعنی اُوندھا ہے۔ اس کا سر نیچے اور پیندا اوپر ہے۔ اور چوتھی قسم کا دِل مصفح ہے۔ یعنی دو پہلو والا دِل۔

پہلی قسم کے دِل کے متعلق فرمایا۔ کہ صاف و شفاف دِل مومن کا دل ہے۔ جس میں نورِ ایمان بالکل صاف اور واضح ہے۔ اس میں کوئی خرابی یا کسی قسم کی ملاوٹ نہیں ہوتی۔ غلاف میں بند دِل کے متعلق فرمایا، یہ کافر کا دِل ہے امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کسی پرندے کو ایسے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو، جس میں کوئی سوراخ نہ ہو۔ ایسا دل کافر، مشرک یا دہریے کا ہوتا ہے۔ جس میں سے باہر دیکھنے کے لیے سوئی کے برابر بھی سوراخ نہ ہو۔ کہ وہ اپنے خول سے باہر حق کی بات کو دیکھ سکے۔ فرمایا اوندھا دِل منافق کا دِل ہے۔ جس نے ایمان کو پہچان تو لیا ہے مگر قبول نہیں کیا۔ محض اپنے بچاؤ کی خاطر کوئی فریب کاری کی ہے۔ مگر ہے پکّا منافق۔ رہا پہلو دار دِل، تو وہ ایسا ہے، جس میں ایمان بھی ہے اور نفاق بھی۔ یہ عملی منافق ہے۔ جسے کسی حد تک یقین بھی ہوتا ہے۔ اور کبھی متردد بھی ہوتا ہے۔

ایمان اور نفاق کی مثال

حضور علیہ السلام نے فرمایا[1] ایمان کی مثال كَمَثَلِ الْبَقْلَةِ يَمُدُّهَا الْمَاءُ الطَّيِّبُ اُس پودے کی ہے، جسے پاکیزہ پانی سیراب کرتا ہو۔ پودے کا بیج اچھا ہو، اُس کی آبیاری بھی صاف پانی سے ہو، تو ظاہر ہے کہ اُس کی نشو و نما بھی اچھی ہوگی۔ نیز فرمایا کہ منافق کی مثال انسانی جسم میں پیدا ہونے والے پھوڑے کی سی ہے۔ ایک طرف سے پیپ آتی ہے۔ تو دوسری طرف سے خون کا دورہ ہوتا ہے۔ گویا پھوڑے کی غذا خون اور پیپ ہوتی ہے۔ ان میں سے جس چیز کا غلبہ ہو گیا، تو مریض ہلاک ہو جائے گا۔ اور اگر خون غالب آ گیا۔ تو صحت یابی ہو جائے گی۔ منافق میں دونوں قسم کے مادے پائے جاتے ہیں۔

قلب کی چھ حالتیں

دِل کے حالات بہت مختلف ہوتے۔ یہ کبھی یکساں نہیں ہوتے۔ حضرت ابوبکر ورّاق رحؒ بڑے پائے کے بزرگ ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں[2]۔ کہ قلب پر چھ قسم کی حالتیں وارد ہوتی ہیں۔

---

[1] مسند احمد ص ۱۷ ج ۳، تفسیر ابن کثیر ص ۵۶ ج ۱ — [2]

یعنی حیات اور موت۔ صحت اور بیماری، بیداری اور نیند، فرماتے ہیں کہ قلب کی حیات ہدایت کی مرہونِ منت ہے۔ اگر ہدایت نصیب ہو گئی ہے تو سمجھ لیں کہ دل زندہ ہے۔ اور قلب کی موت گمراہی سے واقع ہوتی ہے۔ فرمایا مَوْتُهُ الضَّلَالَةُ دل کی موت کا سبب گمراہی ہے۔ کسی قسم کی گمراہی دل میں پیدا ہو جائے۔ سمجھیں کہ دل مردہ ہو گیا، اس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی۔

قلب کی صحت طہارت اور صفائی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور طہارت کا حصول ایمان اور توحید کی بدولت ہے۔ کہ ایمان کے بغیر طہارت نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس کے برخلاف قلب میں بیماری، کدورت گندے تعلقات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے "یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ" اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل کیا ہے۔ انہوں نے قیامت کے تذکرہ میں فرمایا۔ اس دن نہ مال کسی کام آئے گا۔ اور نہ اولاد مفید ہو گی، ہاں! جو قلب سلیم لے کر پہنچ گیا، اس کو فائدہ ہو گا، اور قلب سلیم وہی ہے۔ جس میں طہارت، پاکیزگی اور نور ایمان ہو گا۔

فرمایا دل کی بیداری ذکر الٰہی میں ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہتا ہے اس کا دل بیدار ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[1] مَثَلُ الَّذِیْ یَذْکُرُ رَبَّهٗ وَالَّذِیْ لَا یَذْکُرُ مَثَلُ الْحَیِّ وَالْمَیِّتِ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے اور نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی ہے۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہے تو سمجھو کہ اس کے دل پہ غفلت کی نیند طاری ہے قرآن میں جگہ جگہ آپ پڑھتے ہیں۔ کہ اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو وَلَا تَکُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ" اور غافلوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

بارش کی مثال

فرمایا منافق کی مثال ایسی ہے اَوْ کَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ جیسے آسمان سے بارش آتی ہے۔ صیب کا معنی زور سے برسنے والی بارش ہے اور عربی زبان میں سماء آسمان کو بھی کہتے ہیں، فضاء کو بھی اور یہ لفظ بادل پر بھی بولا جاتا ہے، اسی طرح عربی زبان کے اعتبار سے چھت

---

[1] بخاری ص ۹۴۸ ج ۲

کو بھی سما۔ کہتے ہیں۔ تاہم اس مقام پہ سما ء سے مراد بادل ہیں۔ کیونکہ بارش بادلوں ہی سے برستی ہے ہو سکتا ہے اس کا تعلق آسمان سے بھی ہو۔ جس کو عام انسان اور سائنس دان نہیں سمجھ سکتے تاہم بظاہر بارش کا تعلق بادلوں کے ساتھ ہے۔ اس لیے یہاں پہ آسمان کا لفظ فرمایا۔

فرمایا فِیۡهِ ظُلُمٰتٌ اس میں اندھیرے ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ بارش کے دوران بادل چھائے ہوتے ہیں اور سورج غائب ہوتا ہے، اور کسی قدر اندھیرا ہوتا ہے۔ اور اگر اندھیری رات کے وقت ہو تو تاریکی اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ ستارے تک نظر نہیں آتے۔ جب قرآن پاک نازل ہوا۔ تو اس وقت ہر طرف کفر و شرک کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اندھیروں کے علاوہ فرمایا وَّرَعۡدٌ اس میں گرج بھی ہوتی ہے۔ فرشتے بادلوں کو ہانک کر لاتے ہیں۔ تو ان کے مارنے سے گرج پیدا ہوتی ہے۔ اسے رعد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرے معنی میں کفر و شرک پہ وعید کو بھی رعد سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فرمایا وَّبَرۡقٌ بارش میں اکثر اوقات بجلی بھی چمکتی ہے۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ بادل آپس میں ٹکر کھاتے ہیں۔ تو بجلی پیدا ہوتی ہے۔ نیز اس کا معنی یہ بھی ہے۔ کہ قرآن پاک میں بڑے واضح دلائل موجود ہیں جن سے حق و باطل میں تمیز ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ دلائل بمنزلہ برق کے ہیں۔

منافقین کی بے بسی

فرمایا منافقوں کی حالت یہ ہے کہ یَجۡعَلُوۡنَ اَصَابِعَهُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِهِمۡ مِّنَ الصَّوَاعِقِ اپنی انگلیاں کڑک کے خوف سے اپنے کانوں میں ڈالتے ہیں۔ جب بارش کے دوران بجلی چمکتی ہے۔ اور بادلوں میں گرج پیدا ہوتی ہے۔ تو دہشت کے مارے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ حَذَرَ الۡمَوۡتِ کہ کہیں ہلاک نہ ہو جائیں۔ موت کے ڈر سے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ موت سے بھاگ نہیں سکتے۔ کیونکہ وَاللّٰهُ مُحِيۡطٌۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ اللہ تعالےٰ کافروں کو ہر طرف سے گھیرنے والا ہے۔ وہ پکڑنا چاہے گا تو فوراً گرفت کر لے گا۔ منافقین کا خوف و ڈر انہیں اللہ کی گرفت سے بچا نہیں سکتا۔

لہ ترمذی صفحہ ۴۲۶

فرمایا یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ قریب ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ناراضگی کی وجہ سے اُن کی آنکھوں کو اچک لے۔ اور وہ اندھے ہو کر رہ جائیں۔ کُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ جب بجلی کی چمک پیدا ہوتی ہے۔ تو اس کی روشنی میں تھوڑی دور چلتے ہیں وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ قَامُوْا اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے۔ تو ٹھہر جاتے ہیں۔ امام جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کفر و شرک کا ذکر فرمایا ہے اور یہ اندھیروں کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے کان، آنکھیں، بصارت، قلب اور حواس عطا کئے۔ یہ سب اس کے انعام ہیں۔ اور ہدایت حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔ یہ منافقین کس خیال میں پھرتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی عطا کردہ نعمتیں چھین نہیں سکتا بلکہ فرمایا وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کی سماعت اور بصارت ہی زائل کر دے۔ یہ لوگ باطنی طور پہ تو اندھے ہی ہیں۔ اللہ چاہے تو ظاہری طور پر بھی ان کی بینائی ضائع ہو جائے اور قوت شنوائی سلب ہو جائے۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں اس لیے عطا کی ہیں کہ ان کے ذریعے ہدایت قبول کریں اپنے لیے کمال حاصل کریں تاکہ آئندہ زندگی میں ان کے کام آسکے۔ مگر یہ ان ذرائع کو غلط طور پہ استعمال کر رہے ہیں۔ ان سے صحیح طور پر مستفید نہیں ہو رہے ہیں۔ لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنا عطا کیا ہوا انعام واپس لے سکتا ہے۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ ان ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے ہدایت کا راستہ اختیار کریں۔ تاکہ انہیں فلاح نصیب ہو۔

---

[1] تفسیر جلالین ص ۱/۲ مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعْبُدُوا۟ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُمْ وَٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٢١﴾ ٱلَّذِى جَعَلَ لَكُمُ ٱلْأَرْضَ فِرَٰشًا وَٱلسَّمَآءَ بِنَآءً وَأَنزَلَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجَ بِهِۦ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا۟ لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٢﴾

ترجمہ:۔ اے لوگو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا ہے۔ اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے گذرے ہیں، تاکہ تم بچ جاؤ ﴿۲۱﴾ وہی رب جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا ہے۔ اور آسمان کی طرف سے پانی اتارا ہے۔ پھر اس پانی کے ذریعے پھلوں سے تمہارے لیے روزی نکالی ہے۔ پس نہ ٹھہراؤ اللہ تعالیٰ کے لیے شریک، اور تم جانتے ہو۔ ﴿۲۲﴾

گذشتہ سے پیوستہ

دوسرے رکوع کے اختتام تک اللہ تعالیٰ نے تین قسم کے انسانوں کا ذکر فرمایا ہے۔ سورۃ البقرہ کی ابتدائی چار آیتوں میں ایمان والوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے اوصاف بیان فرمائے ہیں اگلی دو آیتوں میں ظاہراً اور باطناً انکار کرنے والے کفار کا حال اور ان کا انجام بیان ہوا ہے۔ اس کے بعد تیرہ ۱۳ آیات میں منافقین کا حال تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ان کی چال بازی۔ دھوکا بازی فریب کاری، دلیشہ دوانی، ظاہر و باطن میں تفاوت، فساد فی الارض اور غلط عقیدے کا رد ہے۔ پھر اس کی وضاحت دو مثالوں کے ذریعے کی گئی ہے۔ ایک آگ کی مثال اور دوسری پانی کی۔ منافقین کا انجام بھی بیان ہوا ہے اور تنبیہ بھی کی گئی ہے۔

مخاطبین قرآن

اب تیسرا رکوع شروع ہو رہا ہے۔ یہاں سے تمام انسانوں کو خطاب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں[1] کہ قرآن پاک میں جہاں بھی یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ سے خطاب ہے

---

[1] تفسیر مظہری صفحہ ۳۵ ج ۱

وہاں روئے سخن اہلِ مکہ کی طرف ہے۔ کیونکہ نزول قرآن کے زمانہ میں اکثر و بیشتر وہی لوگ کفر میں مبتلا تھے۔ اور جہاں پر یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ ان سے مراد اہلِ مدینہ ہیں کہ انہوں نے برضا و رغبت ایمان قبول کیا۔ اور اسلام کی مرکزیت کے لیے بیشمار قربانیاں دیں۔ تو جہاں پر یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ کے مخاطب دنیا کی تمام اقوام اور تمام بنی نوع انسان ہیں۔ جو لوگ اس وقت موجود تھے، ان سے براہ راست خطاب ہے۔ اور جو بعد میں آنیوالے ہیں انہیں اہلِ ایمان کے واسطہ سے مخاطب کیا گیا ہے۔ قرآن پاک کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ تاکہ میں اس قرآن پاک کے ذریعے تمہیں بھی تمہارے خطرناک انجام سے آگاہ کر دوں۔ اور جن لوگوں تک یہ قرآن پہنچے گا انہیں بھی متنبہ کر دوں، گویا میں سب کو ان کے بُرے انجام سے ڈرا رہا ہوں۔

چار اہم مضامین

اس رکوع میں قرآن کریم کے چار اہم اور عمدہ مضامین کا تذکرہ ہے۔ سب سے پہلے توحید کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لائے بغیر نجات کا کوئی راستہ نہیں لہذا اس کے بغیر جنت کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ قرآن پاک کا دوسرا اہم مضمون رسالت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص حدِ کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ تیسرا مضمون خود قرآن کریم اس کی حقانیت اور اس کا وحی الٰہی ہونا ہے۔ جسے قرآن پاک میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔ انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر ہدایت اور راہنمائی کی ضرورت ہے۔ اور اس کا واحد ذریعہ وحی الٰہی ہے۔ کیونکہ یہاں پر انسانی عقل و شعور کام نہیں کر سکتے۔ انسان ہمیشہ علم کی روشنی میں ترقی کرتا ہے اور ذرائع علم میں سب سے اہم، قطعی اور آخری ذریعہ وحی الٰہی ہے۔

اس رکوع میں چوتھے اہم مضمون معاد کا ذکر ہے۔ قیامت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کیونکہ اچھے اور برے نتیجے کا دار و مدار روزِ قیامت پر ہے۔ اس روز تمام چیزیں اپنی اصلی حالت میں ظاہر ہوں گی۔ نیکی اور بدی میں امتیاز ہوگا۔ اور انسان اس کے نتیجے میں ذمہ داری سے دوچار ہوگا۔ لہذا یہ اہم مضمون بھی یہاں بیان ہوا ہے۔

توحید

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو توحید پر کاربند رہنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ۔ اے انسانو! اپنے رب

کی عبادت کرو۔ توحید فی العبادت فَوَحِّدُوا اپنے رب کو وحدہٗ لاشریک مانو۔ اور اس کی عبادت کرو۔ کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ گویا اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے توحید جیسی سب سے اہم انسانی ذمہ داری کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ اس سلسلے میں اکثر لوگ غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

عبادت کا مفہوم اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں ذکر کر دیا گیا تھا۔ کہ عبادت حقیقت میں اپنے ظاہر و باطن کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مصروف کرنا ہے۔ اور اس خاص عقیدے اور تصور کے ساتھ کرنا ہے کہ پوری کائنات اور اس کے تمام اسباب پر اُسی مالک الملک کا تسلط ہے۔ ہر قسم کا نفع و نقصان اُسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وہ علیم کل، قادر مطلق اور مختار مطلق ہے۔ اس ہستی کا تصور کرتے ہوئے اس کے سامنے انتہائی عاجزی کے اظہار کو عبادت کہتے ہیں۔ عبادت کی ادائیگی بدن۔ زبان۔ دل۔ مال اور افعال سے ہوتی ہے۔ اور اس تصور کے ساتھ عبادت صرف خدا تعالیٰ کی ہی ہو سکتی ہے۔

صفاتِ الٰہی

یہاں پر اللہ تعالیٰ کی چند صفات بیان کر کے اس ہستی کی پہچان کرائی گئی ہے جس کی عبادت مطلوب ہے۔ فرمایا اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ یعنی اپنے رب کی عبادت کرو۔ اور رب خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ وہی انسان کو پالنے والا ہے۔ انسانی زندگی کی ترقی اور بقا کے تمام اسباب مہیا کرنے والا اللہ ہی ہے۔ انسانی وجود سے باہر جتنی بھی نعمتیں ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت خلق بیان کی گئی ہے۔ اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ انسان کو سب سے پہلے اور سب سے بڑی نعمت جو میسر آتی ہے، وہ اس کا وجود ہے۔ اسی لیے فرمایا اُس ذات کی عبادت کرو۔ جس نے تم کو پیدا کیا۔ خالق اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ "اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ" گویا تمہارا خالق بھی وہی ہے۔ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ اور تم سے پہلی قوموں کا خالق بھی وہی ہے۔

معرفتِ الٰہی

امام غزالیؒ نے حدیث پاک کے حوالے سے لکھا ہے[1]۔ کہ خدا تعالیٰ کی ذات میں غور و فکر

---

[1]

کرنا استعداد سے باہر ہے۔ کیونکہ لَا فِکْرَۃَ فِی الرَّبِّ رب کی ذات میں فکر نہیں ہوسکتا۔ کہ یہاں تک عقل و شعور کی رسائی نہیں ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی پہچان اس کی پیدا کردہ اشیاء میں غور و فکر سے حاصل ہوتی ہے۔ جب اس کی صفات سمجھ میں آجاتی ہیں۔ تو اس کی ذات کی معرفت بھی حاصل ہوجاتی ہے۔ اسی لیے حکم یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی مصنوعات میں غور و فکر کرنا چاہیئے۔ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی صفت، اس کی قدرت، اس کا علم، اس کی حکمت اور اس کی ربوبیت سب کچھ سمجھ میں آئے گا۔ اور اس طرح خود اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوجائے گی۔

حضور علیہ السلام نے حضرت معاذ بن جبل ؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو فرمایا[۱]، تم ایک ایسی قوم کے پاس جا رہے، جو اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ہیں۔ سب سے پہلے توحید و رسالت کی دعوت دینا شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ یعنی سب سے پہلے اس بات کی دعوت دینا کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کے برگزیدہ رسول ہیں۔ آپ نے فرمایا فَاِذَا هُمْ عَرَفُوْا ذٰلِكَ جب وہ اس کو پہچان لیں تو پھر انہیں نماز، روزہ اور دیگر احکام کا حکم دینا۔ گویا سب سے پہلے معرفت الٰہی اس کے بعد رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے اور باقی باتیں بعد میں بتانا۔

اللہ تعالیٰ نے یہود کے متعلق قرآن پاک میں فرمایا ہے " وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ " انہوں نے تو خدا کے مرتبے کو بھی نہیں پہچانا ہے۔ جس طرح کہ پہچاننے کا حق ہے اگرچہ یہ لوگ اہل کتاب اور صاحب علم ہیں۔ بڑے بڑے فلاسفر ہیں، مگر رب کی صفت کو نہیں پہچان سکے۔ اگر اُس کی صفت کو پہچان لیتے تو پھر شرک کا ارتکاب نہ کرتے۔ عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا نہ کہتے۔ مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کا خطاب نہ دیتے اور حضرت مریم علیہا السلام کو مادر خدا نہ کہتے۔ غرضیکہ بندے اور خدا کو ایک نہ کر دیتے۔ انہیں تو پہچان ہی نہیں ہوسکی۔ اسی لیے اللہ تعالےٰ نے یہاں پہچان کرائی ہے۔ کہ جب اللہ کی صفت کو پہچان لوگے تو اس کی عبادت ہوگی۔ اور اگر اس کی معرفت

---

[۱] مسلم ص۳۶ ج۱

ہی حاصل نہیں ہوئی۔ کہ وہ کن صفات کا مالک ہے۔ تو عبادت کس کی کرو گے۔

عبادت الٰہی

فرمایا یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وہ رب جس نے تم کو وجود کی نعمت بخشی۔ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ اور جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ تا کہ تم بچ جاؤ۔ لَعَلَّ ترجی کے لیے ہوتا ہے اور ترجی کا معنیٰ ہے امید۔ لیکن امام جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں[۱]۔ کہ قرآن پاک میں لَعَلَّ کا لفظ تحقیق کے لیے آتا ہے۔ تا کہ تم برے انجام اور کفر شرک سے بچ جاؤ۔ تَتَّقُوْنَ یعنی متقی بن جاؤ۔ اس رب کی پہچان کرنے کے بعد اس کی عبادت کرو۔ خَلَقَكُمْ میں صفت ایجاد کا تذکرہ ہے۔ کہ اس نے انسان کو عدم اور نیستی سے پیدا کیا ہے۔ جس کے متعلق فرمایا لَمْ یَكُنْ شَیْئًا مَّذْكُوْرًا "کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ اسے عدم سے وجود میں لایا۔ لہذا اپنے رب کی عبادت کرو۔ جس نے وجود جیسی نعمت عطا کی۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی عبادت سے متعلق احادیث میں بہت سے احکام موجود ہیں۔ ترمذی شریف اور مسند احمد میں یہ روایت[۲] موجود ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ لوگوں کو ان باتوں کی تبلیغ کرو۔ سب سے پہلی بات یہ کہو کہ اَنْ تَعْبُدُوْهُ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْئًا اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ کیونکہ اس کی مثال ایسی ہے كَمَثَلِ رَجُلٍ اِشْتَرٰی عَبْدًا کہ کوئی شخص غلام خریدے۔ روپیہ یا سونا چاندی غلام خریدنے پہ خرچ کرے۔ پھر اس غلام کو کام پہ لگادے۔ اور غلام مزدوری کر کے جو معاوضہ حاصل کرے وہ اپنے مالک کی بجائے کسی دوسرے شخص کو دے دے۔ فرمایا اَیُّكُمْ یَرْضٰی اَنْ یَّكُوْنَ عَبْدُهٗ كَذٰلِكَ اس قسم کے غلام سے کون راضی ہو سکتا ہے۔ کہ اس کا مالک وہ ہے۔ اس کی خوراک یا لباس اور رہائش کا بندوبست وہ کرتا ہے۔ مگر غلام دن بھر کی کمائی مالک کی بجائے دوسروں کو دے آتا ہے۔ فرمایا مشرک کا حال بھی یہی ہے کہ تمام نعمتیں اور ان کے اسباب اللہ تعالیٰ نے مہیا کیے ہیں۔ مگر وہ تعظیم غیر کی کرتا ہے۔ یہ مشرک اس نمک حرام غلام

---

[۱] تفسیر جلالین ص۶ [۲] ترمذی ص۴۰۶ مسند احمد ص۲۰۲ ج۴

کی طرح ہے۔ جو اپنی کمائی دوسروں کے گھر میں ڈال آتا ہے۔

الغرض فرمایا رب تعالیٰ کی پہچان نشانیوں سے ہوتی ہے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ کی دو صفات بیان ہوئی ہیں۔ ایک ربوبیت اور دوسری خالقیت اگر انسان غور و فکر کرکے ان صفات کو پہچان لیں گے۔ کہ یہ صفات خدا تعالیٰ کے ساتھ ہی خاص ہیں۔ تو پھر وہ عبادت بھی اُسی ہی کی کریں گے۔

وجود الٰہی پر دلائل

ہارون الرشید نے امام مالک صاحبؒ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کے وجود پہ کوئی دلیل بتلائیں۔ انہوں نے فرمایا[1] کہ انسان کی مختلف بولیاں، مختلف آوازیں، مختلف لب و لہجے اور مختلف لحجے خود خدا تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل ہیں۔ دنیا میں چار ہزار مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں کیا یہ وجود الٰہی پر کچھ کم دلیل ہے۔

اہل سنت کے چار اماموں میں سے امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ بڑے امام ہیں۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ ان کے شاگرد ہیں، یا شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ پھر ان چاروں اماموں میں سے امام ابو حنیفہؒ امام اعظم ہیں۔ ان کا مرتبہ زیادہ ہے۔ کیونکہ انہوں نے تقریباً آٹھ صحابہ کرامؓ کی زیارت کی ہے[2] یہ سعادت کسی دوسرے امام کو حاصل نہیں۔ آپ صحابہ کرامؓ کے زمانہ سے قریب تر ہیں۔ آپ کی ولادت ۸۰ھ میں ہوئی، جب کہ صحابہ کرامؓ ۱۱۰ھ تک دنیا میں موجود تھے۔

انہیں امام اعظمؒ کا واقعہ ہے[3]۔ کہ دہریوں اور زندیقوں کی ایک جماعت آپ سے مناظرہ کرنے کے لیے حاضر ہوئی۔ ان کا دعوےٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی وجود یا ہستی نہیں ہے بلکہ کائنات کا یہ نظام خود بخود چل رہا ہے۔ جب انہوں نے امام صاحبؒ سے گفتگو کرنا چاہی تو آپ نے فرمایا اِنِّیْ مُفَکِّرٌ فِیْ اَمْرٍ میں ایک معاملہ میں غور و فکر کر رہا ہوں۔ اور بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ مجھے بتلایا گیا ہے۔ کہ سامان سے بھری ہوئی ایک کشتی خود بخود دریا میں چل رہی ہے۔ اس کو چلانے والا کوئی ملاح اس میں نہیں ہے۔ مگر یہ پانی کی موجوں کو چیرتی ہوئی چلی جارہی ہے۔ اور واپس آرہی ہے۔ وہ کہنے لگے یہ کس قدر بے عقلی کی بات ہے۔ بھلا

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۵۸/۱۲
[2] الخیرات الحسان لابن حجر مکی ص ۲۱ و مناقب الامام ابی حنیفہ و صاحبیہ لحافظ ذہبی ص ۷
[3] تفسیر ابن کثیر ص ۵۸/۱۲

کون عقلمند کہہ سکتا ہے۔ کہ کشتی بغیر کسی چلانے والے کے خود بخود چل رہی ہے۔ یہ سن کر امام صاحبؒ فرمانے لگے۔ وَیۡحَکُمۡ تم پر افسوس ہے۔ کہ جب ایک معمولی کشتی چلانے والے کے بغیر چل نہیں سکتی۔ تو تمام کائنات، عالمِ سفلی اور عالمِ علوی اور جو کچھ ان کے اندر ہے۔ کیا یہ نظام خود بخود چل رہا ہے۔ کوئی اس کا نگران نہیں ہے۔ اس حاضر جوابی سے تمام دہریے تائب ہو گئے اور امام صاحبؒ کے ہاتھ پر ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے۔

کسی نے امام شافعیؒ سے عرض کیا کہ حضرت! وجودِ الٰہی پر کوئی دلیل لائیں۔ اتفاق کی بات کہ سامنے توت کا درخت تھا۔ امام صاحبؒ فرمانے لگے[۱] یہ توت کا درخت خدا تعالےٰ کے وجود پر دلیل ہے۔ دیکھو اس درخت کے پتوں کا ذائقہ، مزہ اور بُو یکساں ہے۔ مگر ریشم کا کیڑا اس پتے کو کھا کر ریشم نکالتا ہے۔ شہد کی مکھی اس سے شہد حاصل کرتی ہے۔ بکری کھائے تو مینگنیاں نکالتی ہے۔ اور ہرن کھائے تو کستوری پیدا ہوتی ہے۔ بتاؤ یہ خدا تعالےٰ کا کام نہیں تو اور کس کا کام ہے۔ چار مختلف چیزیں ایک ہی پتا کھاتی ہیں اور ان سے مختلف چیزیں نکلتی ہیں۔ یہ خدا تعالےٰ کی قدرتِ تامّہ کا شاہکار ہے۔ کہ چاروں چیزوں کو الگ الگ پیدا کرتا ہے۔

امام احمدؒ سے بھی کسی نے یہی سوال کیا، فرمانے لگے[۲] کہ انڈہ قلعہ کی مانند ہے۔ اوپر سے سفید اور چکنا اور اندر سے سونے کی طرح زرد ہے۔ یہ اچانک پھٹتا ہے۔ تو اس سے سمیع و بصیر حیوان نکلتا ہے۔ یہ خوبصورت جانور کون نکالتا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی قدرت کے سوا اور کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان ہی مصنوعات پر غور کرنے سے اس کی قدرت، حکمت، خالقیت اور ربوبیت کے رموز سمجھ میں آتے ہیں۔ لہٰذا اگر خدا تعالیٰ کی صفت سمجھ میں آ گئی۔ تو پھر عبادت بھی ٹھکانے لگے گی۔

فرمایا اَلَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وہ خدا تعالےٰ جس نے زمین کو تمہارے لیے فرش بنایا۔ زمین کی ساخت اس طرح کی ہے کہ نہ دلدل کی طرح نرم اور نہ

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ص ۵۸ ج ۱، [۲] تفسیر ابن کثیر ص ۵۹ ج ۱

پتھر کی طرح سخت۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا معتدل بنایا ہے۔ کہ انسان اپنی تمام ضروریات اسی سے پوری کرتا ہے۔ اسی پر چلتے پھرتے ہیں۔ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ مکان بناتے ہیں، الغرض زمین کو کمال درجے کا فرش بنایا۔

درس یازدہم ۱۱

(آیت ۲۱ تا ۲۲)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

ترجمہ: اے لوگو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی، جس نے تم کو پیدا کیا ہے۔ اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے گذرے ہیں۔ تاکہ تم بچ جاؤ ﴿۲۱﴾ وہی رب جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا ہے اور آسمان کی طرف سے پانی اتارا ہے۔ پھر اس پانی کے ذریعے پھلوں سے تمہارے لیے روزی نکالی ہے۔ پس نہ ٹھہراؤ اللہ تعالیٰ کے لیے شریک اور تم جانتے ہو ﴿۲۲﴾

توحید عبادت کے لیے شرط ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ اے انسانو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کی تفسیر اس طرح بیان کرتے ہیں[۱]۔ اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَحِّدُوا اللّٰهَ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو مانو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر دو طریقے پر ہے۔ وَحِّدُوا اللّٰهَ میں توحید کا لفظ پہلے بیان کیا۔ کیونکہ توحید عبادت کے لیے شرط ہے۔ اگر توحید ہوگی۔ تو عبادت بھی کارآمد ہوگی۔ ورنہ کوئی فائدہ نہیں جس طرح نماز کے لیے طہارت شرط ہے۔ یعنی طہارت کے بغیر نماز ادا نہیں ہوگی۔ اسی طرح توحید کے بغیر عبادت نہیں ہوگی۔ تفسیر کے دوسرے طریقے میں وَحِّدُوا اللّٰهَ کا معنی یہ کیا ہے۔ کہ عبادت صرف ایک خدا کے لیے کرو۔ یہ توحید فی العبادۃ ہے۔ خدا کے سوا کسی دوسرے کے لیے عبادت ہرگز جائز نہیں۔ بلکہ ایسا کرنا کفر، شرک اور حرام ہے۔

---

[۱] معالم التنزیل ص۱۷ ج۱، درمنثور ص۳۳ ج۱، تفسیر مظہری ص۳۵ ج۱

دلائل توحید — اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی توحید کے قوی دلائل موجود ہیں۔ سب سے پہلے خدا تعالیٰ جو صانع اور قادر ہے۔ اس کی صفات کا ذکر ہے۔ کہ اس کے مشابہ کوئی چیز نہیں۔ نہ اُس کا کوئی ند یعنی مقابل یا شریک ہے اور نہ اس کی کوئی مثل ہے۔ وہ ایسی اعلیٰ و ارفع ذات ہے جسے کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی۔

دلائل توحید کے متعلق فرمایا کہ آسمان کی بلندی پر غور کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بغیر ستون کے قائم کیا ہے۔ اس بات کا اشارہ سورۃ رعد میں کیا گیا ہے "بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا" اسے تم بغیر ستونوں کے دیکھ رہے ہو۔ دنیا میں کوئی چھت بغیر ستون کے کھڑی نہیں ہو سکتی مگر یہ خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ جس نے آسمان جیسی عظیم الشان چھت کو کھڑا کیا ہوا ہے۔ لطف یہ ہے کہ جب سے اسے قائم کیا ہے۔ اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں آیا۔ جب تک چاہے گا آسمان کو اسی حالت میں قائم رکھے گا۔ اور جب چاہے گا، اسے توڑ پھوڑ دے گا۔ اور یہ درہم برہم ہو جائے گا۔ اسی بات کو دوسری جگہ یوں بیان کیا "وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ" دیکھو! ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا ہے۔ مگر لوگ ہماری ان نشانیوں سے اعراض کرتے ہیں۔ ان میں غور و فکر نہیں کرتے۔

دلائل توحید کے سلسلے میں زمین کو دوسری دلیل کے طور پر پیش کیا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کیسا ثبات بخشا ہے۔ امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں[1] کہ زمین کے اوپر بھی ہوا ہے اور نیچے بھی ہوا ہے۔ اور اسے فضا میں بغیر کسی سہارے کے قائم کر رکھا ہے۔ بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی دلیل ہے۔ لفظ خلق کی تشریح کل (گذشتہ درس میں) بیان کر دی تھی۔ کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ" یعنی وہ ذات جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔ پھر فرمایا اُس رب کی عبادت کرو "الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا" جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا۔ فرش۔ بستر۔ دری چٹائی وغیرہ کو کہتے ہیں۔ جس پر انسان آرام کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو فرش کے ساتھ اسی طرح تعبیر کیا ہے

---

[1] احکام القرآن ص ۲۸ ج ۱

جیسا پہاڑوں کے متعلق فرمایا" وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا" یعنی پہاڑوں کو کیل بنایا، اور سورج کے متعلق آتا ہے" وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا" سورج کو اللہ تعالیٰ نے چراغ بنایا۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں[1] کہ اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں فرش پر نہیں سوؤں گا۔ اور وہ زمین پر سو جائے۔ تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو بھی فرش سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ عرف عام میں فرش، چارپائی، دری، قالین یا چٹائی کو کہتے ہیں، زمین کو نہیں کہتے۔ اس لیے قسم نہیں ٹوٹے گی۔

اسی طرح اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں چراغ کی روشنی میں نہیں بیٹھوں گا۔ یا نہیں پڑھوں گا اور وہ سورج کی روشنی میں بیٹھ کر پڑھے، تو بھی اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ حالانکہ سورج کو بھی اللہ تعالیٰ نے چراغ کہا ہے۔ وجہ یہی ہے۔ کہ عرف عام میں چراغ کا لفظ دیئے یا لالٹین پر بولا جاتا ہے۔ سورج پر نہیں بولا جاتا۔ لہٰذا سورج کی روشنی میں اس کے لیے پڑھنا مباح ہوگا۔

ابوالحسین قدوری فرماتے ہیں[2] کہ اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔ مگر وہ مچھلی کھالے، تو اس کی قسم قائم رہے گی۔ حالانکہ مچھلی بھی گوشت ہی کی ایک قسم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ میں" لَحْمًا طَرِيًّا" یعنی تازہ گوشت فرمایا ہے۔ یہاں بھی وہی اصول کارفرما ہے۔ عرف عام میں گوشت کا اطلاق گائے، بھینس یا بھیڑ، بکری وغیرہ کے گوشت پر ہوتا ہے۔ مچھلی پر نہیں ہوتا۔

عبادت کیوں ضروری ہے

قرآن پاک کی اولین دعوت اللہ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ کی عبادت ہے۔ اس مسئلہ میں تمام آسمانی کتب متفق ہیں۔ کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی کی جائے۔ قرآن پاک جس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم دیتا ہے۔ اسی طرح غیر اللہ کی عبادت سے منع بھی کرتا ہے۔ اس آیت میں فرمایا کہ اپنے رب کی عبادت کرو۔ تو عبادت کو ربوبیت پر مرتب فرمایا۔ گویا ربوبیت عبادت کی علت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت اسی لیے کرو کہ وہ رب ہے۔ اگلی آیت میں ربوبیت کی تشریح بیان کر دی گئی ہے کہ اس نے تم پر ایسے ایسے انعام کیے ہیں، لہٰذا اس کی عبادت ضروری ہے۔ ربوبیت

---

[1] احکام القرآن ص ۲۷/۱ ، [2] مختصر القدوری ص ۲۲۵ ، مطبوعہ نور محمد کراچی

کے سلسلہ میں سب سے پہلے صفت خلق کا ذکر ہے۔ اور پھر ظاہری، باطنی، علمی، اور عملی ہر قسم کے انعامات کا بیان ہے۔ اس ضمن میں قرآن پاک بھی ایک بہت بڑا انعام ہے۔ اس کے چار عمدہ مضامین یعنی توحید، رسالت، قرآن کی حقانیت اور معاد کا ذکر ہو چکا ہے۔

عبادت کے لائق صرف ذات باری تعالیٰ ہے

فرمایا اُس رب کی عبادت کرو۔ جس نے تمہیں پیدا کیا۔ جب انسان اپنے بارے میں غور کرے گا تو اُسے معلوم ہوگا۔ کہ پہلے وہ موجود نہیں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُسے پیدا کیا۔ نہ صرف اُسے بلکہ اُس کے آباؤ اجداد کو بھی پیدا فرمایا" وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ" تم سے پہلے تمام لوگوں کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ خالق وہ ہے باقی سب مخلوق ہیں۔ عاجز اور محتاج ہیں۔ انسان اس قدر بے بس ہے۔ کہ اُس کے جسم کی کھال کا کوئی حصہ اُتر جائے تو ساری مخلوق مل کر بھی اُسے وہ کھال مہیا نہیں کر سکتی۔ اس سلسلے میں نہ جنات کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ فرشتے۔ نہ نیک انسان کسی کام آسکتے ہیں۔ اور نہ بد۔ اسی لیے خود انسان یا کسی دوسری مخلوق میں کوئی بھی عبادت کا مستحق نہیں۔ گویا کسی چیز میں ایسی صلاحیت موجود نہیں۔ جس کی بنا پر اس کی عبادت کی جائے۔ لہذا عبادت صرف اسی ذات اقدس کی ہو سکتی ہے۔ جو واجب الوجود ہے۔ یعنی جس کا وجود خود بخود ہے۔ جو خالق۔ رب، علیم کل، قادرِ مطلق۔ مختارِ کل اور نفع و نقصان کا مالک ہے۔ جو ازلی و ابدی ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ باقی ہر چیز حادث اور فانی ہے" كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهٗ" ہر چیز بالفعل ہلاک ہے۔ یا فنا ہو جائے گی۔ دوام اور بقا صرف اس ذات اقدس کے لیے ہے۔ جو محسن اور منعم ہے۔ جو سمیع و بصیر ہے لہذا عبادت بھی اسی کی ہو سکتی ہے۔

فرمایا عبادت کرنے کا فائدہ یہ ہوگا" لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" تاکہ تم خدا کی پکڑ اور اس کے عذاب سے بچ جاؤ۔ تقویٰ بچاؤ کو کہتے ہیں کہ اگر اس کی عبادت کرتے رہو گے تو بچ جاؤ گے ورنہ اس کی گرفت میں آجاؤ گے۔ عبادتِ الٰہی کو لازم پکڑ لو گے تو دنیا میں بُرائی سے بچ جاؤ گے۔ اور آخرت میں عذاب سے محفوظ رہو گے۔

زمین کے فوائد

اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وہی قادرِ مطلق اور مہربان خدا تعالیٰ جس نے زمین کو تمہارے لیے فرش کے طور پر بنایا۔ ایسا فرش جو نہ پتھر کی طرح سخت ہے اور نہ پانی کی طرح بالکل نرم، نہ یہ ہوا کی طرح لطیف بھی نہیں بلکہ بالطبع اس کو خشک بنایا۔ اگر یہ

دوسری چیزوں کے ساتھ مل کر مفید مرکب بن سکے۔ اور لوگوں کے کاروبار ٹھیک طور پر چل سکیں۔
اس زمین میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی بے شمار نشانیاں ودیعت کی ہیں۔ کرۂ ارض کے مختلف حصوں کی زمین مختلف ہے۔ یہ بھی ایک نعمت خداوندی ہے " وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ " زمین کے ٹکڑے الگ الگ ہیں۔ رنگت کے اعتبار سے کوئی حصہ سفید ہے۔ اور کوئی حصہ سیاہ ہے۔ " وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا " کہیں سرخ گھاٹیاں ہیں اور کہیں سیاہ پتھر ہیں۔ وضع قطع میں واضح اختلافات ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے زمین میں روئیدگی کی صلاحیت بھی رکھی ہے۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ آتا ہے " وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ " قسم ہے زمین کی جو پھٹ کر پودے اور نباتات کو باہر نکالتی ہے پانی کو اپنے اندر جذب کر کے محفوظ رکھتی ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی اتارتا ہے۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا " فَسَلَكَهٗ يَنَابِيعَ فِي الْاَرْضِ " پھر اس کو زمین میں نالیوں اور چشموں کی شکل میں چلاتا ہے۔ ضرورت کے وقت چشمے یا نہریں جاری ہو جاتی ہیں، یا کنویں کھود کر پانی حاصل کیا جاتا ہے۔ جس سے انسان، جانور اور کھیتیاں یکساں طور پر مستفید ہوتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے زمین میں کرم و سخاوت کا وہ مادہ رکھا ہے۔ کہ اس میں ایک دانہ پھینکو، یہ سو دانے لوٹائے گی۔ اس پر خود قرآن شاہد ہے۔

زمین میں انسان ہر روز موت و حیات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک جگہ فرمایا " وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا " دیکھتے نہیں، کہ زمین بالکل مردہ یعنی خشک ہوتی ہے۔ پھر اس کو ہم زندہ کر دیتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ لوگ ہر موسم میں کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قیامت کا نقشہ انسان کی نگاہ میں رہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں مختلف قسم کے جانور پھیلا دیئے " وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ " جنہیں انسان شمار تک نہیں کر سکتا۔ پھر دیکھو! اللہ تعالیٰ نے زمین کے مختلف طبقات میں مختلف قسم کے پتھر رکھ دیئے جن میں بڑے بڑے قیمتی اور معمولی سے معمولی ہر قسم کے پتھر انسانی ضروریات کے لیے موجود ہیں۔

زمین کی افادیت کے متعلق مزید فرمایا " خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا " اے انسانو! تمہارے ہی فائدے کے لیے زمین کی ساری چیزوں کو پیدا کیا۔ ذرا غور کرو، پتھروں

میں عقیق اور یاقوت بھی ہے۔ اور زمرد اور ہیرا بھی۔ نفیس مرمر اور سنگ خارا بھی ہے۔ سنگ سرخ بھی ہے اور سماق بھی ہے۔ پھر یہ کہ زمین میں اللہ تعالیٰ نے وسیع کانیں رکھ دی ہیں۔ کہیں سونے کی کان ہے۔ اور کہیں چاندی کی کہیں سے تانبا نکل رہا ہے۔ اور کہیں سے لوہا۔ کہیں سے پٹرول برآمد ہو رہا ہے۔ اور کہیں سے گیس اور تیل کے چشمے ابل رہے ہیں۔ صنعت و حرفت کا سارا دارومدار انہیں کانوں پر ہے۔ اگر زمین یہ چیزیں مہیا نہ کرے۔ تو تمام کارخانے بند ہو جائیں اور پوری دنیا افراتفری کا شکار ہو جائے۔

یہ بڑے بڑے پہاڑ اور سلسلہ ہائے کوہسار زمین پر ہی قائم ہیں۔ جن کے ساتھ انسان کے بے شمار فوائد وابستہ ہیں۔ سورۃ حجر میں فرمایا، اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو اس لیے پیدا کیا تاکہ تمہاری زمین کا توازن قائم رہے۔ اور یہ مضطرب نہ ہونے پائے۔

آسمان اور پانی کی نعمت

فرمایا اُس رب کی عبادت کرو جس نے آسمان کو چھت بنایا وَالسَّمَآءَ بِنَآءً یہ بھی خدا تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ دیکھو! روشنی کے لیے مہتاب اور آفتاب کو آسمان میں ہی رکھا ہے۔ اس میں ستارے اور سیارے بھی لٹکائے ہیں۔ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے اعمال کے صعود کی جگہ آسمان ہے۔ اور ادھر سے نزول وحی کا مقام بھی آسمان ہے فرمایا وہی رب وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً جس نے آسمان سے پانی اتارا اور جس کے نتیجے میں فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ یعنی پانی کے ذریعے زمین سے پھلوں کو نکالا جو تمہارے لیے روزی کا سامان ہیں۔ اگر آسمان سے پانی نازل نہ ہو۔ تو کھیتی باڑی نہ ہو سکے۔ درخت سوکھ جائیں۔ اور نہ کوئی فصل پیدا ہو اور نہ کوئی پھل۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اُسی رب کی عبادت کرو، جس نے پانی اتار کر یہ تمام نعمتیں تمہارے استفادہ کے لیے پیدا فرمائیں۔

لفظ ند کا معنیٰ

یہ سب نعمتیں ذکر کرنے کے بعد فرمایا فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا جب یہ تمام انعامات اللہ تعالیٰ نے عطا کیے ہیں۔ تو پھر اُس کے لیے نِد نہ ٹھہراؤ، اس کا شریک نہ بناؤ۔ ند کا لفظی معنیٰ ہے۔ المثل المساوی مگر اصطلاحاً ند اس کو کہتے ہیں۔ جو ذات اور جوہر میں شریک ہو۔ جریر کا شعر ہے[1]۔

---

[1] دیوان جریر ص ۱۲۹

اَتَیمًا تجعلونَ الٰی نِدًّا وَھَل تیمٌ لِذی حَسَبٍ نَدِیدُ

تم بنی تیم کو میرا شریک بناتے ہو، حالانکہ بنی تیم تو کسی شریف آدمی کے شریک نہیں بن سکتے وہ تو گھٹیے آدمی ہیں۔

ایک ند ہے اور ایک شبیہ ہے۔ شبیہ یا مشابہ اس چیز کو کہتے ہیں۔ جو کیفیت میں برابر ہو جیسے گرمی، سردی، سختی، نرمی وغیرہ۔ اسی طرح جو چیز طول، عرض اور عمق میں برابر ہو۔ اسے مشاکل کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا اللہ تعالےٰ کے لیے شریک مت ٹھہراؤ، کیونکہ خدا تعالےٰ کے سوا واجب الوجود کوئی نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی علیم کل اور قادر مطلق نہیں۔ یہ ایسی صفات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔ مگر تم جہالت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا ند ٹھہراتے ہو۔

آج دنیا میں خدا تعالےٰ کے مقابل اور شریک ٹھہرانے والے بیشمار مجوسی موجود ہیں، ثنوی مذہب والے دو خدا مانتے ہیں۔ ایک نیکی کا دوسرا بدی کا۔ ایک کا نام یزدان رکھا ہے۔ اور دوسرے کا نام اہرمن۔ اُن کے نزدیک ایک شر کا خدا ہے۔ اور دوسرا خیر کا۔ نور کا خدا اور ہے اور ظلمات کا اور ہے۔ حالانکہ سورۃ "انعام" میں پڑھیں گے "جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ط" یعنی ظلمت اور نور اُسی وحدہٗ لاشریک لہٗ کے پیدا کردہ ہیں۔ اس میں کوئی اس کا شریک نہیں اور یہ وہی ذات ہے جس نے خود تمہیں بھی پیدا کیا ہے۔

بعض لوگ ستاروں میں مستقل تاثیر کے قائل ہیں۔ ایسے لوگ نیک بختی اور بدبختی اور ترقی و تنزل کو ستاروں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ صابی فرقہ کے لوگ ہیں۔ جو ستاروں کو اللہ تعالےٰ کا ند ٹھہراتے ہیں۔

بعض لوگ اصحاب قبور سے حاجتیں طلب کرتے ہیں۔ اور اس طریقے سے خدا کا ند ٹھہراتے ہیں۔ بعض لوگ پیروں کو ہر حالت میں مستجاب الدعوات سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ خدا چاہے راضی ہو یا ناراض پیر ہر حالت میں سفارش کریں گے۔ آج کل پیر پرست لوگوں کا یہی عقیدہ ہے۔ کہ پیر کا دامن پکڑ لیا ہے۔ بس پار ہو جائیں گے۔ کسی نیکی بدی کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ اس قسم کی سفارش کو قرآن پاک نے جبری سفارش سے تعبیر کیا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ "وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی" اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی جبری سفارش نہیں ہوگی۔ سفارش کی اجازت اُسے

ہوگی جس سے خدا تعالیٰ راضی ہوگا۔ اور جس کا عقیدہ خدا تعالیٰ کو پسند ہوگا۔ چونکہ کفر و شرک اللہ تعالیٰ کے ہاں مردود عقائد ہیں۔ لہٰذا کسی مشرک کی سفارش ممکن نہیں ہے۔ یہ ند ٹھہرانے کی مختلف صورتیں ہیں۔

شرک فی المشیت

بعض لوگ مشیت میں شرک کرتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے ایک شخص نے کہا مَاشَآءَ اللّٰہُ وَمَاشِئْتَ تو آپ نے فرمایا اَجَعَلْتَنِیْ لِلّٰہِ نِدًّا کیا تم نے مجھے خدا کے ساتھ شریک ٹھہرا لیا ہے۔ قُلْ مَاشَآءَ اللّٰہُ وَحْدَہٗ کہو، جو صرف اللہ تعالیٰ چاہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے "وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ" تم اس وقت تک نہیں چاہ سکتے جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے۔ البتہ بعض روایات میں[1] یوں آتا ہے۔ کہ کہو مَاشَآءَ اللّٰہُ جو اللہ چاہے۔ اس کے بعد جو تمہارا ارادہ ہے اس کے مطابق عمل کرو، شرک سے بچ جاؤ گے۔

شرک فی العادت

شاہ اسماعیل شہیدؒ اور دوسرے علمائے کرام فرماتے ہیں[2]۔ کہ شرک عبادت میں بھی ہوتا ہے۔ اور عادت میں بھی ہوتا ہے۔ شرک فی العادت کی مثال زنّار کا دھاگا ہے۔ جو ہندو یا مجوسی اپنے جسم کے ساتھ باندھتے ہیں۔ عیسائی صلیب باندھتے ہیں۔ یہ بھی شرک فی العادت ہے۔ حضور علیہ السلام نے صلیب کو کفر کی نشانی بتایا ہے۔ اسی لیے فرمایا[3] اِطْرَحْ عَنْکَ ھٰذَا الْوَثَنَ اسے اتار دو، یہ بُت ہے۔ حدیث شریف[4] میں آتا ہے کہ جب مسیح علیہ السلام دوبارہ تشریف لائیں گے تو صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے۔ صلیب کی شکستگی اس لیے ہوگی۔ کہ یہ کفر کی نشانی ہے۔ اور وہ بھی نبی کے نام پر۔ اور خنزیر کو قتل کریں گے۔ کہ عیسائیوں نے اسے بکری کی طرح حلال قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ یہ کسی نبی کی شریعت میں حلال نہیں ٹھہرا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں[5]۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جتنے پیغمبر آئے ہیں۔ سب کی شریعتوں میں خنزیر حرام ہی رہا ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص۵۷ ج۱، در منثور ص۳۵ ج۱، [2] تقویۃ الایمان ص۷۷، ۹۱، [3] ترمذی ص۱۴۲

[4] بخاری ص۴۹ ج۱، مسلم ص۸۷ ج۱، [5] حجۃ اللہ البالغہ ص۱۸۰ ج۲

شرک کی دوسری قسمیں

بعض لوگ بچے کے سر پر چوٹی رکھ کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ چوٹی فلاں بزرگ یا فلاں خواجہ کی رکھی ہے۔ اگر یہ چوٹی نہ رکھتے تو بچہ مر جاتا۔ یہ صریح اور جلی شرک ہے۔ بعض لوگ مجوسیوں کے نوروز یا عیسائیوں کے بڑے دن کی تعظیم بجالا کر شرک کرتے ہیں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ ایسے مواقع پر جو تحفہ میں پھول، ہار، ڈالی یا کوئی اور ہدیہ پیش کریگا اور تعظیم کریگا تو شرک میں مبتلا ہو جائے گا۔ بعض مشائخ نے کفر تک کا فتویٰ لگایا ہے۔

کچھ لوگوں کے اندر بدعت بنانے کا طریقہ یہ ہے۔ کہ وہ غیر اللہ کے تقرب کے لیے نذر و نیاز دیتے ہیں۔ ہم ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں، کہ قبروں اور زیارتوں پر کس کس طرح اور کس کس نام کے عرس منعقد ہوتے ہیں۔ یہ سب بدعت اور بعض شکلوں میں شرک ہے۔ بعض لوگ غیر اللہ کی قسم اٹھا کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور کچھ غیر اللہ کے نام پر بچے کا نام رکھ کر شرک کرتے ہیں۔ جیسے عبد المصطفیٰ، حالانکہ صحیح طریقہ یہ ہے۔ کہ عبد اللہ یا عبد الرحمٰن وغیرہ نام رکھ کر اللہ تعالےٰ کی طرف نسبت کی جائے۔

بعض لوگ استعانت طلب کرنے میں شرک کرتے ہیں یعنی غائبانہ طور پر مافوق الاسباب قبروں والے بزرگوں اور اولیاء سے مدد چاہتے ہیں۔ یہ سب شرک ہے ”وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ“ خدا تعالےٰ کی ذات ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ اُس سے مدد طلب کرو۔ تم غائبوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو۔ جن کا کوئی اختیار نہیں۔ ان کو تو یہ بھی علم نہیں کہ تم کس تکلیف میں مبتلا ہو۔ چہ جائیکہ ان کے آگے دست سوال دراز کرو۔

بعض لوگ جانور ذبح کرتے وقت بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کے ساتھ کچھ اور اضافہ کر کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جیسے بِسْمِ اللّٰہِ وَبِاسْمِ مُحَمَّدٍ یا بِسْمِ اللّٰہِ وَبِاسْمِ فُلَانٍ یعنی فلاں بزرگ یا فلاں پیر کے نام پر۔ ایسی صورت میں جانور سرے سے مردار ہو گیا۔[1] فقہائے کرام نے اسے بسم اللہ میں شرک قرار دیا ہے۔

اور کچھ لوگ ایسے ہیں۔ جو شگون لے کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ حضور علیہ السلام

---

[1] ہدایہ ص ۴۳۷ ج ۴

نے فرمایا اَلطِّیَرَۃُ شِرْكٌ شگون لینا شرک کی بات ہے۔ بعض لوگ غیب کی خبریں معلوم کرنے کی وجہ سے شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کاہن، سنیاسی، نجومی، دست شناس یا جفار کے پاس جا کر پوچھتے ہیں۔ اور ایمان کو ضائع کر لیتے ہیں۔ اس قسم کی خبروں پر یقین نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ اپنی جیب سے پیسے دیکر شرک خریدنے کے مترادف ہے۔

بعض لوگ تعویذ گنڈے کی شکل میں شرک کرتے ہیں۔ تعویذ گنڈے کرنے والے اکثر غلط کار لوگ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے کلام یا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق پڑھ کر دَم کر دے یا لکھ کر دے دے، تو جائز ہے۔ وگرنہ یہ ٹونے ٹوٹکے جن کے ساتھ طرح طرح کی شرائط وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ سب شرکیہ یا بدعت اور معصیت کی باتیں ہیں۔

بعض لوگ غیر اللہ کو غائبانہ طور پر پکار کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جیسے یا شیخ عبد القادر جیلانی شَیْئًا لِلّٰہِ یہ ندا کا شرک ہے۔ اور پھر ان سے حاجتیں بھی طلب کرتے ہیں۔ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ تقویۃ الایمان میں لکھتے ہیں۔ کہ دیکھو! ایسے لوگ کتنی غلط بات کرتے ہیں۔ کہ بندے کو اصل ٹھہرا دیا۔ اور خدا تعالیٰ کو واسطہ بنا دیا۔ اگر اس کا الٹ کر دیتا تو درست تھا۔ یعنی یا اللہ شَیْئًا للشیخ عبد القادر جیلانی۔ اے مولا کریم الشیخ عبد القادر جیلانیؒ کے واسطے اور ان کے طفیل سے میرا یہ کام کر دے۔ مگر اس شخص نے شیخ عبد القادر جیلانیؒ کو منتہیٰ بنا کر اللہ تعالیٰ کو واسطہ کے طور پر پیش کیا۔ اور اس کے ساتھ توہین کا بھی مرتکب ہوا۔ غیر سے امداد طلب کر کے کفر میں مبتلا ہوا۔

شرک خفی

شرک جلی کے بعد شرک خفی کا ذکر بھی ہو جائے ——— شرک خفی ریا میں پایا جاتا ہے۔ یا بعض دوسری اعتقادی صورتوں میں ہوتا ہے۔ چونکہ اس قسم کا شرک خفیف ہوتا ہے۔ اس لیے اس سے بچنے کے لیے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے امام ابن کثیرؒ اور امام رازیؒ نے اس کی مثال دی ہے۔ کہ بعض وَاللّٰہِ وَحَیَاتِكَ اللہ کی قسم اور تیری زندگی کی قسم یا میری زندگی کی قسم۔ یا بعض لوگ اس طرح کہہ جاتے ہیں۔ کہ اگر رات کو یہ کتا نہ ہوتا تو ہم لٹ جاتے۔ یہ بطنج

لہ مسند احمد صـ ۳۸۹ ج ۱، ۲ے تقویۃ الایمان صـ ۷۹ فصل شرک فی العادات ۳ے تفسیر ابن کثیر صـ ۵۷ ج ۱

مکان میں موجود تھی۔ جس کی وجہ سے ہم چوری سے بچ گئے۔ یہ شرک خفی کی مثالیں ہیں۔ عام محاورے میں یوں بھی کہا جاتا ہے۔ کہ ڈاکٹر صاحب یا حکیم صاحب کی مہربانی سے مریض بچ گیا۔ ورنہ مر گیا تھا۔ یہ پہرے دار یا چپڑاسی نہ ہوتا۔ تو ہم تباہ ہو گئے تھے۔ یہ تمام چیزیں اس لیے شرکِ خفی کی فہرست میں آتی ہیں۔ کہ ان چیزوں کو مؤثر سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ ہر چیز میں اثر ڈالنے والی ذات تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

اطاعت لغیر اللہ

جس طرح غیر اللہ کی عبادت مطلقاً کفر اور شرک ہے۔ اسی طرح غیر اللہ کی بالاستقلال اطاعت بھی شرک ہے۔ اطاعتِ غیر کا مطلب یہ ہے۔ کہ نبی یا کسی بزرگ کی اطاعت کرتا ہے۔ مگر اس کو مبلّغ نہیں سمجھتا بلکہ سب کچھ اسی کو سمجھ رہا ہے۔ یعنی وہ جو بھی حکم کرے گا، اس کی بلا چون و چرا اطاعت کی جائے گی۔ "اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" اسی کو کہا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو رب بنا لیا تھا۔ یہ شرک ہے۔ البتہ نبی کی مطلق اطاعت فرض ہے کیونکہ نبی کے بغیر انسان اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی اور اس کی خوشنودی معلوم نہیں کر سکتا۔ مگر نبی کا حکم مستقل نہیں ہوتا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہوتا ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ ہم نے دنیا میں انبیاء (علیہم السلام) کو اس لیے بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کی اطاعت کی جائے۔ نبی کی اطاعت فرض ہے بحیثیت "رسالت" کے۔ اور علی الاطلاق صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ نبی کے لفظ میں یہ بات پائی جاتی ہے۔ کہ وہ اپنی جانب سے کوئی حکم نہیں دیتا۔ بلکہ "اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ" میں تو اسی حکم کی تعمیل کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے یعنی منجانب اللہ ہوتا ہے

باقی رہی یہ بات کہ علمائے کرام، مجتہدین، شیخ طریقت، بادشاہ وقت، امراء، حکام اور والدین کی اطاعت بھی کی جاتی ہے۔ نیز غلام اپنے آقا کی اطاعت بھی کرتا ہے۔ تو یہ سب اطاعتیں اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ مقید ہیں۔ کہ اس کے حکم کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔ شیخ، پیر، حاکم، استاد اور والدین کی اطاعت، غلام کی اطاعت وغیرہ اسی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ

---

[1] ترمذی صد ۲۶۲، مسلم صد ۱۲۵ ج ۲، بخاری صد ۱۰۷۸ ج ۲

مَعْصِیَۃِ الْخَالِقِ خالق کی معصیت کرتے ہوئے، اس کی نافرمانی کرتے ہوئے۔ مخلوق کی اطاعت روا نہیں ہے۔ ایسا کرنا شرک کے مترادف ہے۔ ان کی اطاعت مطلق نہیں ہے۔ بلکہ نبی کی اطاعت مطلق ہے۔ کیونکہ نبی اپنی جانب سے حکم نہیں دیتا۔ بلکہ وہ منجانب اللہ ہوتا ہے۔ باقی لوگ چونکہ اپنی طرف سے حکم دیتے ہیں، اسی لیے ان کے حکم کو جانچنا ہو گا۔ صحیح حکم کی اطاعت ہو گی۔ اور خلاف شرع غلط بات کو ٹھکرا دیا جائے گا۔

اسی لیے فرمایا فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اللہ تعالیٰ کے لیے ہمسر نہ ٹھہراؤ۔ اور تم جانتے ہو کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں۔ کوئی نافع اور ضار نہیں۔ کوئی خالق اور قادر مطلق نہیں۔ جب یہ تمام صفات اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ تو پھر اس کی عبادت اور اس کی صفات میں غیروں کو کیوں شریک مانتے ہو۔ مسئلہ توحید قرآن پاک کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دو آیتوں میں یہ مسئلہ سمجھا دیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے مضامین ہوں گے۔

درس دوازدہم ۱۲ (آیت ۲۳ تا ۲۵)

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۴﴾ وَبَشِّرِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوۡا مِنۡهَا مِنۡ ثَمَرَةٍ رِّزۡقًا ۙ قَالُوۡا هٰذَا الَّذِىۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ وَاُتُوۡا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمۡ فِيۡهَآ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۵﴾

ترجمہ: اور اگر تم اُس چیز سے شک میں ہو جس کو ہم نے نازل کیا ہے اپنے بندے (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر پس لاؤ تم ایک سورۃ اس کے مانند۔ اور بلاؤ اپنے مددگاروں کو اللہ تعالیٰ کے سوا۔ اگر تم سچے ہو ﴿۲۳﴾ پھر اگر تم نہ کر سکے اور ہرگز نہ کر سکو گے۔ پس بچو اُس آگ سے جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے جو کفر کرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے ﴿۲۴﴾ اور آپ خوشخبری سنا دیں ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے عمل کیے۔ کہ بیشک ان کے لیے باغات ہیں۔ جن کے سامنے نہریں بہتی ہیں۔ جب بھی وہ ان بہشتوں میں پھلوں سے روزی دیے جائیں گے۔ تو کہیں گے۔ کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے روزی دی گئی اور وہ اس میں دیے جائیں گے ایک دوسرے کے مشابہ پھل۔ اور اُن کے لیے ان بہشتوں میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ﴿۲۵﴾

گزشتہ سے پیوستہ

سورۃ کے ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے "اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ" کا جواب

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ سے دیا۔ پھر انسانوں کے تین گروہ بیان فرمائے۔ پہلا مومنین، متقین کا گروہ۔ اور اس کے اوصاف بیان فرمائے۔ اس کے بعد دوسرے گروہ کفار کا ذکر کیا جو ظاہراً اور باطناً اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کے دین اور قیامت کے منکر ہیں اس کے بعد تیرہ ۱۳ آیات میں منافقین کا حال ذکر کیا۔ جو سب سے زیادہ خطرناک گروہ ہے ان کی علامات کارنامے اور ان کی ذہنیت کا بیان ہوا۔ اس کے بعد مثالوں کے ذریعے ہر دو قسم کے منافقوں کی نشاندہی کی۔ جو کفر میں پکے ہو چکے ہیں یا پھر ابھی متردد ہیں۔ اور پھر ان کے بُرے انجام کا بھی ذکر فرمایا۔

سورۃ بقرہ دو سو چھیاسی ۲۸۶ آیات کی سب سے لمبی سورۃ ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے مکی زندگی میں جس قدر سورتیں نازل ہوئیں اور ان میں جتنی تعلیم دی گئی۔ سب کا خلاصہ اس سورۃ میں آگیا ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت سے احکام اس میں آگئے ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے نظام کو مجمل طور پر اس میں بیان فرما دیا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلی بنیادی تعلیم جس پر تمام کُتب آسمانی متفق ہیں اس کا حکم دیا کہ " يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ" یعنی عبادت خالصتاً اللہ تعالیٰ ہی کی کرنا۔ اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اس کے بعد معرفت الٰہی پر زور دیا کہ اللہ تعالیٰ کی پہچان ضروری ہے۔ اس کے بغیر عبادت بھی کسی کی کارآمد نہیں۔ مشرکین اور یہود و نصاریٰ اگرچہ خدا تعالیٰ کو مانتے تھے۔ مگر صحیح پہچانتے نہیں تھے۔ اسی لیے وہ ناکام ہوئے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کی پہچان اس کی ذات سے نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ انسانی عقل و فکر سے بلند ہے، وہاں تک کسی کی رسائی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جو عالم جبروت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا پہچاننا بھی بڑا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت کی پہچان اس کی مخلوق اور اس کی مصنوعات میں غور کرنے سے ہوتی ہے۔ جب کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کو پہچان لیتا ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو بھی پہچان لیتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان صفات کا ذکر کیا "رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ" تمہارا رب وہ ہے۔ جس نے تمہیں پیدا کیا۔ اس کے سوا نہ کوئی خالق ہے نہ قادرِ مطلق ہے اور نہ علیم کُل ہے۔ عبادت کے لائق وہی ذات ہے۔ جو ان صفات کی مالک ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ربوبیت اور خالقیت کو بیان کیا۔ کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے کس طرح زمین کو تمہارے لیے بچھونا اور فرش بنا دیا۔ اور آسمان کو چھت کی مانند کھڑا کر دیا۔ آسمان سے پانی اتار کر پھلوں کے

ذریعے تمہاری روزی کا سامان مہیا کردیا۔ لہذا عبادت صرف اسی کی کرو۔ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا " کسی چیز میں بھی خدا کا شریک نہ بناؤ۔ تم جانتے ہو کہ خدا کے سوا دوسرا کوئی کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ سارے محتاج اور اس کی عاجز مخلوق ہیں، خواہ وہ انسان ہوں۔ جن ہوں یا فرشتے۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی ان آیات میں چار عمدہ مضامین کا ذکر کیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کہ یہ بنیادی مسئلہ ہے۔ اس کے بعد رسالت ہے۔ کہ نبی پر ایمان لائے بغیر اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے اوامر اور نواہی کا علم نہیں ہوسکتا۔ بڑے بڑے یونانی حکماء محض اس لیے گمراہ ہوئے کہ انہوں نے نبیوں کی اتباع کی ضرورت کو محسوس نہ کیا۔ وہ تو کہتے تھے کہ یہ تو جاہل لوگوں کے لیے ضروری ہے۔ ہم تو بڑے عقلمند ہیں۔ تیسرا مضمون خود قرآن پاک کی صداقت ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اور چوتھا مضمون قیامت پر ایمان ہے۔ نیک و بد اعمال کی جزا و سزا قیامت پر منحصر ہے۔ لہذا اس پر بھی ایمان لانا ضروری ہے

قرآن پاک خاص معجزہ ہے

ان حالات میں قرآن پاک اور پیغمبر علیہ السلام کا اکٹھا تذکرہ فرمایا ہے وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا اگر تمہیں اس چیز کے بارے میں شک ہے۔ جو ہم نے اپنے بندے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے۔ کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے۔ گویا اس کلام الٰہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے نبی کی نبوت کی تصدیق مطلوب ہے۔ نبی دعویٰ کرتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا فرستادہ ہوں۔ تو اس کی تصدیق کے لیے کسی معجزہ کا ہونا ضروری ہے۔

احادیث میں حضور علیہ السلام کے تین ہزار سے زیادہ معجزات کا ذکر آتا ہے۔ مگر قرآن پاک حضور علیہ السلام کا خصوصی معجزہ ہے۔ آپ نے فرمایا[1] اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو کوئی نہ کوئی خصوصی معجزہ عطا فرمایا ہے۔ پھر جس کی قسمت میں تھا وہ ایمان لے آیا۔ فرمایا میرا خصوصی معجزہ وحی الٰہی ہے۔ جس کے ذریعے قرآن پاک جیسا بے مثال معجزہ عطا ہوا۔ اسی لیے آپ نے ارشاد فرمایا اَرْجُوْ اَنْ اَكُوْنَ اَكْثَرَهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ یعنی مجھے امید ہے کہ قیامت کے روز سب سے زیادہ پیروکار میرے ہوں گے۔ کیونکہ میرا خصوصی معجزہ پائیدار اور دائمی ہے باقی پیغمبروں کے معجزات عارضی تھے

---

[1] مسلم ص ۸۶ ج ۱

جو وقت کے ساتھ ختم ہو گئے۔ مگر میرا معجزہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا لاٹھی کا معجزہ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا معجزہ عارضی معجزات تھے۔ جو وقت گذرنے کے ساتھ ختم ہو گئے مگر حضور علیہ السلام کا معجزہ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔

عبد باعزت لفظ ہے

اس آیت میں حضور علیہ السلام کے لیے عبد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو کہ بڑا باعزت لفظ ہے نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا کسی پیغمبر کی عبدیت کا اظہار اس کی بہت بڑی صفت ہے کیونکہ کامل درجے کی عبدیت انبیاء کرام علیہم السلام میں ہوتی ہے۔ اور پھر تمام نبیوں میں حضور علیہ السلام اکمل ترین بندے ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قرب نصیب ہے۔ قرآن پاک میں جہاں بھی عبد کا لفظ آیا، وہاں پر خاص انعام کا ذکر ہے۔ جیسے "سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ" دوسری جگہ فرمایا "نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِہٖ" ایک اور جگہ ارشاد ہے "فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰى" الغرض یہ عبد کا لفظ نہایت اعلیٰ مقام کا حامل ہے نماز میں جب تک کوئی اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ نہ کہے۔ اس کی نماز کامل ہی نہیں ہوتی۔ تمام انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں۔ نہ تو خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ نہ اوتار ہیں اور نہ خدا نے ان میں حلول کیا ہے۔ نہ ان میں الوہیت کی صفت پائی جاتی ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے اس کے عبد یعنی بندے ہیں۔ معبود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

بعض لوگ جہالت کی وجہ سے غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ انبیاء علیہم السلام بشر یا انسان نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان ہونا فخر کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ" میں تو مٹی سے انسان جیسی برگزیدہ ہستی کو پیدا کرنے والا ہوں۔ بشر ہونا کوئی بے عزتی کی بات نہیں ہے۔ خاص طور پر عبدیت تو بہت اعلیٰ صفت ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ عطا کر دے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اندر تو عبدیت والی بات ہی نہیں پائی جاتی۔ ہماری عبدیت کی حالت خراب ہے۔ ہم گندے انسان ہیں۔ جو گناہوں سے آلودہ ہیں۔ جنہیں عبدیت کا مقام حاصل ہے وہ تو پاکیزہ نفوس ہیں جو ہر وقت خدا تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت میں مشغول رہتے ہیں۔

قرآن پاک بطور چیلنج

خود قرآن پاک اس بات کا گواہ ہے۔ کہ مشرکین اسے خدا تعالیٰ کا کلام ماننے کے لیے

تیار نہ تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال کے رد کے طور پر قرآن پاک میں تین قسم کی آیات نازل فرمائیں۔ اولاً سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا کہ یہ قرآن پاک کسی انسان کا وضع کردہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ انسان کے بس کی بات ہے۔ بلکہ "لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا" یعنی تمام انسان اور تمام جن مل کر بھی اس قرآن پاک کی مثل لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے۔ اگرچہ یہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔ گویا یہ ساری مخلوق عاجز ہے۔ اس بات سے کہ قرآن پاک جیسا کوئی کلام پیش کر سکیں۔ دوسری جگہ فرمایا۔ کہ اگر تمہیں اس کلام پاک کے منجانب اللہ ہونے میں کسی قسم کا شک ہے یعنی یہ کہ یہ انسانی کلام ہے تو "فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ" تو اس جیسی دس سورتیں ہی بنا کر لے آؤ۔ خواہ چھوٹی چھوٹی ہی ہوں۔ پتا چل جائے گا۔ کہ واقعی یہ خدا تعالیٰ کا کلام نہیں ہے۔ بلکہ کوئی انسان بھی ایسی چیز پیش کر سکتا ہے۔ مگر کوئی بھی اس چیلنج کا جواب نہ دے سکا۔ اب تیسرے نمبر پر آیت پاک میں آخری چیلنج دیا جا رہا ہے۔ کہ اگر تم کو اس کلام پاک میں شک ہے۔ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ تو اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لے آؤ چاہے وہ تین آیات کی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ ہی کیوں نہ ہو۔

امام ابوبکر جصاص چوتھی صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں[1]۔ کہ قرآن پاک کے اس چیلنج کو صدیاں گذر جانے کے باوجود کسی نے اس کا جواب دینے کی جرأت نہیں کی۔ اور اگر مسیلمہ کذاب جیسے کسی شخص نے حماقت کی تو اُسے منہ کی کھانی پڑی۔ اس کے ہم عصر کافروں نے اس کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ کہ تم پر لعنت ہو۔ کیا تمہارا وضع کردہ کلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والے کلام کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ قرآن پاک کا یہ اعجاز چودہ صدیاں گذرنے کے باوجود قائم و دائم ہے۔ اور آج تک کوئی ایک سورۃ بھی بنا کر پیش نہیں کر سکا۔

عام مفسرین کرام فرماتے ہیں[2]۔ کہ یہ چیلنج قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت کے لحاظ

---

[1] احکام القرآن ص ۲۸ ج ۱ ، [2] تفسیر مظہری ص ۳۷ ج ۱

سے ہے۔ امام ابوبکر جصاصؒ بھی انہیں مفسرین میں شامل ہیں۔ جو فرماتے ہیں۔ کہ قرآن پاک ایسا فصیح و بلیغ کلام ہے۔ کہ اس جیسی فصاحت و بلاغت آج تک کوئی دوسرا کلام پیش نہیں کر سکا۔ مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر یہ چیلنج فصاحت و بلاغت تک ہی محدود ہے۔ تو پھر یہ خطہ عرب تک ہی محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ جہاں عربی زبان بولی جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن پاک عربی زبان میں نازل ہوا۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ چیلنج صرف عربوں کے لیے نہیں بلکہ تمام اقوام عالم کے لیے ہے۔ اگر اس چیلنج کو بین الاقوامی چیلنج تسلیم کیا جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ فصاحت و بلاغت کے علاوہ نہ کوئی دوسرا کلام اس جیسا ہے نہ اس میں دیے ہوئے نظام جیسا کوئی نظام دیا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہی اس جیسا کوئی دوسرا دستور پیش کیا جا سکتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ماحول جیسی اجتماعیت کوئی دوسرا قانون پیش نہیں کر سکتا۔ حتّٰی کہ سابقہ کتُب آسمانی اور صحیفے بھی ایسا اجتماعی نظام نہیں دے سکتے۔ جیسا قرآن پاک نے عطا کیا۔ اسی لیے فرمایا کوئی ایک سورۃ لا کر دکھاؤ۔ جو قرآن جیسی جامعیت پیدا کر سکے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ برصغیر کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ صرف سولہ سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم کی طرف راہنمائی فرمائی۔ اور آپ سکھ مت چھوڑ کر اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے والد محترم شیخ حبیب اللہ حضرت سندھیؒ کے دوست تھے اور آپ کے ساتھ ہی اسلام لائے۔ رشتے کے لحاظ سے حضرت مولانا سندھیؒ حضرت مولانا لاہوریؒ کے خسر تھے۔ تو مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے[1]۔ کہ دنیا بھر کی اقوام اگر انصاف کی نظر سے دیکھیں تو اُن پر واضح ہو جائے گا۔ کہ جو پروگرام اور نظام عدل اسلام اور قرآن پاک نے پیش کیا ہے۔ دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا عیسائی یا یہودی۔ انہیں یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی۔ کہ اسلام جیسا اٹل مضبوط اور غیر تغیر پذیر قانون کہیں سے نہیں مل سکتا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں[2]۔ کہ قرآن پاک کی چھوٹی سی سورۃ "وَالْعَصْرِ" اتنی جامع سورۃ ہے۔ کہ ساری کائنات کی ہدایت کے لیے ہی کافی ہے۔ بشرطیکہ بنی نوع انسان اس

---

[1] سرگزشت کابل صفحہ ۸

[2] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۵۴۷ جلد ۴

پر غور و فکر کر کے اس سے راہنمائی طلب کریں۔

الغرض! فرمایا اگر ہمارے نازل کردہ کلام میں تمہیں کوئی شک ہے تو اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ۔ صرف یہی نہیں بلکہ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اور اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ کے علاوہ اپنے گواہ بھی بلا لو۔ یعنی خود بھی آجاؤ اور اپنے دیگر مددگار اور حمایتی بھی بلا لو۔ مگر تم اس کلام جیسی ایک سورۃ بھی پیش نہیں کر سکو گے۔ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام نہیں ہے تو اس چیلنج کو قبول کرو۔ یہ قرآن پاک عربی زبان میں ہے۔ یہ تمہاری مادری زبان ہے۔ حضور علیہ السلام نے اسی تمہارے ماحول سے عربی زبان سیکھی ہے۔ آپ مکے میں رہے ہیں۔ بادیہ بنی بکر میں۔ یہ اسی علاقے کی زبان ہے اگر حضور علیہ السلام خود کلام بنا سکتے ہیں۔ تو پھر تم بھی کوئی سورۃ بنا کر دکھاؤ۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں عربی زبان اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ اس انتہا پر پہنچنے کے بعد تنزل کی ہی توقع کی جا سکتی ہے۔ مگر کسی شاعر نے قرآن پاک کی مثل لانے کی جرأت نہیں کی۔ جو بھی قرآن پاک کی کوئی آیت سنتا تھا۔ دم بخود رہ جاتا تھا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت انیس رضی اللہ عنہ کہتے تھے[1] کہ میں شاعروں کا کلام بھی جانتا ہوں اور ساحروں کا بھی۔ اور کاہنوں کا بھی۔ میں نے کلام الٰہی کا ان سب کلاموں کے ساتھ موازنہ کیا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی قرآن پاک کا مقابل نہیں۔ خدا کا کلام تمام کلاموں سے منفرد اور ممتاز ہے۔

منکرین قرآن کی سزا

قرآن پاک نے چیلنج پیش کرنے کے بعد پھر خود ہی اس کا جواب دیا فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا پس اگر تم نہ کر سکے اور تم ہرگز نہیں کر سکو گے۔ گویا پیشگوئی بھی کر دی، کہ تم اس کلام کی مثل ہرگز پیش نہیں کر سکو گے۔ تو پھر خبردار فرمایا فَاتَّقُوا النَّارَ اس آگ سے بچو الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ گویا دوزخ کی آگ میں اس کلام کے مکذبین خود کھانا جلیں گے۔ اور پتھر جلانے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئلے سے جلائی گئی آگ سخت ہوتی ہے۔ اسی طرح پتھر سے جلنے والی آگ شدید تر

---

[1] مسلم ج ۲ ص ۲۹۶

ہوگی۔ یا پتھر سے مراد وہ پتھر کے بُت ہیں۔ جن کی پوجا کی جاتی تھی۔ وہ بھی دوزخ کی آگ میں جلائے جائیں گے[1]۔ فرمایا یہ ایسی آگ ہے اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ جو کفار کے لیے تیار کی گئی ہے۔ کفار لوگ اسی آگ کا ایندھن بنیں گے۔

ایمانداروں کے لیے بشارت

اس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے ترہیب و ترغیب کو ساتھ ساتھ بیان فرمایا ہے۔ کفار کا انجام کا انجام بیان کرنے کے بعد ایمانداروں کے لیے بشارت سنائی وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ آپ ان لوگوں کو خوشخبری سُنا دیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کی رسالت پر ایمان لائے۔ کلام الٰہی کو سچا کلام تسلیم کیا۔ قیامت کو برحق جانا اور پھر اس کے ساتھ شائستہ کام بھی انجام دیے یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسے فرائض پورے کیے۔ صدقہ و خیرات کیا۔ حلال و حرام میں امتیاز روا رکھا۔ کہ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے باغات تیار کر رکھے ہیں۔ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔

پھلوں میں مشابہت

فرمایا كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا جب وہ ان بہشتوں میں پھلوں سے روزی دیے جائیں گے قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ تو کہیں گے یہ تو وہی ہے۔ جو ہمیں اس سے پہلے دی گئی وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا اور وہ اس میں دیے جائیں گے ایک دوسرے کے مشابہ پھل، مقصد یہ کہ ایک دفعہ جنتیوں کو پھل پیش کیے جانے کے بعد جب دوسری دفعہ ان سے ملتے جلتے پھل دیے جائیں گے، تو جنتی لوگ کہیں گے کہ یہ وہی پھل ہیں جو ہمیں اس سے پہلے دیے گئے تھے، مگر جب وہ انہیں کھائیں گے۔ تو ان کا ذائقہ پہلے پھلوں سے بالکل مختلف ہوگا۔ یا اس کا معنی یہ ہے۔ کہ جنت کے پھل دنیا کے پھلوں سے مشابہ ہوں گے اور جنتی انہیں دیکھ کر دنیا کے پھلوں پہ قیاس کریں گے۔ مگر ان دونوں قسم کے پھلوں میں ذائقے کے اعتبار سے بڑا تفاوت ہوگا۔

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ پھلوں میں مشابہت کی ایک اور توجیہ یہ ہے۔ کہ فطرت سلیمہ رکھنے والے اس دنیا میں جب نیکی اور اطاعت کے کام کرتے تھے

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صہ ۱۳۲ پارہ ۱، ابن کثیر صہ ۶۱ ج ۱، [2]

تو انہیں لذت محسوس ہوتی تھی۔ اس کے نتیجے میں جب بہشت میں انہیں پھل دیے جائیں گے تو وہ لوگ کہیں گے کہ ان میں وہی لذت پائی جاتی ہے۔ جو دنیا میں نیکی کرتے وقت حاصل ہوتی تھی۔

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے۔[1] کہ جنت کی زمین خالی ہے سُبحَانَ اللّٰہِ وَالحَمدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکبَرُ کہنا اس خالی زمین میں درخت لگانے کے مترادف ہے۔ جب کوئی مومن دل کی گہرائیوں سے اَلحَمدُ لِلّٰہِ کہتا ہے۔ تو جنت میں اس کے لیے ایک درخت لگا دیا جاتا ہے۔ جب اس درخت کا پھل انہیں میسّر ہو گا۔ تو وہ کہیں گے کہ اس کا ذائقہ تو بالکل وہی ہے جیسا ذائقہ ہمیں دنیا میں نیکی کی توفیق پر حاصل ہوتا تھا۔ اسی نیکی کے صلے میں آج ہمیں جنت میں یہ نعمتیں حاصل ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا میں آرام و راحت کا جو بھی تصور کیا جا سکتا ہے۔ وہ سب جنت میں حاصل ہو گا۔ خواہ وہ لباس کی صورت میں ہو خوراک کی صورت میں ہو یا اعلیٰ مقام کی صورت میں۔ ہر چیز وہاں حاصل ہو گی اور اسی کو پھلوں کی مشابہت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پاکیزہ بیویاں

جنّتیوں کے ایک اور انعام کے متعلق فرمایا وَلَھُم فِیھَآ اَزوَاجٌ مُّطَھَّرَۃٌ اور ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ ان مادی نعمتوں کے علاوہ دوسرے مقام پر روحانی نعمتوں کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا وَلَکُم فِیھَا مَا تَشتَھِیٓ اَنفُسُکُم "اس میں تمہارے لیے ہر وہ چیز ہو گی جس کے لیے تمہارا جی چاہے گا۔ جنت کی نعمتوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہو گی۔ کہ وہ نہ ختم ہونے والی ہونگی۔ دنیا میں کسی چیز کے میسّر آجانے کے بعد بھی ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے۔ کہ یہ کسی وقت چھین بھی سکتی ہے۔ یا ختم ہو سکتی ہے۔ مگر جنت کی نعمتیں دائمی ہوں گی۔ ان کے لیے زوال کا کوئی خطرہ نہیں ہو گا اسی لیے فرمایا کہ جنتی لوگ کسی محدود عرصے کے لیے جنت کی نعمتوں سے مستفید نہیں ہوں گے۔ بلکہ وَھُم فِیھَا خٰلِدُونَ اور وہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیں رہیں گے۔ اور ان کے انعامات میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔

ان آیات میں قرآن پاک پر ایمان لانے والوں کا انجام بھی بیان فرما دیا اور اس کی تکذیب کرنے والوں کے حشر سے بھی اللہ تعالیٰ نے آگاہ کر دیا۔

---

[1] ترمذی صفحہ ۴۹۹

درس سیزدہم ۱۳ (آیت ۲۶ تا ۲۷)

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَۃً فَمَا فَوۡقَہَا ؕ
فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۚ وَ اَمَّا
الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَیَقُوۡلُوۡنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِہٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ
بِہٖ کَثِیۡرًا ۙ وَّ یَہۡدِیۡ بِہٖ کَثِیۡرًا ؕ وَ مَا یُضِلُّ بِہٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِیۡنَ
۲۶ الَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَہۡدَ اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِہٖ ۪ وَ یَقۡطَعُوۡنَ
مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ اُولٰٓئِکَ
ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ۲۷

وقف لازم

ترجمہ:- بیشک اللہ تعالیٰ نہیں شرماتا اس بات سے کہ بیان کرے مثال مچھر کی یا اس سے بڑی۔ بہرحال جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان کے رب کی طرف سے اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، پس وہ کہتے ہیں۔ کیا ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے اس مثال کے ساتھ؟ اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے اس کے سبب سے بہتوں کو اور ہدایت دیتا ہے اس کے سبب سے بہتوں کو۔ اور نہیں گمراہ کرتا اس کے سبب سے مگر فاسقوں کو (۲۶) وہ جو توڑتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کے عہد کو اس کو مضبوط کرنے کے بعد اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اور زمین میں فساد کرتے ہیں۔ یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ (۲۷)

گذشتہ سے پیوستہ

پچھلی آیتوں میں اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم کی حقانیت، صداقت اور اس کے منزل من اللہ ہونے اور حضور علیہ السلام کی رسالت کا ذکر کیا تھا۔ اس سے پہلے توحید اور رد شرک کے متعلق بیان تھا۔ لوگوں کے اس خیال کی تردید تھی کہ یہ قرآن خدا تعالےٰ کا کلام نہیں، بلکہ پیغمبر علیہ السلام کا اپنا وضع کردہ ہے۔ اور پھر اسی ضمن میں قرآن پاک کے چیلنج کا ذکر تھا کہ

تمہیں اس کے منزل من اللہ ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ ہے۔ تو اس جیسی ایک ہی سورۃ بنا کر لاؤ۔ اس کے ساتھ پیش گوئی کر دی گئی تھی۔ کہ قیامت تک تم اس قرآن کی مثل نہیں لا سکو گے لہٰذا یاد رکھو کہ جب ایسا کلام پیش کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ تو پھر اس کلام سے انکار کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ تم ایسی دوزخ میں ڈالے جاؤ گے۔ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ اس کے ساتھ ایمان والوں کو بشارت تھی۔ کہ آخرت میں وہ کامیاب ہوں گے۔ اور ان کا انجام نہایت اچھا ہوگا۔

حقیر چیزوں کی مثالیں

کفار قرآن پاک کے متعلق یہ اعتراض پیش کرتے تھے۔ کہ اس میں بعض چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں کا ذکر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے کلام کے شایانِ شان نہیں۔ کہیں مکھی کا ذکر ہے۔ اور کہیں مکڑی کا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ اس کا کلام بھی بہت اعلیٰ باتوں پر مشتمل ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ ایک عام محاورہ ہے کَلَامُ الْمُلُوْكِ مُلُوْكُ الْكَلَامِ یعنی بادشاہوں کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات بلند و برتر ہے۔ اسی طرح اس کا کلام بھی اعلیٰ و ارفع ہونا چاہیئے۔ اس میں مکھی۔ مچھر جیسی ادنیٰ چیزوں کا ذکر نہیں ہونا چاہیئے۔

اس اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا یعنی اللہ تعالیٰ کی شان اور عظمت کے یہ ہرگز منافی نہیں کہ وہ مچھر یا اس سے کسی بڑی چیز کی مثال بیان فرمائے۔ کیونکہ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی مثالیں انسانوں کے سمجھانے کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔ یہ تو بعض لوگوں کی عقل یا انکے عرف کی کمزوری کی دلیل ہے۔ کہ وہ بعض حقیر چیزوں کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھتے۔ مگر حکمت کے اصول کے تحت ایسی چیزوں کے بیان کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی کسی سے خوفزدہ ہو کر یا کسی کو خوش کرنے کے لیے کسی چیز کا بیان روکا جا سکتا ہے۔ حقیر چیزوں میں بڑے مفید پہلو بھی ہوتے ہیں قرآن پاک میں مکھیوں اور مکڑی کا ذکر ہے۔ اور ان کی مثال دے کر بڑی مفید باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ لہٰذا ایسی مثالوں کے ترک کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

اس قسم کی مثالیں اکثر حکماء کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ خود عرب کہتے ہیں مَا الْبَقُّ وَشَحْمُهٗ یعنی کیا مچھر اور کیا اس کی چربی۔ اسی طرح مَا الْجُرَذُ وَطَعْمُهٗ یعنی کیا

ٹڈی اور کیا اس کا گوشت وغیرہ۔ حضور علیہ السلام نے بھی تفہیم حقیقت کے لیے مثال بیان فرمائی ہے۔ مسند احمد، ابن ماجہ اور ترمذی شریف میں یہ الفاظ موجود ہیں[1] لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَزِنُ عِنْدَ اللهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقَى كَافِرًا مِنْهَا قَطْرَةً اَبَدًا یعنی اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا کی قدر و قیمت ایک مچھر کے پَر کے برابر ہوتی تو کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی کبھی بھی عطا نہ فرماتے۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کا نافرمان ہے۔ یہ مچھر کی مثال آپ نے اس لیے بیان فرمائی کہ ساری دنیا کی قیمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنی بھی نہیں جتنی مچھر کے ایک پَر کی ہوتی ہے۔ اسی لیے تو کفار اس دنیا میں آرام و عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ کچھ نہیں۔ آخرت میں جب ان کا حساب کتاب پیش ہوگا۔ تو سخت سزا میں مبتلا ہوں گے۔

مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے[2]۔ کہ اُمّ سلیمؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت کیا اور تمہید کے طور پر عرض کیا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيْ مِنَ الْحَقِّ یعنی اللہ تعالیٰ تو حق بات سے نہیں شرماتے۔ میں آپ سے مسئلہ دریافت کرنا چاہتی ہوں۔ کیا عورت کو بدخوابی ہو جائے تو اس پہ غسل واجب ہوتا ہے یا نہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا نَعَمْ يَا اُمَّ سُلَيْمٍ اِذَا رَأَتِ الْمَاءَ، ہاں جب مادہ خارج ہو جائے تو اس پہ غسل آتا ہے۔ جس طرح مرد کو احتلام ہوتا ہے اسی طرح عورت کو بھی بدخوابی ہوتی ہے۔ الغرض اس حدیث میں بھی یہی الفاظ آتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ حق بات کو ظاہر کرنے سے نہیں شرماتا۔

حیا کی مختلف قسمیں

حیا انسان کی اُس انکساری اور شکستگی کو کہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے کوئی شخص قبیح امور سے باز آجاتا ہے۔ حیا انسانوں سے بھی ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ سے بھی ہوتی ہے۔ اسی لیے جب کوئی شخص بُرائی کا ارادہ کرتا ہے۔ تو وہ چھپ کر کرتا ہے۔ کیونکہ اُسے انسانوں سے حیا آتی ہے کہ اگر وہ دیکھ لیں گے تو کیا ہوگا۔ خدا تعالیٰ اگرچہ نظر نہیں آتا۔ مگر جب یہ یقین ہو جائے کہ اُس کی نظر سے کوئی فعل پوشیدہ نہیں ہے۔ تو پھر ذرّہ بھر بھی خوفِ خدا رکھنے والا شخص فعل قبیح کے ارتکاب کے وقت اللہ تعالیٰ سے حیا کرے گا۔ اگرچہ کوئی دوسرا انسان اس کو نہ دیکھ رہا ہو۔

---

[1] مسند احمد ص ، ابن ماجہ ص ۳۰۲ ، ترمذی ص ۳۳۷ [2] بخاری ص ۴۲ ج ۱ ، مسلم ص ۱۴۶ ج ۱

حیا کی ایک قسم حیا عبودیت ہے۔ ایک عابد و زاہد اپنی تمام قویٰ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف کرنے کے باوجود یہی سمجھتا ہے۔ کہ وہ اس کی عبادت کا حق ادا نہیں کر سکا۔ اللہ تعالےٰ نے اس پر جس قدر انعامات کیئے ہیں۔ اگر وہ ساری عمر بھی عبادت میں لگا دے یعنی پیدائش کے وقت ہی اللہ تعالیٰ اس کو فہم عطا کرے اور سجدے میں گر جائے اور ساری عمر اسی ایک سجدہ میں گذار دے۔ اور وہیں اس کی موت آجائے۔ تو وہ بارگاہ رب العزت میں عرض کریگا۔ کہ مولا کریم! میں تیری عبادت کا حق ادا نہیں کر سکا۔ حیا عبودیت اسی چیز کا نام ہے۔

حیا خود اپنے نفس سے بھی ہوتی ہے۔ جب اُسے کوئی شخص دیکھنے والا نہ ہو، تو بعض اوقات انسان خود اپنے جی میں شرم محسوس کرنے لگتا ہے۔ کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کسے دھوکا دے رہا ہوں۔ یہ نفس کی حیا ہے۔

حیا کی ایک قسم حیا کرم ہے۔ خود حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ ہے۔ کہ آپ نے بعض صحابہؓ کو کھانے پر بلایا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد وہ لوگ وہیں بیٹھ کر بات چیت کرنے لگے۔ یہ چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار گذری۔ مگر آپ نے حیا کرم کی وجہ سے انہیں زبان مبارک سے کچھ نہ کہا۔ بلکہ اٹھ کر باہر چلے گئے تاکہ یہ لوگ بھی چلے جائیں۔ مگر وہ بیٹھے رہے اور باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ حضور علیہ السلام پھر تشریف لے آئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیات نازل فرمائیں۔ کہ "جب نبی علیہ السلام کے گھر پر کھانا کھانے کے لیے جاتے ہو، تو وہاں بیٹھ کر بات چیت میں وقت نہ گذارو۔ اللہ تعالیٰ کا نبی تو حیا کرم کی وجہ سے تمہیں نہیں کہتا۔ مگر تم خود ہی احساس کرو۔ اور کھانا کھا کر واپس چلے جایا کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔"

ہدایت اور گمراہی

فرمایا جب اللہ تعالیٰ اس قسم کی مثالیں بیان فرماتے ہیں۔ تو مومن اور کافر پر ان کے مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ایماندار لوگ بخوبی جانتے ہیں۔ کہ یہ چھوٹی چھوٹی مثالیں بے معنی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ اُن کے رب کی طرف سے حق ہے، ان کا بیان کرنا حکمت کے منافی نہیں۔ لہٰذا وہ اس سے بُرا نہیں مناتے وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا جن لوگوں نے کفر کیا فَيَقُوْلُوْنَ پس وہ کہتے ہیں مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ اللہ تعالیٰ نے اس مثال کے ساتھ کیا ارادہ کیا ہے۔ وہ لوگ طعن کرتے ہیں۔

اور بطور استہزاء اور تحقیر کے کہتے ہیں۔ کہ ایسی معمولی چیزوں کی مثال بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کو کیا حاصل ہوا۔ اگر مثال ہی بیان کرنا تھی تو کسی اعلیٰ چیز کی بیان کی ہوتی مکھی اور مچھر کی مثال کی کیا حیثیت ہے۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس مثال کو معمولی چیز نہ سمجھو۔ کیونکہ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا اللہ تعالیٰ اسی مثال کے ذریعے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔ ایسی بات بعض لوگوں کے ذہن میں فٹ نہیں بیٹھتی۔ جس کی وجہ سے وہ طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں حالانکہ نہ تو وہ حکمت کے اصولوں سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں کلام کی حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ لہٰذا فضول اعتراض پیش کرتے ہیں اور گمراہ ہو جاتے ہیں۔ فرمایا ایسی مثالیں صرف گمراہ ہی نہیں کرتیں بلکہ وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا اللہ تعالیٰ انہیں مثالوں کے ذریعے ہدایت بھی دیتا ہے۔ جو لوگ مثال کے ذریعے بات کو آسانی سے سمجھ جاتے ہیں، وہ حقیقت کو پا لیتے ہیں۔ لہٰذا ہدایت یافتہ ہو جاتے ہیں۔ فرمایا تاہم وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ یعنی گمراہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو فاسق ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہیں۔ کوئی ایماندار اور منصف مزاج اور حق کا طالب گمراہ نہیں ہوتا۔

فاسق کا معنیٰ

فسق کا معنیٰ خروج یا باہر نکلنا ہے۔ عربی میں کہتے ہیں فَسَقَتِ الرُّطَبَةُ عَنْ قِشْرِهَا کھجور اپنے چھلکے سے باہر آگیا یا کہتے ہیں فَسَقَتِ النَّوَاةُ مِنَ الثَّمَرَةِ گٹھلی کھجور سے باہر نکل گئی۔ اسی اصطلاح میں فاسق اس شخص کو کہتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے باہر نکل جاتا ہے۔ شریعت کے عرف میں فاسق دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے پہلے معنیٰ میں فاسق اس شخص کو کہتے ہیں، جس کے دل میں ایمان موجود ہے۔ مگر وہ اطاعت کی بجائے صغیرہ یا کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایسا شخص مسلمان ہے۔ اور اس کے متعلق امید ہے۔ کہ اُسے آخرت میں شفاعت نصیب ہو جائے گی۔ اور وہ نجات پا جائے گا۔ کیونکہ بہر حال وہ مسلمان ہے۔ مگر نافرمان ہے وہ نماز کو فرض سمجھتا ہے مگر پڑھتا نہیں۔ زکوٰۃ کو فرض جان کر ادا نہیں کرتا۔ گویا نیکی کو صحیح سمجھتے ہوئے اس کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ شریعت کی اصطلاح میں فاسق کہلاتا ہے۔ دوسری قسم کا فاسق وہ ہے۔ جو کفر میں حد سے بڑھ جائے۔ سرکش ہو جائے۔ جیسا کہ اعتقادی منافقوں یا سخت کافروں کے متعلق فرمایا "أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ" ان یہودیوں کو فاسق کہا گیا ہے۔ جو بڑے سرکش، ضدی،

اور نافرمان ہیں اور کفر میں بڑے پکے ہیں۔ فاسق کے یہ دونوں معنے قرآن پاک میں استعمال ہوئے ہیں۔

اس مقام پہ بطور تشریح یوں کہہ سکتے ہیں کہ فاسق وہ ہیں۔ جو قرآن پاک کی بیان کردہ مثالوں سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ مقصد یہ کہ جو شخص قرآن کے پروگرام کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ فاسق ہے۔ قرآن پاک کا پروگرام یہ ہے۔ کہ "الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾"

نیز قرآن پاک کا پروگرام یہ ہے "يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ" فلاح کا پروگرام تو یہ ہے مگر جو شخص اس کے خلاف کرے گا۔ وہ فاسقوں کی فہرست میں رکھا جائے گا۔

یہود و منافقین کی عہد شکنی

آگے اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی تشریح کرتے ہوئے ان کی تین بری خصلتوں کا ذکر کیا ہے پہلی بات یہ ہے کہ "الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ" فاسق وہ لوگ ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑتے ہیں اس کو پختہ کرنے کے بعد۔ اگر وہ اشخاص منافق ہیں تو وہ زبان سے اقرار کرتے ہیں کہ "اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" ہم اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لائے ہیں۔ مگر یہ عہد کو پورا نہیں کرتے۔ عملی طور پر ان کا ایمان نہ اللہ تعالیٰ کی ذات پہ ہے اور نہ آخرت کے دن پہ۔ اور اگر فاسقوں سے مراد یہود ہیں۔ تو اُن سے تو پہلی کتابوں میں عہد لیا گیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نبیوں پر ایمان لائیں گے۔ اور خاص طور پہ نبی آخر الزمان پر ایمان لائیں گے۔ اس کا ساتھ دیں گے اور اس کی نصرت کریں گے۔ نیز یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر جو ہدایت نازل فرمائی ہے۔ اُسے چھپائیں گے نہیں۔ بلکہ ظاہر کریں گے۔ مگر ان لوگوں نے اس عہد کو توڑ دیا۔ گویا فاسقوں کی پہلی خصلت یہ بیان فرمائی۔ کہ وہ عہد کرنے کے بعد اُسکو توڑتے ہیں

عہد شکن لوگوں کا دوسرا گروہ معاند کافر ہیں یہی وہ لوگ ہیں۔ جن کے متعلق فرمایا "سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ" انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اُس عہد کو توڑا۔ جو ازل میں ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا تھا "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ سب نے بیک زبان ہو کر کہا تھا۔ "بَلٰى" اے مولا کریم! کیوں نہیں بیشک تو ہمارا رب ہے۔ اس عہد کی یاد دہانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف رسول بھیجے،

کتابیں نازل کیں مگر انہوں نے اس پختہ عہد کو توڑ دیا۔ لہٰذا یہ بھی عہد شکنوں کی صف میں شامل ہوئے ایک عام مومن جب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہتا ہے۔ تو وہ اللہ تعالےٰ کی وحدانیت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا عہد کرتا ہے۔ ان کے احکام کو تسلیم کرنے اور ان پر کاربند ہونے کا عہد کرتا ہے۔ مگر جب وہ اُس کے خلاف چلتا ہے۔ گویا عہد شکنی کرتا ہے۔ ایسا شخص بھی فاسق یا منافق کی فہرست میں لکھا جائے گا۔ عہد کی خلاف ورزی کرنا منافق کی واضح نشانی ہے۔

قطع رحمی — فاسقوں کی دوسری خصلت یہ بیان فرمائی وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اُسے قطع کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے تو قرابتداروں کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیا ہے۔ مگر یہ اس کے برخلاف قطع رحمی کے مرتکب ہوتے ہیں جیسے کافروں کے متعلق فرمایا ______ کہ وہ قطع رحمی کرتے ہیں۔ اور کسی مومن کے بارہ میں نہ تو عہد و پیمان کا خیال رکھتے ہیں اور نہ قرابت داری کو خاطر میں لاتے ہیں۔ بلکہ انہیں ہر طرح سے ایذا پہنچاتے ہیں۔ حالانکہ قطع رحمی بہت بڑا جرم ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے[۱]۔ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جو شخص جوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔ میں بھی اس کو جوڑوں گا۔ اور جو قطع کرتا ہے۔ میں بھی اس کو کاٹ دوں گا۔

صلہ رحمی — اللہ تعالیٰ نے صلہ رحمی کی بہت تاکید فرمائی ہے۔ رحم یعنی قرابت داری کو اپنے نام رحمٰن سے نکالا ہے۔ اور رحمٰن کا معنی بے حد مہربان ہے۔ لہٰذا ہر انسان کو اپنے رشتہ داروں کے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آنا چاہیئے۔ فرمایا "وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ" یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ اور قرابتداری کا خیال رکھو۔ صلہ رحمی بہت بڑا عمل ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کو بہت پسند ہے۔ اس میں انسان کے تمام حقوق آجاتے ہیں۔ جن کی ادائیگی کا اللہ تعالےٰ نے حکم دیا ہے۔ فرمایا[۲] اٰتِ کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ ہر حقدار کا حق ادا کرو۔ یہی صلہ رحمی ہے۔

فساد فی الارض — منافقین کی تیسری خصلت یہ بیان فرمائی۔ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وہ زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ فساد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اور کافر لوگوں کو ایمان سے

---

[۱] بخاری ص ۸۵۵ ج ۲، مسلم ص ۳۱۵ ج ۲، ترمذی ص ۲۸۵، [۲]

متنفر بناتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے۔ کہ لوگ ایمان نہ لائیں۔ اسی لیے تو وہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں۔ کیونکہ اس میں مکھی اور مچھر جیسی حقیر چیزوں کی مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ یہی وہ پراپیگنڈا ہے۔ جس کی بدولت وہ لوگوں کو ایمان سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ اور اسی کو فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ کفر شرک اور شرائع کو خراب کرنا۔ اللہ تعالیٰ کے قوانین کی خلاف ورزی کرنا فساد فی الارض ہے۔ زمین و آسمان کی اصلاح اطاعت سے ہوتی ہے۔ کفر شرک اور معاصی کی وجہ سے اسمیں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمام قسم کی قبیح رسوم بھی فساد فی الارض کے قبیل سے ہی ہیں، شرک، بدعت، ناچ گانا، عریانی اور فحاشی یہ سب قبیح رسوم ہیں۔ قبروں پر عرس منانا، قبر پرستی کو رواج دینا یہ بھی انہیں رسوم میں سے ہے۔ اور فساد فی الارض ہے۔ تیسری قابلِ ذکر بات یہ ہے۔ کہ منافق لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی بجائے اُس کے غضب کو دعوت دیتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے۔ کہ ان کی ہر خواہش پوری ہوجائے۔ ان کے کسی فعل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اور وہ اپنی من مانی کرتے رہیں۔ الغرض عہد شکنی، قطع رحمی، اور فساد فی الارض یہ تین بُری خصلتیں ہیں۔ جو فاسقوں یا منافقوں میں پائی جاتی ہیں اور جن سے اجتناب کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

فاسقین کی ناکامی

فاسقوں کی علامات بیان کرنے کے بعد فرمایا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔ ناکام و نامراد ہونے والے ہیں۔ یہ لوگ اپنی خصلتوں کی وجہ سے دنیا میں بھی ناکام ہیں۔ کیونکہ فساد فی الارض کی بدولت دنیا میں امن و سکون پیدا نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا یہ طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا رہیں گے اور آخرت میں ہمیشہ کے لیے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑیگا۔ اسی لیے فرمایا "خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ" یہ دنیا اور آخرت ہر جگہ کی ناکامی ہے۔ اور یہی بہت بڑی ناکامی ہے۔ ابتدائے سورۃ میں متقین کے متعلق فرمایا تھا۔ "اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۙ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" یعنی یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں اور یہی کامیاب ہیں۔ اس مقام پر فاسقین کے متعلق فرمایا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ یہی لوگ ناکام ہیں۔

---

[1] تفسیر بیضاوی صہ ۲۲ ج ۱

درس چہاردہم ۱۴ (آیت ۲۸ تا ۲۹)

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ
يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ ثُمَّ
اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾ ع ۳

ترجمہ: کس طرح تم کفر کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ، حالانکہ تم بے جان تھے پس اللہ تعالیٰ نے تم کو زندگی بخشی۔ پھر وہ تم پر موت طاری کرتا ہے۔ پھر وہ تم کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۲۸﴾ اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے پیدا کیا ہے۔ تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے سب۔ پھر وہ متوجہ ہوا آسمان کی طرف۔ پس برابر کر دیا ان کو سات آسمان۔ اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۲۹﴾

گزشتہ سے پیوستہ

اس سے پہلی آیات میں ان لوگوں کا رد فرمایا۔ جو قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے کا انکار کرتے تھے۔ کیونکہ اس کلام میں مچھر مکھی جیسی حقیر چیزوں کا بیان ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مچھر یا اس سے بھی کم تر چیز کی مثال بیان کرنے سے نہیں شرماتا۔ کیونکہ اس کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں ہوتی۔ بعض اوقات ادنیٰ چیزوں میں بھی اہم باتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے ایسی کسی چیز کے بیان سے اجتناب کرنا خلافِ حکمت ہوتا ہے۔ معترضین کا اس قسم کا اعتراض ان کی ناسمجھی کی دلیل ہے۔ البتہ ایمان والے خوب سمجھتے ہیں۔ کہ قرآن پاک ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔ ناسمجھ لوگ کہتے ہیں کہ ایسی حقیر چیز کی مثال بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کو کیا مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ایسی ہی مثال کے ذریعے وہ بہتوں کو ہدایت سے نوازتا ہے۔ اور بہتوں کو گمراہ کر دیتا ہے مگر گمراہ وہی لوگ ہوتے ہیں، جو نافرمان ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی تین خصلتیں بیان فرمائیں۔ کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد و پیمان کو توڑتے ہیں۔ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ یہ لوگ انہیں توڑتے ہیں۔ اور یہ لوگ زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ فرمایا یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ گویا قرآن کریم کا انکار، معاد کا انکار، رسالت کا انکار یا خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا اور اُس کی صفات کا انکار سب کا مآل و انجام ایک ہی ہے۔ ان سب باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ورنہ انسان کافر ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک چیز کا انکار بھی اللہ تعالیٰ کے انکار کے مترادف ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر

اس مقام پر اللہ تعالیٰ اپنی بعض نعمتوں کا ذکر کر کے انسان کو مخاطب فرماتے ہیں۔ کہ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ یہ انعام پانے کے باوجود تم اللہ تعالیٰ کی ذات کا کیسے انکار کرتے ہو۔ تمہارا انکار محض جہالت، ضد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر ہے ورنہ اس کے حق میں تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا "وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ" یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارتا ہے۔ یعنی شرک کرتا ہے۔ اُس کے پاس ایسا کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور اس کا حساب تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ یہی بات یہاں پر بیان کی گئی ہے۔ کہ تمہارے پاس کفر کرنے کی کون سی دلیل ہے كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ تمہارے لیے کفر کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ میں نہ صرف خدا تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے کا بیان ہے۔ بلکہ اسمیں ایمان لانے کی دوسری چیزیں بھی شامل ہیں۔ یعنی تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان کیوں نہیں لاتے اس کے کلام کا کیسے انکار کرتے ہو۔ اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کو کیوں نہیں مانتے۔ اور معاد پر تمہارا ایمان کیوں نہیں ہے۔ گویا كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ میں وہ تمام چیزیں آگئیں جن کا کفار انکار کرتے تھے۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں[1] کہ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ کا تعلق گذشتہ آیت "يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ" کے ساتھ ہے

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۹۷ ج ۱

وہاں پر بھی بعض انعامات کا تذکرہ فرمایا۔ کہ اے لوگو! اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا۔ تمہارے لیے زمین و آسمان کو پیدا کیا، پھر آسمان سے ہی پانی نازل کر کے زمین کو سیراب کیا اور تمہارے لیے پھل پیدا کیے۔ اس مقام پر موت و حیات اور زمین سے پیدا ہونے والی نعمتوں کا ذکر کر کے ایک دوسرے انداز سے بیان ہو رہا ہے کہ ان نعمتوں کے ہوتے ہوئے تم اللہ تعالےٰ کے ساتھ کس طرح کفر کرتے ہو۔

برخلاف اس کے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو مانتا ہے۔ اور اسی کی عبادت کرتا ہے۔ اس کے سامنے معرفتِ الٰہی کی لاکھوں کروڑوں عقلی اور نقلی دلیلیں موجود ہیں۔ اس کے پاس آسمانی کتابیں موجود ہیں، جو اس بات کی شہادت دیتی ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت انسان کے ذمے فرض ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[1] حَقُّ اللّٰہِ عَلَی الْعِبَادِ اَنْ یَّعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا یُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا یعنی اللہ تعالےٰ کا بندوں پر حق یہ ہے۔ کہ وہ اسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔

امام ابوحنیفہ رح فرماتے ہیں[2]۔ کہ کوئی شخص پہاڑ کی چوٹی پر زندگی بسر کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اُسے عقل و شعور جیسے اعلیٰ حواس سے نوازا ہے۔ وہ زمین و آسمان کے نظام کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اور اس کے باوجود وہ کفر کرتا ہے۔ تو پکڑا جائے گا۔ اُسے معافی نہیں مل سکتی۔ کیونکہ مشاہداتِ قدرت کو دیکھنے کے باوجود اگر وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لایا تو اس کی بدنصیبی ہے۔ گویا عقلی طور پر بھی اللہ تعالیٰ کو پہچاننا واجب ہے۔ ایک شخص عملاً نماز نہیں پڑھتا یا روزہ نہیں رکھتا مگر اللہ تعالےٰ کی وحدت پر ایمان ہے۔ تو اس کی بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر کفر کرنے کی صورت میں وہ قابلِ گرفت ہو گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ میں نے تمہیں عقل دی، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بخشی۔ تمہارے ارد گرد نشانیاں پھیلا دیں۔ اس کے باوجود تم نے ایمان کی بجائے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ لہٰذا تمہارا معاملہ ناقابلِ معافی ہے۔

موت و حیات تصرفِ الٰہی میں ہے

اسی لیے فرمایا۔ کہ تم ان تمام دلائل کے باوجود کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ تم اللہ تعالیٰ

---

[1] مسلم ص۴۴ ج ۱، [2] شرح فقہ اکبر ملا علی قاری ص۱۶۸ و ص۱۶۹ مطبع مجتبائی دہلی

کیساتھ کیسے کفر کرتے ہو۔ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا حالانکہ تم بے جان تھے۔ فَأَحْيَاكُمْ پس اللہ تعالیٰ نے تم کو زندگی بخشی۔ مطلب یہ کہ تم اپنے باپوں کی پشتوں میں بالکل بے جان چیز تھے۔ پھر اس نے تمہیں ماؤں کے رحموں میں قطرۂ آب یا نطفہ کی شکل میں منتقل کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمہیں زندگی بخشی اور تمہیں وجود جیسی نعمت عطا کی۔ گویا تمہیں نیستی سے ہستی میں تبدیل کیا۔ اس کے بعد پھر ایک وقت ایسا آئے گا۔ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ پھر وہ تم پر موت طاری کرے گا۔ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ پھر قیامت کے دن تم کو زندہ کرے گا۔ دیکھو یہ سب تصرف خدا تعالیٰ کا ہے۔ جو پیدا کرتا ہے، موت بھی وہی طاری کرتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کوئی متصرف نہیں۔ نہ کوئی کچھ دے سکتا ہے۔ نہ کوئی چھین سکتا ہے۔ اسی بات کو سورۃ واقعہ میں اس طرح بیان فرمایا کہ دیکھو تم کیسے بے بس ہو۔ جب ہمارے کارندے آتے ہیں۔ تو کون ہے جو انہیں روک سکے بڑے بڑے بادشاہ اور بڑے بڑے طاقتور عاجز آجاتے ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ تمام چیزوں کا تصرف خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ متصرف فی الامور وہی ہے۔ اور ایک ایماندار کا عقیدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جاندار بنایا۔ وہی موت طاری کرتا ہے۔ اس کے بعد پھر زندہ کرے گا۔

محاسبۂ اعمال

فرمایا موت وحیات کی اس کشمکش کے بعد انسان کو یونہی نہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ بلکہ وہ انسانی اعمال کا محاسبہ بھی کریگا ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ پھر اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی اور تم سے پوچھا جائے گا۔ کہ میں نے تم کو وجود کی نعمت دی۔ تمہاری پرورش کی اور تمہاری ضروریات و آسائش کے تمام سامان مہیا کیے۔ تمہارے جسم میں ہدایت کی مشینری نصب کی۔ علم حاصل کرنے کے لیے حواس ظاہرہ باطنہ سے نوازا۔ قوت متخیلہ عطا کی۔ غور و فکر کے ذرائع [illegible] قوت حافظہ دی۔ جوڑ توڑ کرنے کی طاقت بخشی۔ اس کے علاوہ بہت بڑی مہربانی یہ فرمائی کہ راہنمائی کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا "رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ" انہیں بشیر اور منذر بنایا اور دوسری جگہ فرمایا "وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ" ان کے ساتھ کتابیں نازل فرمائیں۔ وحی نازل کی شریعت دے کر بھیجا لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ" تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قائم رہیں۔ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ" یہ شرک تو بہت بڑا ظلم ہے۔ اور کفر سے بڑا اور کوئی ظلم نہیں۔ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ" سب سے

بڑے ظالم تو کافر ہیں۔ یہ تمام ہدایت دے کر حجّت پوری کر دی۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے۔ کہ انہیں کوئی سمجھانے والا نہیں آیا" لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ

میت دفن کرنے کے آداب

مشکوٰۃ میں حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے[۱] ۔لَیْسَ مِنْ شَیْءٍ یُقَرِّبُکُمْ اِلَی الْجَنَّۃِ وَیُبَاعِدُکُمْ مِنَ النَّارِ اِلَّا قَدْ اَمَرْتُکُمْ بِہٖ یعنی جو چیز جنت سے قریب کرنے والی اور دوزخ سے بچانے والی ہے وہ سب میں نے تمہیں بتا دی ہے۔ اب تمہارے پاس انکار کی کیا دلیل ہے۔ موت وحیات اور تصرفات کے بنیادی عقائد بیان ہوگئے ہیں جن کی قرآن پاک میں تعلیم دی گئی ہے

فرمایا میّت[۲] کو دفن کرتے وقت یوں کہو بِسْمِ اللّٰہِ وَعَلٰی مِلَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ اور اسی طرح قبر پر مٹی ڈالتے وقت یہ آیت پڑھنی چاہیئے[۳]۔ مِنْھَا خَلَقْنٰکُمْ وَفِیْھَا نُعِیْدُکُمْ وَمِنْھَا نُخْرِجُکُمْ تَارَۃً اُخْرٰی" مگر لوگ اس کی بجائے زور زور سے کلمہ شریف پڑھنے لگتے ہیں۔ کلمہ طیّبہ بے شک افضل الذکر ہے۔ مگر اس مقام پر وہی کچھ کہنا چاہیے جسکی تعلیم دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا بھی فرمان ہے۔ کہ ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ اسی میں اس کو لوٹائیں گے۔ اور پھر اسی میں سے دوبارہ زندہ کرینگے ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ کا یہی مطلب ہے۔

تمام چیزیں انسان کے لیے ہیں

انسان کی موت وحیات کا تذکرہ کرنے کے بعد دیگر انعامات کا اجمالی خاکہ پیش کیا هُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ؕ اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو کچھ بھی پیدا کیا ہے۔ وہ سب تمہارے فائدے کے لیے ہے۔ غذا، لباس، پانی، ہوا، نباتات، خوشبو، آلات، نیک بختی اور کمال حاصل کرنے کے ذرائع سب انسانی مفاد کے واسطے ہیں۔ بعض چیزیں براہ راست انسانی مفاد میں ہیں۔ اور بعض بالواسطہ۔ حتّٰی کہ موذی جانور بھی تمہارے فائدے کے لیے ہیں۔ بعض اوقات زہریلے جانوروں کا زہر بھی تریاق کا کام دیتا ہے۔ کسی موسم میں انسان مکھیوں سے

۱۔ مشکوٰۃ صفحہ ۴۵۲ بحوالہ شرح السنتہ والبیہقی فی شعب الایمان۔ ۲۔ ترمذی صفحہ ۱۷۰ ابن ماجہ صفحہ ۱۱۱ مستدرک حاکم صفحہ ۳۶۶ ج۱ ، ۳۔ مستدرک حاکم صفحہ ۳۷۹ ج۲ حصن حصین صفحہ ۳۹۴

تنگ آجاتا ہے۔ مگر یہ بھی فائدے سے خالی نہیں۔ یہ غلاظت کے ڈھیر جو بیماری کا باعث بنتے ہیں، انہیں مکھیاں ہی چاٹ جاتی ہیں۔ یہ تو انسان پر احسان کرتی ہیں۔ کہ غلاظت کے خاتمے کا سبب بنتی ہیں۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی ہے۔

حضرت ابُوہریرہؓ کی تخلیق والی روایت میں ہے[1] کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی کو ہفتے کے دن پیدا کیا۔ اور جمعہ کے روز نمازِ عصر کے بعد آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔ یہ سب چیزیں پہلے پیدا کر دی گئی تھیں۔ اللہ تعالےٰ جانتا تھا کہ نوعِ انسانی کی مصلحت فرشتوں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے انسان کی تخلیق سے کروڑوں سال پہلے فرشتوں کو پیدا کیا۔ ان میں جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام اور ملاءِ اعلیٰ کے دوسرے فرشتے ہیں۔ ان میں مقرب فرشتے بھی ہیں ان میں ملاءِ سافل کے فرشتے اور فضائی اور ہوائی فرشتے بھی ہیں۔ یہ سب کے سب انسان کی مصلحت کے لیے ہیں۔ تاکہ انسان درجۂ کمال تک پہنچ سکے۔

موت سامانِ عبرت ہے

اللہ تعالیٰ نے موت کو پیدا کیا اور یہ ایک بڑی خطرناک چیز ہے۔ مگر اس میں بھی انسان کے لیے عبرت کا سامان موجود ہے۔ یہ بھی فائدے سے خالی نہیں۔ شیخ سعدیؒ نے اس کی وضاحت ایک مثال کے ذریعے کی ہے[2] ۔۔۔۔۔۔۔۔ بادشاہ اور وزیر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ بادشاہ کہنے لگا۔ کاش کہ اگر ایں موت نہ بودے، چہ خوش بودے، یعنی اگر یہ موت نہ ہوتی۔ تو کیا اچھا ہوتا۔ ہماری بادشاہت ہمیشہ قائم رہتی۔ نہ موت وارد ہوتی اور نہ بادشاہت کا خاتمہ ہوتا۔ وزیر بڑا دانا آدمی تھا کہنے لگا، اگر موت نہ بودے ایں سلطنت تا کے رسیدے یعنی اگر موت نہ ہوتی، تو یہ سلطنت تم تک کیسے پہنچتی۔ یہ موت ہی ہے جس کے ذریعے یہ بادشاہت تم تک پہنچی ہے۔ ورنہ یہ تمہارے آباؤ اجداد تک ہی محدود رہتی۔ آگے نہ چلتی۔ مقصد یہ کہ موت جیسی چیز بھی انسان کے لیے مفید ہے۔ کہ اس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔

اس مقام پر فقہائے کرام اور محدثین ایک اور مسئلہ بیان کرتے ہیں[3] اور وہ یہ کہ اشیاء میں اصل چیز اباحت ہے۔ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا یعنی زمین کی تمام چیزیں تمہارے

---

[1] مسلم ص ۳۷۱ ج ۲، تفسیر ابن کثیر ص ۶۹ ج ۱، [2] — [3] تفسیر بیان القرآن ص ۱۴ ج ۱، تفسیر کشاف ص ۱۲۲ ج ۱

لیے پیدا کیں۔ اصلاً تمام چیزیں مباح یعنی جائز ہیں۔ البتہ جس چیز کے متعلق حرمت کی دلیل آئے گی صرف وہی حرام ہوگی۔ باقی سب جائز سمجھی جائے گی۔ ہر قسم کے جانور اور ہر قسم کے پھل انسان کے لیے مباح ہیں مگر جہاں حکم آگیا کہ خنزیر حرام ہے۔ مردار حرام ہے۔ یا فلاں قسم کا جانور حرام ہے تو وہ حرمت کے زمرہ میں آگیا۔ باقی سب جائز ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی وضع ہی ایسی رکھی ہے۔ کہ انہیں انسان کے فائدے کے لیے بنایا ہے۔ البتہ جس چیز کو حرام قرار دیا ہے۔ اس میں ضرور کوئی روحانی یا جسمانی قباحت ہوگی۔ جس کی وجہ سے اُسے ناجائز قرار دیا گیا ہے ورنہ سب چیزیں مباح ہیں۔

یہاں پر ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر اباحت کے اس اصول کو من وعن تسلیم کر لیا جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ ہر چیز ہر حالت میں مباح قرار پائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہے ہر چیز کے لیے کوئی نہ کوئی ضابطہ مقرر کیا گیا ہے۔ مثلاً ہر چیز کا ہر شخص مالک نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قبضہ اور ملک کا قانون مقرر کیا ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی حدود میں رہ کر کسی چیز کا قابض یا مالک ہوگا۔ کسی صاحب جائیداد کی موت کے بعد ہر شخص اس کی جائیداد کا حقدار نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ فیصلہ کرنا ہوگا۔ کہ اس جائیداد پر قبضہ کس کا ہے۔ وراثت کے طور پر اس کا کون حقدار ہے۔ عطیہ کے طور پر کسی کو ملی ہے یا نہیں۔ یا کسی اور قانون کے تحت اس کا کون حقدار ہے یہ سب قانون شریعت میں موجود ہیں۔ اور انہیں کے مطابق حقوق کا تعین ہوگا۔ ہر شخص حقدار نہیں ہوسکتا اسی طرح ایک عورت صرف ایک آدمی کے نکاح میں آسکتی ہے۔ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا دعویدار نہیں ہوسکتا بجز اس کے کہ خاوند کی وفات یا طلاق کی صورت میں وہ عورت کسی دوسرے شخص کے نکاح میں جاسکتی ہے لہذا اباحت کے اس کلیے کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔

آسمانوں کی تخلیق

زمین کی تمام اشیاء کی تخلیق کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا کہ اے انسان! میں نے تمہارے لیے صرف زمین کی چیزیں ہی پیدا نہیں کیں۔ بلکہ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ پھر اللہ تعالےٰ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ پس برابر کر دیا ان کو سات آسمان۔ یعنی تہ در تہ سات آسمان پیدا فرمائے۔ اور زمین سے آسمان تک اور ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچسو سال کی مسافت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنے دبیز آسمان پیدا کیے ہیں۔ یونانی فلکیات کے ماہرین آسمانوں کی تعداد نو بتاتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی اعتراض نہیں۔ سات

آسمانوں کے ساتھ عرش اور کرسی کو شامل کر لیں۔ تو نو بن جاتے ہیں۔ کیونکہ عرش الگ ہے۔ اور کرسی الگ ہے، وہ آسمانوں سے بھی وسیع تر ہیں۔ اور ذاتِ خداوندی ان تمام چیزوں سے وراء الوراء ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تجلّی عرش پر واقع ہوتی ہے۔ امام شاہ ولی اللہؒ اُسے تجلّی اعظم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس تجلی سے اول سارا عرش رنگین ہوتا ہے۔ پھر تمام کائنات رنگین ہوتی ہے اس کے نیچے تمام اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد وہ تجلّی واپس پلٹ جاتی ہے۔

علیم کل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے

فرمایا ”وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ“ یعنی وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ اُس کے علاوہ ہر چیز کو جاننے والا اور کوئی نہیں۔ لہٰذا عبادت بھی اُسی کی کرنی چاہیئے۔ جو علیم کل اور قادر مطلق ہے ”اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ جو قادر ہے۔ جو خالق اور رب ہے۔ اُس کے علاوہ الٰہ بھی کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ غرضیکہ ذرّے ذرّے کو جاننے والا وہی ہے اور محیط علم صرف خدا تعالیٰ کا ہے۔ نہ جبرائیل علیہ السلام اور دیگر فرشتوں کا۔ نہ نبیوں کا نہ ولیوں کا۔ اس لیے معبود برحق بھی صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پہچان کی یہ صفات جس طرح قرآن پاک میں بیان ہوئی ہیں۔ اسی طرح توراۃ اور انجیل میں بیان ہوئی ہیں۔ مگر لوگوں نے دین کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے حقیقت یہ ہے۔ کہ نافع اور ضار بھی وہی ذات ہے۔ خدا تعالیٰ کے سوا غائبانہ طور پر نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے۔ اور نہ نقصان۔ نہ کوئی فریاد سُن سکتا ہے۔ اور نہ کوئی بگڑی بنا سکتا ہے۔ نہ کسی کو تفصیل سے علم ہے۔ کہ کسی کو کیا تکلیف یا پریشانی ہے۔ کیونکہ علیم کُل صرف ذات خداوندی ہے۔ اس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

عبادت الٰہی لازم ہے

”كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ“ سے لے کر ”وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ“ تک دو آیات کا تعلق ”يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا“ کے ساتھ ہے۔ یعنی اے لوگو! تم اپنے رب کی عبادت کرو۔ کہ یہ تمہارے لیے لازمی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں وجود کی نعمت بخشی، زندگی دی، پھر موت کا طاری کرنا اور دوبارہ زندہ کرنا اُسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ پھر اُس نے تمہیں زمین کی تمام نعمتیں مہیا کیں۔ دوسری جگہ فرمایا۔ کہ زمین کی تمام سبزیاں اور پھل پیدا کئے۔ اُسے

انسان "مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ" یہ سب چیزیں تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے فائدے کے لیے ہیں۔ یہ مویشی بھی تمہاری ہی خدمت کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔ ان پر سواری کرتے ہو۔ ان سے کھیتی باڑی میں مدد لیتے ہو۔ اور پھر ان کا گوشت بھی کھاتے ہو۔ یہ سب چیزیں تمہاری خاطر پیدا کی ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ خَلَقَ الدُّنْيَا ..... لَكُمْ وَخُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ اے انسان! یہ ساری دنیا تیرے لیے پیدا کی ہے۔ اور تو آخرت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تم اس کی معرفت حاصل کرو۔ اور اسی کی عبادت کرو۔ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" قرآن پاک شاہد ہے۔ کہ انسانوں اور جنوں کی تخلیق محض عبادت الٰہی کے لیے ہوئی۔

قرآن پاک میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے زمین کا مادہ پیدا کیا۔ آسمان دخان (دھواں) کی شکل میں تھا۔ پھر اس کو برابر کر دیا۔ زمین کا پھیلاؤ اس کے بعد عمل میں آیا۔ "وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا" زمین کا مادہ کثیف ہے۔ امام شاہ ولی اللہؒ تفہیمات الٰہیہ میں فرماتے ہیں[1] کہ جس طرح زمین مختلف عناصر کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح آسمان بھی کئی عناصر پر مشتمل ہے مگر آسمان کے عناصر زمین کی نسبت لطیف ہیں۔ اسی لیے وہاں شفافیت نظر آرہی ہے۔ اور کوئی چیز جس قدر لطیف ہوگی، اسی قدر طاقتور ہوگی۔ دیکھئے روح لطیف چیز ہے۔ اس لیے اس میں قوت بھی زیادہ ہے۔ اور جتنی کوئی چیز کثیف ہوتی ہے۔ اتنی ہی کمزور اور ضعیف ہوتی ہے۔ الغرض فرمایا وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ہر چیز کا جاننے والا خدا تعالیٰ ہے لہٰذا عبادت بھی اسی کی ہونی چاہیئے۔

---

[1] تفہیمات الٰہیہ جلد اوّل تفہیم ۶۷

درس پانزدہم ۱۵ (آیت ۳۰)

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰

ترجمہ: اور اس وقت کو خیال میں لاؤ جب تیرے رب نے فرشتوں سے فرمایا۔ تحقیق میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے عرض کیا کیا (زمین میں ایسوں) کو بنائے گا جو اس میں فساد کریں گے۔ اور خون بہائیں گے اور ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ تیری تعریف کے ساتھ اور تیری تنزیہہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۝۳۰

گذشتہ سے پیوستہ

اس سے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے چار بنیادی مسائل یعنی توحید، رسالت ایمان بالقرآن اور معاد (قیامت) کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کے بعد قرآن و رسالت میں شک کرنے والے لوگوں کا رد فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال کا ذکر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن بے شمار انعامات کا بھی تذکرہ فرمایا۔ جو اُس نے بنی نوعِ انسان پر کئے۔ ان میں خصوصاً مادی انعامات کا بیان تھا۔ جس میں انسان کا اپنا وجود، زمین و آسمان کی تخلیق، زمین میں پیدا ہونے والی تمام چیزیں شامل ہیں۔ بالخصوص زمین سے نکلنے والے پانی کا ذکر تھا۔ جس سے انسان فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی سے نباتات پیدا ہوتے ہیں جو انسان کی روزی کا ذریعہ ہے۔

موضوع

مادی انعامات کے تذکرہ کے بعد اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اُن روحانی اور نفسانی نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ جو اس نے انسان کو عطا فرمائیں۔ چنانچہ اس مقام پر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور خلافت ارضی کو بیان فرمایا گیا۔ تخلیق آدم ایک بنیادی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت آدم علیہ السلام کو عطاء کی اور پھر یہ خلافت بنی نوع انسان میں ودیعت کر کے خلافت ارضی کے مسئلہ کو واضح کر دیا۔ گویا اس رکوع کا موضوع خلافت ارضی ہے۔

ہر جنتی بادشاہ ہوگا

قرآن پاک کی آیات مبارکہ اور احادیث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ کہ جو لوگ دنیا کی زندگی کے بعد حشر و نشر کی منازل طے کر کے جنت میں پہنچیں گے۔ اُن میں سے ہر شخص بادشاہ ہوگا۔ اس دنیا میں تو بادشاہی کروڑوں میں سے ایک کو نصیب ہوتی ہے۔ مگر جنت کے ہر باشندے کا اعزاز دنیا کے بادشاہ سے کہیں زیادہ ہوگا۔ ہر جنتی کو آرام و راحت کے ایسے ایسے سامان میسر ہوں گے۔ جو دنیا کے کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں جنت میں ادنٰی سے ادنٰی درجہ بھی حاصل ہو جائے۔

تخلیق انسانی سے قبل کے ادوار

اس رکوع میں تخلیقِ آدم کا ذکر ہے۔ مگر پہلے کے ادوار کو ہم نہیں جانتے۔ کسی کو خواب میں بھی معلوم نہیں ہوا۔ کہ آدم علیہ السلام سے پہلے کتنے دور گذر چکے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے اپنی کتاب "تفہیمات الٰہیہ" میں بیان کیا ہے۔ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے بھی اپنی کتاب "عبقات" میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ کسی حکیم انسان کا کمال یہ ہے۔ کہ وہ صرف آدم علیہ السلام کے دور ہی کو ابتداء سے انتہا تک سمجھ لے۔ چہ جائیکہ کوئی شخص اس دور سے پہلے کے ادوار کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کے جد امجد خود شاہ ولی اللہؒ اس امت کے آخری دور کے حکماء میں سے ہیں۔ البتہ ان سے پہلے بڑے بڑے حکماء گذرے ہیں جنہوں نے قرآن پاک کی تفاسیر اور تاریخ کی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں امام ابن کثیرؒ بڑے پائے کے محدث، مفسر اور تاریخ دان ہوئے ہیں۔ آپ امام ابن تیمیہؒ کے شاگرد تھے آپ کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری ہے۔ آپ کی تفسیر کی مشہور کتاب ابن کثیر ہے آپ نے بخاری شریف کی شرح اور اصول حدیث پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کی تاریخ کی کتاب البدایہ والنہایہ نہایت مستند کتاب ہے۔ جو چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے ابتداء سے لے کر اپنے دور تک تمام زمانوں کی تاریخ لکھی ہے۔ یہ کتاب آپ نے روایت کے اعتبار سے ترتیب دی ہے۔ صحیح اور غلط روایت کی پڑتال کی ہے۔ اگرچہ ابن خلدونؒ اور ابن جریرؒ جیسے بڑے بڑے مؤرخوں نے تاریخ کی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں اور ہزاروں تاریخ کی کتب موجود ہیں۔ مگر ان سب سے مستند ترین کتاب امام ابن کثیرؒ کی ہے۔

اس کتاب کی پہلی جلد میں امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں[1] کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے

[1] البدایہ والنہایہ ص ۵۵ ج ۱

اس زمین پر کئی دور گذر چکے تھے۔ مثلاً ایک قوم یا افراد کو حن کہتے تھے، اس کے بعد بن کا دور گذرا۔ اور پھر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل اس دنیا میں جنات کا دور دورہ تھا۔ انہوں نے زمین میں فساد برپا کیے۔ جس طرح آجکل کی دنیا میں قتل وغارت گری ایک عام معمول ہے اس طرح اُس دور کے جنات میں بھی جنگ وجدل عام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جنات کی سرکوبی کے لیے فرشتوں کو بھیجا۔ چنانچہ انہوں نے جنات کو مار مار کر پہاڑوں اور جزیروں میں بھگا دیا اور اس زمین کو صاف کیا۔ اس واقعہ کے دو ہزار سال بعد آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔

جنات کا ذکر تو قرآن پاک میں بیشتر مقامات پر آیا ہے۔ تاہم حن اور بن کے ادوار کا علم تاریخی روایات سے ہوتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ موجودہ دور سے پہلے کتنے دور گذر چکے ہیں۔ علماء نے اپنی اپنی تحقیق کے مطابق اپنی کتابوں میں ان ادوار کا تذکرہ کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فرشتوں کا مادۂ تخلیق

اللہ تعالیٰ نے انسانوں، فرشتوں، جنات اور شیاطین کو مختلف مادوں سے پیدا فرمایا۔ پھر ان مادوں کے عناصر بھی مختلف ہیں۔ فرشتے ایک خاص نوری مادے سے پیدا کیے گئے ہیں۔ پھر ان فرشتوں کے مختلف درجات ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1] کہ فرشتوں میں سب سے اعلیٰ درجہ ملأ اعلیٰ کا ہے۔ یہ حاملین عرش فرشتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر حَافِّیْنَ حَوْلَ الْعَرْشِ والے فرشتے ہیں۔ یہ سب خطیرۃ القدس کے فرشتے ہیں۔ پھر آسمانوں کے فرشتے پھر فضائی فرشتے، اس کے بعد ہوائی فرشتے اور ارضی فرشتے ہیں جو زمین پر موجود رہتے ہیں۔ دریہ ملأ سافل کے فرشتے ہیں۔

حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں[2] کہ اول درجے کے فرشتوں کا مادہ تخلیق اُس آگ کی مانند ہے جو دوران سفر طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ظاہر ہوئی۔ آپ اپنی زوجہ کے ہمراہ جا رہے تھے۔ بھیڑ بکریاں ساتھ تھیں۔ رات کا اندھیرا تھا۔ بیوی حاملہ تھی۔ اُن کو درد زہ شروع ہو گیا موسیٰ علیہ السلام کو دُور سے آگ نظر آئی۔ آپ اُس طرف گئے۔ تو وہ آگ ایک درخت سے نکل رہی

---

[1] الخیر الکثیر ص

[2] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۶ ج ۱

تھی۔ جو درخت کے پتوں کو جلانے کی بجائے انہیں سرسبز و شاداب کر رہی تھی۔ آگ جس قدر بھڑکتی تھی درخت کی شاخوں اور پتوں میں شادابی آتی تھی۔ یہ واقعہ کس قدر قرآن پاک میں موجود ہے۔ بعض تصریحات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ آگ نہیں تھی بلکہ حجاب نوری یا ناری تھا۔ الغرض! فرشتوں کی تخلیق اللہ تعالےٰ نے اس قسم کے مادے سے کی۔ پھر اس میں مقدس روحیں ڈالیں۔ جس طرح انسانوں اور جنوں میں روحیں موجود ہیں۔ اسی طرح فرشتوں میں بھی روحیں ہیں۔

جنات اور شیاطین

جنات کے مادہ تخلیق کے متعلق قرآن پاک میں موجود ہے "وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ" یعنی جنات کا مادہ تخلیق آگ اور ہوا ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ شیاطین کا مادہ تخلیق نہایت گندا اور غلیظ ہوتا ہے۔ بالکل سنڈاس کی مانند کہ جب وہ زیادہ مقدار میں ہوتا ہے۔ تو اس سے بخار اور بُو اٹھتی ہے۔ تو گویا جنات اور شیاطین کا مادہ آگ اور ہوا ہے۔ اس میں گیس ہوتی ہے۔ اور تپش کا مادہ بھی ہوتا ہے۔

انسان کا مادہ تخلیق

انسان کا مادہ تخلیق خاک ہے۔ دنیا میں جتنے بھی خارجی عناصر پائے جاتے ہیں۔ وہ سب آدم کے وجود میں موجود ہیں۔ تخلیق انسانی کے متعلق قرآن پاک میں آتا ہے "خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ" انسان کو کھڑکنے والی مٹی سے پیدا کیا۔ دوسرے مقامات پر تراب اور طین کا لفظ بھی آتا ہے۔ الغرض۔ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔ اور یہ تخلیق باقی تخلیقات کی نسبت پیچیدہ ہے۔ اس میں تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام خلیفۃ اللہ ہیں

اس مقام پر تخلیق انسانی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے "وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" یعنی اس بات پر غور کرو کہ جب تیرے پروردگار نے فرشتوں کے سامنے فرمایا۔ کہ تحقیق میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں گویا آدم کی تخلیق اس واسطے ہوئی کہ اُسے دنیا میں خلیفہ مقرر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا آدم کی تخلیق مستقل تخلیق نہیں بلکہ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں خلافت کا ایک اہم ترین مسئلہ بھی سمجھا دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا "یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ" یعنی اے داؤد! ہم نے آپ کو دنیا میں خلیفہ بنایا ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ صـ۱۷

قرآن پاک میں خلیفہ دو معانی میں آتا ہے۔ پہلا معنیٰ وہی ہے جو آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ میں آپ کو اپنا خلیفہ یعنی نائب بنانے والا ہوں۔ خَلَفَ یَخْلُفُ دوسرے کے پیچھے آنے والے یعنی نیابت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں یہ بھی آتا ہے" هُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ" یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ذات ہے۔ جس نے تمہیں ایک دوسرے کا جانشین یا خلیفہ بنایا۔ جس طرح بیٹا اپنے باپ کا جانشین ہوتا ہے۔

خلیفہ کا دوسرا معنیٰ جو اس مقام پہ واضح ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنا خلیفہ یعنی نیابت انجام دینے والا پیدا کیا۔ انسان کے علاوہ باقی بے شمار مخلوقات بھی اس زمین پہ پیدا کی گئی ہیں۔ مگر خلافت کا حق اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت انسان کو دیا ہے۔ اور اس سے بھی مراد یہ ہے۔ کہ زمین اور ساری کائنات کی اصل بادشاہت تو اللہ تعالیٰ کی ہے۔ آدم علیہ السلام کو صرف نیابت تفویض ہوئی ہے۔ گویا انسان دنیا میں خلافت اپنی مرضی سے انجام نہیں دے گا۔ بلکہ حکم تو اللہ تعالیٰ کا ہوگا ——— اور انسان اُس حکم کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ سورۃ نور میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ سے جس خلافت کا وعدہ فرمایا اور جس کو پورا فرمایا وہ یہی خلافت ہے" وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ"

مسئلہ خلافت

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ نظام نظامِ خلافت ہے۔ دین میں ملوکیت اور ڈکٹیٹر شپ کی کوئی حیثیت نہیں۔ انسان تو اس زمین پہ اللہ تعالیٰ کا نظام نافذ کرنے والا ادارہ ہے۔ اس کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ کہ جس قسم کے احکام چاہے نافذ کرے بلکہ اُسے احکام اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل کرنا ہوں گے۔

مسلمانوں کے تمام فرقے اس بات پہ متفق ہیں۔ کہ خلیفہ منتخب ہونا چاہیئے۔ صرف ایک خارجی فرقہ ایسا ہے۔ جو کہتا ہے کہ حکومت صرف اللہ ہی کی ہے۔ کوئی اس کا خلیفہ نہیں ہے۔ یہ انارکسٹ لوگ ہیں۔ جو خلافت کو تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق ہی بطور خلیفہ کے کی ہے۔ اس معاملہ میں شیعہ مذہب بھی باطل ہے۔ کہ اس کے پیرو کار خلیفہ یا حاکم (امام) کو معصوم اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ مانتے ہیں۔ یہ نظریہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ خلیفہ کو

منتخب کرنے والے عام لوگ ہیں۔ اور وہی اسے معزول بھی کر سکتے ہیں۔

اس مسئلہ میں اہل السنّت والجماعت کا نظریہ بالکل واضح ہے۔ کہ خلیفہ کا انتخاب واجب ہے اس کو منصوص اور مقرر نہیں کیا گیا۔ بلکہ جماعت المسلمین پر چھوڑا گیا ہے۔ کہ وہ اپنے میں سے بہتر شخص کو اس منصب پر فائز کر لیں۔ خلیفہ کے بغیر نظام ارضی کا چلانا درست نہیں ہے صحابہ کرامؓ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کی وفات پر مسئلہ خلافت آپ کے دفن سے پہلے طے کر لیا گیا۔ ترمذی شریف، کی روایت[2] میں آتا ہے۔ کہ اگر مسئلہ خلافت طے نہ کیا جاتا تو امت کے اختلافات کا ختم ہونا ممکن نہ تھا۔ خود حضور علیہ السلام کے دفن کے متعلق اختلاف رائے پیدا ہوا۔ کسی کی رائے یہ تھی کہ آپ کا جسد اطہر بیت المقدس لے جایا جائے۔ کوئی مکہ معظمہ لے جانے کے حق میں تھا۔ تو اس کا فیصلہ بھی حضور علیہ السلام کے جانشین حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کیا۔ انہوں نے کہا[1] کہ اس معاملہ میں جھگڑا نہ کرو۔ میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنا تھا۔ کہ جس جگہ پر آپ کا وصال مبارک ہوا۔ اسی جگہ پر آپ کو دفن کیا جائے گا۔ اس طرح یہ اہم معاملہ طے ہو گیا۔ تاہم یہ واضح ہے۔ کہ قرآن پاک یا حضور نبی کریم علیہ السلام نے کسی کا نام لے کر خلافت کا فیصلہ نہیں کیا۔ بلکہ یہ کام جماعت المسلمین پر چھوڑا کہ جس کو مناسب سمجھیں، خلیفہ مقرر کر لیں۔ البتہ نبی علیہ السلام نے اشارۃً یہ بات سمجھا دی[3] یَأْبَى اللّٰهُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلَّا اَبَا بَكْرٍ یعنی میرے بعد اللہ تعالیٰ بھی انکار کرے گا اور مومن بھی انکار کریں گے کہ خلیفہ ابوبکرؓ کے سوا کوئی نہیں ہونا چاہیئے۔

انتخاب خلیفہ کا ایک طریقہ تو یہ ہو گیا۔ کہ عامۃ المسلمین جس کو چاہیں اپنے میں سے خلیفہ منتخب کر لیں جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب ہوا اس کے علاوہ بعض دوسرے ذرائع بھی ہیں۔ جو امت میں ملتے ہیں، مثلاً حضرت ابوبکرؓ نے اپنے آخری ایام میں حضرت عمرؓ کا انتخاب بطور خلیفہ خود کر دیا تھا[4]۔ آپ نے ایک خط لکھ دیا تھا کہ لوگوں کے سامنے پڑھ دینا۔ یہ گویا خلافت کا پروانہ تھا۔ حضرت عمرؓ

---

۱ شمائل ترمذی صـ ۶۰ ۲ شمائل مع ترمذی صـ ۶۰ مطبع نور محمد کراچی

۳ مسلم صـ ۲۷۳ ج ۲ ۴ البدایہ والنہایہ جـ ۷ صـ ۱۸

امت میں بہترین آدمی تھے۔ ان کا انتخاب اس طرح عمل میں آیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے بعد خلافت کا فیصلہ کرنے کے لیے چھ آدمیوں کی شوریٰ قائم کی اور فرمایا کہ میرے بعد خلافت کا فیصلہ یہ لوگ کریں گے۔ یہ چھ آدمی وہ تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہوتے وقت اُن سے بڑے راضی تھے۔ چنانچہ ان حضرات نے حضرت عثمان غنیؓ کو خلیفہ منتخب کیا۔[1]

خلافت پر فائز ہونے کی ایک چوتھی صورت یہ ہے۔ کہ کوئی شخص خود بخود غلبہ پاکر حکومت حاصل کرے۔ کہتے ہیں کہ ایسا شخص بھی قابلِ اطاعت ہے۔ ہاں اگر وہ شریعت کے احکام جاری کرنے میں کوتاہی کرے۔ تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ الغرض اللہ تعالےٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اُس کے احکام نافذ کرنے کے لیے خلیفہ بنایا۔ اور پھر یہ خلافت آپ کی نسل میں باقی رکھی۔ کہ خلافت کا حق بنی نوعِ انسان کو حاصل ہے۔ یہ حق کسی اور مخلوق کو نہیں پہنچتا۔

الغرض! جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنا نائب مقرر کرنے کا ارادہ فرمایا تو "قَالُوٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ"[2] یعنی فرشتوں نے کہا اے مولا کریم تو دنیا میں ایسی ہستی کو اپنا خلیفہ مقرر کرنا چاہتا ہے۔ جو زمین میں فساد کریں گے۔ اور خون بہائیں گے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ فرشتوں کا یہ جواب کئی وجوہات کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ اولاً یہ کہ خود اللہ تعالیٰ نے یہ بات انہیں الہام کی ہو۔ جس کی بنا پر انہوں نے یہ رائے دی۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتوں نے جنات کے حالات پر قیاس کیا۔ وہ دیکھ چکے تھے۔ کہ جنات نے زمین پر فتنہ و فساد برپا کیا۔ لہٰذا انہوں نے گمان کیا۔ کہ آدم کی اولاد بھی ایسا ہی کرے گی۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے۔ کہ فرشتوں نے خلیفہ کے لفظ سے یہ قیاس کیا۔ کہ خلیفہ جب زمین پر حکومت کی باگ ڈور سنبھالے گا۔ تو وہاں پر لازماً فتنہ و فساد اور خونریزی بھی ہو گی۔ لہٰذا انہوں نے اللہ تعالیٰ کو یہ جواب دیا۔ تاہم زیادہ تر مفسرین کرام فرماتے ہیں[3]۔ کہ فرشتوں کا یہ گمان جنات کے حالات کی بنا پر تھا۔

اس گمان کے اظہار کے ساتھ ساتھ فرشتوں نے بارگاہِ ربّ العزت میں یہ بھی عرض کیا "وَنَحْنُ

---

[1] البدایہ النہایہ ص ۱۴۴ ج ۷ [2] تفسیر معالم التنزیل ص ۲۰ ج ۱، تفسیر جلالین ص ۷

نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ مولا کریم! اس فتنہ و فساد برپا کرنے والی مخلوق کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ۔ وَنُقَدِّسُ لَكَ اور تیری پاکیزگی بھی بیان کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم اس کام کے لیے کافی ہیں۔

تحمید کا معنی یہ کہ خوبی کی تمام باتیں اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ اور تنزیہہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے نقائص اور عیوب سے پاک ہے۔ وہ ہر قسم کی کمزوریوں اور نقص والی چیزوں سے مبّرا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ تمام شریکوں سے پاک ہے۔

فرشتوں کا یہ جواب سن کر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ اے فرشتو! تم اس راز کو نہیں جانتے۔ صرف میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے آدم میں کس قدر کمال اور شرف ودیعت کیا ہے۔

درس شانزدہم ۱۶ (آیت ۳۱ تا ۳۳)

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ
فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾
قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ
الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ
اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ
غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ
تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سارے نام سکھا دیے۔ پھر پیش کیا ان کو فرشتوں پر۔ پس کہا مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو ﴿۳۱﴾ انہوں نے کہا پاک ہے تیری ذات۔ نہیں ہے ہمارے پاس علم مگر وہ جو تو نے ہم کو سکھلایا ہے۔ بیشک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے ﴿۳۲﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے آدم! بتلا دے ان کو ان چیزوں کے نام، پس جب اس نے ان کو ان چیزوں کے نام بتلا دیے تو فرمایا۔ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمینوں کی پوشیدہ چیزوں کو۔ اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو۔ اور جس کو تم چھپاتے ہو۔ ﴿۳۳﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کو وحدانیت اختیار کرنے اور اپنے خالق کی عبادت کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اس کی پہچان کے سلسلے میں اس کی صفات و کمالات کا ذکر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان انعامات کا ذکر فرمایا جو اس نے نسل انسانی پر کیے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق کا ذکر کیا "وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ" اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے تذکرہ کیا۔ کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں تو فرشتوں

نے جواب میں کہا "اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا" کیا تو زمین میں ایسی ہستی کو بنائے گا جو فساد کریگی اور خون بہائے گی۔ حالانکہ ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں۔ تیری حمد کے ساتھ۔ اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ" یعنی بیشک میں جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے۔

خلافت کے متعلق بھی پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ خلافت نیابت کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو بطور خلیفہ پیدا فرمایا ہے۔ تاکہ وہ زمین پر اللہ تعالےٰ کی نیابت کے فرائض انجام دے سکیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر شرعی قانون انسان کے ذریعے نافذ فرمایا ہے۔ اور تکوینی احکام یعنی وہ احکام جو انسانوں سے متعلق نہیں ہیں وہ قدرت کے مقرر کردہ دوسرے کارندے انجام دیتے ہیں۔

تخلیق آدم پر فرشتوں کا گمان کرنا کہ یہ زمین پر فتنہ وفساد برپا کرے گا۔ اس کا بیان بھی ہو چکا۔ فرشتوں نے خیال کیا کہ خلیفہ کی ضرورت ہی ایسی جگہ پڑتی ہے۔ جہاں قتل وغارت اور خونریزی ہوگی۔ لہٰذا انہوں نے ایسا گمان کیا۔ یا پھر یہ وجہ تھی کہ انہوں نے انسانوں کو جنوں پہ قیاس کیا۔ جو اس نسل سے پہلے اس زمین پہ فتنہ وفساد برپا کر چکے تھے۔

آدم علیہ السلام کو کن چیزوں کے نام سکھلائے گئے

آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت اللہ تعالےٰ اور فرشتوں کے درمیان سوال وجواب ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے کی حکمت کے اظہار کے لیے فرمایا وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سارے نام سکھا دیے۔ ان ناموں سے کیا مراد ہے۔ اور اللہ تعالےٰ نے کون سے نام آدم علیہ السلام کو سکھلائے۔ اس سلسلے میں مفسرین کرام کے کئی اقوال ہیں۔ تفسیر ابو السعود اور مدارک عربی زبان کی چار چار جلدوں کی مختصر تفسیریں ہیں۔ ان کے مؤلفین حنفی امام تھے۔ وہ اور بعض دیگر حضرات فرماتے ہیں[۱]۔ کہ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ سے مراد تمام انواع واجناس کے نام ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے سکھلائے۔ اس سے مراد ہر ہر فرد کا نام سکھلانا نہیں۔ کیونکہ ہر ہر فرد اور جزو کا تعلق غیب سے ہے۔ اور اسے اللہ تعالےٰ ہی جانتا ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا۔ انواع واجناس

---

[۱] تفسیر مدارک ص ۴۱ ج ۱ وابو السعود ص ۶۹ ج ۱

کا مطلب یہ ہے۔ کہ جیسے انسان ایک نوعی نام ہے۔ اس طرح اجناس میں سے حیوان ایک جنس ہے۔ اور پھر آگے اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ مثلاً گھوڑے، بھینس، گائے، بھیڑ، بکریاں، کیڑے مکوڑے وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ اُن چیزوں کے نام آدم علیہ السلام کو سکھائے۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں[۱]۔ کہ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی قیامت تک پیدا ہونے والی اولاد کے نام تبلا دیئے۔ برخلاف اس کے شیخ ابن عربیؒ فرماتے ہیں[۲]۔ کہ اسماء سے مراد اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ ہیں۔ نہ کہ بعض دوسری چیزوں کے نام

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں[۳]۔ کہ اسماء سے مراد جزیات ہیں۔ مگر تمام کی تمام اور ہر قسم کی جزیات نہیں۔ بلکہ صرف وہ جزیات مراد ہیں جن کی ضرورت تھی۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں[۴]۔ کہ صرف انسانی ضروریات کی تمام چیزوں کے نام تبلا دیئے۔ جو چیزیں انسانی ضرورت سے باہر ہیں۔ ان کے بتانے کا نہ کوئی فائدہ تھا۔ اور نہ ہی وہ بتائیں۔ قرآن پاک میں اس کی مثال سورۃ نمل میں آتی ہے۔ کہ ملکہ سبا کو "وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ" ہر چیز دی گئی تھی۔ تو یہاں پر ہر چیز سے مراد اس کی سلطنت کی ضروریات ہی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ اُس زمانے میں ملکہ سبا کے پاس فینٹم طیارے اور راکٹ بھی موجود تھے۔ بلکہ ضرورت کی تمام اشیاء اُسے میسّر تھیں۔ تو یہاں پر بھی الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا سے مراد اُنہی چیزوں کے نام ہیں جو انسانی ضروریات میں شامل ہیں۔

اسی طرح سورۃ نحل میں شہد کی مکھیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ" پھر تمام پھلوں سے کھاؤ اور شہد پیدا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں ایک پاکیزہ چیز رکھ دی ہے۔ اور اس کے پیٹ میں ایک لطیف قسم کا مادہ پیدا کر دیا ہے۔ جس سے شہد بنتا ہے۔ تو یہاں پر تمام قسم کے پھل کھانے سے مراد یہ نہیں ہے۔ کہ دنیا جہاں کا ہر اچھا، بُرا، کڑوا، کسیلا پھل کھائے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس کی ضرورت اور رسائی کے مطابق جتنے پھل ہیں مکھی اُن پر بیٹھتی ہے۔ اور پھر اس سے اللہ تعالیٰ شہد جیسی مفید چیز پیدا کرتا ہے۔ بادام اور

---

[۱] ابن کثیر صـ ۷۳ / ج ۱، تفسیر طبری صـ ۲۱۶ / ج ۱، [۲]

[۳] معالم التنزیل صـ ۲۱ / ج ۱ [۴] تفسیر ابن کثیر صـ ۷۳ / ج ۱

اخروٹ وغیرہ ایسے پھل ہیں۔ جن کے مغز تک رسائی ہی نہیں۔ تو ایسی چیزوں کے کھانے کا حکم اللہ تعالےٰ نے نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت اور شریعت میں یہ قانون رکھ دیا ہے۔ کہ وہ پاکیزہ چیزوں پر بیٹھتی ہے۔ گندی جگہ پر نہیں بیٹھتی ہے۔ مشاہدے سے معلوم ہوا ہے۔ کہ اگر شہد کی مکھی غلاظت والی جگہ پر بیٹھ جائے۔ اور اس کا پتہ چل جائے۔ تو مکھیوں کی ملکہ کے پاس شکایت پیش ہوتی ہے۔ اور ایسی مکھی کو سزائے موت تک دے دی جاتی ہے۔

پھلوں میں بھی بعض کڑوے پھل ہوتے ہیں۔ مگر مکھی وہاں سے مادہ حاصل کرنے کی پابند نہیں ہے۔ اسی طرح بعض پھول بھی بدبودار ہوتے ہیں۔ جو شہد کے لیے ناموافق ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہوتے وہ بھی پھول ہی ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ جس قسم کے پھل یا پھول سے مکھی رس چوسے گی، شہد کا ذائقہ بھی ویسا ہی ہوگا۔ مثلاً کھجور پر بیٹھے گی تو وہ ذائقہ حاصل کرے گی اور انگور کی شاخ پر جائے گی۔ تو ویسی مٹھاس حاصل کرے گی۔ مقصد یہ ہے۔ کہ مکھی کے ہر پھل اور پھول چوسنے سے مراد صرف وہ پھل اور پھول ہیں۔ جو اس کی شہد کی ضرورت سے مناسبت رکھتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[1]۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۤءَ كُلَّهَا سے مراد انسانی ضرورت کی تمام چیزیں ہیں۔ ان میں غیر ضروری اشیاء کے نام مراد نہیں ہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں[2]۔ ہانڈی چمچہ وغیرہ چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں۔ مگر چونکہ ان کا تعلق ضروریات انسانی سے ہے۔ لہذا ان کے نام آدم علیہ السلام کو بتلائے گئے۔

امام ابوبکر جصاصؒ اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں[3]۔ کہ چیزوں کے نام سکھانا بالکل ایسا نہیں تھا جیسے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ ب۔ بِلّی۔ ط۔ طوطا بلکہ نام سکھانے سے مراد یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی طبیعت اور مزاج میں بطور صلاحیت ان چیزوں کے نام رکھ دیئے تھے۔ اور پھر جب فرشتوں کے سامنے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تو آدم علیہ السلام نے تمام نام بتلا دیئے۔ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے[4]۔ کہ چیزوں کے نام بطور تعلیم سکھلائے گئے۔ جیسے کسی چیز کی وضاحت کی جاتی ہے۔ کہ یہ فلاں چیز ہے اس کی خاصیت یہ ہے۔ اور اس کا فائدہ یہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ وَاللّٰهُ تَعَالٰى اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

۱؎ تفسیر بیضاوی ص ۴۵/ج ۱ ۲؎ تفسیر ابن کثیر ص ۴۳/ج ۱، تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۹۶ پارہ ۱

۳؎ تفسیر بیضاوی ص ۴۶/ج ۱، تفسیر روح المعانی ص ۲۲۴/ج ۱ ۴؎ تفسیر ابن کثیر ص ۴۳/ج ۱، تفسیر کبیر ص ۱۷۶/ج ۱

ملائکہ کا امتحان

آدم علیہ السلام کو تمام ضروری اشیاء کے نام سکھلانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آزمایا۔ چنانچہ وہ تمام چیزیں فرشتوں کے سامنے پیش کر دیں ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اور فرشتوں کو حکم دیا اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ مجھے ان تمام چیزوں کے نام بتاؤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم سچے ہو۔ یعنی اے فرشتو! تمہارا دعوےٰ یہ ہے۔ کہ انسانی مخلوق کے پیدا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ تم میری تسبیح و تقدیس بیان کرنے کے لیے کافی ہو۔ اور یہ مخلوق تو دنیا میں خونریزی کرے گی۔ مگر تم نہیں جانتے کہ انسان کون سے کمالات کا حامل ہو گا۔ منجملہ ان کے علم و فہم کا کمال سب سے اعلیٰ ہے۔ جو اسے دیا گیا ہے۔ اور خلیفہ کے لیے اُن چیزوں کی ماہیت اور حقیقت کا جاننا بھی ضروری ہے۔ جن پر اُس نے احکام کا نفاذ کرنا ہے۔ مثلاً اگر خلیفہ کو شراب کی خاصیت کا ہی علم نہ ہو کہ یہ کس طرح انسانی عقل کو ماؤف کرتی ہے۔ اور یہ کن نقصانات کی وجہ سے ام الخبائث کہلاتی ہے۔ تو خلیفہ شراب کے رسیا کو سزا کیسے دے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تمام ضروری چیزوں کے نام، ان کی حقیقت اور ماہیت سے آدم علیہ السلام کو آگاہ کر دیا۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کا پورا پورا حق ادا کر سکے۔

فرشتے اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ کہنے لگے اے مولا کریم! تیری ذات پاک ہے لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ہمیں اعتراف ہے۔ کہ ہمیں ان چیزوں کے اسماء اُن کی خاصیّت اور ماہیّت کا علم نہیں ہے۔ ہم اس معاملہ میں عاجز ہیں۔ ہمارا علم تو اسی قدر ہے جس قدر تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ احادیث میں آتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بتلا دیا تھا۔ کہ آدم میں بہیمیّت اور ملکیّت دونوں خواص ہوں گے۔ مگر فرشتوں کی نگاہ صرف بہیمیّت تک ہی پہنچی۔ آدم کی ملکیت تک نہ گئی۔ چنانچہ اس کمال کو واضح کرنے کے لیے علمی صلاحیّت پیش کی۔ تب فرشتوں نے عاجزی کا اظہار کیا۔ کہ ہمارے پاس یہ کمال نہیں ہے۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۹، ۲۰ / ج ۱

ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے عطا کیا۔ ہاں جس ہستی کے پاس علم وفہم کا یہ خزانہ ہوگا۔ خلافت کے لائق وہی ہوگی۔ اور وہی ہستی قانونِ خداوندی کو نافذ کر سکے گی۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ایک علم فرشتوں کو عطا ہی نہیں کیا تو ان کے امتحان کا کیا مطلب؟ اگر آدم علیہ السلام کی طرح فرشتوں کو بھی وہ علم سکھلا دیا جاتا تو وہ بھی جواب دے دیتے۔ اس کے جواب میں مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم فرشتوں کی موجودگی میں ہی دی گئی تھی۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ آدم علیہ السلام کو ان چیزوں کی ضرورت تھی۔ لہٰذا انہوں نے ان کے نام ذہن میں محفوظ کر لیے۔ مگر فرشتوں کو چونکہ ایسی چیزوں کی ضرورت ہی نہ تھی لہٰذا انہوں نے یہ نام ذہن نشین رکھنے کی کوشش ہی نہ کی۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی اُستاد پوری کلاس کے سامنے لیکچر دے سبق کی پوری پوری وضاحت کر دے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ امتحان کے وقت بعض طالب علم ٹھیک ٹھیک جواب دیتے ہیں۔ مگر بعض کو کچھ یاد نہیں ہوتا۔ حالانکہ استاد نے سب کو بیک وقت ایک ہی لیکچر دیا تھا۔ یہی حال آدم علیہ السلام اور فرشتوں کا ہوا۔ آدم علیہ السلام نے حسبِ حال ہونے کی بناء پر اُن چیزوں کے نام یاد کر لیے اور بوقت امتحان بتا دیے۔ مگر فرشتے اس سبق کو ضبط نہ کر سکے لہٰذا انہوں نے امتحان کے وقت عاجزی کا اظہار کر دیا۔

آدم علیہ السلام کی کامیابی

الغرض! جب فرشتے اس امتحان میں ناکام ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۔ فرمایا اے آدم! ان کو ان چیزوں کے نام بتلا دے۔ چنانچہ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ جب آدم علیہ السلام نے اُن کو ان چیزوں کے نام بتلا دیے۔ کہ یہ ہنڈیا ہے۔ اس میں سالن پکایا جاتا ہے۔ یہ توا ہے اس پہ روٹی پکائی جاتی ہے۔ یہ فلاں چیز ہے۔ یہ فلاں چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس قدر امتحانی سوال کیے۔ آدم علیہ السلام نے فرفر جواب دے دیے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہ میں آسمان و زمین کی پوشیدہ چیزوں کو جاننے والا ہوں۔

---

[1] تفسیر بیان القرآن صفحہ ۱/۱۸

یہاں آسمان وزمین کے غیوب کا تعلق مخلوق کے اعتبار سے ہے۔ نہ کہ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی کوئی چیز غائب ہے۔ اس کے لیے تو کوئی چیز بھی پس پردہ نہیں۔ البتہ مخلوق کے لیے بعض چیزیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور بعض پوشیدہ۔ دوسری جگہ ہے۔ "وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ" تیرے رب سے تو ایک ذرّہ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ اس پہ تو ہر چیز عیاں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اس لیے بولا جاتا ہے۔ کہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ جو مخلوق کے اعتبار سے پوشیدہ ہے یا ظاہر ہے۔ یہاں پر بھی اِنِّیٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا مطلب یہی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں زمین وآسمان کی تمام چیزوں کو جانتا ہوں، جو مخلوق یعنی انسان، جن اور فرشتوں کے اعتبار سے خواہ پوشیدہ ہیں یا ظاہر ہیں۔ حتیٰ کہ آدم علیہ السلام کی صلاحیت اور ان کے کمال کو بھی جانتا ہوں۔ اے فرشتو! تمہاری نظر تو آدم علیہ السلام کی بہیمیت تک ہی پہنچی ہے اور اسی سے تم نے اندازہ لگا لیا ہے۔ کہ یہ فتنہ وفساد برپا کرے گا۔ اور خونریزی کا مرتکب ہو گا۔ یا تم نے جنات پر قیاس کر کے کہہ دیا ہے کہ آدم زمین میں لڑائی جھگڑے کا موجب بنے گا۔ تمہاری نظر اس کے کمال تک پہنچ جاتی تو یہ گمان نہ کرتے۔

ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کے دل میں یہ بات آئی ہو کہ اے مولا کریم! ہم تیری تسبیح و تقدیس بیان کرنے والے ہیں لہٰذا اگر زمین میں نیابت کی ضرورت ہے۔ تو ہم حاضر ہیں۔

اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ہر اس چیز کو جانتا ہوں جس کو تم ظاہر کرتے ہو یا چھپاتے ہو۔ اے فرشتو! شاید تمہارا خیال ہو کہ جو صلاحیت ہم میں پائی جاتی ہے۔ وہ آدم میں نہ پائی جاتی ہو۔ مگر یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے آدم میں وہ کمال رکھ دیا ہے۔ جہاں تک تمہاری رسائی نہیں ہے۔ لہٰذا نیابت کا حقدار آدم علیہ السلام ہی ہے۔ اسی لیے فرمایا وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ۔ اے فرشتو! میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی برتری اور فضیلت کو عملی طور پہ فرشتوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ چنانچہ اگلی آیات میں فرشتوں کو سجدہ کے حکم کا بیان ہے۔

درس ہفدہم ١٧ (آیت ٣٤ تا ٣٦)

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَؕ
اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٣٤﴾ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ
اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ
شِئْتُمَاص وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ
﴿٣٥﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا
فِيْهِص وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ
فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٣٦﴾

ترجمہ: اور اس بات کو اپنے دھیان میں لاؤ جب کہا ہم نے فرشتوں سے سجدہ کرو آدم کے لیے۔ پس سجدہ کیا انہوں نے۔ مگر ابلیس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کفر کرنے والوں میں سے تھا ﴿٣٤﴾ اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ اور تم دونوں اس میں سے وسعت اور کشادگی سے کھاؤ۔ جہاں سے بھی چاہو۔ اور تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا، پس ہو جاؤ گے تم دونوں ظلم کرنے والوں میں سے ﴿٣٥﴾ پس پھسلایا اُن دونوں کو شیطان نے اُس سے۔ پس اُن کو اُس نعمت سے نکالا جس کے اندر وہ تھے اور ہم نے کہا اتر جاؤ بعض تمہارے بعض کے لیے دشمن ہیں۔ اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے۔ اور ایک مدت تک فائدہ اٹھانے کی بات ہے ﴿٣٦﴾

فرشتوں کی سجدہ ریزی

حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت عطا کرنے پر فرشتوں کو آپ کی فضیلت کا علم ہو گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کی تعظیم کرائی۔ تاکہ ان کی نیابت واضح ہو جائے۔ تو فرشتوں کو حکم ہوا۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کہ آدم علیہ السلام کے لیے سجدہ کرو۔ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔

مفسرین کرام نے اس مسئلہ میں بڑی بحث کی ہے۔ کہ جو سجدہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کے لیے کرایا، وہ کس قسم کا سجدہ تھا۔ انتہائی درجے کی عاجزی۔ تذلّل اور تواضع کے ساتھ پیشانی کو زمین پر رکھ دینا سجدہ کہلاتا ہے۔ اور اس کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً اگر یہ پیشانی معبودِ برحق کے حق کو ادا کرنے کے لیے جھکائی ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا ایسا کرنا ہر دور اور ہر شریعت میں حرام، باطل، کفر اور شرک رہا ہے۔ اور ایسے سجدہ کو سجدہ عبادت کہتے ہیں۔ البتہ سجدہ تحیہ و تکریم جو محض عزت و اعزاز کے لیے کیا جائے۔ یا جو سلام کے وقت کیا جائے۔ ایسا سجدہ پہلی شریعتوں میں روا تھا۔ مگر ہماری شریعت میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کو یہ سجدہ کرنا بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ جو سجدہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کے روبرو کیا۔ یہ سجدہ تعظیمی تھا[۱] یہ سجدہ عبادت نہ تھا۔ جو ہر شریعت میں حرام رہا ہے۔

خدا تعالیٰ کے سوا کو اب ہر قسم کا سجدہ حرام ہے

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[۲]۔ کہ سجدۂ عبادت اور سجدۂ تعظیمی کے درمیان فرق صرف نیت سے ہی ممکن ہے۔ اگر بوقت سجدہ نیت یہ ہے۔ کہ یہ وہی سجدہ ہے جو حق تعالیٰ کے سامنے روا ہے تو پھر ایسا سجدہ غیر اللہ کے سامنے کفر اور شرک ہوگا۔ اور اگر سجدہ محض تعظیم و تکریم کے لیے ہے تو یہ پہلی امتوں میں جائز تھا۔ جیسے یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کا یوسف علیہ السلام کو سجدہ یا فرشتوں کا آدم علیہ السلام کو سجدہ۔ مگر ہماری شریعت میں ہر قسم کا سجدہ ناجائز ہے۔ خواہ وہ تعظیمی ہو یا عبادتی ہو۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی غیر کے سامنے سجدہ منع ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا فرمان ہے[۳] لَوْ كُنْتُ اٰمِرًا اَحَدًا لَاَمَرْتُ الْمَرْاَةَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا یعنی اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کے سامنے سجدہ کرے کہ اللہ تعالیٰ نے خاوند کا بڑا حق رکھا ہے۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے[۴] لَا يَصْلُحُ لِبَشَرٍ اَنْ يَّسْجُدَ لِبَشَرٍ یعنی کسی انسان کے لیے لائق نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو سجدہ کرے۔ ایک صحابی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ کہ حضرت اہم باہر

---

[۱] تفسیر عزیزی فارسی ص۱۷۱ پارہ عا۔ تفسیر ابن کثیر ص۷۷ ج۱، [۲] حجۃ اللہ البالغہ ص۶۱ ج۱

[۳] ترمذی ص۱۸۷، [۴] مسند احمد ص۱۵۹ ج۳

جاکر دیکھتے ہیں کہ وہاں کے لوگ اپنے بادشاہوں کو سجدہ کرتے ہیں، حالانکہ وہ تو باطل ہیں۔ اور آپ نبی برحق ہیں۔ تو ہم آپ کے سامنے کیوں سجدہ نہ کریں۔ حضور علیہ السلام نے منع فرما دیا اور کہا[1] کہ دیکھو بھائی! جب میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ تو کیا تم میری قبر پہ سجدہ کرو گے۔ تو اس شخص نے کہا حضور! ہم ایسا نہیں کریں گے۔ آپ نے فرمایا جس طرح میری قبر پہ سجدہ حرام ہے۔ اسی طرح میرے سامنے سجدہ کرنا آج بھی حرام ہے خواہ تعظیمی ہی کیوں نہ ہو۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں[2] کہ اگر کسی نے قبر کو سجدہ کیا تو اس کو کفر اور شرک تو نہیں کہیں گے مگر اس کے حرام ہونے میں سب کا اتفاق ہے۔ اور اگر اس سجدہ سے مراد وہی سجدہ ہے جو بندے اپنے رب کے سامنے کرتے ہیں۔ تو ایسا کرنے والا کافر اور مرتد ہو جائے گا۔ اور اگر محض تعظیم کے لیے قبر، بادشاہ یا استاد کے سامنے کیا ہے۔ تو تمام صحابہ کرامؓ، آئمہ دین، علمائے کرام اور سلف صالحین کا متفقہ فتویٰ ہے کہ اس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں۔ اگرچہ کفر کے درجے تک نہیں پہنچتا۔

فرشتوں کے سجدہ کی بعض توجیہات

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں[3] کہ حضرت آدم علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کو سجدہ بمنزلہ قبلہ کے تھا۔ یعنی حقیقت میں سجدہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا گیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام محض جہت تھے۔ جن کی طرف منہ کر کے سجدہ کیا گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ ہم آج بھی قبلہ کی طرف منہ کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اور اس سے مراد قبلہ کو سجدہ کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ سجدہ تو اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح فرشتوں نے بھی آدم علیہ السلام کی طرف منہ محض قبلہ ہونے کی حیثیت سے کیا تھا۔ سجدہ آدم علیہ السلام کو نہیں تھا بلکہ اللہ تعالےٰ کے سامنے ہی تھا۔

بعض فرماتے ہیں[4] کہ لِاٰدَمَ کا لام سببی ہے۔ یعنی حکم یہ تھا کہ حق تعالیٰ کو سجدہ کرو۔ آدم علیہ السلام کی وجہ سے اور سبب سے۔ اور بعض فقہائے کرام فرماتے ہیں[5] کہ اس سجدہ میں دونوں باتیں

---

[1] ابو داؤد ص ۲۹۱ ج ۱ [2] بیان القرآن ج ۱ [3] ابن کثیر ص ۷۷ ج ۱، در منثور ص ۵۰ ج ۱
[4] تفسیر مظہری ص ۵۶ ج ۱، [5] ابن کثیر ص ۷۸ ج ۱، معالم التنزیل ص ۲۱ ج ۱

پائی جاتی ہیں۔ یعنی سجدہ عبادت تو اللہ تعالیٰ کے لیے تھا۔ اور تعظیم وتکریم آدم علیہ السلام کے لیے تھی گویا یہ خلافت کا تعظیمی سجدہ تھا۔

سجدہ خلافت یا سجدہ تعظیمی میں مسجود الیہ عرضی یا مجازی ہوتا ہے۔ حضرت مولانا نانوتویؒ فرماتے ہیں[1] کہ سجدہ عبادت میں مسجود الیہ بالذات ہوتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ مفسر قرآن کی توجیہہ یہ ہے[2] کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی اس زبردست تجلی کو سجدہ کیا تھا۔ جو آدم علیہ السلام کے قلب پر پڑ رہی تھی۔ یہی توجیہہ مولانا نانوتویؒ نے خانہ کعبہ کے متعلق اس وقت کی تھی جب ایک ہندو دیانند سرسوتی نے اعتراض پیش کیا تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا۔ کہ اگر ہندو پتھر کی مورتیوں کے سامنے سجدہ کرتا ہے۔ تو مسلمان بھی پتھروں سے بنی ہوئی دیواروں والے مکان یعنی خانہ کعبہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ پھر ہندو اور مسلمان میں فرق کیا ہوا؟ اس کے جواب میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے فرمایا تھا[3]۔ کہ مسلمان اس مکان کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ اس تجلّی الٰہی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ جو اس گھر پر پڑتی ہے۔ چونکہ یہ تجلّی عظیم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ لہٰذا مسلمان پتھر کی دیواروں کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ خدا تعالیٰ کو کرتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے۔ کہ اگر کسی وقت خدانخواستہ بیت اللہ شریف کی دیواریں منہدم بھی ہو جائیں اور بظاہر وہاں کوئی چیز باقی نہ رہے تو بھی مسلمان اسی جہت میں سجدہ ریز ہوں گے۔ برخلاف اس کے ہندو اسی طرف سجدہ کریں گے۔ جس طرف ان کا بت رکھا ہوا ہوگا۔ لہٰذا معلوم ہوا۔ کہ بت کے سامنے سجدہ کرنا دو مختلف چیزیں ہیں۔

ابلیس کا انکار

الغرض! جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا تو فَسَجَدُوْا سب نے سجدہ کیا اِلَّآ اِبْلِیْسَ سوائے ابلیس کے۔ یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ کرنے کا حکم تو فرشتوں کو دیا تھا۔ "وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا" مگر ابلیس کے انکار کا کیا مطلب ہے؟ تو مفسرین کرام فرماتے ہیں[4]۔ کہ سجدے کا حکم نہ صرف ملائکہ کو تھا، بلکہ جنات کو بھی تھا۔ اور ابلیس جنات میں سے ہے۔ بلکہ ابوالجنات تھا۔ اور جب کسی بڑے کو کوئی حکم دیا جاتا ہے۔ تو

۱ـ

۲ـ الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن ص ۴۳ ج ۱

۳ـ قبلہ نما ص

۴ـ تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۷۵ ج ۱

اس کے ماتحت والے خود بخود اس حکم کے پابند ہو جاتے ہیں۔ سورۃ اعراف میں ابلیس کے متعلق آتا ہے۔ کہ جب اس نے سجدہ نہ کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دریافت کیا "مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ" جب میں نے تمہیں حکم دیا تو تو نے سجدہ کیوں نہ کیا؟ معلوم ہوا۔ کہ سجدہ کرنے کا حکم ابلیس کو بھی ہوا تھا۔ اور نسلی طور پر یہ جنات میں سے تھا۔ جیسا کہ سورۃ کہف میں "كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ" وہ جنوں میں سے تھا۔ پس اپنے رب کے حکم سے باہر ہو گیا۔ مقصد یہ کہ سجدہ کا حکم فرشتوں اور جنات دونوں انواع کو ہوا تھا۔ فرشتے آدم علیہ السلام کے سامنے سربسجود ہو گئے۔ مگر ابلیس اور اس کی قوم نے انکار کیا۔

حضرت یحییٰ منیریؒ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ اور بڑے پائے کے عالم اور بزرگ تھے انہوں نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے۔ کہ ابلیس نے سات لاکھ سال اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تھی۔ مگر ایک حکم کی سرتابی پر مردود ہو گیا۔ اور اتنے لمبے عرصے کی عبادت برباد ہو گئی۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[۱]۔ کہ محدث ابن ابی الدنیا نے اپنی کتاب مکاید الشیطان میں ایک روایت بیان کی ہے۔ مکاید الشیطان کا مطلب ہے۔ شیطان کی مکاریاں تو وہ فرماتے ہیں کہ کسی موقع پر ابلیس کی ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہو گئی۔ ابلیس نے عرض کیا۔ کہ آپ اللہ تعالیٰ کے پاس میری سفارش کریں۔ وہ میری توبہ قبول کرلے۔ موسیٰ علیہ السلام نے سفارش کا وعدہ کیا۔ اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ اُدھر سے خدا تعالیٰ کا حکم ہوا۔ کہ میں ابلیس کی توبہ اس شرط پر قبول کرنے کو تیار ہوں کہ وہ آدم علیہ السلام کی قبر کو سجدہ کرے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے ابلیس کو یہ شرط پیش کی تو کہنے لگا۔ کہ زندگی میں تو میں نے آدم کو سجدہ نہ کیا اب اُس کی قبر کو سجدہ کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ ابلیس اپنی بات پر پکا تھا۔ اس نے انکار کیا۔ "اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ" نہ صرف انکار کیا بلکہ تکبر بھی کیا۔ اور تھا انکار کرنے والوں میں۔

یہاں پر ایک اور مسئلہ بھی سمجھ لیں۔ آپ کے مشاہدہ میں بھی شاید آیا ہو۔ کہ آجکل کے بعض

---

[۱] تفسیر عزیزی فارسی ص۱۷۶ پارہ ۱

مرید اپنے پیروں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ مشرکانہ فعل ہے۔ اگر نیت عبادت کی تھی۔ تو سجدہ کرنے والا کافر ہو گیا۔ اور اگر عبادت کی نیت نہ بھی تھی، محض تعظیم مقصود تھی۔ تو اس کے حرام ہونے میں کسی عالم کو، کسی بزرگ کو اختلاف نہیں۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ یہ بھی شرک ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ اور جو ایسا کرتا ہے اُس کو روکنا چاہیئے۔

حسد اولین گناہ ہے

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں۔[۱] کہ ابن منذرؒ نے عبادۃ بن ابی امیہؓ سے ایک روایت بیان کی ہے۔ کہ اس کائنات میں سب سے پہلا گناہ حسد تھا۔ جو ابلیس نے آدم علیہ السلام پر کیا۔ اور کہا "اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ" میں اس سے بہتر ہوں "خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ" مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔ لہذا میں اس سے افضل ہوں۔ میں کیوں اس کو سجدہ کروں۔ یہی ابلیس کی بھول تھی۔ کہ اُس نے اپنی شخصیت کی طرف دیکھا۔ اللہ تعالےٰ کے حکم پہ نگاہ نہ ڈالی۔ لہذا مردود ٹھہرا۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ جو کوئی بھی خدا تعالےٰ کے حکم کا انکار کرے گا۔ وہ ابلیس کی طرح کافر ہو جائے گا۔ ابلیس نے حسد کی وجہ سے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا۔ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ اور اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ کفر کرنے والا تھا۔

حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواؓ جنت میں

انکار ابلیس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا وَقُلْنَا یٰٓاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ حضرت حواؓ کی تخلیق کے متعلق دوسرے مقام پہ فرمایا "خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا" آدم علیہ السلام کی وحشت کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں کی پسلیوں سے اُن کا جوڑا پیدا فرمایا۔ اور آپ حضرت حواؓ سے مانوس ہو گئے۔ اس لیے فرمایا کہ تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ وَکُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا اور تم اس میں سے کشادگی کے ساتھ کھاؤ۔ جہاں سے چاہو۔

اس جنت کے متعلق بھی مختلف روایتیں ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جنت زمین پر تھی۔ مگر صحیح قول یہ ہے کہ جس جنت میں آدم علیہ السلام اور حضرت حواؓ کو رہنے کا حکم ہوا۔ وہ عالم بالا میں جَنَّۃُ الْمَاْوٰی ہے۔ جس کا ذکر قرآن پاک کے دوسرے مقامات پہ آیا ہے۔ سورۃ نجم

۱۔ تفسیر عزیزی فارسی صـ۱۷۹ پارہ ۱

میں موجود ہے "عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى" جو کہ سدرۃ المنتہی کے قریب ہے "عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى" یہ عالم بالاہی کے متعلق ہے۔

شجر ممنوعہ

جنت میں سکونت اختیار کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور حوا کو یہ حکم بھی دیا۔ کہ جہاں سے جتنا جی چاہے کھاؤ مگر وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ اس درخت کے قریب نہ جانا۔ اگر ایسا کرو گے فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ تو ظلم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمادی۔

یہ کون سا درخت تھا۔ جس کی مقاربت سے منع فرمایا گیا۔ اس کے متعلق مفسرین کرام کے کئی اقوال ہیں۔ بعض اسے کھجور کا درخت بتاتے ہیں بعض انجیر کا اور بعض انگور کا[1]۔ بائیبل کی روایت کے مطابق یہ نیکی اور بدی کی پہچان کا درخت تھا۔ اور بعض نے یہ توجیہہ[2] کی ہے۔ کہ آدم علیہ السلام اور حوا کے ملاپ یعنی مباشرت کو درخت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس لحاظ سے پیدا ہونے والی اولاد کو پھل کہا گیا ہے۔

بعض مفسرین[3] کا خیال ہے۔ کہ شجر ممنوعہ گندم کا درخت تھا۔ مگر یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے۔ کہ گندم کا درخت نہیں بلکہ چھوٹا سا پودا ہوتا ہے۔ مفسرین نے اس اعتراض کا جواب بھی دیا ہے، فرماتے ہیں۔ کہ شاعر لوگ لطیفے کی زبان میں کہتے ہیں۔

ـــ بخور نان جواری گر جوار اللہ می خواہی   کہ گندم کرد آدمؑ را بیرون از جنۃ الماویٰ

اگر اللہ تعالیٰ کا قرب چاہتے ہو۔ تو جوار کی روٹی کھاؤ۔ جو قدرے ٹھنڈی ہوتی ہے۔ گندم گرم ہوتی ہے۔ اگر اس کی روٹی کھاؤ گے تو اس نے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوا دیا۔ مولانا رومیؒ بھی فرماتے ہیں ـــ ایں عشق نیست ایں فساد گندم است۔ یہ عشق نہیں ہے بلکہ گندم کی گرمی کا اثر ہے۔ اور یہ اسی کا برپا کردہ فساد ہے۔ غرضیکہ گندم کے اس درخت کو دنیا کے گندم کے درخت پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔

امام ابوداؤدؒ نے خود اپنا مشاہدہ نقل کیا[4] ہے۔ کہ انہوں نے مصر میں اتنا بڑا ستگرہ دیکھا۔ جسے

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۷۹/۱ اور درمنثور ص ۵۲/۱۔ [2] الہام الرحمٰن از حضرت سندھیؒ ص ۳۵/۱۔ [3] تفسیر عزیزی فارسی پ ۱ ص ۱۸۱ ابن کثیر ص ۷۹/۱
[4] ابوداؤد ص ۲۲۶/۱

دو ٹکڑے کر کے بڑی مشکل سے اونٹ پر لادا گیا۔ اگر اس دنیا میں اتنا بڑا شکرہ ہو سکتا ہے۔ تو جنت میں گندم کا درخت اتنا بڑا کیوں نہیں ہو سکتا۔ امام ابوداؤد نے یہ بھی بیان کیا ہے[1] کہ انہوں نے دس بالشت لمبا کھیرا دیکھا ہے۔ یہ ترکی قسم کا کھیرا جو موسم گرما میں ہوتا ہے۔ اور بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ روایات میں آتا ہے[2]۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت انار کے دانے اتنے بڑے بڑے ہوں گے۔ کہ ایک دانے کے نصف خول سے اتنا بڑا خیمہ بن سکیگا۔ جس کے نیچے دس بیس آدمی ٹھہر سکیں۔ بہر حال یہ اعتراض معقول نہیں ہے۔ کہ گندم کا پودا ہوتا ہے۔ درخت نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ جنت میں گندم کا بہت بڑا درخت ہو۔ جس کے قریب جانے یا پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا۔

شیطانی وسوسہ

اللہ تعالیٰ کے حکم سے آدم علیہ السلام اور حضرت حوّا جنّت میں رہنے لگے۔ وہ بچوں کی طرح معصوم تھے۔ ابھی ان میں بہیمیّت کا مادہ نہیں ابھرا تھا۔ کہ شیطان نے آہستہ آہستہ وسوسہ ڈالنا شروع کیا۔ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا ان دونوں کو شیطن نے پھسلا دیا۔ دوسری جگہ آتا ہے[۲] فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ شیطان نے دونوں میں وسوسہ ڈالا۔ کس چیز کے متعلق وسوسہ ڈالا۔ اس میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ درخت کا پھل کھانے کے متعلق وسوسہ ڈالا۔ دوسری جگہ موجود ہے۔ کہ شیطان نے کہا کہ اس کو کھالو گے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں رہ جاؤ گے۔ اور کسی قسم کا خطرہ لاحق نہ ہوگا۔

بعض کہتے ہیں[3] کہ ضروری نہیں کہ وسوسہ دل کے اندر ہی ڈالا جائے۔ کوئی فعل سرزد کرنے سے بھی وسوسہ اندازی ہوتی ہے۔ بعض کہتے ہیں[4] کہ شیطان ایک جنیہ کو پکڑ کر لایا۔ اور جنت کے دروازے پر اس سے مباشرت کی جسے آدم علیہ السلام دیکھ رہے تھے۔ تو ان کے دل میں بھی ویسا ہی خیال پیدا ہوا۔ انہوں نے حضرت حوّا کے ساتھ مقاربت کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جنت کا لباس اتر گیا۔ اور وہ دونوں برہنہ ہو گئے۔

۱؎ ابوداؤد صـــ ۲۲۶/۱ ۔ ۲؎ ترمذی صـــ ۳۲۶

۳؎ درمنثور صـــ ۵۳/۱ ۔ ۴؎ الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن صـــ ۳۵/۱

جنت سے خروج

شیطان کی وسوسہ اندازی کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اس وسوسہ اندازی نے فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ان دونوں کو اس جگہ یعنی جنّت سے نکال دیا جس کے اندر وہ تھے۔ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا اور ہم نے کہا اتر جاؤ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہیں۔ شیطان تمہارا دشمن ہے اور تم اس کے دشمن ہو۔ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ اور زمین میں تمہارے لیے ٹھکانا ہے۔ اب تمہاری رہائش زمین پہ ہوگی۔ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ اور ایک مدت تک فائدہ اٹھانا ہے۔ یعنی تمہاری اصل رہائش گاہ زمین ہی ہوگی۔ البتہ اگر زمین کو چھوڑ کر کہیں فضاؤں یا سمندروں میں جاؤ گے تو وہ عارضی قیام گاہ ہوگا۔ مستقل قیام زمین پہ ہی کرو گے۔

زمین ہی اصل ٹھکانا ہے

آج کے دور میں جو پراپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ کہ ہم زمین پہ مستقل طور پہ نہیں رہیں گے۔ بلکہ چاند، مریخ یا دوسرے سیاروں میں چلے جائیں گے۔ تو یہ محض شیطانی پراپیگنڈا ہے۔ چاند ہماری زمین سے قریب ترین سیارہ ہے۔ اور اس کا فاصلہ اڑھائی لاکھ میل ہے۔ مریخ تو یہاں سے پچاس کروڑ میل دور ہے۔ اور دوسرے سیارے اس سے بھی دور ہیں۔ فرض کر لیا کہ چاند پہ رہائش کا بندوبست ہو جاتا ہے۔ وہاں ہوٹل قائم ہو جاتے ہیں۔ تو سائنسدانوں کا اپنا اندازہ یہ ہے۔ کہ ایک پونڈ غذا کو چاند پہ پہنچانے کے لیے تیس ہزار پونڈ خرچ ہوں گے۔ وہاں پہنچنے کا خصوصی لباس چار لاکھ روپے میں تیار ہوگا۔ یہ لباس تو راستے میں ہی جل جائے گا۔

چاند پہ تو ایٹمی لباس پہننا ہوگا، وہاں کی گرمی کی مقدار تقریباً چالیس ہزار سنٹی گریڈ ہے۔ جہاں پہ پانی تو کجا تانبا بھی پگھلنے لگتا ہے۔ چاند کے ایک طرف گرمی ہے۔ اور دوسری طرف اتنی سردی ہے۔ جس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ لہذا ایسی جگہ پہ رہنے کے لیے اتنا قیمتی لباس تیار کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے۔ خوراک اور لباس پہ اتنی رقم کون خرچ کر کے رہائش پذیر ہوگا۔ اگر کوئی وہاں تک پہنچے گا بھی۔ تو اس کا قیام بالکل عارضی ہوگا۔ آخر کار اُسے زمین پہ ہی آنا پڑے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ تمہارا اصل ٹھکانا زمین پہ ہی ہوگا۔ دوسری جگہ فرمایا مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى "اے انسان! ہم نے تمہیں اسی زمین سے پیدا کیا۔ اسی میں لوٹائیں گے۔ اور پھر قیامت کو دوسری مرتبہ اسی سے نکالیں

گے۔ اسی لیے یہاں پر فرمایا۔ کہ اے آدم اور حوا تم یہاں سے زمین پر اتر جاؤ۔ ایک خاص مدت تک وہی تمہارا ٹھکانا ہوگی۔

فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیۡہِ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ التَّوَّابُ
الرَّحِیۡمُ ﴿۳۷﴾ قُلۡنَا اہۡبِطُوۡا مِنۡہَا جَمِیۡعًا ۚ فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ
مِّنِّیۡ ہُدًی فَمَنۡ تَبِعَ ہُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ
یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَکَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِکَ ۴
اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۳۹﴾ ع ۴

ترجمہ:- پس آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا آدم کی طرف مہربانی کے ساتھ۔ بے شک وہ رجوع کرنے والا بے حد مہربان ہے ﴿۳۷﴾ ہم نے کہا تم سب زمین پر اتر جاؤ۔ پس جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئیگی۔ پس جس نے میری ہدایت کی پیروی کی۔ ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اور نہ وہ غم کھائیں گے ﴿۳۸﴾ اور جنہوں نے کفر کیا۔ اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔ وہ دوزخ والے ہیں۔ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ﴿۳۹﴾

گذشتہ سے پیوستہ

جب حضرت آدم علیہ السلام نے اس درخت کا پھل کھالیا۔ جس سے انہیں منع کیا گیا تھا۔ تو ان سے انعام واکرام لے لئے گئے۔ اور انہیں حکم ہوا۔ کہ زمین پر اتر جاؤ۔ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہیں۔ اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے۔ اور تمہیں ایک وقت تک فائدہ اٹھانا ہوگا۔ اب آدم علیہ السلام کو بڑی پریشانی ہوئی۔ کہ انہیں زمین پر اترنے کا حکم مل گیا ہے۔ بعض روائتوں میں یہ بھی آتا ہے[1]۔ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام آئے اور آدم علیہ السلام کے سر سے تاج اتار لیا۔ اور ان کے جسم سے بہشت کا لباس بھی اتار لیا اور انہیں برہنہ کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے ستر ڈھانپنے کے لیے جنّت کے درخت کے پتّے استعمال کیے۔ کیونکہ دوسروں کے سامنے ستر کا کھلنا خلافِ فطرت ہے۔

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۸۳ پارہ ۱

حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ

اس کے بعد کیا ہوا۔ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ پس آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے۔ تلقی کا معنی پانا یا سیکھنا ہے۔ ان کلمات کا اللہ تعالیٰ نے الہام کیا یا آدم علیہ السلام کے دل میں ڈالا۔ ان کلمات کے ساتھ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کی۔ جیسا کہ سورۃ اعراف میں آتا ہے۔ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ یعنی اے پروردگار! بیشک ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ اگر تو ہمیں معاف نہیں کرے گا۔ اور ہم پر رحم نہیں کرے گا۔ تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ حدیث میں ان دعائیہ کلمات کا ذکر ہے۔ جن کے ذریعے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ فَتَابَ عَلَيْهِ اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا۔ آدم علیہ السلام کی طرف مہربانی کے ساتھ تاب کا معنی رجوع کرنا ہے۔ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے۔ تو اس کا مطلب ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا اپنی مہربانی کے ساتھ۔ اور جب اس لفظ کو بندے کی طرف منسوب کیا جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہو گا۔ کہ بندے نے رجوع کیا اپنی عاجزی کے اعتراف کے ساتھ اور برائی کے ترک کرنے کے ساتھ۔ گویا توبہ کی صفت کا تعلق خالق اور مخلوق دونوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں "تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گناہوں کو چھوڑ دو۔ اور عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ اس سے معافی مانگو۔ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ بے شک وہ رجوع کرنے والا بڑا مہربان ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی لغزش کو معاف کر دیا۔

امام بیہقیؒ نے اپنی مشہور کتاب شعب الایمان میں روایت بیان کی ہے[1]۔ کہ اپنی لغزش پر آدم علیہ السلام اس قدر روئے کہ لَوْ وُزِنَ دُمُوْعُ اٰدَمَ بِجَمِيْعِ دُمُوْعِ وَلَدِهٖ لَرَجَحَ دُمُوْعُهٗ عَلٰى جَمِيْعِ دُمُوْعِ وُلْدِهٖ یعنی آدم علیہ السلام نے جس قدر آنسو بہائے اگر ان کا مقابلہ ان کی قیامت تک آنے والی ساری اولاد کے ساتھ کیا جائے۔ تو آدم علیہ السلام کے آنسو غالب آجائیں۔ اور بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت بھی مروی[2] ہے۔

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صـ۱۸۵ پارہ ۱ بحوالہ بیہقی شعب الایمان [2] در منثور صـ۵۴ ج۱ بحوالہ بیہقی شعب الایمان

مَا حَمَلَكَ عَلٰی اَنْ اَکَلْتَ مِنَ الشَّجَرَةِ اے آدم! تم کو اس درخت کا پھل کھانے پر کس نے آمادہ کیا۔ الَّتِیْ نَھَیْتُكَ جس سے میں نے منع کیا۔ قَالَ یَارَبِّ زَیَّنَتْهُ لِیْ حَوَّاءُ اے اللہ! اس کو میرے لیے حوا نے مزین کیا۔ یعنی اس درخت کا پھل کھانے کے لیے حوا نے مجھے ترغیب دی تھی۔ تاکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیں رہ جائیں گے۔ یہ شیطان کا وسوسہ تھا۔

حضور علیہ السلام کی حضرت آدم علیہ السلام پر فضیلت

خطیب بغدادی نے روایت بیان کی ہے۔ اور بیہقیؒ نے دلائل النبوۃ میں اس کو نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[۱]۔ اللہ تعالےٰ نے مجھے آدم علیہ السلام پر دو باتوں میں برتری عطا فرمائی ہے۔ اول یہ کہ ہر آدمی کے ساتھ قرین اور شیطان مقرر ہے۔ جو اسے بہکاتا ہے مگر میرا قرین اور شیطان کَانَ شَیْطَانِیْ مُسْلِمًا وہ مطیع اور منقاد ہے۔ صحیح روایت میں آتا ہے[۲]۔ فَلَا یَاْمُرُنِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ وہ مجھے برائی کا حکم نہیں دیتا بلکہ بھلائی کی دعوت ہی دیتا ہے۔ چونکہ آدم علیہ السلام کے ساتھ ابلیس تھا۔ اُس نے وسوسہ اندازی کی جس سے حضرت حواؓ بھی متاثر ہوئیں۔ اور انہوں نے آدم علیہ السلام کو درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی۔

فرمایا[۳] آدم علیہ السلام پر مجھے دوسری فضیلت یہ ہے۔ کہ ان کی بیوی نے برائی کی طرف ترغیب دی۔ جب کہ میری ازواج دین کے معاملے میں میرے ساتھ تعاون کرتی ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک میں ازواج مطہرات کی تعریف فرمائی ہے۔ ایک موقع پر ان سے معمولی سی لغزش ہوئی تھی۔ جب انہوں نے زیادہ خرچہ کا مطالبہ کیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی جس پر وہ اپنے مطالبہ سے دست بردار ہو گئیں۔ اور دنیا کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آخرت کو اختیار کیا۔ گویا حضور علیہ السلام کی بیویاں آپ کے امور میں معاون تھیں۔ ویسے بھی آپ کا فرمان ہے[۴]۔ کہ وہ انسان نیک بخت ہے۔ جس کی بیوی دین کے معاملہ میں اس کی معاون ہو۔

زمین پر اُترنے کا حکم

صحاح ستہ کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے[۵]۔ لَوْلَا بَنُوْا اِسْرَائِیْلَ اگر بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے نبی کے حکم میں خیانت نہ کرتے۔ یعنی نبی نے حکم دیا تھا۔ کہ من اور سلویٰ کھاؤ پیو۔ مگر اسے ذخیرہ نہ کرنا۔ مگر انہوں نے ذخیرہ کرنا شروع کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی

---

[۱] تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۹۲/پ ۱، [۲] مسلم ص ۳۷۶/ج ۲، [۳] تفسیر عزیزی ص ۱۹۲/پ ۱، [۴]
[۵] بخاری ص ۴۶۹/ج ۱، مسلم ص ۴۷۵/ج ۱

سزا یہ دی۔ کہ گوشت گلنا سڑنا شروع ہوگیا۔ آج کل گرمی کے موسم میں تو ایک دو دن سے زیادہ گوشت نہیں رہ سکتا۔ بدبو آنے لگتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر بنی اسرائیل اپنے نبی کے حکم کی پاسداری کرتے۔ گوشت کو ذخیرہ نہ کرتے تو یہ کبھی خراب نہ ہوتا۔ خواہ کتنا ہی عرصہ پڑا رہتا۔

دوسری بات آپ نے یہ فرمائی لَوْلَا حَوَّاءُ لَمْ تَخُنْ اُنْثٰی زَوْجَهَا۔ یعنی اگر حواؑ اپنے خاوند کی خیانت نہ کرتی۔ تو دنیا کی کوئی عورت اپنے خاوند کے ساتھ خائن نہ ہوتی۔ حواؑ کی خیانت یہ تھی۔ کہ انہوں نے آدم علیہ السلام کو درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی تھی۔

بہر حال جب آدم علیہ السلام نے پھل کھالیا۔ اور برہنہ ہوگئے۔ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا۔ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ج تم سب زمین پہ اتر جاؤ۔ یہ حکم شیطان، آدم علیہ السلام اور حواؑ سب کے لیے تھے۔ توبہ تو قبول ہوگئی۔ مگر زمین پر اتر جانے کا حکم صادر ہوگیا۔

بائبل اور بعض تاریخی روایات میں مور اور سانپ کا ذکر بھی آتا ہے کہ وہ بھی آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالنے میں معاون ہوئے تھے۔ اور یہ کہ شیطان سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنّت میں داخل ہوگیا تھا۔ مگر یہ روایت درست نہیں ہیں۔ صحیح بات یہی ہے کہ شیطان نے جنّت کے باہر وسوسہ اندازی کی تھی۔ اس نے دروازے سے باہر جنبیہ سے مباشرت کی تھی۔ جسے آدم علیہ السلام دیکھ رہے تھے۔ اور اس کی بات بھی سُن رہے تھے۔ اسی بات سے آپ کو وسوسہ پیدا ہوا۔ اور آپ نے وہ کام کرلیا۔ جس سے منع کیا گیا تھا۔ لہٰذا آپ کو زمین پر اترنے کا حکم ہوگیا۔

آدم علیہ السلام اور حضرت حواؑ کی حاجات

آدم علیہ السلام نے پھل کھایا ہوا تھا۔ اُدھر زمین پر اتار گیا۔ آپ کو بول و براز کی حاجت ہوئی۔ پیٹ میں درد پیدا ہوا۔ آپ پریشان ہوگئے کہ اس سے پہلے یہ تکلیف کبھی نہیں ہوئی تھی۔ آپ کی پریشانی دیکھ کر جبرائیل علیہ السلام آئے۔ اور آپ کو بتایا کہ اس تکلیف سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس طریقے سے فراغت حاصل کریں۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ تو براز سے بدبو آنے لگی۔ آپ کو اور پریشانی ہوئی۔ رونے لگے کہ یہ کیا مصیبت ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ

درمنثور ص ۵۲ ج ۱، معالم التنزیل ص ۲۲ ج ۱، ابو السعود ص ۷۳ ج ۱

ستروں تک روتے رہے۔ اس واقعہ کو ابن ابی الدنیا نے روایت کیا ہے[۱]۔ اور امام دارقطنیؒ نے بھی کتاب الافراد میں حضرت عمرؓ سے بیان کیا ہے[۲]۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو اس وقت بھیجا جب حضرت حواؑ کو حیض کی حاجت ہوئی۔ جنت میں تو ہر طرح کی پاکیزگی حاصل تھی۔ زمین پر آکر یہ پریشانی لاحق ہوگئی۔ مائی حواؑ نے جبرائیل علیہ السلام کو آواز دی۔ کہ دیکھو یہ کیا معاملہ ہے مجھے وقفہ وقفہ سے خون آرہا ہے۔ جبرائیل علیہ السلام نے کہا۔ اے حواؑ! یہ بات تم پر اور تمہاری بنات پر ہمیشہ کے لیے مسلط رہے گی۔

بخاری اور مسلم کی روایت میں آتا ہے[۳]۔ کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کو ایام حج میں حیض کی حالت لاحق ہوگئی۔ آپ نے احرام باندھا ہوا تھا۔ حیض آنے پر سخت افسردہ ہوئیں اور رونے لگیں۔ حضور علیہ السلام تشریف لائے۔ تو آپ سے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ هٰذَا شَیْءٌ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلٰى بَنَاتِ اٰدَمَ یہ ایسی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی بیٹیوں پر لازم کر دیا ہے۔

الغرض! جبرئیل علیہ السلام نے حواؑ کو یہی کہا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری بیٹیوں پر یہ چیز لازم کر دی ہے۔ یہ تمہارے گناہوں کا کفارہ بنے گا۔ اور تمہارے لیے پاکیزگی کا ذریعہ ہوگا۔ اس کی وجہ سے عورت جسمانی طور پر صحت حاصل کرتی ہے۔ اور اگر نیک بخت ہے۔ تو باطنی طور پر بھی اس کو طہارت نصیب ہوگی۔

جنت کے تحفے

جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اترے، تو بعض روایات[۴] کے مطابق تیس ۳۰ قسم کے پھلوں کے بیج ان کے ساتھ آئے۔ بعض دوسری روایات[۵] میں ہزار قسم کا ذکر آتا ہے بعض روایات میں خوشبو کا تذکرہ ملتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں۔ کہ خوشبو جنت کا تحفہ ہے اگر کوئی پھول یا گلدستہ پیش کرے۔ تو اس کو رد نہیں کرنا چاہیے۔ فَاِنَّهٗ خَرَجَ مِنَ الْجَنَّةِ[۶] کیونکہ یہ جنت سے آئی ہوئی ہے۔

---

۱ تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۹۳ پ ۱ ، ۲ درمنثور ص ۵۴ ج ۱ ، آیات الاذان ۔ ۳ بخاری ص ۴۳ ج ۱، مسلم ص ۳۸۸ ج ۱

۴ تفسیر عزیزی ص ۱۹۲ پ ۱ ۵ ۔ ۶ شمائل مع ترمذی ص ۵۸۳

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے[1]۔ کہ سنداں، چمٹا اور ہتھوڑا بھی آدم علیہ السلام کے ساتھ نازل ہوا۔ تاکہ دنیا میں کام کاج کر سکیں۔ حجر اسود بھی جنّت سے اترا تھا۔ پہلے اس کو جبل ابو قبیس پر رکھا گیا۔ یہ دودھ کی طرح سفید تھا۔ اور رات کو سورج کی طرح چمکتا تھا۔ آہستہ آہستہ انسانوں کے گناہوں کی تاریکیوں نے اس پتھر کو سیاہ کر دیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کا مقام نزول

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں[2] آتا ہے۔ کہ آدم علیہ السلام ہندوستان کی سرزمین شرق الہند میں اترے تھے۔ چنانچہ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان کے مصنّف لکھتے ہیں۔ کہ آدم علیہ السلام کا نزول شرق الہند میں اور حضرت حوّاؑ کا نزول جدہ میں ہوا۔ جدّہ کا لفظی معنی دادی یا نانی ہے۔ غالباً اسی مناسبت سے اس مقام کا نام جدّہ مشہور ہو گیا۔ صاحب سبحۃ المرجان بڑے پائے کے محدّث اور عالم تھے۔ اور امام شاہ ولی اللہؒ کے ہم عصر تھے۔

بعض انبیاء علیہم السلام کے پیشے

حضرت آدم علیہ السلام کھیتی باڑی کرتے تھے۔ اور کپڑے بننے کا کام بھی آپ ہی سے شروع ہوا۔ دراہم اور اشرفیاں بھی حضرت آدم علیہ السلام نے بنائیں۔ دیگر انبیاء علیہم السلام میں سے حضرت نوح علیہ السلام نجاری یعنی بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام درزی کا کام کرتے تھے۔ حضرت ہود اور صالح علیہما السلام تاجر تھے۔ حضرت ابراہیم اور لوط علیہما السلام نے کھیتی باڑی کا پیشہ اختیار کیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام مویشی پالتے تھے۔ اور ان کا دودھ اور اون وغیرہ فروخت کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیشہ گلہ بانی تھا۔ داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے حضرت سلیمان علیہ السلام روئے زمین کی عظیم سلطنت کے بادشاہ ہونے کے باوجود اپنی گذر اوقات کے لیے ٹوکریاں اور زنبیلیں بناتے تھے[3]۔

توبہ کی قبولیت

امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں روایت نقل کی ہے[4]۔ کہ جب آدم علیہ السلام سے لغزش سرزد ہوئی تو وہ بہت نادم ہوئے۔ انہوں نے عرش پر نگاہ کی۔ تو وہاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ لکھا پایا۔ آپ نے خیال کیا۔ کہ جس شخصیت کا نام اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ لکھا

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۱۹۲ پ ۱ [2] ابن کثیر صفحہ ۸۰ ج ۱ [3] تفسیر عزیزی صفحہ ۱۹۳ پ ۱
[4] تفسیر عزیزی صفحہ ۱۸۴ پ ۱

ہوا ہے۔ یہ ضرور کوئی عظیم شخصیت ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ معافی مانگی۔ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اِلَّا غَفَرْتَ لِیْ۔ اے اللہ! میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طفیل سے دعا کرتا ہوں کہ میری لغزش کو معاف فرما دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے آدم! تمہیں کیا علم کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ مولا کریم! میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ تیرے نام کے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نام لکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم! تیری اولاد میں یہ آخری نبی ہوں گے۔ اور میری پوری مخلوق میں ان کی فضیلت کو کوئی نہیں پہنچے گا۔ اگرچہ یہ روایات ضعیف ہیں اور بعض نے ان کو موضوع بھی کہا ہے۔ تاہم تشریح کی خاطر ان کو قبول کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی لغزش کو معاف کر دیا۔ بیہقی کے علاوہ یہ روایات طبرانی، حاکم اور ابونعیم میں بھی موجود ہیں۔ اور روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو دنیا میں ابوالبشر کی کنیت سے پکارا جاتا ہے۔ اور قیامت کے دن حضور علیہ السلام کی طرف نسبت کرتے ہوئے ابو محمد کی کنیت سے پکارا جائے گا۔ گویا آپ کو ابوالبشر اور ابو محمد دونوں اعزاز حاصل ہیں۔

بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے[۱]۔ کہ قیامت کے روز جب لوگ آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے تو کہیں گے کہ اے آدم اَنْتَ اَبُوالْبَشَرِ آپ تمام نسل انسانی کے جد امجد ہیں۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ حساب کتاب شروع کریں۔ حضرت آدم علیہ السلام انکار کر دیں گے اور کہیں گے کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں آتا ہے[۲] کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا۔ کیا آدم علیہ السلام خدا تعالیٰ کے نبی تھے۔ فرمایا ہاں۔ نَبِیًّا رَسُوْلًا کَلَّمَهُ اللّٰهُ آپ نبی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سے کلام کیا۔ آپ پر وحی نازل ہوئی تھی۔ اَوَّلُ الْاَنْبِیَاءِ[۳] آدمؑ اور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

توبہ کی تین شرائط

توبہ ایک ایسا عمل ہے۔ جس سے انسان کی سابقہ کوتاہیوں کی معافی ہو جاتی ہے حضور علیہ السلام

---

[۱] مسلم ص ۱۰۸ ج ۱ البخاری ص ۹۷۱ ج ۲ [۲] تفسیر عزیزی ص ۱۸۸ پ ۱ ،،

کا فرمان ہے[1] اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے۔ جیسا اس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ مگر توبہ کی قبولیت کے لیے بعض شرائط بھی ہیں۔ اگر ان شرائط کے ساتھ توبہ کی ہے تو قبول ہوگی ورنہ نہیں۔ توبہ میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی علم حال اور عمل۔

علم سے مراد یہ ہے۔ کہ آدمی جانتا ہے۔ کہ میں نے واقعی یہ غلط کام کیا ہے۔ اور اس کے ارتکاب پر گناہ اور اس کے ضرر کا احساس ہوتا ہے۔ حال کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان اس غلط کام کو ترک کر دے۔ اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرے یہ عمل ہے۔ اس ضمن میں ندامت کا ذکر بھی آتا ہے[2] اَلتَّوْبَةُ النَّدَمُ اور اگر کچھ فرائض رہ گئے ہوں تو ان کو ادا کیا جائے۔ کوئی حقوق تلف ہوئے ہوں۔ تو اُن کو پورا کیا جائے۔ تب انسان کی توبہ قبول ہوتی ہے۔

امام دارقطنیؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت بیان کی ہے[3]۔ جس میں آدم علیہ السلام سے متعلق مختلف باتیں ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی وفات پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے مسجد خیف میں (جو کہ منیٰ میں واقع ہے) حضرت آدم علیہ السلام کی نمازِ جنازہ پڑھی اور چار تکبیریں کہیں۔ فرشتوں کی ایک جماعت بھی آپ کے ساتھ تھی۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کو لحد میں دفن کیا گیا۔ اور اُن کی قبر کوہان دار بنائی گئی۔ جیسا کہ عام طور پر آج کل بنائی جاتی ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے[4] کہ آدم علیہ السلام نے ہندوستان کی سرزمین سے چالیس حج پیدل کیے۔

زمین پر آتارنے کی حکمت

ان آیات میں اِهْبِطُوْا یعنی اتر جاؤ کا لفظ دو دفعہ آیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[5]۔ کہ پہلی دفعہ اللہ تعالیٰ نے اتر جانے کا عام حکم دیا تھا۔ مگر جب اس حکم کی فوری تعمیل نہ ہوئی۔ تو دوبارہ سخت آرڈر ہوا۔ کہ فوراً زمین میں اتر جاؤ۔

یہاں پر یہ نکتہ قابلِ غور ہے۔ کہ زمین پر اترنے کا حکم کسی سزا کے طور پر نہیں تھا۔ بلکہ اس

---

[1] ابن ماجہ ص ۳۱۳ [2] ابن ماجہ ص ۳۱۳ فیض القدیر، شرح جامع صغیر ص ۲۸۵ ج ۲،
[3] تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۹۶ پارہ ۱۵، [4] درمنثور ص ۵۶ ج ۱ تفسیر عزیزی ص ۱۹۷ پارہ ۱ [5] ابن کثیر ص ۸۲ ج ۱

میں بھی حکمتِ خداوندی تھی۔ تخلیق آدم کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً" کہ میں زمین میں نائب بنانے والا ہوں۔ چنانچہ اس ارادے کی تکمیل یعنی خلافت ارضی کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتار گیا۔ آپ نے نیابت کے کام کی ابتدا کی۔ اور پھر یہ فرض آپ کی آنے والی اولاد میں منتقل ہو گیا۔ گویا زمین پر اترنے کا حکم سزا نہیں بلکہ ایک اعزاز تھا۔ جو آدم علیہ السلام کے حصے میں آیا کہ انہیں نیابت الٰہی کا فریضہ سونپا گیا۔

خوفِ محشر کی حقیقت

حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارنے کے بعد اللہ تعالےٰ نے مزید حکم یہ دیا کہ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے۔ یعنی جب انبیاء علیہم السلام میرا پیغام اور ہدایت لے کر آئیں فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی۔ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ اُن پر انجام کے لحاظ سے کوئی خوف نہیں ہو گا وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ اور نہ وہ غم کھائیں گے۔

یہاں پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے۔ کہ قیامت کے دن تو بہت زیادہ خوف ہو گا۔ عام انسانوں کا تو کیا حال ہو گا۔ خود نبیوں کے متعلق آتا ہے۔ کہ وہ نَفْسِیْ نَفْسِیْ پکاریں گے۔ اس کے جواب میں مفسرین کرام فرماتے ہیں[1]۔ کہ ظاہری طور پر تو یہ واقعی خوف ہو گا۔ مگر انجام کے اعتبار سے بالکل خوف نہیں ہو گا۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی قہری صفات کا ظہور ہو گا۔ تو خوف و ہراس طاری ہو گا۔ جیسے کسی مقدمہ میں ملزم بڑا گھبراتا ہے۔ مگر وکیل مقدمے کی مثل دیکھ کر کہہ دیتا ہے۔ کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ تسلی رکھو۔ آخر کار انجام بخیر ہو گا۔ اسی طرح جو لوگ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آمدہ ہدایت کی پیروی کریں گے۔ انہیں اگرچہ قیامت کے دن وقتی طور پر خوف پیدا ہو گا مگر اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق آخر کار انہیں خوف نہیں ہو گا۔

ہدایت کے متبعین

ہدایت اصل میں دین کی روح اور حکمت کو کہا جاتا ہے۔ اور دین حق دائمی قانون کا نام ہے جو انسانیت کے اصلی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اسی ہدایت کے مفصلات میں نبی، رسول، بینات، معجزات، کتبِ سماویہ اور شریعت وغیرہ آتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کا اتباع ہی ہدایت

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۱۹۱ پارہ ۱

کا اتباع ہے۔ قرآن پاک میں بَیِّنَات کا لفظ لاتعداد مقامات پر آیا ہے۔ اور ہدایت کا لفظ بھی آیا ہے۔ بَیِّنَات وہ ہوتے ہیں۔ جو بالکل واضح اور بدیہہ ہوں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننا بینات میں سے ہے۔ اسی طرح صبر وشکر کرنا اور خدا تعالیٰ کا ذکر کرنا بینات ہیں۔ ہدایت وہ چیز ہوتی ہے۔ جس کی تعلیم کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً شعائر اللہ کی تعظیم احکام شرع میں استاد کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ چیزیں تعلیم کے بغیر حاصل نہیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ کتابیں، انبیاء علیہم السلام وغیرہ ہدایت میں شامل ہیں۔ اسی لیے فرمایا۔ جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی۔ نہ اُن پر خوف ہوگا۔ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

کفار و مکذبین

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اور جنہوں نے کفر کیا۔ وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اور ہماری آیات کو جھٹلایا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ وہ دوزخ والے ہیں هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ اس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[۱]۔ کہ انسان کی سعادت اور شقاوت کا دارومدار ایمان اور کفر پر ہے۔ یا ہدایت اور ضلالت پر ہے۔ اور پھر یہ ہے کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ[۲] اعمال کا دارومدار خاتمے پر ہے۔ جس کا ایمان پر خاتمہ ہوگیا یعنی جو ایمان کی دولت ساتھ لے گیا۔ وہ مومن ہے۔ اور جس کا خاتمہ کفر پر ہوا۔ وہ کافر ہوگیا۔ اب قانون یہ مقرر ہوگیا۔ کہ ایک دفعہ جنت سے نکلنے کے بعد اب دوبارہ داخلہ ایمان اور نیکی کی بناء پر ہوگا۔ اس کے بغیر جنت میں دوبارہ داخلے کی کوئی صورت نہیں۔

---

[۱] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۱۹۱ پارہ ۱ [۲] بخاری صفحہ ۹۷۷ ج ۲

درس نوزدہم ۱۹ (آیت ۴۰ تا ۴۲)

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَوۡفُوۡا
بِعَہۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَہۡدِکُمۡ ۚ وَاِیَّایَ فَارۡہَبُوۡنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوۡا بِمَاۤ
اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ وَلَا تَکُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ کَافِرٍۭ بِہٖ ۪
وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰیٰتِیۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۫ وَّاِیَّایَ فَاتَّقُوۡنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا
تَلۡبِسُوا الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَکۡتُمُوا الۡحَقَّ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۲﴾

ترجمہ: اے بنی اسرائیل یاد کرو میری اُن نعمتوں کو —— جو میں نے تم پر انعام کیں۔ اور پورا کرو میرے عہد کو۔ میں پورا کروں گا تمہارے عہد کو۔ اور اور خاص مجھ ہی سے ڈرو ﴿۴۰﴾ اور ایمان لاؤ اس چیز پر جس کو میں نے نازل کیا ہے اور وہ ان (اصل غیر محرف شدہ) کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ جو تمہارے پاس ہیں۔ اور نہ ہو تم پہلے کفر کرنے والے اس کے ساتھ۔ اور مت خرید و میری آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت اور خاص مجھ ہی سے پس ڈرتے رہو ﴿۴۱﴾ اور نہ ملاؤ حق کو باطل کے ساتھ۔ اور تم حق کو چھپاتے ہو۔ اور تم جانتے ہو ﴿۴۲﴾

تاریخ بنی اسرائیل

"یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا" سے تمام بنی نوعِ انسان سے عمومی خطاب تھا۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور خلافت ارضی کا ذکر تھا۔ اس کے بعد "وَاِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ" میں بھی عمومی نعمت کا ذکر ہوا۔ جو حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعے تمام انسانوں کو حاصل ہوئی۔ اب یہاں سے بنی اسرائیل کو خصوصی خطاب ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں یاد دلائی ہیں۔ اور ان معجزات کا ذکر کیا ہے۔ جو ان میں ظاہر ہوئے۔ بنی اسرائیل کے باطل شکوک و شبہات کا ازالہ بھی کیا ہے۔ اور اس قوم میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہ بیان یہاں سے شروع ہو کر "وَاِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰھٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ" تک چلا جائے گا۔

خلافتِ ارضی عمومی نعمت ہے۔ جو آدم علیہ السلام اور اس کی اولاد کو نصیب ہوئی۔ یہ خلافت بنی اسرائیل میں عرصے تک قائم رہی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ نعمت چھین لی اور بنی اسماعیل کو حاصل ہوگئی۔ یہاں پر بنی اسرائیل کی اُن خرابیوں کا ذکر ہوگا۔ جن کی وجہ سے اس عزت شرافت اور فضیلت سے وہ محروم ہو گئے۔

اسرائیل یعقوب علیہ السلام کا نام ہے۔ ان دونوں خاندانوں یعنی بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل کے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ جن کا وطن مالوف موجودہ بغداد سے ستر میل دور بابل شہر تھا۔ آپ کی پیدائش کے وقت بابل بہت بڑا شہر اور تہذیب کا مرکز تھا۔ یہ چالیس مربع میل میں پھیلا ہوا تھا۔ اور بہت بڑی سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہاں سے ہجرت کی جیساکہ فرمایا "اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ" اور مصر کے راستے شام پہنچے۔ کچھ عرصہ وہاں قیام فرمایا۔ اور پھر حجاز آئے اور مکہ مکرمہ بھی گئے۔ آپ اصلاً عراقی تھے۔ پھر شامی پھر حجازی ہوئے۔ اُس زمانے میں فلسطین کو کنعان کہتے تھے۔ اور یہ شام ہی کے ماتحت تھا۔ بعد میں اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی ہاجرہؓ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام تولد ہوئے۔ آپ کے بارہ فرزند تھے۔ پھر اُن کے آگے بے شمار قبیلے ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری بیوی آپ کی چچازاد حضرت سارہؓ تھیں۔ جن کا ذکر قرآن پاک میں بھی آتا ہے۔ آپ کے بطن سے حضرت اسحٰق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور پھر اُن سے حضرت یعقوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عظیم نبی ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی میں ہی بشارت سنا دی تھی۔ "وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ" یعنی تمہارے فرزند اسحاق علیہ السلام سے ان کے بیٹے یعقوب علیہ السلام ہوں گے۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے ہوئے "اِثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا" سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ یہ اسی بات کی طرف اشارہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک تیسری بیوی قطورا بھی تھیں۔[۱] جس کی اولاد بنی قطورا کہلاتی ہے

---

[۱] ارض القرآن ص۳۳ ج۲

مگر انہیں زیادہ شہرت حاصل ہے نہ ہوئی۔

واقعہ اس طرح ہے۔ کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے دو بیٹے یعنی عیص اور یعقوب جڑواں بچے تھے۔ البتہ عیص ذرا پہلے پیدا ہوئے اور یعقوب علیہ السلام بعد میں۔ یعقوب کا لفظی معنی پیچھے آنے والے کے ہیں۔ خدا کی قدرت کہ اسحٰق علیہ السلام کو عیص کے ساتھ زیادہ محبت تھی۔ اور اُن کی بیوی کو یعقوب علیہ السلام زیادہ پیارے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام زیادہ صحت مند اور مضبوط جسم کے مالک تھے اور حضرت اسحٰق علیہ السلام نے انہیں یہ فریضہ سونپ رکھا تھا۔ کہ وہ دروازے پہ موجود رہیں۔ جب تک میں عبادت میں مصروف رہوں۔ کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ دیں تاکہ عبادت میں خلل واقع نہ ہو۔ ایک موقع پہ انسانی شکل میں فرشتہ آیا اور اندر جانا چاہا۔ مگر یعقوب علیہ السلام نے روکا۔ جب اسحاق علیہ السلام باہر آئے تو دیکھا کہ یعقوب علیہ السلام فرشتے کے ساتھ اُلجھ رہے ہیں۔ تو انہوں نے تحسین فرمائی۔ کہ واقعی تم نے اپنی ڈیوٹی پوری پوری ادا کی ہے۔ فرشتے نے آپ کا نام دریافت کیا تو انہیں یعقوب بتایا گیا۔ اس نے کہا اس کا نام اسرائیل ہے۔ سریانی یا عبرانی زبان میں اسرا کا معنی بندہ اور ایل کا معنی اللہ ہے۔ گویا فرشتے نے یعقوب علیہ السلام کا نام اسرائیل یعنی اللہ تعالیٰ کا بندہ رکھا۔ جو کہ عبداللہ کے مترادف ہے یہیں سے آپ کا نام اسرائیل مشہور ہوا[1]۔ اور آپ کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی۔ چونکہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی محبت عیص کے ساتھ زیادہ تھی۔ اس لیے انہوں نے عیص سے فرمایا۔ کہ میں آخری وقت میں تیرے لیے خصوصی دعا کروں گا۔ جب ماں کو پتا چلا تو اس نے چاہا کہ یہ دعا یعقوب علیہ السلام کے حق میں ہو۔ چنانچہ اس نے یعقوب علیہ السلام کو عیص کا لباس پہنا کر اُن کے باپ کے پاس بھیج دیا۔ اور ساتھ نصیحت کی کہ باپ کے سامنے آہستہ بولنا تاکہ وہ تمہیں پہچان نہ سکیں۔ چونکہ اس وقت حضرت اسحٰق علیہ السلام کی نظر کمزور ہو چکی تھی۔ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عیص سمجھے اور اُن کے حق میں دعا فرمائی۔ کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد میں نبوت کو جاری رکھے۔ یہ خصوصی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۰۰ پارہ ۱

سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اللہ تعالیٰ نے چار ہزار نبی اور رسول اس خاندان میں مبعوث فرمائے۔

کچھ عرصہ بعد عیص نے باپ کو یاد دلایا کہ آپ نے میرے حق میں دعا کا وعدہ فرمایا تھا۔ تو انہوں نے کہا کہ وہ دعا تو میں تے کر دی ہے۔ عیص نے کہا۔ کہ وہ دعا تو آپ نے یعقوب علیہ السلام کے حق میں فرمائی ہے۔ تو انہوں نے کہا۔ اچھا وہ تو اس کے لیے ہو گئی۔ تمہارے لیے دعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے خاندان میں بادشاہت قائم رکھے۔[۱] چنانچہ آپ کی دعا سے بادشاہت کا زیادہ تر سلسلہ عیص کی اولاد میں ہی رہا۔

جب حضرت اسحٰق علیہ السلام اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ تو ان کے سارے مال و اسباب پر عیص نے قبضہ کر لیا اور یعقوب علیہ السلام کو کچھ نہ ملا۔ اسی مال و دولت کی وجہ سے لوگوں کا رجوع بھی عیص کی طرف ہو گیا۔ اور یعقوب علیہ السلام نادار ہونے کی وجہ سے کسی شمار میں نہ آتے تھے۔ ان کے ماموں کسی دوسری جگہ مقیم تھے۔ اور بڑے مالدار تھے۔ ماں نے مشورہ دیا۔ کہ ان کے پاس چلے جاؤ۔ ان کے پاس مال و دولت بھی ہے۔ اور اس کی بیٹی بھی ہے۔ جس کے ساتھ وہ تمہارا نکاح بھی کر دے گا۔ چنانچہ آپ اپنے لایان نامی ماموں کے پاس پہنچے۔ وہ آپ کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ اور کہا کہ اپنے بھائی کی بدسلوکی سے دل برداشتہ نہ ہونا۔ میں تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گا۔ چنانچہ اس نے اپنے سارے مال و اسباب کا متصرف حضرت یعقوب علیہ السلام کو بنا دیا۔ اور اپنی بیٹی کا نکاح بھی کر دیا۔

اس بیوی سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو چار بیٹے عطا کیے۔ اور اس کے بعد بیوی کا انتقال ہو گیا۔ ماموں نے آپ پر مزید احسان کیا۔ کہ دوسری بیٹی کا نکاح کر دیا۔ اس سے دو فرزند پیدا ہوئے اور وہ بھی فوت ہو گئی۔ اس کے بعد ماموں نے تیسری لڑکی آپ کے نکاح میں دے دی۔ اس سے ایک لڑکی اور دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اس کے بعد وہ بھی اللہ تعالیٰ کو پیاری ہو گئی۔ پھر ماموں نے اپنی چوتھی لڑکی راحیل کا نکاح کر دیا۔ اس وقت تک حضرت یعقوب علیہ السلام کی عمر چالیس برس ہو چکی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرمائی۔ اور حکم دیا کہ اس مقام کو چھوڑ کر

---

[۱] تفسیر عزیزی فارسی جلد ۲ صفحہ ۱۰ پارہ ۱ ص ۱۰

کہ کنعان چلے جاؤ۔ اور وہاں پہ تبلیغ کا فریضہ انجام دو۔ جب ماموں کو پتا چلا۔ تو اس نے کہ کہ تمہاری جدائی سے تکلیف تو ضرور ہوگی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رضا ہر چیز پہ مقدم ہے۔ چنانچہ اپنے بخوشی حضرت یعقوب علیہ السلام کو کنعان چلے جانے کی اجازت دے دی۔ اور بیوی بچوں کو بھی ساتھ بھیج دیا۔ اور اُن کی خدمت کے طور پہ پانچسو گھوڑے، پانچسو اونٹ، پانچسو گائے پانچسو خچر، پانچسو بھیڑیں اور بہت سا دیگر سامان ہمراہ کر دیا۔

کنعان پہنچ کر آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ وہاں پر آپکی چوتھی بیوی راحیل کے بطن سے دو بیٹے یوسف اور بن یامین پیدا ہوئے۔ یوسف علیہ السلام ابھی دو سال کے تھے۔ کہ راحیل بھی فوت ہوگئی۔ جب ماموں کو پتا چلا۔ تو اس نے اپنی پانچویں بیٹی بھی نکاح میں دے دی۔ اور اسے یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں بھیج دیا۔ تاکہ بچوں کی پرورش ہو سکے۔ اس طرح یعقوب علیہ السلام کے کل بارہ بیٹے ہوئے۔ جن سے آگے بارہ خاندان ظہور میں آئے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے عیص کو بھی اس فضیلت سے محروم نہ رکھا جب حضرت یعقوب علیہ السلام کنعان کی طرف آ رہے تھے۔ تو راستہ میں عیص نے بھی آپ کا استقبال کیا۔ اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت کے ذریعے مجھ پہ فضیلت بخشی ہے۔ آپ دعا کریں۔ کہ اللہ تعالیٰ میرے خاندان میں بھی نبوت جاری فرمائے۔ آپ نے دعا فرمائی۔ تو وحی نے خبر دی۔ کہ اللہ تعالیٰ عیص کے خاندان میں ایک نبی ایوب علیہ السلام کو پیدا فرمائے گا۔ اور ایک عظیم المرتبت بادشاہ ذوالقرنین بھی آپ کے ہی خاندان میں ہوگا۔ چنانچہ آگے چل کر ایسا ہی ہوا۔[2]

بنی اسرائیل پر انعامات

ان آیات میں اُن انعامات کا تذکرہ ہے۔ جو اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل پہ کیے۔ يَٰبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتِىَ ٱلَّتِىٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ اے بنی اسرائیل! میرے ان انعامات کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیے۔ ان میں سے دو بنیادی انعام تھے۔ یعنی اس قوم میں انبیاء علیہم السلام مبعوث کیے اور بادشاہت بھی عطا کی۔ سورۃ مائدہ

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۰۲/۱ ، [2] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۰۲/۱

میں موجود ہے: "اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا" اللہ تعالےٰ نے کتنا عظیم احسان اس قوم پر کیا۔ اُس وقت اس کے برابر دنیا بھر میں کوئی دوسری قوم نہیں تھی، ان کو عزت، دولت اور شہرت حاصل تھی۔ مگر آہستہ آہستہ ان میں بگاڑ پیدا ہونے لگا حتیٰ کہ مسیح علیہ السلام کے زمانے تک ان کی ذلت انتہا۔ کو پہنچ گئی۔ انجیل اور تواریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان میں بہت زیادہ خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ ہزاروں سال گذرنے کے بعد جب نزول قرآن کا زمانہ آیا۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اللہ تعالےٰ کا آخری پیغام اور شریعت نازل ہوئے۔ اس وقت بھی بے شمار خرابیوں کے باوجود یہی لوگ صاحب علم سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ قرآن پاک نے اس مقام پر بنی اسرائیل کو ہی دعوت فکر دی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو جنہیں تم اپنی خرابی کی وجہ سے کھو چکے ہو۔ لہٰذا اب بھی راہ راست پر آجاؤ۔ نبی آخر الزمان پر ایمان لے آؤ۔ اور خدا تعالےٰ کے آخری پیغام کو تسلیم کر لو۔ تو تمہاری چھنی ہوئی عزت واپس آسکتی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں کرو گے۔ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہو گے۔ تو تمہارے حصے میں ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ چنانچہ اگلے رکوع میں ذکر آئے گا۔ کہ بنی اسرائیل میں کس طرح خرابیاں پیدا ہوئیں۔

بنی اسرائیل کی عہد شکنی

اللہ تعالےٰ نے انعامات کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اے بنی اسرائیل میرے عہد کو پورا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے یہی عہد تو لیا تھا۔ کہ میری اطاعت کرنا، انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کرنا۔ اور فرائض کو پورا کرنا۔ فرمایا اس کے بدلے میں اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ تمہارا عہد یہ ہے۔ کہ تمہارے گناہ معاف کر کے تمہیں بخش دوں گا۔ اور جنت تک پہنچاؤں گا۔ تمام بنی نوع انسان نے جو عہد اللہ تعالےٰ سے کیا ہوا ہے۔ آگے اُس کے مطلب یعنی میثاق کا ذکر بھی آئے گا۔ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ وہ میثاق بھی پورا کرو۔ "الَّذِیْ وَاثَقَكُمْ بِهٖ" جو تم نے پختہ عہد کیا ہوا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل سے کہا تھا۔ کہ صحیح دین اور سچی بات کو مت چھپانا۔ مگر انہوں نے کیا کیا۔ "فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ" اس عہد کو پس پشت ڈال دیا۔ نزول قرآن کے وقت تک بنی اسرائیل میں تلبیس اور کتمان حق کی بیماری اپنے عروج پر تھی۔ یہ لوگ تورات، انجیل اور دیگر کتب میں موجود

آخری نبی علیہ السلام کے متعلق پیشن گوئیوں کو چھپاتے تھے۔ اور اس حسد میں مبتلا تھے کہ نبی آخر الزمان بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسمٰعیل میں کیوں آیا ہے۔ یہ لوگ صاحب علم ہونے کے باوجود متعصب تھے۔ مشرکین نے تو ایمان قبول کر لیا مگر یہ لوگ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ جیسا کہ "وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ" یعنی ان کی اکثریت نافرمانوں کی ہے۔ جب کہ نہایت ہی قلیل تعداد راہِ راست پر آئی ہے۔ چنانچہ ان میں سے حضرت عبداللہ بن سلامؓ جیسے چند حق پرستوں نے اسلام کی دعوت قبول کی۔ الغرض فرمایا تم میرا عہد پورا کرو۔ میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ اور خاص مجھ ہی سے ڈرو۔ میں ہی تمہارا خالق اور مالک ہوں۔ میں نے تم پر پہلے بھی انعام کیے۔ آئندہ بھی کروں گا۔ بشرطیکہ مجھ سے ڈر کر سیدھے راستے پہ آجاؤ۔

ایمان بالقرآن

بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے مزید فرمایا۔ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ اور جو چیز میں نے نازل کی ہے۔ اس پر ایمان لاؤ۔ اور یہ چیز مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ اس چیز کی تصدیق کرتی ہے۔ جو تمہارے پاس موجود ہے۔ یعنی تورات اور دیگر سابقہ کتب یہاں پر یہ نکتہ یاد رہے۔ کہ قرآن پاک سابقہ کتب کی ہر چھوٹی بڑی چیز کی تصدیق نہیں کرتا۔ بلکہ اصولی طور پر بعض اہم باتوں کی تصدیق کرتا ہے۔ جس طرح ہر نبی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ کہ وہ سابقہ نبی کی تصدیق کرے۔ مگر اس کی شریعت اور احکام کی من و عن تصدیق نہیں کرتا۔ کیونکہ بسا اوقات دوسرا نبی پہلے نبی کی بعض چیزیں منسوخ کر دیتا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک بھی سابقہ کتب کی تصدیق کرتا ہے۔ لہٰذا تم اس قرآن پاک کو بحیثیت کلام الٰہی تسلیم کر لو۔ اور اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ اور تم لوگ قرآن پاک کے اولین منکرین نہ بن جاؤ۔

قرآن پاک کا نزول مکہ مکرمہ میں شروع ہوا۔ اور سب سے پہلے انکار کرنے والے تو کفار مکہ تھے۔ پھر جب حضور علیہ السلام ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں یہود نے اس کا انکار کیا۔ تو اس لحاظ سے قرآن پاک کے اولین منکرین کفار مکہ ہیں، نہ کہ یہود مدینہ۔ مگر یہاں بنی اسرائیل کو خطاب ہو رہا ہے۔ کہ تم اولین مکذبین نہ بن جاؤ۔ مفسرین کرام اس کی توجیہہ یہ بیان فرماتے ہیں[1]

---

[1] تفسیر عزیزی ص ۲۰۶، ص ۲۰۹ پارہ ۱

کہ مکے والوں کے پاس تو کوئی کتاب نہیں تھی۔ کتاب یعنی توراۃ تو مدینے کے یہود کے پاس تھی۔ لہٰذا اہل کتاب میں سے اولین کافرین یہی لوگ تھے، اسی لیے ان کو کہا گیا۔ کہ تم اولین منکرین میں سے نہ ہو جانا۔ اس کا دوسرا مطلب مفسرین کرام یہ بھی بیان فرماتے ہیں۔ کہ بنی اسرائیل سے سے کہا گیا۔ کہ اگر تم موجودہ نسل والے انکار کر دو گے۔ تو تمہارے بعد آنے والی نسلیں بھی تمہاری روش پہ چل کر انکار کر دیں گی۔ اس طرح پیچھے آنے والی نسلوں کی گمراہی کے ذمہ دار بھی تم ہی ٹھہرو گے۔ اس لیے اولین منکرین نہ بن جاؤ۔

دنیا کی محبت

پھر فرمایا وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اور مت خریدو میری آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت، تھوڑی قیمت سے مراد دنیا کا حقیر مال ہے۔ جیسا کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں[1]۔ کہ دنیا کی چار چیزیں ایسی ہیں۔ جن کے پیچھے لوگ مرتے ہیں یعنی کھانا، پینا، پہننا اور نکاح کرنا مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ کھانے کا انجام گندگی اور پینے کا انجام بول ہے۔ اچھے سے اچھا لباس بھی کچھ عرصہ بعد پھٹ جاتا ہے۔ اور اُسے پھینک دیا جاتا ہے۔ رہا نکاح۔ تو اس کی وجہ سے انسان طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہوتا اور اذیتیں برداشت کرتا ہے یہ چاروں چیزیں عقیدے کو فاسد اور دین کو بگاڑنے والی ہیں۔ مگر لوگ ان حقیر اشیاء کے حصول کے لیے قیمتی اور اعلیٰ چیز یعنی ایمان کو خراب کر لیتے ہیں۔

فرمایا وَاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ اور مجھ ہی سے ڈرو۔ آخرت کی خبر لو۔ دنیا کے پیچھے مت پڑو۔ آخرت میں میرے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ حساب و کتاب ہوگا۔ اور پھر تمہیں اپنے کیے کی جزا یا سزا بھگتنا ہوگی۔ لہٰذا مجھ سے ڈرتے رہو۔

تلبیس اور کتمانِ حق

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو۔ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ اور نہ ہی حق کو چھپاؤ۔ یہ بنی اسرائیل کی عام عادت تھی۔ کہ وہ اپنی کتاب میں موجود سچی بات چھپا لیتے تھے۔ آگے آئے گا۔ کہ یہ لوگ قرآن پاک اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح پہچانتے تھے۔ جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے تھے مگر پھر بھی انکار کر دیتے تھے۔ یہ

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۰۸ پارہ ۱۵

یہ لوگ واضح علامات کو بگاڑ کر پیش کرتے تھے۔ اور ان میں تحریف کے مرتکب ہوتے تھے۔ یہ عیسائی اور یہودی تحریف میں بڑے ماہر ہیں۔ خود عیسائیوں کے بڑے بڑے پادریوں نے تسلیم کیا ہے کہ انجیل میں تین ہزار تحریفیں ہو چکی ہیں[1] ظاہر ہے کہ جہاں اس قدر تحریف کا عمل آزمایا گیا ہو۔ وہاں کس قدر بگاڑ پیدا ہو گا۔ اور جس کتاب کے ساتھ یہ سلوک ہوا ہو۔ اُس کا کیا سے کیا بن گیا ہو گا۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے[2]۔ کہ جس طرح بنی اسرائیل میں بگاڑ پیدا ہوا، اسی طرح آپ کی امت میں بھی پیدا ہو گا۔ آج کے دور میں دیکھ لیں کہ بدقماش قسم کے علماء محض دنیوی مفاد کی خاطر کس طرح غلط فتوے جاری کرتے ہیں۔ یہ چیز کتمانِ حق سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اسی قسم کے لوگ امراء اور بادشاہوں کو خوش کرنے کے لیے غلط فتوے دیتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ حاکم وقت راضی ہو جائے۔ تو اپنی عیش ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ظالم بادشاہ اور فاسق امراء آخرت سے بے خوف ہو کر کمزور طبقے پہ ظلم و جور کے پہاڑ توڑتے ہیں۔ یہ لوگ علماء سُو کے فتوے کی آڑ لے کر اپنی من مانی خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہی حال وزیروں اور دیگر دفتری اہلکاروں [illegible] کی آڑ میں عوام کے حق غصب کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے[3]۔ وَيْلٌ لِمَنْ لَا يَعْلَمُ وَاحِدٌ مِّنَ الْوَيْلِ جو کسی چیز کو نہیں جانتا۔ اس کے [illegible] ایک بار ہلاکت ہے مگر وَيْلٌ لِّمَنْ يَعْلَمُ وَلَا يَعْمَلُ سَبْعٌ مِّنَ الْوَيْلِ جو جاننے کے باوجود اس پہ عمل پیرا نہیں ہوتا۔ اس پہ سات بار ہلاکت ہے۔ مقصد یہ کہ کتمانِ حق کرنے والے دنیا پرست لوگ حق بات کو جاننے کے باوجود اس کو چھپاتے ہیں۔ اور حق پہ عمل نہیں کرتے۔ لہٰذا یہ سات گنا سزا کے مستحق ہیں۔

پیروں، گدی نشینوں اور علمائے سوء کا حال دیکھ لیں۔ انہیں فرائض کا کوئی خیال نہیں کہ پورے ہو رہے ہیں یا نہیں، مگر مستحبات اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو سینے سے لگائے

---

[1] تفریر دلپذیر   [2] ترمذی ص ۳۷۹

[3] فیض القدیر شرح جامع صغیر ص ۳۷۶/۶ بحوالہ سنن سعید بن منصور و مسند احمد و حلیۃ الاولیاء

بیٹھے ہیں، جنہیں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ لوگ ملک پہ کافر کی حکومت برداشت کرلیں گے جیساکہ پیروں اور علماء سوء نے انگریز کی حمایت کی۔ مگر یہ اپنے خود ساختہ عقیدے کے خلاف کوئی چیز برداشت کرنے کے لیے کبھی تیار نہ ہوں گے۔ ایسے ہی لوگ کتمانِ حق کے مرتکب ہوتے ہیں۔

آجکل دین کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ نہ کسی کو فرائض کی پرواہ ہے۔ اور نہ واجبات کی۔ معمولی معمولی باتوں کو نشانہ بنا کر ان کی تشہیر ہو رہی ہے۔ پراپیگنڈا جاری ہے۔ تفرقہ بازی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اور پھر گالی گلوچ تک نوبت پہنچتی ہے۔ یہ سب کیا ہے۔ بنی اسرائیل کے شیوہ کو اپنایا جا رہا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[1] جو بیماریاں بنی اسرائیل میں پائی جاتی تھیں۔ اے میری امت! تم میں بھی وہی بیماریاں عود کر آئیں گی حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ جس طرح ایک جوتا دوسرے کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی طرح میری امت کی خرابیاں بنی اسرائیل کی خرابیوں کے مشابہ ہوں گی۔

فرمایا حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو چھپاؤ۔ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ اور تم جانتے ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ غرضیکہ اس مقام پر بنی اسرائیل کی خرابیوں کا اجمالاً بیان ہوا ہے۔ اگلے رکوعات میں تفصیل کے ساتھ ایک ایک خرابی کی نشان دہی ہوگی۔ آج بھی یہ خطاب موجودہ دور کے بنی اسرائیل کے لیے موجود ہے۔ ان کے بڑوں کی خرابیوں کو ان کے سامنے رکھا جا رہا ہے۔ اور جو خرابیاں ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ ان کی نشاندہی بھی ہو رہی ہے۔ گویا یہ دعوت الی القرآن ہے۔ کہ "اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ" جس چیز کو میں نے نازل کیا ہے یعنی قرآن پاک آؤ آج بھی اس پہ ایمان لے آؤ تو فلاح پا جاؤ گے۔ قرآن پاک پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے۔ اور آخری نوشتہ اور صحیفہ ہے۔ اس پہ ایمان لائے بغیر اور اس کے پیش کردہ پروگرام پہ عمل کیے بغیر فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔

---

[1] ترمذی صـ ۳۷۹

درس بستم ۲۰ (آیت ۴۳ تا ۴۶)

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾
اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ
تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ
وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾
الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ
رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ع

ترجمہ :- اور قائم کرو نماز کو اور دو زکوٰۃ اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ (۴۳) کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو۔ اور اپنی جانوں کو فراموش کرتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ کیا تم نہیں سمجھتے (۴۴) اور مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ساتھ۔ اور بے شک یہ نماز البتہ بھاری ہے۔ مگر ان لوگوں پر جو عاجزی کرنے والے ہیں (۴۵) وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں کہ بیشک وہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں۔ اور بیشک وہ اسی پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں (۴۶)

گذشتہ سے پیوستہ

اس رکوع کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کا ذکر فرمایا۔ پھر زمین پر اترنے کا حکم دیا۔ اور ہدایت و راہنمائی کا وہ اصول بھی بتلا دیا جس پر جنت میں دوبارہ داخلے کا دارومدار ہے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل سے خطاب ہوا۔ دوسری قوموں کے مقابلے میں بنی اسرائیل کو مدت دراز تک فضیلت حاصل رہی۔ نبوت اور حکومت اُن میں رہی۔ ان میں بڑے بڑے عابد و زاہد لوگ پیدا ہوئے۔ مگر ایک طویل عرصہ کے بعد اس قوم میں خرابیاں پیدا ہوگئیں۔ جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے خلافت ارضی بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل میں منتقل کردی۔

گذشتہ درس میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے اُن پر کیے گئے انعامات یاد دلائے گئے اور انہیں قرآن پاک پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی۔ اور انہیں نصیحت کی گئی کہ وہ بنی اسرائیل میں اولین کافر نہ بنیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے آئندہ نسلیں بھی انہی کے قدموں پر چلیں گی۔ اور اس طرح اُن کا وبال بھی کفر میں پہل کرنے والوں پر پڑے گا۔ انہیں حق و باطل کی تلبیس سے اور کتمانِ حق سے منع کیا گیا اور ترغیب دی گئی۔ کہ تمہاری اپنی کتابوں میں قرآن پاک اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو پیشن گوئیاں موجود ہیں انہیں ظاہر کریں۔

قبولِ حق سے انکار کی وجوہات

مدینہ طیبہ کے اطراف میں رہنے والے اہل کتاب یعنی یہود نسلی برتری کے زعم میں مبتلا تھے۔ وہ انبیاء علیہم السلام کے خاندان میں سے ہونے کی وجہ سے دوسری اقوام کو کم تر سمجھتے تھے اعربوں کو وہ جاہل، ان پڑھ اور اُمّی خیال کرتے تھے۔ اس قسم کے اشارات آگے اسی سورۃ میں، سورۃ آل عمران میں اور دیگر سورتوں میں بھی ملتے ہیں۔ بنی اسرائیل کا دوسرا باطل زعم یہ تھا۔ کہ نبوت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انہی کے خاندان میں جاری رہے گی۔ مگر جب نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسمٰعیل میں آگئے تو ان کی ساری برتری ختم ہو گئی۔ اور وہ حسد کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ ان کے قبول حق سے انکار کی ایک بڑی وجہ یہ تھی۔ اور دوسری وجہ یہ تھی۔ کہ اس وقت انہیں جو مالی اور منصبی برتری حاصل تھی۔ ایمان لانے سے وہ ضائع ہو جاتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب ان کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ اور انہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کرنی پڑے گی۔ چنانچہ ایسی ہی چیزیں اُن کے ایمان لانے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔

حُبِّ مال و حُبِّ جاہ کی بیماریاں

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں[1] کہ یہود کو حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ کی دو ایسی بیماریاں لاحق تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ ایمان لانے سے گریز کرتے تھے۔ اس زمانے میں بھی اکثر لوگ انہی دو بیماریوں میں مبتلا ہو کر خیر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ حُبِّ مال کی بیماری کی شدت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ"، مال کی محبت انسان

---

[1] بیان القرآن صفحہ ۲۴ جلد ۱ مطبع مجتبائی دہلی

میں فطرۃً بڑی شدید ہے۔ دوسری جگہ فرمایا" وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا" تم بھی ہر کر مال سے محبت کرتے ہو۔ جس کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور لوگوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ اس قسم کی چیزیں بنی اسرائیل کے قبول حق میں مانع تھیں۔

ان بیماریوں کا علاج

ان دو بیماریوں کا علاج اللہ تعالیٰ نے یہ تجویز کیا وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ نماز قائم کرو۔ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ اور زکوٰۃ ادا کرو۔ یعنی حبِّ جاہ کی بیماری کے لیے نماز شافی ہے۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے غرور، تکبر اور بڑائی کا علاج رکھا ہے۔ جو شخص نماز قائم کرے گا، اس کا مطلب سمجھے گا۔ وہ حُبِّ جاہ کی بیماری سے شفایاب ہو جائے گا۔ اسی طرح حُبِّ مال کی بیماری کا علاج ادائیگی زکوٰۃ میں ہے۔ اور اس میں بہت سی حکمتیں ہیں منجملہ ان کے بُخل دُور کرنا بھی ہے چنانچہ جب کوئی شخص ہر سال مال کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ تو وہ بخل کی لعنت سے پاک ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ صرف مقررہ مقدار میں زکوٰۃ ادا کر دینا ہی کافی نہیں بلکہ فرمایا" لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ " یعنی تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیز خرچ نہ کرو یہی وہ جذبہ ہے۔ جو مال کی محبّت کو کم کر کے بخل سے نجات دلاتا ہے۔ گویا نماز اور زکوٰۃ حُبِّ جاہ اور حُبِّ مال کی بیماری کا علاج ہے۔

نماز جامع عبادات ہے

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ اللہ تعالیٰ نے" وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ میں نماز کے ساتھ توسل پکڑنے کا اس لیے حکم دیا ہے کہ نماز تمام عبادات کی جامع ہے۔ نماز میں روحانی، نفسانی اور جسمانی ہر قسم کی عبادات جمع ہیں۔ مثلاً نماز طہارت پر موقوف ہے۔ اور طہارت اسلام میں ایک بہت بڑا اصول ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا حصہ ہے اسی طرح ستر کا ڈھانپنا نماز کے لیے شرط ہے۔ ستر پوشی تو ہر حالت میں لازم ہے۔ مگر نماز کے دوران تو اور زیادہ مؤکدہ ہے۔ انسان برہنگی کی حالت میں نماز ادا نہیں کر سکتا۔ عبادت کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ مال بھی صرف کرنا پڑتا ہے تو گویا نماز میں انفاق جیسی عبادت بھی شامل ہے۔ پھر نماز کے لیے قبلہ شریف کی طرف رُخ کرنا بھی ضروری ہے۔ نماز کی حالت میں انسان معتکف ہوتا ہے۔ اور اعتکاف ایک مستقل عبادت ہے لہذا نماز میں عکوف بھی شامل ہے

---

[1] تفسیر بیضاوی ص ۵۳ ج ۱

نماز کے دوران انسان کے اعضا اور جوارح خشوع کا اظہار کرتے ہیں۔ دل سے نیت اور اخلاص بھی ضروری ہے۔ اگر نیت اور خلوص نہ ہو تو نماز نہیں ہوتی۔ اسی طرح نماز میں شیطان کے ساتھ مجاہدہ بھی شامل ہے۔ نماز میں انسان رب العزت کے سامنے مناجات کرتا ہے۔ اور قرآن کریم کی تلاوت جیسی بہترین عبادت سے فیضیاب ہوتا ہے۔ نماز میں انسان شہادتین کا تکلم کرتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ یہ بہت بڑی حقیقت ہے۔ جس کی انسان گواہی دیتا ہے۔ نماز میں انسان کھانے پینے سے بھی اجتناب کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ الغرض امام بیضاویؒ فرماتے ہیں۔ کہ نماز ایک ایسی اعلیٰ درجے کی عبادت ہے۔ کہ اس میں بہت سی دوسری عبادات بھی شامل ہیں۔

نماز باجماعت

نماز و زکوٰۃ کا حکم دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ مل کر نماز ادا کرو۔ اسی لیے تو نماز باجماعت ہمارے مذہب میں تقریباً وجوب کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ حضور علیہ السلام کی ایسی سنت مؤکدہ ہے۔ کہ اگر بلا عذر ترک کر دے تو انسان منافقوں میں شمار ہونے لگتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں ہے[1]۔ کہ اگر تم بلا عذر نماز سے تخلف کرو گے تو پیغمبر علیہ السلام کی سنت کو چھوڑنے والے بن جاؤ گے۔ اور اگر ایسا کرو گے تو لَضَلَلْتُمْ گمراہ ہو جاؤ گے۔ صرف معذور افراد کو گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ وگرنہ تندرست آدمی کو بغیر جماعت کے نماز پڑھنے کی قطعاً اجازت نہیں۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں[2]۔ کہ ہم لوگ جماعت میں شریک ہوتے تھے اور جماعت سے پیچھے وہی رہتا تھا۔ جس کا نفاق معلوم ہوتا ہے۔ یا وہ معذور ہوتا تھا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں[3]۔ کہ یہودیوں کی نماز میں رکوع نہیں تھا۔ صرف سجدہ ہی ہوتا تھا۔ اس لیے حکم ہوا۔ کہ رکوع بھی کرو۔ اگرچہ یہ سجدہ سے کم درجے کا رکن ہے۔ مگر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جس نماز میں رکوع نہ ہو، وہ نماز باطل ہو جاتی ہے۔ بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں[4]۔ کہ بیشک رکوع نماز کا ایک اہم رکن ہے۔ مگر مَعَ الرّٰكِعِيْنَ سے صاف واضح ہے

---

[1] مسلم ص ۲۳۲ ج ۱، [2] مسلم ص ۲۳۲ ج ۱، [3] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۱۳ پارہ ۱، معالم التنزیل ص ۲۴ ج ۱)
[4] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۱۳ پارہ ۱ تفسیر ابن کثیر ص ۸۵ ج ۱

کہ اس سے مراد نماز باجماعت ہے۔ کیونکہ اس میں انسان کے لیے بے شمار فوائد ہیں۔ اسی سے اجتماعیت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ بہت سی بیماریوں کا علاج ہے۔

قول و فعل میں تضاد

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو انعامات یاد دلائے۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ کے آخری پیغام پر ایمان لانے کی تلقین کی۔ پھر اُن کی خامیاں ظاہر کر کے انہیں تلبیس اور کتمانِ حق سے منع فرمایا۔ ان بیماریوں کا علاج نماز اور زکوٰۃ بتلایا۔ اور اس کے بعد بنی اسرائیل کی بہت بڑی کمزوری کی طرف توجہ دلائی۔ اور فرمایا اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو۔ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ اور اپنی جانوں کو فراموش کرتے ہو۔ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ مقصد یہ کہ جس نیکی کی طرف تم دوسرے لوگوں کو دعوت دیتے ہو۔ خود جانتے بوجھتے بھی اس پر عمل نہیں کرتے ظاہر ہے۔ کہ یہودی توراۃ کے عالم تھے اور وہ لوگوں کو توراۃ کے حقائق سے روشناس کراتے تھے۔ ان میں اللہ تعالیٰ کے آخری کلام قرآن پاک اور آخری نبی محمد رسول اللہ کے متعلق پیشن گوئیاں بھی موجود تھیں۔ جو انہوں نے لوگوں کو بتا رکھی تھیں۔ مگر جب یہ حقائق سامنے آگئے تو دوسروں کو وعظ کرنے والے یہودی علماء خود ان حقائق سے منحرف ہو گئے۔ گویا انہوں نے اپنے آپ کو فراموش کر دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں[۱]۔ کہ یہودی عالم اپنے مسلمان رشتہ داروں کو کہا کرتے تھے۔ کہ تم جس شخص پر ایمان لائے ہو۔ وہ بلاشبہ سچا اور آخری نبی ہے۔ اس کا دامن نہ چھوڑنا۔ مگر خود اس پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ وجہ یہ تھی۔ کہ ایمان لانے سے اُن کے مالی فوائد ضائع ہوتے تھے۔ اُن کے اسی رویہ کے متعلق فرمایا کہ دوسروں کو تلقین کرتے ہیں اور خود کو فراموش کرتے ہیں۔ محض دنیوی لالچ کے بدلے جہنم کے کندہ ناتراش بنتے ہیں۔ آگے سورۃ آل عمران میں ذکر آئے گا۔ کہ نصاریٰ کا ایک وفد حضور علیہ السلام کی خدمت میں آیا تھا۔ مگر دنیا کے مال کی خاطر ایمان سے محروم رہا سیرت کی . . اور دوسری کتابوں میں موجود ہے[۲] کہ اس وفد کے لوگوں نے کہا۔ کہ اگر ہم ایمان قبول کر لیں۔ تو ہمارے وظیفے اور تنخواہیں بند ہو جائیں گی۔ لہٰذا ہم ایمان لانے کے

---

[۱] تفسیر معالم التنزیل ص۲۴ ج۱ مظہری ص۶۳ ج۱ ، [۲] تفسیر عثمانی مع ترجمہ شیخ الہند ص۶۴

لیے تیار نہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ تم دوسروں کو تو نیکی کی طرف دعوت دیتے ہو۔ مگر خود اس سے بچتے ہو۔ یہ کہاں کا انصاف اور عقلمندی ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا[1] کہ معراج کی رات میرا گذر ایسے لوگوں پر ہوا۔ جن کے ہونٹ جہنم کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا۔ یہ کون لوگ ہیں انہوں نے بتایا کہ حضور! یہ آپ کی امت کے خطیب ہیں۔ جو لوگوں کو امر بالمعروف یعنی نیکی کا حکم کرتے تھے۔ مگر اپنے آپ کو فراموش کر دیتے تھے۔ امام رازیؒ نے بھی ایک روایت بیان کی ہے[2]۔ کہ جہنم میں ایک ایسا شخص بھی ہوگا۔ جس کی بدبو سے جہنم والے بھی بیزار ہوں گے لوگوں نے عرض کیا۔ حضور! ایسا بدبخت شخص کون ہوگا؟ آپ نے فرمایا وہ صاحب علم شخص جو اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ایک دوسری حدیث میں اس طرح آتا ہے[3]۔ کہ جو شخص دوسروں کو نیکی سکھلاتا ہے۔ اور خود اس پر عمل نہیں کرتا۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے چراغ جو دوسروں کو روشنی مہیا کرتا ہے۔ مگر خود جلتا رہتا ہے۔

بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے[4]۔ کہ قیامت کے روز ایک شخص کو لایا جائے گا۔ اور اسے اس حالت میں جہنم رسید کیا جائے گا۔ کہ اس کی آنتیں پیٹ سے نکل کر نیچے کی طرف لٹک رہی ہوں گی۔ وہ شخص آنتوں کو اس طرح کھینچے گا۔ جیسا گدھا خراس کو کھینچتا ہے لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو جائیں گے۔ اور پوچھیں گے کہ اے فلاں! تجھے یہ مصیبت کس طرح پہنچی۔ حالانکہ تو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتا تھا۔ اور برائیوں سے منع کرتا تھا۔ وہ کہے گا۔ ہاں میں تم کو نیکی کا حکم کرتا تھا۔ مگر خود نیکی نہیں کرتا تھا۔ تمہیں برائیوں سے منع کرتا تھا۔ مگر خود باز نہیں آتا تھا۔ اس لیے آج مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔

تو فرمایا اے بنی اسرائیل! تم لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہو۔ بڑے مسائل بیان کرتے ہو۔ قرآن پاک کی حقانیت کا اقرار کرتے ہو، نبی آخر الزمان کے اوصاف حمیدہ بھی بتلاتے

---

[1] تفسیر کبیر ص ۴۷ ج ۲، ابن کثیر ص ۸۶ ج ۱، [2] تفسیر کبیر ص ۴۷ ج ۳، [3] تفسیر کبیر ص ۴۷ ج ۲، ابن کثیر ص ۸۵ ج ۱
[4] مسلم ص ۴۱۲ ج ۲، بخاری ص۔ تفسیر خازن ص ۵۵ ج ۱، در منثور ص ۶۵ ج ۱

ہو۔ مگر خود ایمان نہیں لاتے۔ اپنے آپ کو فراموش کیے بیٹھے ہو اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کیا تم میں عقل وشعور کا مادہ نہیں ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔

صبر وصلوٰۃ کی برکات

فرمایا وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ یعنی مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ساتھ۔ صبر وصلوٰۃ کو اختیار کرو گے۔ تو برائیاں دور ہو جائیں گی۔ حُبِّ مال وجاہ کا علاج بھی تم صبر کے ذریعے کر سکتے ہو۔ نماز پڑھو گے تو عجز وانکساری پیدا ہو گی اور اس میں مختلف بیماریوں کی شفا ہے۔ پھر فرمایا وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اور یہ نماز بے شک بڑی بوجھل اور بھاری ہے۔ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ مگر عاجزی کرنے والوں کے لیے یہی نماز راحت کا سامان بنتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے[1]۔ کہ حضور علیہ السلام کو اِذَا حَزَبَہٗ اَمْرٌ فَزِعَ اِلَی الصَّلٰوۃِ جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی۔ تو نماز کی طرف رجوع فرماتے۔ کیونکہ نماز سے تعلق باللہ کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اور انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ جسقدر مضبوط ہو گا۔ اسی قدر مشکلات کم ہو جائیں گی۔ انسان کو مصائب کا احساس اسی وقت ہوتا ہے۔ جب اس کا تعلق باللہ کمزور ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ نماز کئی ظاہری بیماریوں کی شفا کا سبب بھی بنتی ہے۔ امام ابن کثیرؒ اور ابن جریرؒ نے روایت بیان کی ہے[2]۔ کہ حضرت ابوہریرہؓ ایک دفعہ پیٹ کے درد میں مبتلا ہو گئے۔ شدت درد کی وجہ سے آپ لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ حضور علیہ السلام کا آپ پر گزر ہوا۔ تو فارسی لہجہ میں فرمایا "اَشکم درد" کیا تمہارے پیٹ میں درد ہو رہا ہے شکم فارسی میں پیٹ کو کہتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کیا نعم کہ حضور ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ قُمْ فَصَلِّ فَاِنَّ الصَّلٰوۃَ شِفَاءٌ اٹھو اور نماز پڑھو کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے شفا رکھی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نے نماز پڑھی۔ تو پیٹ کا درد دور ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے شفا عطا کر دی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔

رجوع الی اللہ

تو فرمایا یہ نماز بوجھل ہے۔ مگر عاجزی کرنے والوں پر نہیں۔ اور وہ کون لوگ ہیں اَلَّذِیْنَ

---

[1] ابن کثیر ص۸۷ ج۱، طبری ص۲۶۱ ج۱ ، [2] تفسیر ابن کثیر ص۸۷ ج۱ تفسیر طبری ص۲۶۰ ج۱

يَظُنُّوْنَ جو یقین کرتے ہیں اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ کہ وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کرنے والے ہیں لفظ ظن اضداد معانی میں استعمال ہونے والا لفظ ہے، اس کا معنیٰ گمان بھی ہوتا ہے۔ اور یقین بھی۔ مگر یہاں پر ظن کا معنیٰ یقین ہے۔ عربی زبان میں بعض دوسرے کئی الفاظ بھی متضاد معانی رکھتے ہیں۔ جیسے جَوْن کا معنیٰ سیاہ بھی اور سفید بھی۔ اسی طرح حمیم کا معنیٰ گرم اور سرد دونوں طرح ہوتا ہے۔

فرمایا یہ نماز اُن لوگوں پر بوجھل نہیں ہے جنہیں یقین ہے کہ انہیں ایک دن اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ وہاں اعمال کی باز پرس ہوگی۔ اور نماز جیسی نعمت کی قدر وہاں جا کر معلوم ہوگی۔ اور انہیں یہ بھی یقین ہے وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہ انہیں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا "وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ" تمام چیزوں کا رجوع اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے۔ "وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى" اور ہر چیز کی انتہا بھی وہیں ہوگی۔ چونکہ عاجزی کرنے والوں کا ان باتوں پر یقین ہے۔ اس لیے وہ نہایت خوشی اور ذوق وشوق کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ اُن پر یہ بھاری نہیں ہوتی۔

درس بست ویک ۲۱ (آیت ۴۷ تا ۵۰)

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ
وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ
نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ
مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ
اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ
وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ
وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾

ترجمہ: اے اسرائیل کی اولاد! یاد کرو میری اس نعمت کو جو میں نے تم پر انعام کی اور یہ کہ میں نے تم کو فضیلت بخشی جہان والوں کے مقابلے میں ﴿۴۷﴾ اور ڈرو اس دن سے کہ نہیں بچائے گا کوئی نفس دوسرے نفس سے کچھ بھی، اور نہ قبول کی جائے گی اس سے سفارش اور نہ لیا جائے گا اس سے فدیہ۔ اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔ ﴿۴۸﴾ اور اس وقت کو یاد کرو۔ جب ہم نے تم کو نجات دی فرعون والوں سے۔ وہ چکھاتے تھے تم کو بہت بری سزا۔ وہ ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو، اور زندہ چھوڑتے تھے۔ تمہاری عورتوں کو اور اس بات میں آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی ﴿۴۹﴾ اور اس بات کو یاد کرو جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا تھا۔ اور ہم نے تمہیں نجات دی اور آلِ فرعون کو غرق کیا۔ اور تم دیکھ رہے تھے۔ ﴿۵۰﴾

ربطِ آیات

پہلے رکوع میں اجمال تھا۔ اب یہاں سے اللہ تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ بنی اسرائیل کا ذکر کیا ہے۔ اور انہیں وہ انعامات اور معجزات یاد دلائے ہیں۔ جو اُن پر ظاہر کیے گئے تھے۔ نزولِ قرآن کے زمانے کے بنی اسرائیل کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ ایمان قبول کر لیں۔ نیز اس

قوم میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ساتھ ساتھ اہل ایمان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی روش سے بچتے رہیں، کہیں ان کی خرابیوں میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ فرعون کی غلامی میں عرصہ دراز تک رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل میں بے شمار خرابیاں اور سرکشی کا مادہ پیدا ہو گیا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بیشمار انبیاء علیہم السلام تشریف لائے۔ مگر سرکشی کا جو مادہ اس قوم میں پیدا ہو چکا تھا۔ وہ برقرار رہا۔ یہ سب باتیں ان آیات سے واضح ہوں گی۔

بنی اسرائیل کی فضیلت

اسرائیل کا معنی اللہ کا بندہ ہے۔ اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اے فرزندان یعقوب اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی۔ اللہ تعالیٰ کے انعامات میں بنی اسرائیل کی غلامی سے آزادی بحیثیت قوم انہیں برتری دینا اور ان میں کثرت سے نبی بھیجنا وغیرہ شامل ہیں اور دوسری بات یہ کہ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ تمہیں جہان والوں پر فضیلت بخشی۔ سورۃ مائدہ میں آتا ہے۔ اِذۡ جَعَلَ فِیۡکُمۡ اَنۡۢبِیَآءَ وَجَعَلَکُمۡ مُّلُوۡکًا یاد کرو اس احسان کو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر بڑے بڑے بادشاہ پیدا کیے۔ اور کثرت سے انبیاء مبعوث فرمائے۔ اور تم کو وہ چیز عطا کی، جو جہان والوں میں سے کسی دوسری قوم کو عطا نہیں کی۔

یہاں پر بنی اسرائیل کی جہاں والوں پر فضیلت سے یہ مراد نہیں ہے۔ کہ انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر بھی فضیلت حاصل ہے۔ قرآن پاک میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اُمت کو سب سے زیادہ فضیلت بخشی ہے۔ اور اس فضیلت کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی۔ گویا دونوں جہانوں میں امتِ محمدیہ کی فضیلت مسلم ہے۔ بنی اسرائیل کی فضیلت سے مراد یہ ہے۔ کہ انہیں اپنے دور میں دینی اور دنیوی ہر دو لحاظ سے باقی اقوام عالم پر برتری حاصل تھی۔ اُس زمانے میں اس قوم میں صلاحیت بھی پائی جاتی تھی۔ اور اُن کی علمی حیثیت بھی مستند تھی۔ ایک خاص چیز جو بنی اسرائیل میں پائی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس قوم نے اپنی تاریخ کو محفوظ رکھا ہے۔ چنانچہ بائیبل کا ایک بڑا حصہ تاریخ بنی اسرائیل پہ مشتمل ہے۔ برخلاف اس کے ہندو قوم ہزاروں برس تک برسر اقتدار رہی ہے مگر سوائے چھوٹے موٹے قصے کہانیوں کے ہندوؤں کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اپنی یہ خامی خود ہندو بھی

تسلیم کرتے ہیں۔ گویا بنی اسرائیل کے دور میں جو دوسری اقوام موجود تھیں، اُن میں سے کسی کی تاریخ بھی محفوظ نہیں ہے۔ بنی اسرائیل ہی ایک واحد قوم ہے جس کی تاریخ ملتی ہے۔

اسلامی تاریخ کی حفاظت

البتہ جب حضور خاتم النبیینؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کا زمانہ آیا تو انہیں علمی لحاظ سے بھی برتری حاصل ہوئی اور انہوں نے اپنی تاریخ کو بھی محفوظ کر لیا۔ انہیں زمانے میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ مگر جب یہ امت بھی زوال پذیر ہوئی۔ تو اس کی حیثیت بھی دنیا کی دیگر زوال پذیر اقوام سے مختلف نہ رہی۔ موجودہ دور کے مسلمان کو اپنی تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ نہ اپنی تاریخ کی حفاظت کی کوشش کرتا ہے۔ اور نہ اپنی کتاب کی تشریح اور تفسیر معلوم کرنے کی سعی کرتا ہے۔ مسلمانوں کے زمانۂ عروج کی تاریخ تو آج بھی موجود ہے۔ اسلام نے بڑے بڑے مؤرخ پیدا کیے۔ جنہوں نے اپنے زرّیں دور کے ایک ایک لمحے کو اپنی کتابوں کے اوراق میں محفوظ کر لیا۔ ان مؤرخین میں علامہ طبریؒ تیسری صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔ ابن خلدونؒ اور ابن کثیرؒ آٹھویں صدی کے مؤرخ ہیں۔ ابن اثیرؒ جنہوں نے تاریخ اور دیگر علوم کو محفوظ کیا۔ جو مفسرؒ بھی ہیں۔ اور تاریخ دان بھی۔ مگر آج ہم ہیں جو اپنے اکابر کے جمع کردہ علمی ذخیرہ سے بھی خاطر خواہ مستفید نہیں ہو پاتے جب سے انگریز کی حدت پیدا ہوئی ہے۔ اس نے مسلمانوں کو اُن کی اپنی تاریخ سے بے بہرہ کر دیا ہے آج مسلمان اپنی تاریخ کو فراموش کر چکا ہے۔ اُسے اب یورپ کے افراد پر فخر ہے۔ ان کی تاریخ کو حفظ کرتے ہیں۔ اپنی تاریخ سے نہ تو واقفیت پیدا کی جاتی ہے۔ اور نہ اُسے محفوظ کرنے کی تگ و دو ہوتی ہے۔

امت مسلمہ کی برتری

بہر حال یہ چیز بنی اسرائیل کے خصائل میں سے ہے۔ کہ انہوں نے اپنی تاریخ کو محفوظ رکھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں فضیلت بخشی اور فرمایا کہ میں نے تمہیں عالمین پر فضیلت بخشی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ عالمین سے مراد اقوام عالم ہیں۔ اور اس سے صرف انسان مراد ہیں۔ کیونکہ دنیا کی باقی اشیا تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لیے پیدا فرمائی ہیں۔ "خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا" زمین کی ہر چیز تمہارے لیے پیدا کی۔ لہٰذا برتری صرف انسان کو ہی حاصل ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو اپنے زمانہ میں اقوام عالم پر فضیلت حاصل تھی۔ یہ فضیلت مطلقاً ہر زمانے کے لیے نہیں تھی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[1]۔ کہ میری امت سب امتوں سے

[1] بخاری صفحہ ۱۲۰ ج ۱ و مسلم صفحہ ۱۸۲ ج ۱

بعد میں آنے والی ہے۔ مگر قیامت کے دن سب سے آگے ہوگی۔ ان کا حساب و کتاب بھی باقی امتوں سے پہلے ہوگا۔ اور جنت میں بھی سب سے پہلے جائیں گے۔ انہیں باقی تمام امتوں پر برتری حاصل ہوگی۔

برتری کا معیار تقوٰی ہے

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان پر کیے گئے انعامات یاد دلانے کے بعد فرمایا وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی نفس نہ بچائے گا۔ دوسرے نفس سے کچھ بھی۔ بہت ہی خوفناک اور خطرناک دن آنے والا ہے۔ ہر نفس کو اپنے عقیدے اور عمل کے مطابق بھگتنا پڑے گا۔ یاد رکھو اس دن انسان کی برتری تقوے کے اعتبار سے ظاہر ہوگی۔ تقوے کی تشریح میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے یہ آیت پڑھی تھی[1] اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ تقوٰی یہ ہے۔ کہ انسان عدل و احسان کا دامن تھام لے۔ قرابت داروں کے حق ادا کرے۔ اور فحش اور بے حیائی کی باتوں سے بچتا ہے۔ عقیدے اور عمل میں اپنوں اور بیگانوں سے عدل لازم ہے۔ اور احسان تو بڑی منزل ہے۔ حقوق کی ادائیگی ——— اس سے بھی آگے ہے۔ یہ تمام چیزیں تقوے میں شامل ہیں۔

مسئلہ شفاعت

وَلَا یُقْبَلُ مِنْھَا شَفَاعَۃٌ اور نہ اس نفس سے سفارش قبول کی جائیگی۔ شاہ رفیع الدینؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت میں مطلق سفارش کی نفی کی گئی ہے، حالانکہ سفارش برحق ہے۔ قرآن و سنت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سفارش ہوگی۔ اس مقام پر جس سفارش کی نفی کی گئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے۔ کہ کسی کافر کے حق میں سفارش مفید نہیں ہوگی۔ کسی کافر سے سفارش قبول نہیں کی جائیگی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[2] میری سفارش برحق ہے۔ اور یہ میری امت کے ہر اس شخص کو پہنچے گی مَنْ لَّا یُشْرِکُ بِاللّٰہِ شَیْئًا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا۔ مگر کافر کے حق میں یہ بالکل قبول نہیں ہوگی۔ البتہ اگر کسی کی فطرت پاک ہوگی عقیدہ صحیح ہوگا۔ مشرک اور کافر نہیں ہوگا۔ تو سفارش مفید ہوگی۔ " مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ

---

[1] غنیۃ الطالبین ج۲ صفحہ ۱۴۲ مطبوعہ مصر   [2] ترمذی ص۳۵۱، مسلم ج۱ ص۱۱۳

اِلَّا بِاِذْنِہٖ" اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر بھی کوئی سفارش نہیں ہوگی۔ سفارش کی دوسری شرط یہ ہے "وَرَضِیَ لَہٗ قَوْلًا" سفارش اس کے حق میں ہوگی۔ جس کا عقیدہ اور بات اللہ تعالیٰ کو پسند ہوگی۔ فاسد العقیدہ انسان کے بارے میں سفارش کا کوئی امکان نہیں۔

حضرت شاہ رفیع الدینؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا۔ جس وقت بالکل کوئی چیز مفید نہیں ہوگی۔ حشر میں بڑی بڑی منزلیں آئیں گی۔ جب قہری تجلی زور سے نازل ہو رہی ہوگی۔ تو انبیاء علیہم السلام بھی گھبرا جائیں گے۔ حدیث میں آتا ہے[2]۔ کہ نفسی نفسی پکاریں گے۔ اس موقع پر سفارش کہاں ہوگی۔ ہاں بعض دوسرے مواقع پر دو شرائط کے ساتھ سفارش ہوگی۔ کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت ہو اور جس کے حق میں سفارش کی جا رہی ہے۔ اس کا عقیدہ صحیح ہو۔

فرمایا اُس دن سے ڈرو جس دن سفارش بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ وَلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ اور جس دن فدیہ بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ کہ کوئی شخص فدیہ دے کر اپنی جان چھڑا سکے۔ یہ بھی ممکن نہیں ہوگا۔ دوسری جگہ صاف موجود ہے۔ کہ اگر کوئی شخص سونے کی بھری ہوئی پوری زمین بھی فدیہ دے کر اپنی جان بچانا چاہے گا۔ تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ اول تو اتنا مال و دولت، سونا، چاندی مہیا ہونا ہی ناممکن ہے۔ اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی جائے۔ تو اتنا بڑا فدیہ بھی کسی کام نہ آئے گا۔ وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ اور نہ کسی طرف سے اُن کی مدد ہوگی۔ دنیا میں کسی کو چھڑانے کے یہی طریقے ہیں۔ کہیں سفارش چل گئی۔ کہیں فدیہ یا نذرانہ دے دیا یا کہیں جتھابندی کر لی۔ مگر میدان حشر میں ان میں سے کوئی چیز بھی کارگر نہیں ہوگی۔

بعض لوگوں نے سفارش کا عقیدہ بالکل ایسا بنا لیا ہے۔ جیسے عیسائیوں نے کفارے کا عقیدہ بنا رکھا ہے۔ یہ غلط عقیدہ ہے۔ سفارش حقیقت میں انسان کے عقیدے اور اعمال کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ یہودیوں نے بھی غلط امید لگا رکھی ہے۔ کہتے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہوں گے۔ اور وہ کسی ختنہ کیے ہوئے اسرائیلی کو دوزخ میں نہیں گرنے دیں گے۔ ہم جو چاہیں کرتے رہیں، دوزخ میں نہیں جا سکتے۔ آگے آ رہا ہے کہتے

---

[1] تفسیر شاہ رفیع الدینؒ صـ ۲۵ [2] مسلم صـ ۱۱۱ ج ۱

تھے" وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً اگر ہم دوزخ میں گئے بھی تو صرف اتنے دن کے لیے جتنے دن ہمارے بڑوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔ وہ کہتے ہیں " لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى" یعنی جنت کے وارث صرف یہودی اور عیسائی ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ یہ سراسر غلط عقیدہ ہے سفارش کے متعلق بھی لوگوں نے اسی قسم کا عقیدہ بنالیا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ راضی ہو یا ناراض عقیدہ درست ہو یا باطل، اعمال کا کوئی حصہ ہو یا نہ ہو۔ ہمارے سفارشی ہمیں بچالیں گے۔ نبیوں کی شریعتیں بتاتی ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکلف بنایا ہے۔ مکلف مسئول ہوتا ہے۔ اس سے بازپرس ہوتی ہے۔ عقیدے اور اعمال کے متعلق پوچھا جائے گا۔ قرآن پاک میں صاف موجود ہے"۔ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا" ہر نفس اپنی طرف سے دفاع کرے گا۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے۔ کہ وہ دن بھی آنے والا ہے۔ جس دن اللہ تعالےٰ انسان سے براہِ راست خطاب کرے گا۔ وَلَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهٗ تَرْجُمَانٌ جب خدا تعالیٰ اور انسان کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا۔ براہِ راست سوال وجواب ہوں گے۔ انسان مسئول ہے اور جس سفارش کے عیسائی یا مشرک اور یہودی قائل ہیں۔ ایسی سفارش کا اسلام میں کوئی مقام نہیں ہے

فرعون سے نجات

بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے مزید ارشاد ہوتا ہے "وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ اور یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے تمہیں آل فرعون سے نجات دی۔ فرعون نے بنی اسرائیل پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رکھے تھے۔ اس کے حواری بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ اور ظلم وستم میں فرعون کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے۔ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وہ تمہیں ذلت ناک بہت بری سزا دیتے تھے۔ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ تمہارے بچوں کو ذبح کرتے تھے۔ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔

لہ بخاری ص ۹۶۸ / ۲ج

مردوں کے قتل اور عورتوں کے زندہ رکھنے کا عمل بنی اسرائیل کے ساتھ دو دفعہ پیش آیا۔ پہلی دفعہ یہ ظلم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ڈھایا گیا۔ جب نجومیوں نے پیش گوئی کی۔ کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ جو فرعون کی سلطنت کے زوال کا باعث بنے گا۔ اس وقت فرعون نے حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل میں جو بھی بچہ پیدا ہو۔ اُسے ذبح کر دیا جائے اور اُسے زندہ نہ چھوڑا جائے۔ مگر جب موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو اللہ تعالےٰ نے فرعون کے گھر میں ہی اُن کی پرورش کی۔ اور وہ سارے واقعات پیش آئے جو سورۃ قصص میں مذکور ہیں۔

ظلم کی اس چکی میں کتنے بچے پسے۔ اسکے متعلق مختلف روایات آتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں[۵] کہ اُس وقت نوّے ہزار بچے ذبح کیے گیے۔ ظلم و جور کی یہ انتہا تھی۔ اُن والدین کے دل پر کیا گذرتی ہوگی۔ جن کے سامنے اُن کے نومولود بچوں کو قتل کر دیا جائے۔ ایسے والدین کی پریشانی کا کیا حال ہوگا۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ میرے اُس احسان کو یاد کرو۔ جب میں نے تمہیں اس ظلم سے نجات دی۔

بنی اسرائیل کے بچّوں کے قتل کا دوسری دفعہ حکم فرعون نے اُس زمانے میں دیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی بن کر آئے اور تبلیغ کا کام شروع ہوا۔ اس وقت فرعون کو دوبارہ خطرہ پیدا ہوا۔ کہ بنی اسرائیل کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ اسے کسی طرح کم کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اُس نے حکم دے دیا۔ کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو۔ اُسے پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جائے۔ اور اگر لڑکی پیدا ہو۔ تو اسے زندہ چھوڑ دیا جائے۔ لڑکیاں ہماری خدمت گذاری کے کام آسکیں گی۔

فرمایا وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑا امتحان تھا۔ بنی اسرائیل کے لیے واقعی یہ بہت بڑی آزمائش تھی۔ کہ اپنے سامنے بچوں کو ذبح کرا کر وہ کس طرح اس امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جب بنی اسرائیل اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔ ہمت اور حوصلہ نہ چھوڑا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس ظلم سے نجات دے دی

---

۵ تفسیر ابو السعود صنہ ج۱ معالم التنزیل ص۲۵ ج۱

فرعون کی غرقابی

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دوسرا بڑا احسان یہ جتلایا وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰکُمْ اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا، اور تم کو نجات دی. بنی اسرائیل جب ہجرت کر کے مصر آئے تھے۔ تو اس وقت یعقوب علیہ السلام کے خاندان کے بہتر آدمی تھے۔ چار پانچ صدیوں کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے تو اس وقت بنی اسرائیل کی تعداد تقریباً چھ لاکھ ستر ہزار ہو چکی تھی. موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا، کہ میرے ان بندوں کو لے کر یہاں سے نکل چلیں. آپ نے اپنی قوم سے مشورہ کیا اور طے یہ پایا کہ بغیر اطلاع یہاں سے نکلنا درست نہیں بلکہ فرعون سے اجازت حاصل کر لینی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے فرعون سے اجازت طلب کی کہ ہم باہر کسی تقریب میں جانا چاہتے ہیں. اجازت مل گئی۔ انہوں نے فرعونیوں سے زیورات وغیرہ بھی حاصل کر لیے۔ کہ ایک خاص تقریب میں شامل ہونا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل سفر پر روانہ ہو گئے۔ سارا دن گذر گیا۔ اگلی رات فرعونیوں کو احساس ہوا۔ کہ کہیں بنی اسرائیل بالکل ہی نہ چلے جائیں۔ ان کا پتا کرنا چاہیئے۔ فرعون نے تعاقب کا حکم دے دیا۔ ایک دن لشکر کی تیاری میں گذر گیا۔ اور دوسری رات بھی گذر گئی۔ بنی اسرائیل مسلسل چلتے رہے۔ مصر سے مشرق کی جانب بحیرہ قلزم آتا ہے۔ اس کو عبور کرنے کے بعد صحرائے سینا آتا ہے۔ یہ بارہ کوس کی مسافت ہے۔

تفسیری روائتوں میں آتا ہے کہ فرعون کا لشکر بارہ لاکھ افراد پر مشتمل تھا. شاہ رفیع الدینؒ فرماتے ہیں[1] کہ لشکری اور بازاری لوگ ملا کر کل نفری ساٹھ لاکھ کے قریب تھی۔ اُدھر جب بنی اسرائیل بحیرہ قلزم کے کنارے پر پہنچے تو پتا چلا کہ پیچھے فرعون لشکر لے کر آ رہا ہے بڑے گھبرائے کہ اب تو ہم پکڑے جائیں گے۔ اور ہم میں سے ایک شخص بھی زندہ نہیں بچے گا. موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو تسلی دی کہ گھبراؤ مت" اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ" بیشک میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ ضرور راہنمائی کرے گا. اس موقع پہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا" اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْبَحْرَ" یعنی اے موسیٰ اپنی لاٹھی سے سمندر میں بارہ جگہ ضرب لگاؤ۔ بنی اسرائیل کے بارہ

---

[1] تفسیر شاہ رفیع الدینؒ صفحہ ۲۶ طبع ۱۲۷۲ھ

قبیلے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارہ مقامات پر ضرب لگائی اور بارہ راستے سمندر میں بن گئے۔ بارہ کوس کے لمبے راستے میں پانی کی دیواریں کھڑی ہوگئیں۔ گویا پانی منجمد ہوگیا۔ اور ان بارہ راستوں کی درمیانی دیواروں میں کھڑکیاں بھی بن گئیں۔ تاکہ دوران سفر ایک قبیلے کے لوگ دوسرے قبیلے والوں کو دیکھ بھی سکیں۔ یہ سب کچھ معجزانہ طور پر ہوا جس کی تصریح قرآن پاک اور تفاسیر میں موجود ہے۔ مگر سرسید اور پرویزی فرقے اس کا انکار کرتے ہیں۔

بہرحال تمام قبیلے اپنے اپنے راستوں پر روانہ ہوگئے۔ پیچھے سے فرعون کا لشکر بھی آن پہنچا۔ انہوں نے دیکھا کہ پانی میں راستے بنے ہوئے ہیں۔ اور بنی اسرائیل ان راستوں پر رواں دواں ہیں۔ فرعونی گھوڑوں پر سوار تھے۔ مگر ان کے گھوڑے پانی میں اترنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو گھوڑی پر سوار کرکے بھیجا۔ آپ آگے چلے۔ گھوڑی کی بو سونگھ کر فرعون کا گھوڑا بھی پیچھے پیچھے چل پڑا[1] میکائیل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فرعون کے سارے لشکر کو پیچھے لاؤ۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ دیکھو بنی اسرائیل تمہارے ہاتھوں سے نکلے جا رہے ہیں۔ تعاقب کرکے ان کو پکڑ لو۔ چنانچہ سارا لشکر پانی میں بنے ہوئے راستوں پر چل نکلا بنی اسرائیل بارہ کوس مسافت طے کرکے سمندر سے پار ہوگئے۔ اور فرعون کا سارا لشکر پانی میں بنے ہوئے راستوں کے درمیان آگیا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا " فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ " پھر پانی کی موجوں نے انہیں اس طرح گھیرا کہ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔ صرف فرعون کی لاش کو پانی نے عبرت کے لیے باہر پھینک دیا۔ اسی واقعہ کو یاد دلاتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ہم نے تمام فرعونیوں کو غرق کردیا وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ اور یہ سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ میرے اس احسان کو یاد کرو۔ جب تمہارے لیے سمندر میں راستے بنا دیے جن کے ذریعے تم نے سمندر کو عبور کرلیا اور فرعونیوں سے نجات پالی۔ مگر اس پانی میں فرعون کے سارے لشکر کو تمہارے سامنے غرق کردیا۔ ان احسانات کو یاد دلانے کا مقصد یہ تھا کہ اب بھی اپنی برائیوں سے باز آجاؤ۔ اور اُس دن سے ڈر جاؤ۔ جس دن نہ کسی کی سفارش کام آئیگی اور نہ کسی سے فدیہ قبول کیا جائے گا۔ اور جو کچھ میں نے تمہارے اُوپر نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ۔

---

[1] تفسیر خازن ص ۵۹ ج ۱، مظہری ص ۶۸ ج ۱، معالم التنزیل ص ۲۶ ج ۱

درس بست و دو ۲۲ (آیت ۵۱ تا ۵۴)

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ
بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ
ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ
فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ؕ
فَتَابَ عَلَیْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۴﴾

ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس رات کا وعدہ کیا۔ پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ اور تم ظلم کرنے والے تھے ﴿۵۱﴾ پھر ہم نے معاف کیا تم کو اس کے بعد تاکہ تم شکریہ ادا کرو ﴿۵۲﴾ اور اس بات کو یاد کرو جب ہم نے دی موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فرقان تاکہ تم ہدایت پا جاؤ ﴿۵۳﴾ اور اس واقعہ کو یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا۔ اے میری قوم کے لوگو! بے شک تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ بوجہ بنا لینے کے بچھڑے کو معبود۔ پس توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے۔ پس قتل کرو ایک دوسرے کو۔ یہ بہتر ہے تمہارے پیدا کرنے والے کے پاس۔ پس اس نے رجوع کیا تمہارے اوپر بیشک وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے ﴿۵۴﴾

نزول تورات

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر جو انعامات فرمائے ان کا ذکر مسلسل آ رہا ہے۔ فرعون کی غلامی سے نجات دلانے، دریا کو پھاڑ کر معجزانہ طور پر پانی میں راستے بنانا اور بنی اسرائیل کو بچانا اور پھر فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت وغیرہ کا ذکر آ چکا ہے۔ اس درس میں بعض مزید انعامات کا تذکرہ ہے۔ منجملہ ان کے بنی اسرائیل کو کتاب اور شریعت عطا کرنا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً اس بات کو دھیان میں لاؤ جب کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا تھا۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا۔ کہ کوہِ طور پر چالیس رات تک تنہائی میں اعتکاف کریں۔ قرآن پاک میں ہے کہ اصل وعدہ ایک مہینہ کا تھا۔ مگر بعد میں بڑھا کر چالیس رات کر دیا گیا۔ وعدہ یہ تھا کہ مسلسل چالیس رات کے اعتکاف کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی جائے گی۔ اور یہ اس وقت کا واقعہ ہے۔ جب بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کر چکے تھے۔

وٰعَدْنَا باب مفاعلہ کا صیغہ ہے۔ اور اس کا معنیٰ بھی وَعَدْنَا ہی ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عظیم اور جلیل القدر پیغمبر تھے۔ نبی، رسول اور صاحب شریعت تھے۔ خدا تعالیٰ کے خلیفہ بھی تھے۔ لفظ موسیٰ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ جسے عربی میں ڈھال لیا گیا ہے۔ عبرانی زبان کا اصل لفظ میشا تھا مِی کا معنیٰ پانی اور شا کا معنیٰ درخت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے بچپن میں پانی میں بہتے چلے آ رہے تھے۔ جب انہیں اٹھایا گیا وہاں درخت بھی موجود تھے۔ اس بنا پر آپ کا نام میشا اور پھر عربی میں موسیٰ بن گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے سولہ سو سال پہلے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر مبارک ایک سو بیس[1] سال تھی۔ اسی عمر میں یہ سارے واقعات پیش آئے۔ آپ کے والد کا نام عمران تھا۔ آپ کا شجرہ نسب اس طرح ہے موسیٰ بن عمران بن بصہر بن فاہث بن لاوی بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم لاوی یعقوب علیہ السلام کے سب سے بڑے بیٹے تھے اور عرف عام میں بڑا بیٹا ہی ریاست اور نیابت کا وارث ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے موسیٰ علیہ السلام کو دونوں حیثیتیں حاصل تھیں۔ حقیقی ریاست یعنی نبوت بھی اُن کو حاصل تھی۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی اور رسول بنایا۔ اور عام ریاست یعنی نیابت بھی بڑا ہونے کی حیثیت سے آپ کو ہی حاصل تھی۔

فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل کو احساس ہوا۔ کہ وہ اب آزاد ہو چکے ہیں۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں۔ لہٰذا ان کے پاس اپنا قانون ہونا چاہیئے۔ جس سے وہ راہنمائی حاصل

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۴۰ پ ۱

کریں، اور اس کے مطابق زندگی بسر کریں۔ چنانچہ قوم کی خواہش پر موسیٰ علیہ السلام نے رب العزت کی بارگاہ میں عرض کی کہ ہمیں کوئی قانون عطا کیا جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ کہ طور پہ آکر چالیس دن کا اعتکاف کرو۔ تو تمہیں کتاب دی جائے گی۔ جو تمہارے لیے مکمل قانون ہوگی۔

تفسیر معالم التنزیل اور بعض دیگر تفاسیر میں یہ روایت بیان کی گئی ہے[1]۔ کہ بنی اسرائیل بحر قلزم کو عبور کر کے صحرائے سینا میں وارد ہوئے اور انہوں نے چالیس سال میدان تیہ میں گذارے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات بھی وہیں ہوئی۔ ہارون علیہ السلام بھی اسی مقام پر فوت ہوئے۔ تاریخ سے بھی یہ چیز ثابت ہے۔ کہ چالیس سال تک بنی اسرائیل صحرائے سینا میں ہی صحرا نوردی کرتے رہے۔ یہ لوگ مصر کی طرف نہیں گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تھا۔ کہ ارض مقدس پر حملہ کرو۔ وہاں پر تمہیں قبضہ دلایا جائے گا۔ مگر یہ لوگ اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ چالیس سال بعد نئی نسل نے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے ارض مقدس پر حملہ کیا اور کامیاب ہوئے، اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نائب حضرت یوشع علیہ السلام منصب نبوت پر فائز تھے۔ انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت یوشع علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ تو اُن کے زمانے میں شام اور فلسطین پر بنی اسرائیل قابض ہوئے۔ اُس زمانے میں اس علاقے میں قوم عمالقہ کی حکومت تھی۔

معالم التنزیل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے[2]۔ کہ بحر قلزم کو پار کرتے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے قوم کے کچھ آدمیوں کو مصر کی طرف بھی بھیجا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ وہاں کا انتظام کریں۔ ایسا نہ ہو کہ چور، ڈاکو، قزاق، مفسد وغیرہ ملک میں بدامنی پھیلائیں۔ یہ بات اگرچہ عام روایتوں کے خلاف ہے تاہم اس بات کا امکان ہو سکتا ہے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام نے بعض لوگوں کو وہاں بھیجا ہو۔ مگر آپ خود وہاں نہیں گئے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کوہ طور پہ معتکف ہوئے تو وہاں سے اللہ تعالیٰ کی کتاب تورات ملی۔

---

[1] معالم التنزیل ص ۲۷۸ ج ۱، [2] ایضاً

توراۃ کا لفظی معنیٰ قانون ہے اور اس سے مراد قانون شریعت ہے۔ اپنے زمانے میں توراۃ بڑی عظیم المرتبت کتاب تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا تھا۔ کہ ایسی کتاب عنایت کروں گا۔ جسکی شریعت اور قانون قرنوں تک جاری رہے گا۔ آسمانی کتُب میں سب سے اعلیٰ مرتبہ قرآن پاک کا ہے اور اس کے بعد توراۃ کا۔ جس طرح قرآن پاک میں قانون فوجداری۔ دیوانی۔ اخلاق۔ عبادات معاملات وغیرہ موجود ہیں۔ اسی طرح توراۃ میں بھی ہر قسم کے قوانین موجود ہیں۔ جس طرح توراۃ کا معنیٰ قانون ہے۔ انجیل کا معنیٰ بشارت ہے۔ زبور کا معنیٰ صحیفہ ہے۔ اور اس میں زیادہ تر دعائیں ہیں۔ اللہ تعالےٰ کی آخری کتاب قرآن ہے۔ جس کا معنیٰ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ چنانچہ آج بھی دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرآن پاک ہی ہے۔

حکمت خاص نعمت ہے

مفسرین کرام فرماتے ہیں[۱]۔ کہ موسیٰ علیہ السلام ذوالقعدہ کی ابتداء میں کوہ طور پہ معتکف ہوئے اور ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو اللہ تعالیٰ نے توراۃ عطا کی۔ گویا پورا ماہ ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے دس دن آپ نے اعتکاف کیا۔ یہ چالیس دن کا بھی خاص اثر ہوتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے[۲]۔ مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰہِ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا ظَھَرَتْ یَنَابِیْعُ الْحِکْمَۃِ مِنْ قَلْبِہٖ عَلٰی لِسَانِہٖ جس نے چالیس دن تک اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص کیا۔ حکمت اس کے دل سے نکل کر اس کی زبان پر ظاہر ہو جائے گی۔ حکمت دانشوری کو کہتے ہیں اور یہ بڑی گہری بات ہے جسے نصیب ہو جائے" وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا" جسے حکمت عطا کر دی گئی۔ اُسے خیر کثیر مل گئی۔ دوسری جگہ فرمایا" وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ" ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی۔ یہ لقمان اللہ والے ایک بزرگ تھے۔ نبی نہیں تھے۔ اللہ تعالےٰ نے انہیں بڑی دانائی عطا کی تھی۔ تو مقصد یہ ہے کہ چالیس دن تک اخلاص برتنے سے حکمت زبان پہ جاری ہو جائے گی۔ حدیث شریف کا یہ مطلب ہے۔

عددِ چالیس کی حکمت

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے[۳]۔ خَمَّرَ طِیْنَ اٰدَمَ اَرْبَعِیْنَ صَبَاحًا یعنی آدم علیہ السلام کی مٹی چالیس روز تک خمیر کی گئی۔ اور پیدائش کے سلسلہ میں بھی آتا ہے۔ کہ جب

---

[۱] معالم التنزیل ص۲۷ ج۱، ابن کثیر ص۹۱ ج۱، [۲] فیض القدیر شرح جامع صغیر ص۴۳ ج۶۔
[۳] تفسیر عزیزی فارسی ص۲۳۹ پارہ ۱۵

حمل قرار پاتا ہے تو چالیس دن تک نطفہ رہتا ہے۔ اس کے بعد علقہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کے چالیس دن بعد گوشت کا لوتھڑا بنتا ہے۔ پھر چالیس دن بعد اس میں روح انسانی ڈالی جاتی ہے[1]۔ اس سے پہلے روح حیوانی ہوتی ہے۔ صوفیائے کرام عام طور پر چالیس دن کا چلہ کھینچتے ہیں چالیس دن روزہ بھی رکھواتے ہیں۔ اور عبادت بھی کرواتے ہیں۔ جس کا خاص اثر ہوتا ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ کا مشہور واقعہ[2] ہے۔ کہ ایک خوبصورت عورت باجماعت نماز پڑھا کرتی تھی۔ کسی نوجوان کی نظر پڑی تو اُس پر عاشق ہو گیا۔ اس نے عورت کو ملاقات کا پیغام بھیجا۔ وہ بھی سمجھ گئی۔ کہ یہ شخص فتنے میں مبتلا ہو گیا ہے۔ وہ عورت کامل الایمان تھی۔ کہنے لگی کہ میں تجھے ملاقات کا موقع اس شرط پر دینے کو تیار ہوں۔ کہ تم حضرت عمرؓ کے پیچھے چالیس دن تک نماز ادا کرو۔ اور یہ اس حالت میں ہو کہ تمہاری تکبیر اولیٰ فوت نہ ہو۔ اس شخص نے اسے نہایت آسان کام سمجھتے ہوئے نماز باجماعت شروع کر دی۔ ابھی بارہ روز ہی گذرے تھے کہ اس میں تغیّر آنا شروع ہو گیا۔ جب چالیس دن مکمل ہوئے تو اس شخص کی کایا ہی پلٹ چکی تھی۔ اب اُس عورت نے پیغام بھیجا کہ تمہاری شرط پوری ہو چکی ہے۔ تم آکر ملاقات کر سکتے ہو۔ نوجوان نے جواب بھیجا کہ اب میری ملاقات اللہ تعالیٰ سے ہو چکی ہے۔ تمہاری ملاقات کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ چالیس دن کے چلّے کا اُس نوجوان پر یہ اثر ہوا۔ اس کے بعد اس عورت نے اس واقعہ کا ذکر اپنے خاوند سے کیا۔ اور اُس نے سارا واقعہ حضرت عمرؓ کو سُنا دیا۔ آپ نے فرمایا صَدَقَ اللّٰہُ تَعَالیٰ اللہ تعالیٰ نے بالکل سچ فرمایا ' اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ' بے شک نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے۔ اور پھر نماز بھی ایسی جو امیر المومنینؓ کے پیچھے ادا کی گئی ہو۔ سُبۡحٰنَ اللّٰہِ اس کا کیا ہی اثر ہو گا۔ بہر حال چالیس کے عدد کا یہ خاص اثر ہے۔

بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی

جب موسیٰ علیہ السلام چالیس روز کے لیے کوہ طور پر معتکف ہو گئے ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ تم نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ

---

[1] مسلم صفحہ ۲۳۲/۲ ، بخاری صفحہ ۹۷۶/۲   [2] ؟

اور تم بڑے ظلم کرنے والے تھے۔ تم نے کچھ خیال نہ کیا۔ تمہارے پاس ایک پیغمبر بھی موجود تھے۔ مگر اس کے باوجود تم گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ شرک میں ملوث ہو گئے۔ حالانکہ " اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ " شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ دوسری جگہ فرمایا " وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ " کفر کرنے والے بہت بڑے ظالم ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں دخل اندازی کرتے ہیں۔ اس کی صفات میں شرک کرتے ہیں۔ یا اس کی عبادت میں شریک ٹھہراتے ہیں۔ سورۃ طٰہٰ میں آتا ہے۔ کہ حضرت ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی سے منع کرتے رہے۔ انہوں نے ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس قوم نے کوئی بات نہ مانی۔

شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1] کہ گوسالہ پرستی ہر قوم میں پائی جاتی ہے۔ یہ مت سمجھو کہ صرف بچھڑے کی پوجا ہی مشرکانہ فعل ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا جس کی بھی پوجا کی جائے گی۔ وہ شرک ہی ہو گا۔ ترمذی شریف میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے[2]۔ تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ تباہ ہو دینار کا بندہ تباہ ہو درہم کا بندہ تباہ ہو کمبل کا بندہ۔ اِنْ اُعْطِيَ رَضِيَ وَاِنْ لَّمْ يُعْطَ سَخِطَ اگر اسے دے دیا جائے تو راضی ہو جاتا ہے۔ اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہوتا ہے۔ یہ دراصل درہم و دینار کی عبادت ہی تو ہے۔ اس کو بھی گوسالہ پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایک عام مقولہ ہے کہ جو چیز تجھے خدا تعالیٰ کی عبادت سے غافل کر دیتی ہے۔ وہ تیرا طاغوت ہے۔

مختلف قوموں کے ایک دوسرے پر اثرات

اس مقام پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہارون علیہ السلام جیسے نبی کی موجودگی میں بنی اسرائیل گوسالہ پرستی میں کیسے مبتلا ہو گئے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[3] کہ اس کی غالب وجہ یہ ہے۔ کہ مصر میں صدیوں تک رہتے ہوئے بنی اسرائیل نے مصریوں کے اثرات قبول کر لیے تھے۔ مصری لوگ سانپ کی پوجا کرتے تھے۔ گائے کی پوجا کرتے تھے۔ اور سورج کی پوجا کرتے تھے۔ فرعون کا معنی ہی بڑا دیوتا ہے۔ اور یہ سورج کے نام پہ بنایا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ مظاہر قدرت کی پوجا کرتے تھے۔ یہی چیز بنی اسرائیل میں بھی سرایت کر چکی تھی۔ لہٰذا انہوں نے بھی بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۴۱ پارہ ۱ ، [2] تفسیر عزیزی ص ۲۴۱ پارہ ۱ ، [3] قصص القرآن ص ۴۴۲ ج ۱

اقوام عالم کے ایک دوسرے پر اثرات تاریخی طور پر ثابت ہیں۔ برصغیر کے مسلمان ہندوؤں کے آثار سے بہت متاثر ہوئے۔ ہندوؤں کی بہت سی رسمیں مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مرنے والے کا تیجا۔ ساتواں۔ چالیسواں وغیرہ ہندوانہ رسوم ہیں۔ ورنہ مسلمانوں کا ان رسموں سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح بنی اسرائیل چونکہ مصریوں کے غلام تھے۔ لہذا مصریوں کے اثرات بنی اسرائیل میں بھی سرایت کر گئے۔ موجودہ زمانے میں دیکھ لیں جو قومیں انگریز کی غلامی میں رہی ہیں۔ وہ سب اُن کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہیں۔ مشرقی ممالک میں سے ایرانیوں۔ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں نے ان کا بڑا اثر قبول کیا ہے۔ یہی حال عربوں مصریوں اور شامیوں کا ہے۔ بعینہ مصریوں کی عادات بنی اسرائیل میں سرایت کر چکی تھیں۔ لہذا موقع ملتے ہی انہوں نے گوسالہ پرستی شروع کر دی۔

مسئلہ حلول

بعض اسرائیلی حلولی عقیدہ رکھتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز میں حلول کر جاتا ہے۔ اور اس شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ جیسے ہندوؤں میں اوتار کا عقیدہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ فلاں کی شکل میں ظاہر ہو گیا ہے۔ یا فلاں جسم میں اس نے ظہور کر لیا ہے۔ تو اسی قسم کے غلط عقیدہ کی بنا پر سامری بدبخت انہیں گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جیسا کہ قرآن میں موجود ہے۔ سامری نے کہا " هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۚ" یعنی تمہارا اور موسیٰ علیہ السلام کا الٰہ یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بچھڑے میں حلول کر آیا ہے۔ لہذا اس کی پوجا شروع کر دو۔ بچھڑے نے بولنا تو شروع کر ہی دیا تھا۔ جاہل قسم کے بنی اسرائیل سامری کی باتوں میں آ گئے۔ اور انہوں نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔

باقی رہا یہ سوال کہ سامری نے یہ کرشمہ کیسے ظاہر کر دیا۔ تو یہ شخص میجک ماسٹر یا مداری یا جادوگر تھا۔ وہ مختلف قسم کے ٹرک جانتا تھا، چنانچہ اس نے چال بازی سے کام لیا۔ جب فرعون کا لشکر بنی اسرائیل کے تعاقب میں بحیرہ قلزم پر پہنچا اور ان کے گھوڑے سمندر میں اترنے سے ہچکچائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو گھوڑی پر سوار کر کے بھیجا جو لشکر فرعون کے آگے آگے چل نکلی۔ سامری نے دیکھا کہ جس جگہ پر جبرائیل علیہ السلام کی گھوڑی کا پاؤں لگتا ہے وہاں فوراً سبزہ اُگ آتا تھا، وہ سمجھ گیا۔ کہ اس میں کوئی کرشمہ ہے اس نے گھوڑی کے پاؤں والی جگہ کی تھوڑی سی مٹی محفوظ کر لی۔ وہ سنار تو تھا ہی۔ اُس نے سونے کا بچھڑا بنایا۔ اور اس کے منہ

میں وہ مٹی رکھ دی۔ جس کی وجہ سے بچھڑے نے بولنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس نے مشہور کر دیا۔ کہ خدا تعالیٰ اس میں حلول کر آیا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کی واپسی

موسیٰ علیہ السلام چالیس روزہ اعتکاف کے بعد اللہ تعالیٰ کی کتاب لے کر واپس آئے تو دیکھا کہ کئی لوگ شرک میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ آپ سخت ناراض ہوئے۔ مشرکین کو زجر کیا۔ اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے بھی بڑے ناراض ہوئے کہ آپ نے قوم کو شرک میں مبتلا ہونے سے کیوں نہ روکا۔ بھائی نے عذر پیش کیا۔ کہ میرا قصور نہیں ہے۔ میں نے تو انہیں ہر چند شرک سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر یہ تو میرے قتل کے درپے ہو گئے تھے" وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي" یہ سارا واقعہ سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر یہ لوگ آپ کی بات نہیں مانتے تھے۔ تو آپ ان کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے۔ اس کے جواب میں ہارون علیہ السلام نے کہا کہ میں نے تفریق کو پسند نہ کیا۔ کہ آپ واپس آکر اعتراض کرتے کہ قوم کو دو ٹکڑوں میں کیوں تقسیم کر دیا۔ ان میں پارٹی بازی پیدا کر دی ہے۔ لہٰذا میں نے انہیں کے درمیان رہتے ہوئے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر ان بدبختوں نے میری بات نہ مانی۔

بچھڑے کے پجاریوں کا قتل عام

جب موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو خوب ڈانٹا تو وہ پشیمان ہو گئے۔ انہیں احساس ہو گیا کہ انہوں نے غلط کام کیا ہے۔ اور اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ تو عرض کیا کہ ہمارے اس جرم کا ازالہ کس طرح ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ہم نے تمہیں معاف کر دیا۔ تاکہ تم شکر گذار بن جاؤ۔ تمہاری توبہ قبول کر لی مگر بڑے سخت طریقے سے جیسا کہ آگے آیت میں آتا ہے۔ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔ اور فرقان یعنی فیصلہ کن طاقت یا معجزات عطا کیے لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ اے میری قوم کے لوگو! تم نے اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا ہے۔ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ کہ ایک بچھڑے کو معبود بنا لیا ہے۔ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ پس توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے اور یہ توبہ صدق دل سے ہونی چاہیئے۔ محض زبانی

توبہ قابل قبول نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ کا طریق کار یہ متعین فرمایا کہ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اپنی ہی جانوں کو قتل کرو۔ مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں نے شرک کا ارتکاب نہیں کیا۔ وہ مشرکوں کو قتل کر دیں۔ اس کے بغیر توبہ قبول نہیں ہوگی۔ فرمایا یہ بظاہر بہت بڑا امتحان ہے کہ تم خود ہی ایک دوسرے کو قتل کرو۔ مگر یاد رکھو ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ یہ بات تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے۔

الغرض حضرت ہارون علیہ السلام اپنے ان بارہ ہزار ساتھیوں کو لے کر آ گئے جنہوں نے بچھڑے کی پوجا سے اجتناب کیا تھا۔ اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں برہنہ تلواریں تھیں۔ ہارون علیہ السلام ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ اور کہا[1] يَا مَعَاشِرَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اَنَّ اِخْوَانَكُمْ اَتَوْكُمْ شَاهِرِيْنَ سُيُوْفَهُمْ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّقْتُلُوْكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاصْبِرُوْا یعنی اے بنی اسرائیل کے گروہ۔ یہ تمہارے بھائی برہنہ تلواریں لیے تمہارے قتل کے لیے آئے ہیں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور صبر کرو۔ اپنے قتل میں مزاحم نہ ہونا۔ چنانچہ ہارون علیہ السلام کے ہمراہیوں نے تلواریں چلانا شروع کر دیں ان کے اپنے ہی عزیز و اقارب مارے گئے۔ بیشمار لوگ قتل ہوئے۔

فرمایا جب یہ شرط پوری ہو گئی تو فَتَابَ عَلَيْكُمْ اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کر لی اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ توبہ کی قبولیت کا فائدہ یہ ہوا۔ کہ بنی اسرائیل قتل ہو کر آخرت کے دائمی عذاب سے بچ گئے۔

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۴۵ پارہ ۱

درس بست و سہ ۲۳ (آیت ۵۵ تا ۵۷)

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

ترجمہ :- اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ! ہم ہرگز تیری تصدیق نہیں کریں گے یہاں تک کہ ہم دیکھ لیں اللہ کو ظاہر پس پکڑ لیا تم کو بجلی نے اور تم دیکھ رہے تھے ﴿۵۵﴾ پھر اٹھایا ہم نے تم کو تمہاری موت کے بعد تاکہ تم شکر ادا کرو۔ ﴿۵۶﴾ اور ہم نے تمہارے اوپر بادل کا سایہ کر دیا۔ اور تمہارے اوپر مَن اور سلویٰ اتارا۔ کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمہیں روزی دی ہیں۔ اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے ﴿۵۷﴾

ربط آیات

بنی اسرائیل کی خرابیوں اور ان کی سرکشی کا ذکر آچکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر جو انعامات کیے ان کا ذکر بھی ہو گیا ہے۔ گذشتہ درس میں بیان ہوا تھا " وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ " یعنی اس وقت کو دھیان میں لاؤ۔ جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فیصلہ کن بات عنایت کی۔ اس کے لیے خود بنی اسرائیل کے لوگوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ ان کے لیے کوئی ضابطہ حیات ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر اعتکاف بیٹھنے کی ہدایت کی۔ اور تکمیل اعتکاف پر اللہ تعالیٰ نے توراۃ عطا فرمائی۔

رویت الٰہی کی خواہش

موسیٰ علیہ السلام کتاب توراۃ لے کر قوم کے پاس آئے اور انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یہ ضابطہ حیات دیا ہے۔ قوم نے کہا کہ ہمیں پڑھ کر سنایئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کتاب کو پڑھنا شروع کیا۔ تو وہ کہنے لگے کہ ہمارے پاس کیا ثبوت ہے۔ کہ یہ کتاب واقعی اللہ تعالیٰ

نے آپ کو دی ہے۔ یا آپ خود بنا لائے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کر کے بنی اسرائیل کو خطاب ہے وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی اور اس وقت کو یاد کرو، جب تم نے کہا اے موسیٰ لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ ہم ہرگز آپ کی بات کی تصدیق نہیں کریں گے۔ کہ یہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے عطا کردہ کتاب ہے۔ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً یہاں تک ہم خود اللہ تعالےٰ کو ظاہری طور پر نہ دیکھ لیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ چلو تمہاری یہ شرط بھی پوری ہوگی۔ آپ نے ستر آدمی منتخب کیے۔ کہ میرے ساتھ طور پر چلو۔ وہاں میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے براہ راست سنوا دوں گا کہ یہ کتاب اسی نے نازل کی ہے۔ قوم طور پر چلنے کے لیے تیار ہوگئی۔ آپ نے ہر قبیلے سے چھ چھ آدمی نکالے۔ بارہ قبیلوں کے بہتر آدمی جمع ہوئے۔ ان میں دو آدمی حضرت یوشع اور قالب کہنے لگے۔ کہ ہمیں آپ کی بات پر یقین ہے۔ لہٰذا ہمیں طور پر جانے کی ضرورت نہیں۔ چونکہ ان دو آدمیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی اس لیے اللہ تعالیٰ نے بعد میں انہیں نبوت سے سرفراز فرمایا۔ اور موسیٰ علیہ السلام باقی ستر آدمیوں کو لے کر طور پر پہنچے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام کیا۔ کہ ہاں یہ کتاب میں نے ہی دی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی بات سننے کے باوجود یہ لوگ ایمان نہ لائے۔

بعض مفسرین کرام کہتے ہیں۔ کہ جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے ستر آدمیوں کو منتخب کیا۔ کہ کوہ طور پر جا کر اللہ تعالیٰ سے اس فعل شنیع کی معافی طلب کریں۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ کا کلام سننے کے بعد ان لوگوں نے یہ بے ادبی کی۔ کہ اے موسیٰ! ہم ہرگز تیری تصدیق نہیں کریں گے۔ جب تک ہم اللہ تعالیٰ کو ظاہراً نہ دیکھ لیں۔ اس پاداش میں اللہ تعالےٰ نے انہیں سزا دی۔ جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

بنی اسرائیل کو سزا

تفسیری روایات اور بائیبل کی روایات کے مطابق جب ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام بالمشافہ سننے کے بعد بھی تورات کو کتاب الٰہی تسلیم نہ کیا فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَۃُ تو انہیں بجلی نے پکڑ لیا۔ ان کی سرکشی کی یہ سزا دی گئی، کہ یکدم بجلی چمکی اور سب کو فنا کر گئی۔ کہتے ہیں۔ کہ

۱؎ معالم التنزیل ص۲۸ ج۱، ابن کثیر ص۹۴ ج۱، ۲؎ معالم التنزیل ص۲۸ ج۱

بجلی دراصل عالم مثال کا حجاب نوری یا ناری تھا جس کی چمک ظاہر ہوئی تھی۔ اور جو ان لوگوں کی تباہی کا باعث بنی۔ بنی اسرائیل کو یاد دلایا گیا۔ کہ یہ سارا واقعہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۔

رؤیت الہٰی اس جہان میں ممکن نہیں

بنی اسرائیل کی رؤیتِ الہٰی کی شرط قابل قبول نہیں تھی۔ کیونکہ اس جہان میں کسی شخص کے پاس یہ صلاحیت موجود نہیں ہے۔ جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کر سکے اس مادی جہان کے بعد جب اگلے جہان میں پہنچیں گے۔ تو وہاں یہ یہی نگاہیں اتنی طاقتور ہو جائیں گی کہ ان میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے[۱] اِنَّکُمْ لَنْ تَرَوْا رَبَّکُمْ عَزَّوَجَلَّ حَتّٰی تَمُوْتُوْا تم مرے بغیر اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتے۔ چنانچہ قیامت کے بعد جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی رؤیت تمام محدثین اور فقہاء کے نزدیک بالاتفاق ثابت ہے۔ وہاں پہ اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہو گا۔ قرآن پاک میں موجود ہے وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ "کئی چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے۔ اور اپنے رب کا دیدار کرنے والے ہوں گے، مگر یہ سب اگلے جہان کی بات ہے۔ اس جہان کے کثیف اعضاء میں یہ طاقت نہیں ہے۔ کہ وہ زیارتِ الہٰی سے مشرف ہوں۔ بلکہ اگلے جہان کے لطیف اعضاء میں اللہ تعالیٰ یہ صلاحیت پیدا فرما دیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی رؤیت کا انکار بعض گمراہ فرقے مثلاً رافضی، معتزلہ اور خارجی وغیرہ کرتے ہیں۔ جن کا اعتقاد ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار نہ اس دنیا میں ممکن ہے۔ اور نہ اگلے جہان میں۔ دلیل ان کی یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ لامکان ہے۔ جہت اور سمت سے بھی پاک ہے۔ اور رؤیت کسی مکان اور سمت میں ہی ممکن ہے۔ دائیں۔ بائیں، اوپر، نیچے وغیرہ لہذا اللہ تعالیٰ کا دیدار ممکن نہیں۔ محدثین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت قرآن و سنت سے ثابت ہے مگر اس رؤیت کی کیفیت کوئی نہیں بتا سکتا۔ یہ بے کیف رؤیت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ اس بات پہ قادر ہے۔ کہ انسان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دے کہ اسے بے کیف رؤیت الہٰی نصیب

۱؎ جامع صغیر مع شرح فیض القدیر ص ۵۵۷/۲

ہو جائے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ کہ رویت تو یقیناً ہوگی مگر "لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ" انسانی آنکھیں اس کو نہیں پاسکتیں۔ مگر وہ آنکھوں کو پالیتا ہے۔ یہاں یہ کیفیت ہے۔ مگر وہاں کیا ہوگا۔ وہاں تو تجلیات ہوں گی۔ اور علی قدر المراتب ہوں گی۔ وہاں ذاتی اور صفاتی دونوں قسم کی تجلیات ہوں گی۔ جن میں انسان دیکھے گا خدا تعالیٰ کی رویت اس طریقے سے ہوگی۔ مگر یہ اس جہاں میں ممکن نہیں۔

آگے سورۃ اعراف میں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آتا ہے۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کلام کیا تو انہیں رویت کا اشتیاق بھی پیدا ہوا۔ عرض کیا "رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْكَ" مولا کریم میں تجھے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ حکم ہوا "لَنْ تَرَانِي" تم نہیں دیکھ سکتے فرمایا پہاڑ کی طرف دیکھو۔ "فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي" اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہ گیا تو پھر شاید تم بھی مجھے دیکھ سکو۔ "فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ" جب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر تھوڑی سی تجلی ڈالی۔ "جَعَلَهُ دَكًّا" پہاڑ ریزے ریزے ہوگیا "وَخَرَّ مُوسَى صَعِقًا" اور موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو کہنے لگے "تُبْتُ إِلَيْكَ" مولا کریم! میں توبہ کرتا ہوں میری درخواست درست نہیں تھی۔ فرمایا "فَخُذْ مَا آتَيْتُكَ" اے موسیٰ! جو میں تمہیں دے دوں اسی پر اکتفا کرو "وَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِينَ" اور شکر گزار بن جاؤ۔ مقصد یہ کہ رویت الٰہی اس جہان میں ممکن نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اٹل فیصلہ ہے۔ جسے بدلا نہیں جاسکتا۔

حضور علیہ السلام نے معراج کے موقعہ پہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا تھا یا نہیں۔ اس میں مختلف آراء ہیں مگر صحیح بات یہ ہے۔ کہ دیدار کیا، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی[1] اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی[2] فرماتے ہیں[2] کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا۔ مگر عالم بالا میں کیا۔ اس مادی جہان میں نہیں کیا ——— عالم بالا میں رویت کے وقت تو حضور علیہ السلام حظیرۃ القدس میں پہنچے ہوئے تھے۔ وہاں تو رویت یقیناً ہوگی۔

بنی اسرائیل کو ہلاک کرنا اور دوبارہ زندہ کرنا

الغرض جب بنی اسرائیل نے یہ بے ادبی۔ کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھے بغیر اس کتاب پر ایمان نہیں لائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ کا قہر نازل ہوا۔ بجلی پڑی اور ستر کے ستر آدمی ہلاک ہو گئے۔ اب

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۶۵ ج ۱، [2] تفسیر مظہری ص ۱۰۹ ج ۹ ص ۱۱۲، الخیر الکثیر ص ۱۷۷ المکتبہ رحیمیہ اکوڑہ خٹک پشاور

موسیٰ علیہ السلام کو ایک اور پریشانی لاحق ہوگئی۔ جیسا کہ سورۃ اعراف میں آتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے نہایت عاجزی کے ساتھ بارگاہِ رب العزّت میں دعا کی۔ مولا کریم! اگر تو چاہتا تو مجھے بھی ہلاک کردیتا۔ تو ان اسرائیلیوں کو اس سے پہلے بھی ہلاک کرسکتا تھا۔ یہ بیوقوف ہیں۔ ان کی وجہ سے میری ذات پر کوئی حرف نہ آئے اگر میں واپس قوم میں اکیلا جاؤں گا۔ تو وہ کہیں گے۔ کہ ہمارے آدمی لے جاکر مروا دیے۔ اے مولا کریم! مہربانی فرما۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ اور فرمایا۔ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں اٹھایا۔ صریح لفظ موجود ہیں۔ وہ لوگ مر چکے تھے۔ موت کے بعد انہیں زندہ کیا۔ بعض توجیہہ کرتے ہیں۔ کہ مرے نہیں تھے۔ بلکہ سکتہ پڑ گیا تھا۔ پھر ہوش میں آگئے۔ یہ بات درست نہیں۔ مَوْتِكُمْ سے واضح ہے۔ کہ ان لوگوں کی موت واقع ہوگئی تھی۔ اور پھر تفسیری روایتوں میں یہ بھی آتا ہے[1]۔ کہ ان کی زندگی سر کی طرف سے شروع ہوئی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے جسم کا باقی حصہ راکھ ہو چکا ہے۔ پھر اس میں زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے۔ اور پھر وہ پورے کے پورے زندہ ہوگئے۔ یہ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ فرمایا یہ اس واسطے کیا لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔

قرآن پاک میں حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ بھی اسی قسم کا ہے۔ جب عزیر علیہ السلام سو سال کے بعد اُٹھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا "كَمْ لَبِثْتَ" تم کتنے دن سوئے رہے۔ عرض کیا "لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ" ایک دن یا اس کا کچھ حصہ سویا ہوں فرمایا "بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ" تم تو سو سال تک سوئے رہے۔ اتنا عرصہ گزر گیا۔ اس دوران تمہارا گدھا فنا ہوگیا۔ اس کی ہڈیاں چورا چورا ہوگئیں۔ اب دیکھو اس کی ہڈیوں کو ہم کیسے اکٹھا کرتے ہیں۔ پھر انہیں گوشت پہناتے ہیں۔ اور زندگی بخشتے ہیں۔ برخلاف اس کے کھانا جلد خراب ہو جانے والی چیز ہے۔ مگر وہ بالکل تازہ پاس پڑا ہے "لَمْ يَتَسَنَّهْ" وہ گلا سڑا نہیں۔ آخر میں فرمایا "اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" میں جانتا ہوں کہ خدا تعالیٰ قادر مطلق

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۹۳ ج ۱

ہے وہ جس طرح چاہے اور جب چاہے کر سکتا ہے۔

الغرض! اُن ستر آدمیوں کو اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد دوبارہ زندگی دی۔ اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ ان لوگوں نے دوبارہ زندہ ہو کر اقرار کیا۔ کہ ہم ہی غلطی پر تھے۔ ہمیں ایسی گستاخی نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کرتے۔ اس کے بعد انہوں نے قوم میں آکر گواہی دی۔ کہ بے شک ہم نے خدا تعالےٰ کا کلام سنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ کہ میں نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی ہے۔ لے بنی اسرائیل! اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

جہاد سے فرار

اس کے علاوہ دوسری بات یہ تھی۔ کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو یاد دلایا کہ شام و فلسطین تمہارے جدامجد حضرت ابراہیم اور اسحٰق علیہما السلام کی وراثت ہے۔ لہٰذا تم اپنی وراثت دوبارہ حاصل کرو۔ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ ان کا ٹھکانا یہی ہے اب اس علاقے پر عمالقہ قوم کا قبضہ ہے۔ تم اُن کے خلاف جہاد کرو۔ اللہ تعالےٰ تمہیں تمہارا وطن واپس دلادیں گے۔ وہی وطن جہاں تمہارے آباؤ اجداد آباد تھے۔ اور جن کی قبریں بھی وہیں ہیں۔ تم تھوڑی سی ہمت کرو۔ اللہ تعالیٰ فتح عطا کریں گے۔

بنی اسرائیل مسلسل غلامی کی وجہ سے بزدل ہو چکے تھے۔ اُن میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اُن کے ضمیر مردہ ہو چکے تھے۔ اس لیے وہ جہاد پر آمادہ نہیں تھے۔ یہ غلامی کا اثر تھا۔ آج ہمارا حال بھی یہی ہے انگریز کی سو سالہ غلامی کے نتیجے میں اخلاق بگڑ چکے ہیں۔ جنہوں نے انگریز کا دودھ پیا ہے۔ ان کے اخلاق کی درستگی کا کوئی امکان نہیں۔ البتہ نئی نسل آئے گی۔ نئے حالات پیدا ہوں گے۔ تو عرصہ کے بعد اخلاق کی درستگی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

قوم عمالقہ بڑے سخت لوگ تھے۔ جب بنی اسرائیل نے ان کی جرأت و شجاعت کے کارنامے سنے تو اُن کے حوصلے مزید پست ہو گئے۔ کہنے لگے ہم جہاد نہیں کر سکتے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بڑا سمجھایا کہ تم صرف کمر ہمت باندھو۔ اللہ تعالیٰ ضرور فتح عطا فرمائیں گے۔ سورۃ مائدہ میں تفصیلات موجود ہیں۔ یہ قوم کسی طرح جہاد پر آمادہ نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے انہیں سزا میں مبتلا کیا۔ چالیس سال تک صحرا میں نظر بند رہے۔ "يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ط

فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ "اے موسیٰ! یہ فاسق لوگ ہیں۔ ان پر افسوس نہ کر۔" یہ اسی سرزمین میں حیران و پریشان پھرتے رہیں گے۔ اس صحرا سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ نیز یہ کہ یہ ساری نسل یہیں ختم ہو جائے گی۔ نئی نسل کا نیا خون آئے گا۔ تو ان میں جذبہ جہاد بیدار ہو گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام وہیں وفات پا گئے۔ پرانی نسل کے وہ لوگ جنہوں نے فرعون کی غلامی کا دور دیکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ ستر سال کے بعد نئی نسل نے علم جہاد بلند کیا اور شام و فلسطین کو فتح کیا۔

بادل کا سایہ

بنی اسرائیل کی تمام تر نافرمانیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کو انعامات سے نوازتا رہا۔ صحرائے تیہ میں نظر بندی کے دوران بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں معاش اور زندگی کے اسباب معجزانہ طور پر مہیا فرمائے۔ بنی اسرائیل خیموں میں اقامت پذیر تھے۔ جب خیمے پھٹ گئے۔ تو ان کے لیے سورج کی گرمی سے بچنا مشکل ہو گیا۔ صحرا کی گرمی بھی ایسی جو پاکستان کی گرمی سے چھ گنا زیادہ ہو۔ بنی اسرائیل سخت تکلیف میں مبتلا ہو گئے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک اور انعام فرمایا وَظَلَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْغَمَامَ یعنی اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کر دیا۔ جب دن کے وقت دھوپ تیز ہوتی تو اللہ تعالیٰ بادلوں کو حکم دیتے وہ بنی اسرائیل پر چھا جاتے۔ اور اس طرح وہ دن کے وقت سورج کی تپش سے محفوظ رہتے۔

من اور سلویٰ

صحرائے سینا میں خورد و نوش کے لیے کوئی چیز میسر نہ تھی۔ نہ کھیتی باڑی اور نہ کوئی فصل مگر چھ لاکھ ستر ہزار افراد کے لیے کھانے کے بغیر چارہ نہ تھا۔ نسل بتدریج بڑھ رہی تھی۔ اور اشیائے خورد و نوش کی ضرورت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ان کے کھانے پینے کا انتظام اس طرح فرمایا وَاَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی ط اے بنی اسرائیل! ہم نے تم پر من اور سلویٰ نازل کیا۔ من کا لفظی معنی احسان ہوتا ہے۔ سورہ حجرات میں آتا ہے۔ "یَمُنُّوْنَ عَلَیْکَ اَنْ اَسْلَمُوْا ط آپ پر احسان جتلاتے ہیں۔ کہ وہ ایمان لے آئے ہیں۔ تاہم من میں یہ معنی پوشیدہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی محنت و مشقت کے احسان کے طور پر انہیں کھانا مہیا کیا۔ کوئی کھیتی باڑی نہیں کرنی پڑی۔ اور نہ ہی کوئی دوسرا کاروبار کرنا پڑا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے بالکل مفت میں ان کے لیے کھانے کا بندوبست کر دیا۔

مَن ترنجبین کی قسم کے دانے تھے۔ جیسے دھنیا کے دانے ہوتے ہیں، یہ نہایت شیریں مادہ تھا۔ جو رات کو بنی اسرائیل کے خیموں یا دوسری رہائش گاہوں کے اردگرد برس جاتا تھا۔ اور اس کی مقدار اس قدر کافی ہوتی تھی۔ کہ ہر فرد کو ایک ایک سیر کے قریب میسّر آجاتا تھا۔ صبح اُٹھتے تھے۔ اور یہ دانے اکھٹے کر لیتے تھے۔ یہ اُن کی چوبیس ۲۴ گھنٹے کی خوراک کے لیے کافی ہوتا تھا۔ چونکہ ہفتے کے روز چھٹی ہوتی تھی۔ اس لیے جمعہ کے دن دو ۲ دن کی خوراک مل جاتی تھی۔

مَن کے دانوں میں خاص قسم کی شکر ہوتی تھی۔ جو کہ حیاتِ انسانی کے لیے بڑی ضروری ہے۔ انسانی جسم کی حرارت کو برقرار رکھنے کے لیے شکر کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ انسان کا جسم ٹھنڈا ہو کر ختم ہو جائے گا۔ قدرت نے انسان کے جسم میں ایسا نظام پیدا کر دیا ہے۔ کہ انسان جو بھی غذا استعمال کرتا ہے۔ یہ جگر میں پہنچ کر شکر بن جاتی ہے۔ یہ شکر ہر قسم کے اناج اور پھلوں وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ اصلی شکر نہ بھی کھائیں۔ تو بھی انسانی جسم خوراک کے دیگر اجزاء سے شکر حاصل کر لیتا ہے۔ گویا انسانی جسم کو گلوکوز کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ اشیائے خورد ونوش سے جگر میں پیدا کرتا ہے۔ اور پھر وہ جسم کے باقی حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس طرح انسانی جسم کو نشاستہ، پروٹین یا لحمیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو دالوں وغیرہ سے بھی حاصل ہوتے ہیں۔ الغرض! بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے مَن کے دانے مہیا کر کے ان کی یہ ضرورت، پوری کر دی۔

حضور علیہ السلام نے اپنے ایک ارشاد میں عجوہ نامی کھجور اور مَن کی تعریف فرمائی ہے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے[۱] اَلْعَجْوَۃُ مِنَ الْجَنَّۃِ وَفِیْھَا شِفَاءٌ مِّنَ السَّمِّ۔ عجوہ جنت کی کھجور ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے زہر اور سحر کا علاج رکھا ہے۔ اسی طرح فرمایا[۲] اَلْکُمْأَۃُ مِنَ الْمَنِّ وَمَاءُ ھَا شِفَاءٌ لِّلْعَیْنِ یعنی کھنبیاں مَن میں سے ہیں اور ان کے پانی میں اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ یہ چھوٹی موٹی زرد و سفید کھنبیاں خودرو سبزی ہے۔ بڑی لذیذ چیز ہے۔ انسانی جسم کے لیے گوشت کا اثر رکھتی ہے۔ نہ ان کا کوئی بیج بوتا ہے۔ اور نہ ان کی کوئی حفاظت کرتا ہے۔ خود بخود اُگ آتی ہیں اور لوگوں کے کام آتی ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا

۱؎ ترمذی ص۳۰۲، ۲؎ بخاری ص۸۴۲ ج۲ مسلم ص۱۸۲ ج۲

ان کے پانی میں اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ اس کا پانی سُرمہ میں ملا کر لگایا جائے یا ویسے ہی سلائی اس کے پانی میں بھگو کر آنکھوں میں لگائی جائے۔ تو آنکھوں کی کئی بیماریوں کے لیے شفا کا حکم رکھتی ہے فرمایا یہ کھمبیاں منّ ہی کی ایک قسم ہیں۔ تو اللہ تعالےٰ نے ترنجبین کی قسم کے اس مادہ کو بنی اسرائیل کے لیے خوراک کا ذریعہ بنایا۔

سلویٰ سلوان کے مادہ ہے۔ یہ بٹیر کی قسم کا جانور تھا۔ ہر ہفتے ان جانوروں کے غول کے غول دریائے سوئز کی طرف سے اُڑ کر آتے تھے۔ اور بنی اسرائیل کے خیموں کے قریب آکر بیٹھ جاتے تھے۔ جنہیں وہ آسانی سے پکڑ لیتے تھے۔ انہیں پکڑنے کے لیے دوسرے شکار کی طرح ان کو محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ بلکہ جونہی ذرا اندھیرا ہوتا تھا۔ بنی اسرائیل ان جانوروں کو آسانی کے ساتھ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق پکڑ لیتے تھے۔ پھر اُن کو ذبح کر کے اُن کا گوشت پکاتے تھے۔ اور کباب بناتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نہایت اعلیٰ درجے کی خوراک مہیا کی تھی۔

اپنے آپ پر ظلم

بادل کے سائے اور خوراک کی بہم رسانی کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک اور نعمت عطا کی تھی۔ تفسیری روایتوں میں آتا ہے[۱]۔ کہ ایک بہت بڑا ستون نما راڈ تھا۔ جس سے بنی اسرائیل روشنی حاصل کرتے تھے۔ رات کے وقت یہ راڈ چمک اٹھتا تھا۔ جس سے اس قدر روشنی میسّر آجاتی تھی۔ جو بنی اسرائیل کی ضروریات کے لیے کافی تھی۔

فرمایا كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ط اے بنی اسرائیل کھاؤ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو رزق دی ہیں وَمَا ظَلَمُوْنَا اور انہوں نے ہم پہ کوئی زیادتی نہیں کی وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ بلکہ انہوں نے اپنی ہی جانوں پہ ظلم کیا۔ بنی اسرائیل کو حکم یہ تھا۔ کہ کھانے پینے کی جو چیزیں ہم نے عطا کی ہیں۔ انہیں خوب کھاؤ پیو۔ مگر ان کا ذخیرہ نہ کرو۔ لیکن انہوں نے ذخیرہ کرنا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گوشت گلنے سڑنے لگا۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے[۲] لَوْلَا بَنُوْٓ اِسْرَآئِيْلَ یعنی اگر بنی اسرائیل ذخیرہ اندوزی کا ارتکاب نہ کرتے تو گوشت کبھی نہ گلتا سڑتا۔ خواہ مہینوں پڑا رہتا۔ مگر ان کی اس نافرمانی کی وجہ سے گوشت سڑنے لگا۔ اس

---

[۱] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۵۰ پارہ ۱، [۲] بخاری ص ۴۶۹ ج ۱، مسلم ص ۴۷۵ ج ۱

طرح گویا انہوں نے خود اپنا نقصان کیا، ہم پر کوئی ظلم نہ کیا۔ بلکہ خود اپنی جانوں پر ظلم کے مرتکب ہوئے
اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر بڑے انعام کئے۔ ان کی نافرمانی اور معصیت کی وجہ سے
طرح طرح کی آزمائشیں بھی آتی تھیں۔ اس کے باوجود یہ لوگ سرکشی میں مبتلا ہوئے۔ جہاد کا انکار
کیا۔ نبی کی تکذیب کی۔ اس کو ستایا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کی خوراک کا غیر معمولی انتظام
فرمایا۔ پانی کی ضرورت پیش آئی تو جیسا کہ آگے آئے گا وہ بھی مہیا فرمایا۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ
شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ
نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾
فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ
فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا
كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع ۶

ترجمہ: اس وقت کو یاد کرو جب کہ ہم نے کہا داخل ہو جاؤ اس بستی میں اور کھاؤ اس میں سے جہاں بھی تم چاہو کشادگی سے۔ اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے۔ اور کہو بخشش۔ ہم بخش دیں گے تمہاری غلطیوں کو۔ اور زیادہ دیں گے ہم نیکی کرنے والوں کو ﴿۵۸﴾ پس تبدیل کر لیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا بات کو۔ سوائے اس کے جو ان کو کہی گئی تھی۔ پس نازل کیا ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا عذاب آسمان کی طرف سے۔ اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿۵۹﴾

ربط آیات

جس طرح ابتدائے رکوع میں بنی اسرائیل سے خطاب تھا۔ "يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ" اسی طرح ان آیات کے مخاطب بھی بنی اسرائیل ہی ہیں۔ جہاں اس قوم پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا تذکرہ ہو رہا ہے اس کے ساتھ ساتھ بنی اسرائیل کے تمرد، سرکشی اور نافرمانی کا حال بھی بیان ہو رہا ہے۔ انعامات میں سے فرعون کی غلامی سے آزادی، کتاب تورات کا حصول اور من وسلوی کا ذکر ہوا۔ پھر ان کی نافرمانی کا ذکر ہوا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بے ادبی کی۔ جس پر انہیں سزا بھی ملی۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے معاف بھی کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم جہاد کی تیاری کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں شام وفلسطین کا وہ علاقہ واپس دلا دیں گے۔ جو تمہارے آباؤ اجداد کا مسکن رہا ہے۔ مگر بنی اسرائیل

نے انکار کر دیا۔ کہنے لگے۔ وہاں پر بڑے سخت لوگ ہیں۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ البتہ اگر وہ خود بخود اس بستی سے نکل جائیں، تو ہم وہاں جانے کو تیار ہیں۔ اس کی مکمل تفصیلات تو سورۃ مائدہ میں ہیں۔ تاہم کچھ باتیں سورۃ بقرہ میں بھی آرہی ہیں۔ ان کی نافرمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل چالیس سال تک تیہہ کے بیابان میں سرگرداں پھرتے رہے۔

بستی میں داخلہ

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے تمرّد اور سرکشی کا حال بیان فرما کر دوسرے لوگوں کو متنبہ کر دیا ہے۔ کہ سرکشی کا نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت آتی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ بنی اسرائیل کو من وسلویٰ کھاتے ہوئے کئی سال گزر گئے۔ بعض روایات[1] میں اٹھارہ سال کا ذکر آتا ہے۔ تو انہوں نے بعض دوسری چیزوں کا مطالبہ شروع کر دیا۔ جس کا ذکر اگلے رکوع میں آئے گا۔ کہ ہم ایک ہی طرح کا کھانا کھا کر تنگ آ گئے ہیں۔ من وسلویٰ کی بجائے سبزیاں اور دال وغیرہ کھانے کو جی چاہتا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اگر تم ایسا ہی چاہتے ہو۔ تو اس بستی میں چلے جاؤ۔ وہاں پر یہ چیزیں تمہیں میسر آجائیں گی۔

وہ کون سی بستی تھی۔ جس میں بنی اسرائیل کو داخلے کا حکم ہوا تھا۔ اس کے متعلق مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ بعض مفسرین[2] اسے بیت المقدس سے منسوب کرتے ہیں۔ مگر یہ درست نہیں۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے۔ کہ وہ اریحا نامی بستی تھی[3]۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس بستی کے لوگوں سے جہاد کرو۔ تو اللہ تعالیٰ غلبہ عطا کرے گا۔

اس معاملہ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کہ مذکورہ بستی میں داخلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں واقع ہوا یا ان کے بعد۔ تاہم صحیح بات یہی ہے۔ کہ وہ بستی موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد فتح ہوئی۔ حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کی نئی نسل جہاد پر آمادہ ہوئی۔ تو انہیں شام اور فلسطین پر غلبہ حاصل ہوا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ من وسلویٰ کی بجائے دوسری خوراک کی طلب ہے۔ تو اس اریحا نامی بستی میں داخل ہو جاؤ۔ وہاں تمہیں تمہاری مطلوبہ چیزیں میسر آئیں گی۔

---

[1] ... [2] تفسیر ابن کثیر ص ۹۸ ج ۱ [3] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۵۲ پارہ ۱

ف۱۱: وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ اور اس وقت کو یاد کرو۔ جب اے بنی اسرائیل! ہم نے کہا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ۔ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا کھاؤ اس میں کھلے طور پہ وسعت کے ساتھ۔ تمہیں اس معاملہ میں کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔ ہاں یہ بات یاد رکھو۔ کہ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا اور اس بستی کے دروازے میں داخل ہو سجدہ کرتے ہوئے

سجدہ شکر

بستی میں داخل ہوتے وقت سجدہ کرنے سے مراد سجدہ شکر ادا کرنا تھا۔ مقصد یہ تھا۔ کہ اللہ تعالے نے تمہیں فتح عطا کی ہے۔ اس بستی کا قبضہ دلایا ہے۔ تو اس کے بدلے غرور و تکبر نہ کرنا بلکہ عاجزی اور انکساری کرتے ہوئے سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہونا۔ ایسا کرنا انبیاء علیہم السلام کا عمل اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں اور ایمان والوں کا شیوہ ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے[1]۔ کہ جب مکہ معظمہ فتح ہوا۔ تو حضور علیہ السلام اونٹنی پہ سوار تھے۔ اور داخلے کے وقت آپ سر کو جھکائے ہوئے تھے۔ آپ اکڑ کر داخل نہیں ہوئے۔ بلکہ نہایت عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہوئے۔ پھر آپ نے غسل فرمایا اور آٹھ رکعت نماز ادا کی۔ یہ چاشت کا وقت تھا۔ اسی طرح جب حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے ایران کا پایہ تخت مدائن فتح کیا۔ اور آپ نے اس قلعہ میں جاکر آٹھ رکعت نماز ادا کی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر تھا۔ جو فتح و کامیابی پر پیش کیا گیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو بھی یہی حکم تھا۔ کہ جب فتح حاصل ہو جائے۔ اور اس بستی میں داخل ہونے لگو تو نخوت و تکبر کی بجائے عاجزی دکھاتے ہوئے اور سجدہ شکر بجالاتے ہوئے داخل ہو۔ کیونکہ یہ آسمانی تعلیمات کا اہم اصول ہے۔

معرکہ بدر میں بڑے بڑے کفار مارے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فتح دی تو اہل ایمان نے شکرانہ کے طور پر دو نفل پڑھے۔ اور اس بات پہ اللہ رب العزت کا شکریہ ادا کیا۔ کہ اس نے اہلِ ایمان کو ظالموں سے نجات دلائی۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بحرِ قلزم سے باہر نکالا اور لشکر فرعون کو غرق کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے بھی سجدہ شکر ادا کیا۔ کیونکہ یہ ایمان والوں کا شیوہ ہے کہ جب کوئی نعمت ملے تو سجدہ شکر بجالاتے ہیں شریعت محمدیہ میں سجدہ شکر کی بجا آوری نہایت مستحسن فعل ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں[2]۔ کہ سجدہ شکر ادا کرنے کے لیے دو رکعت نماز

[1] مستدرک حاکم ج۳ ص۴۷، سیرت ابن ہشام ج۲ ص۴۰۵ [2] حاشیہ مشکوٰۃ ص۱۳۱ بحوالہ لمعات

نفل ادا کرنی چاہیئے۔ تاہم صرف سجدہ کر لینا بھی درست ہے۔

استغفار کی برکات

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دو احکام دیئے تھے۔ ایک تو یہ کہ اس بستی میں سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہوں۔ اور دوسرا یہ کہ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ اور زبان سے یوں کہیں کہ اے اللہ! ہماری غلطیوں کو معاف فرما دے۔ حطہ کا لفظی معنیٰ گرا دینا ہے۔ ہماری خطاؤں کو گرا دے۔ لفظ حطۃ دراصل اُحْطُطْ عَنَّا حَطًّا کا مخفف ہے۔ یعنی ہماری غلطیوں، کوتاہیوں اور خطاؤں کو مٹا دے معاف کر دے یا درگذر فرما۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو سجدہ اور استغفار کی تلقین کی۔ اور فرمایا کہ اگر تم اپنی خواہش کے مطابق خوراک حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تو ان دو شرائط کے ساتھ بستی اریحا میں داخل ہو جاؤ۔

بزرگ فرماتے ہیں[1] کہ ہر چیز کی کوئی ابتداء ہوتی ہے، وَاَوَّلُ الْخَیْرِ الْاِسْتِغْفَارُ اور خیر کی ابتداء استغفار سے ہوتی ہے۔ یعنی انسان اپنی غلطیوں کی معافی طلب کرے۔ ابن ماجہ اور ترمذی شریف کی حدیث میں آتا ہے[2] وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ ہر شخص خطا کار ہے غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں مگر بہترین خطا کار وہ ہیں، جو توبہ کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے[3] کہ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ گناہ سے توبہ کر لینے والا ایسا ہی ہے جیسا اس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔

فرمایا جب تم استغفار کر لو گے۔ مجھ سے معافی مانگ لو گے۔ تو پھر میں اس کا صلہ یہ دوں گا، کہ نَغْفِرْ لَکُمْ خَطٰیٰکُمْ ہم تمہاری خطاؤں اور لغزشوں کو بخش دیں گے۔ معاف کر دیں گے۔ اور صرف معاف ہی نہیں کریں گے بلکہ وَسَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ نیکو کاروں کو مزید اجر عطا فرمائیں گے۔

حکم خداوندی میں تبدیلی

بنی اسرائیل کی طبیعتوں میں تمرد اور سرکشی گھر کر چکی تھی وہ معمولی سے معمولی حکم بھی ماننے کو تیار نہ تھے۔ جس کا انجام یہ ہوا، کہ فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا پس تبدیل کر دی ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ وہ بات جو انہیں کہی گئی تھی۔ یعنی انہیں حکم تو یہ تھا

---

[1] [2] ابن ماجہ صـ۳۱۳ [3] ابن ماجہ صـ۳۱۳

کہ سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے جائیں۔ وہ اکڑتے ہوئے اور چوتڑ گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے۔ اسی طرح حکم یہ تھا۔ کہ زبان سے استغفار کرتے ہوئے داخل ہوں۔ مگر انہوں نے لفظ حِطَّةٌ کی بجائے حِنطَةٌ کہنا شروع کر دیا۔[1] کہنا تو یہ چاہیئے تھا۔ کہ اے اللہ ہمیں معاف کر دے حِطَّةٌ مگر انہوں نے کہا حَبَّةٌ فِی شَعْرَةٍ یعنی ہمیں تو خوشے کے اندر گندم چاہیئے۔ ایسی ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کہنے لگے۔ جو کہ حد درجے کی بے ادبی، گستاخی اور سرکشی تھی۔

یہاں پر لفظ ظَلَمُوا کہہ کر اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ کہ احکام کو تبدیل کرنے والے سارے کے سارے بنی اسرائیل نہیں تھے۔ بلکہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ظلم کیا۔ جس طرح بچھڑے کی پوجا کرنے والے بھی ـــــ سارے کے سارے لوگ نہیں تھے۔ اسی طرح احکام میں تبدیلی کے مرتکب بھی کچھ لوگ تھے۔ چنانچہ آگے ان کی سزا کا ذکر بھی آتا ہے۔ انہوں نے خدا تعالیٰ کی نص میں تبدیلی کی جو کہ بہت بڑی بات ہے۔ انہیں تو اتباع کرنا چاہیئے تھا۔ انسان مامور ہے۔ لہٰذا اسے اللہ تعالیٰ کے ہر فرمان پر سر تسلیم خم کر لینا چاہیئے۔ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جو کوئی بھی احکام خداوندی میں تغیر و تبدل کا باعث بنے گا۔ وہ ذلت و رسوائی میں مبتلا ہوگا۔

عائلی قوانین اور حق شفعہ

اسلامی اصولوں میں تغیر و تبدل ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے۔ اس دور میں ہمارے ہاں بھی بعض تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ جنرل ایوب خان کے زمانے میں عائلی قوانین نافذ ہوئے۔ علمائے کرام نے ہر چند احتجاج کیا۔ کہ اس کی بعض شقیں قرآن و سنت کے خلاف ہیں۔ مگر حکومت کے سر پہ جوں تک نہ رینگی۔ یہ قوانین آج تک نافذ چلے آ رہے ہیں۔ اسی طرح حق شفعہ کا قانون بنایا گیا۔ احادیث کی رو سے شفعہ صرف تین قسم کے لوگوں کے لیے روا ہے۔ یعنی شفعہ کا وہ شخص حقدار ہے جو یا تو جائیداد کی ملکیت میں شریک ہو یا حق میں شریک ہو یا پڑوسی ہو۔ مگر اب دو قسمیں اور بھی ملا لی گئی ہیں۔ حالانکہ امام شافعیؒ تو پڑوسی کے حق کے بھی قائل نہیں۔[2] مگر اس زمانے میں مزارع اور بائع کے لڑکے وغیرہ کو بھی حق شفعہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ خدائی قانون میں ترمیم نہیں تو اور کیا ہے

---

[1] بخاری ص ۶۴۳ ج ۲، مسلم ص ۴۱۹ ج ۲، معالم التنزیل ص ۲۹ ج ۱، روح المعانی ص ۲۶۶ ج ۱، ابن کثیر ص ۹۹ ج ۱

[2] ہدایہ اخیرین ص ۳۲۸ کتاب الشفعہ

وراثت میں لڑکی کا حصہ

لڑکیوں کی وراثت سے محرومی بھی خدائی احکام میں تبدیلی کے مترادف ہے۔ اللہ تعالےٰ نے لڑکوں اور لڑکیوں ہر دو کو وراثت میں حصہ دیا ہے۔ مگر ہمارے ہاں اس میں بھی ردّ و بدل ہوا ہے۔ لڑکیوں کی وراثت کے اکثر لوگ قائل نہیں۔ اس ملک میں انگریز آیا۔ تو اس نے خود لوگوں سے پوچھا کہ تم اپنے معاملات کو شریعت کی رو سے نپٹانا چاہتے ہو۔ یا رواج کے مطابق۔ تو بعض اضلاع کے لوگوں نے رواج کے مطابق تقسیم کو قبول کیا۔ چنانچہ یہ قانون آج تک موجود ہے کہ وراثت کی تقسیم رواج کے مطابق کی جاتی ہے۔ جس سے لڑکی محروم ہو جاتی ہے۔

صوبہ سرحد میں یہ قانون ڈاکٹر خان کی وزارت میں نافذ ہوا۔ مال کا سارا عملہ اس قانون کا پابند تھا۔ افسر مال، تحصیلدار، پٹواری وغیرہ اسی کے مطابق انتقال چڑھاتے تھے۔ مشہور ہے۔ کہ وہاں پہ ایک شخص کا چھ مربع میل پہاڑی رقبہ تھا۔ اس نے ساری جائیداد دو لڑکوں کے نام ہبہ کر کے لڑکیوں کو محروم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے دنیا پر ہی یہ سزا دی کہ لقوے کی بیماری میں مبتلا ہوا وہ جب تک زندہ رہا اس کا منہ ٹیڑھا رہا۔ دونوں لڑکے بھی آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ ایک نے دوسرے پر گولی چلا دی اور اس کا بازو کٹ گیا۔ اس طرح گویا اس شخص کو اسلامی قانون کی خلاف ورزی کر کے سکھ نصیب نہ ہو سکا۔

ظالموں کا حشر

بہرحال خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں ردّ و بدل بہت بُری بات ہے اور قابلِ عذاب ہے۔ مگر بنی اسرائیل کے بعض ظالم لوگوں نے اس بات کو بدل دیا جو انہیں کہی گئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا جن لوگوں نے ظلم کیا، ہم نے ان پر نازل کیا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ آسمان سے عذاب۔ مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں[1]۔ کہ اللہ تعالےٰ نے طاعون کی بیماری کی صورت میں عذاب نازل کیا۔ صرف ایک دن میں چوبیس ہزار اشخاص لقمہ اجل ہوئے۔ اور کل ستر ہزار آدمی اس عذاب میں مبتلا ہو کر اپنے انجام کو پہنچے، دو چار دن کے اندر اس بیماری نے اپنا کام کیا اور بنی اسرائیل کا صفایا ہو گیا۔ فرمایا اس کی وجہ یہ تھی کہ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ وہ لوگ فسق کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام کی نافرمانی کرتے تھے۔ لہٰذا

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۵۸ پارہ ۱، تفسیر ابو السعود جلد ۱ صفحہ ۸۳، روح المعانی جلد ۱ صفحہ ۲۶۷

اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دی۔ اگر آج بھی کوئی اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کا مرتکب ہوگا۔ تو وہ خدا تعالیٰ کے عذاب کی زد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ مہلت دے دے تو یہ اس کی حکمت ہے۔ ورنہ اس کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

زمین کی آبادی اور بربادی

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ اللہ تعالیٰ کی زمین کی آبادی نیکی اور اطاعت سے ہوتی ہے اور مخلوق کی برائیوں کی وجہ سے اس کی بربادی ہوتی ہے۔ فسق و فجور کو آپ بیشک ترقی کا نام دیں مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ کھیل تماشہ، لہو و لعب، بدکاری، فحاشی، زنا، سود خواری وغیرہ سب بگاڑ کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہ زمین میں فساد پھیلانا ہے۔ آبادی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ کیونکہ زمین کی آبادی تو بہر حال نیکی اور خدا تعالیٰ کی اطاعت سے ہوگی۔ جس قدر سکھ چین نصیب ہوگا اسی قدر آبادی ہوگی۔ جس قدر گناہوں میں اضافہ ہوگا۔ اتنی ہی بے چینی بڑھے گی۔ لوگ اضطراب اور طرح طرح کے مسائل کا شکار ہوں گے۔ لہذا معلوم ہوا۔ کہ نافرمانی بہت بُری چیز ہے۔ اس سے بچنا چاہیئے۔ ان آیات میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ہم سب کے لیے تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ کہ نیکی اور بدی میں تمیز کریں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں، نافرمانی سے پرہیز کریں۔

---

[1] تفسیر بیضاوی ص ۲۲/۱۶

وَاِذِ اسۡتَسۡقٰی مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖ فَقُلۡنَا اضۡرِبۡ بِّعَصَاکَ الۡحَجَرَ ؕ فَانۡفَجَرَتۡ مِنۡہُ اثۡنَتَا عَشۡرَۃَ عَیۡنًا ؕ قَدۡ عَلِمَ کُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَہُمۡ ؕ کُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ اللّٰہِ وَلَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ ﴿۶۰﴾

ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ پس ہم نے کہا۔ کہ اپنی لاٹھی کے ساتھ پتھر کو مارو۔ پس اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ تحقیق جان لیا سب لوگوں نے اپنا اپنا گھاٹ۔ اللہ کی دی ہوئی روزی سے کھاؤ اور پیئو اور نہ زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ چلو ﴿۶۰﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اُن انعامات کا ذکر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر کیے۔ منجملہ ان کے دشمن سے رہائی اور ذلت ناک عذاب اور غلامی سے نجات کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کو ایک عظیم الشان کتاب عطا فرمائی۔ صحرائے سینا میں دھوپ سے بچاؤ کے لیے سر پہ بادل کا سایہ کیا۔ خوراک کے لیے منّ اور سلویٰ فراہم کیا۔ جب بنی اسرائیل نے سبزی اور ترکاری کا مطالبہ کیا۔ تو انہیں ایک دوسری بستی میں اترنے کا حکم دیا جہاں ہر چیز میسّر تھی۔ مگر ساتھ یہ نصیحت بھی کر دی کہ اس بستی میں سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتے ہوئے داخل ہونا۔ مگر بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کو تبدیل کر دیا۔ سجدہ شکر ادا کرنے کی بجائے اکڑ کر بستی میں داخل ہوئے۔ اور زبان سے استغفار کرنے کی بجائے بعض بیہودہ باتیں کہتے ہوئے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی اور تمرّد کی یہ سزا دی کہ آسمان سے طاعون کی صورت میں عذاب نازل ہوا، ہزاروں کی تعداد میں بنی اسرائیل ہلاک ہوئے۔ وجہ یہ تھی۔ کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ انہوں نے صحرائے سینا میں اللہ تعالےٰ کی یاد سے غفلت اور موسیٰ علیہ السلام کی بات کو ٹھکرا دیا۔

بنو اسرائیل کا طلب آب

توراۃ اور بعض اسرائیلی روایتوں میں ذکر آتا ہے[۱] کہ بنی اسرائیل وادی سکات کے قریب

[۱] تفسیر حقانی ص ۱۶۹ ج ۱

ایک مقام پر تھے۔ اسے قادس کی بستی بھی کہتے ہیں۔ یہ علاقہ کچھ پہاڑی ہے۔ اور کچھ صحرا ہے پانی نایاب ہے۔ اس مقام پر بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے پانی کا مطالبہ کیا۔ کہنے لگے ہمارے پاس پانی کا ایک قطرہ تک نہیں۔ حلق خشک ہو رہے ہیں۔ اے موسیٰ (علیہ السلام) ہمارے لیے پانی کا بندوبست کرو۔ اس معاملے میں وہ موسیٰ علیہ السلام سے اس قدر بدتمیزی سے پیش آئے کہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ رب العزت میں ان الفاظ کے ساتھ دعا کا آغاز کیا کہ اے مولیٰ کریم! بنی اسرائیل میرے ساتھ اس قدر سختی سے پیش آ رہے ہیں کہ مجھے سنگسار کرنے کے درپے ہیں۔ لہٰذا تو ہی ان کے لیے پانی کا انتظام فرما۔ آیت زیرِ درس میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

استسقاء کی حقیقت

وَاِذِ اسۡتَسۡقٰی مُوۡسٰی لِقَوۡمِهٖ اس واقعہ کو یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ استسقیٰ کا لفظی معنیٰ طلب آب ہے۔ اور اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑانا استغفار کرنا اور معافی مانگنا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات میں ملتا ہے، کہ قحط سالی کے دوران انہوں نے اپنی اپنی قوم سے کہا تھا " یٰقَوۡمِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ " اے قوم اپنے رب سے استغفار کرو اور توبہ کرو، " يُرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَيۡكُمۡ مِّدۡرَارًا " تاکہ وہ تمہارے لیے آسمان سے پانی برسائے۔ جب کبھی دنیا خشک سالی کا شکار ہو جائے۔ زمین، باغات، انسانوں، حیوانوں کے لیے پانی کی قلت پیدا ہو جائے۔ تو فراہمی آب کے لیے کئی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ منجملہ ان تدابیر کے شریعت نے استغفار کو بڑی اہمیت دی ہے۔ کہ انسان اپنے رب تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ صدقہ خیرات کریں۔ جسکے نتیجے میں اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برسائے گا۔ بارانِ رحمت نازل کرے گا اور خشک سالی دور ہو جائے گی۔ غرضیکہ استسقیٰ کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے رو رو کر گناہوں کی معافی طلب کی جائے۔

استسقاء کا طریقہ

فقہاء کرام میں سے امام ابوحنیفہؒ کو باقی تمام فقہاء پر فوقیت حاصل ہے۔ فقاہت و اجتہاد میں کوئی بھی آپ کا ہم پلہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی گہری بصیرت عطا فرمائی تھی۔ انہوں نے دین کی ایسی زبردست خدمت کی ہے۔ جو آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہے گی۔ آپ نے دین کا نچوڑ اور خلاصہ اس طریقے پر پیش کیا کہ تمام عجمی قومیں اسے بخوشی قبول کر

گیئں۔ امت پر آپ کا بڑا احسان ہے۔ جس طرح محدثین کرام نے احادیث کے الفاظ کی حفاظت کی مفسرین کرام نے قرآن پاک کی تشریح بیان کی۔ اسی طرح فقہائے کرام نے اجتہاد کے ذریعے ضروری مسائل کا استنباط کیا۔ اور مشکلات کے حل پیش کیے۔ انہوں نے دین اسلام کو احسن طریقے پر امت کے سامنے پیش کیا۔ راستے میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کیا۔

امام صاحبؒ فرماتے ہیں[1] کہ استسقا کی حقیقت یہی ہے۔ کہ انسان اپنے گناہوں کی معافی طلب کرے۔ اس کے لیے نماز پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ تاہم استسقا کے عام طور پر دو طریقے ہیں۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ پہلا طریقہ یہ ہے[2] کہ مسلمان بستی سے باہر کھلے میدان میں نکل جائیں۔ اور دو رکعت نماز ادا کریں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں[3] کہ استسقا کے لیے صرف مومن اکٹھے ہوں۔ کسی کافر کو قریب نہ آنے دیں۔ پھر عاجزی اور انکساری کے ساتھ دو نفل ادا کریں۔ اس کے بعد دعا کریں اللہ تعالیٰ بارانِ رحمت نازل کرے گا۔ اور خشک سالی دور ہو جائے گی،

دوسرا طریقہ بھی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے[4]۔ آپ منبر پر تشریف فرما تھے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ کہ ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ حضور! جانور ہلاک ہو رہے ہیں۔ فصلیں تباہ ہو گئیں۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ پانی برسائے۔ آپ نے منبر پر بیٹھے بیٹھے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ اس وقت آسمان بالکل صاف تھا۔ بادل کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ آپ دعا فرما رہے تھے۔ کہ کسی کنارے سے بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بادل پھیل گیا۔ اور یکایک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ایک تیسرا طریقہ بھی ہے کہ کسی بھی نماز کے بعد بارش کے لیے دعا کی جائے۔ استسقا کی یہ مختلف صورتیں ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی صورت اپنائی جا سکتی ہے۔

بہر حال موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ ساری قوم سخت پریشانی کے عالم میں تھی۔ وہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئے۔ مگر آپ دعا میں مصروف ہو ضربِ کلیمی

---

[1] ہدایہ اولین ص۱۲۱ ، [2] بخاری ص ۱۳۷/۱ج، مسلم ص ۲۹۳/۱ج ،

[3] ہدایہ اولین ص۱۲۱ر۱۲۲ [4] بخاری ص ۱۳۷/۱ج، مسلم ص ۲۹۳/۱ج

گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور حکم دیا فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ یعنی اپنی لاٹھی اس پتھر پہ مارو۔ موسیٰ علیہ السلام نے حکم کی تعمیل کی۔ جونہی لاٹھی پتھر پہ ماری فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے پانی کا انتظام فرما دیا۔

اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کہ وہ کون سا پتھر تھا جس پہ لاٹھی ملنے سے پانی جاری ہو گیا تھا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں[1]۔ کہ وہ پتھر موسیٰ علیہ السلام کے تھیلے میں موجود تھا۔ تفسیری روایات کے مطابق یہ پتھر حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعے دنیا میں آیا تھا۔ اور نسلاً بعد نسلٍ موسیٰ علیہ السلام تک پہنچا۔ تاہم کسی صحیح روایت سے ایسا ثابت نہیں ہے۔ بخاری اور مسلم شریف[2] کی بعض روایات سے موسیٰ علیہ السلام کے ایک دوسرے واقعہ کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ کہ اس زمانے میں بنی اسرائیل کے لوگ پردے کا خاص خیال نہیں کرتے تھے، نہاتے وقت بھی ایک دوسرے کے سامنے کپڑے اتار کر نہانا شروع کر دیتے تھے۔ برخلاف اس کے حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے حیادار تھے۔ غسل کرتے وقت ستر پوشی کا خاص خیال رکھتے اور پردے میں نہاتے۔ دین کا اصول بھی یہی ہے۔ کہ بول و براز یا غسل کرتے وقت دوسرے شخص کی نظر نہیں پڑنی چاہیئے۔ ایسے اوقات میں پردہ واجب ہے۔ مگر بنی اسرائیل الٹی ذہنیت کے مالک تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کو پردے میں غسل کرتے دیکھا تو سمجھا کہ ان کے جسم میں کوئی عیب ہے جسے چھپانا چاہتے ہیں۔ بعض نے کہا۔ کہ آپ کو اُدرہ کی بیماری لاحق ہے۔ جس میں خصیے پھول جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت ایک روز ایسا واقعہ پیش آیا۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کسی بڑے پتھر کی اوٹ میں اس پتھر پہ کپڑے رکھ کر پردے میں غسل فرما رہے تھے۔ کہ وہ پتھر آپ کے کپڑوں سمیت بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ نے یہ ماجرا دیکھا تو سخت پریشان ہوئے ثَوْبِي حَجَرُ۔ ثَوْبِي حَجَرُ یعنی پتھر میرے کپڑے، پتھر میرے کپڑے کہتے ہوئے۔ پتھر کے پیچھے بھاگے

---

[1] معالم التنزیل ص ۲۹ ج ۱، ابن کثیر ص ۱۰۱ ج ۱، تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۶۰ پارہ ۱۔

[2] بخاری ص ۴۸۳ ج ۱، مسلم ص ۱۵۴ ج ۱، معالم التنزیل ص ۲۹ ج ۱

اور اسی حالت میں اپنی قوم کے پاس پہنچ گئے۔ لوگوں نے آپ کو برہنہ حالت میں دیکھا مگر جسم میں کوئی عیب نہ پایا تو کہنے لگے مَا بِمُوسیٰ مِنْ بَأْسٍ یعنی موسیٰ علیہ السلام کو تو کوئی بیماری لاحق نہیں۔ ہم تو غلط سمجھ رہے تھے۔ بہر حال جب موسیٰ علیہ السلام اس بھاگتے ہوئے پتھر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو اپنی جلالی طبیعت کے مطابق اُس پتھر کو اپنے ڈنڈے سے خوب پیٹا۔ جس کی وجہ سے اُس پتھر پر لاٹھی کے پانچ۔ سات نشان پڑ گئے۔ تفسیری روایات میں آتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یہ بڑا مبارک پتھر ہے[۱]۔ ایک طرف اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ کہ کپڑے لے کر بھاگ نکلا اور دوسری طرف موسیٰ علیہ السلام کے ادب کو بھی ملحوظ رکھا۔ یعنی اتنا نرم ہو گیا کہ اس پہ لاٹھی کے نشان پڑ گئے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا۔ کہ اس پتھر کو اپنے پاس رکھ لو۔ اس میں بڑی حکمت ہے۔ کہتے ہیں۔ یہ وہی پتھر تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تھیلے میں تھا۔ اور جب بنی اسرائیل نے پانی طلب کیا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالےٰ کے حکم سے اسی پتھر پہ لاٹھی ماری اور بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ بہر حال یہ تفسیری روایات ہیں کسی آیت یا صحیح حدیث سے ثابت نہیں

بعض تاریخی روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے[۲]۔ کہ وادی عربیہ میں جو پہاڑی سلسلہ اور چٹانیں ہیں۔ وہیں زمین پہ پڑی ہوئی ایک چٹان پہ موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی ماری تھی۔ اور اس میں سے پانی برآمد ہوا تھا۔ مؤرخین کا بیان ہے[۳]۔ کہ اس پتھر میں اب پانی تو نہیں ہے۔ مگر پانی کے نکلنے کے نشانات اب تک موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان سوراخوں سے کسی وقت پانی نکلتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ پانی بنی اسرائیل کی ضرورت پوری کرنے کے لیے نکالا تھا۔ جب وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ پانی کی ضرورت باقی نہ رہی۔ تو وہ بھی ختم ہو گیا۔

پانی کی تقسیم

پانی کے بارہ چشمے پھوٹنے کی حکمت یہ تھی۔ کہ بنی اسرائیل بارہ قبیلوں پر مشتمل تھے۔ ان کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان کے آپس کے کسی متوقع جھگڑے کے پیش نظر اللہ تعالےٰ

---

[۱] مظہری ص ۷۵ ج ۱، تفسیر عزیزی ص ۲۶ پارہ ۱، [۲] تفسیر حقانی ص ۱۵۴ ج ۲

[۳] قصص القرآن ص ۴۴۶ ج ۱

سے آئے ہر قبیلے کے لیے علیحدہ علیحدہ چشمہ مقرر کر دیا۔ چشموں کا تعین ہر قبیلے کی تعداد کے لحاظ سے کیا گیا تھا۔ بڑے قبیلے کے لیے بڑا چشمہ مقرر ہوا۔ اور چھوٹے قبیلے کے لیے چھوٹا چشمہ۔ اس طرح گویا پانی تقسیم کر دیا گیا۔ فرمایا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ہر ایک نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کر لیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہر قبیلے میں ایک ایک چشمہ تقسیم کر دیا۔ ہر قبیلے نے اپنی ضرورت کے مطابق نالیاں کھود لیں۔ اور پانی کو دور تک لے گئے۔

اس تقسیم سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے۔ کہ مشترکہ مفاد کی اشیا کی تقسیم عدل و انصاف پر ہونی چاہیئے۔ تاکہ کسی قسم کا تنازعہ پیدا نہ ہو۔ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی والے معاملہ میں بھی پانی تقسیم کیا گیا تھا۔ "لَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ" قوم صالح علیہ السلام سے فرمایا کہ پانی پینے کی ایک روز تمہاری باری ہوگی۔ اور ایک روز اونٹنی کی۔ قوم نے مقررہ حد سے تجاوز کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ساری قوم تباہ ہوگئی۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ پتھر سے پانی کیسے آیا۔ یہ خلاف عقل معلوم ہوتا ہے یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کی چیزوں کو اپنی ناقص عقل سے قیاس کرنا مناسب نہیں۔ ایسا کام ناقص العقل لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے سائنس دان، ریاضی دان، جغرافیہ دان سب کے سب ناقص العقل ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی حکمت یا تخلیق کی کوئی خبر نہیں۔ وہ تو محض اپنی دھن میں مگن رہتے ہیں۔

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ پتھر سے پانی نکلنا کون سی بعید العقل بات ہے۔ یہ تو عام مشاہدے کی بات ہے۔ مقناطیس بھی ایک پتھر ہی ہے۔ جو لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی تاثیر پیدا کر دی ہے۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کسی پتھر میں پانی کو اپنی طرف کھینچنے کی تاثیر پیدا کر دے۔ تو یہ کون سی ایسی بات ہے۔ جو عقل میں نہ آتی ہو۔ ہاں سرسید کو سمجھ میں نہ آسکی۔ پانی تو پتھر کے نیچے موجود تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پتھر کو ذرا سا ہلا دیا تو پانی کو دیکھا۔ سرسید بیچارہ تو نیچریت کا امام تھا۔ اور معجزات کا منکر تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ پانی کا اجرا محض اللہ تعالےٰ

---

[1] تفسیر بیضاوی صفحہ ۵۷/۱، تفسیر عزیزی صفحہ ۲۶۰ پارہ ۱

کے حکم سے ہوا۔ یہ معجزہ تھا۔ جو موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پہ ظاہر ہوا۔ بحیرہ قلزم میں کیا ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام ــــــــــــــ نے لاٹھی چلائی اور بارہ راستے بن گئے۔ پانی کناروں کے ساتھ منجمد ہوکر رہ گیا۔ وہاں لاٹھی مارنے کا حکم ہوا۔ تو پانی میں راستے بن گئے اور یہاں لاٹھی ماری تو خشک پتھر سے پانی کے چشمے پھوٹ پڑے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالےٰ کے حکم سے ہوا۔ پانی نکالنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ لاٹھی مارنا تمہارا کام ہے۔

معجزہ اور کرامت

نبی کا معجزہ ہو یا ولی کی کرامت ہو۔ اصل حکم تو اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ کام کرنے والی وہی ذات ہے۔ اسی مقام پر آکر لوگ ٹھوکر کھا جاتے۔ نبی کے معجزے یا ولی کی کرامت کو ان کا ذاتی فعل سمجھتے ہیں۔ اور شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو ان کا ذاتی فعل سمجھا۔ وہ شرک میں مبتلا ہو گئے۔ حالانکہ وہ تو بِاِذْنِ اللّٰہِ تھا۔ فرمایا وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ " میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور ابرص کو ٹھیک کرتا ہوں۔ اور مُردے میں جان ڈال دیتا ہوں۔ اسی طرح اولیاء اللہ کی جو کرامات صحیح طریقے سے ثابت ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ عزت بخشتے ہیں اس کے ہاتھ پر کرامت ظاہر ہو جاتی ہے اپنی مرضی سے تو کوئی نبی بھی معجزہ پیش نہیں کر سکتا۔ قرآن پاک میں تصریح موجود ہے۔ " وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ فعل تو اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ مگر نبی کے ہاتھ پر ظاہر کر دیا جاتا ہے۔

ہمارے ہادیٔ اعظم علیہ السلام کی زندگی میں بے شمار معجزات پیش آئے۔ پتھروں سے پانی نکلنا تو عام مشاہدہ کی بات ہے۔ جنگلوں اور پہاڑوں سے چشمے نکلتے ہیں۔ مگر ہمارے نبی رحمت علیہ السلام کا معجزہ ملاحظہ فرمایئے کہ ہاتھ کی انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں[1] کہ لشکر اسلامی جہاد کے لیے سفر پہ تھا۔ راستے میں پانی کی قلت پیدا ہو گئی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کسی کے پاس تھوڑا بہت پانی ہے تو پیش کیا جائے۔ چنانچہ ایک لوٹے میں تھوڑا سا پانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اس پانی سے وضو فرمایا

---

[1] بخاری صفحہ ۵۰۵ ج ۱، مسلم صفحہ ۲۴۵ ج ۲

پھر وہ پانی پیالے میں ڈال کر اپنا ہاتھ مبارک اس پیالے میں رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے انگلیوں مبارک کے نیچے سے پانی کا چشمہ جاری ہوگیا۔ آپ نے فرمایا یہ بابرکت پانی ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے نکالا ہے۔ آؤ پانی پی لو اور اس سے وضوء کرو۔ لوگوں نے پانی حاصل کیا۔ اس سے وضو کیا اس میں سے پیا اور دوسری ضروریات پوری کیں۔ جب سارا لشکر سیراب ہوگیا۔ تو آپ نے اپنا ہاتھ مبارک اٹھالیا اور پانی نکلنا بند ہوگیا۔ اسی لیے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح فرماتے ہیں[1]۔ کہ اللہ تعالیٰ نے دیگر انبیاء علیہم السلام کو جو معجزات عطا کیے وہ اس کا کمال ہے مگر جو معجزات حضور علیہ السلام کو عنایت کیے وہ کمالوں سے بھی بڑھ کر کمال ہے۔ معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہو یا ہمارے رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو۔ اصل میں کمال اللہ تعالیٰ کا ہی ہے۔

ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر

بنی اسرائیل کے کھانے کے لیے من وسلویٰ کا بندوبست ہوگیا۔ اور پینے کے لیے بارہ چشمے جاری ہوگئے تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِّزْقِ اللهِ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی سے کھاؤ اور پیو۔ بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ساری نوع انسانی کو یہ بات سمجھا دی گئی ہے کہ ہر قسم کی روزی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے۔ اسے کھاؤ اور پیو اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ شیخ سعدیؒ نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔[2]

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند — تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار — شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرمان نبری

فرماتے ہیں کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے گردش کر رہی ہیں۔ تاکہ تو روٹی کو ہاتھ میں لائے اور غفلت سے نہ کھائے۔ روٹی کھاتے وقت انسان کو غور کرنا چاہیئے کہ روٹی کا یہ ٹکڑا کتنے مراحل طے کر کے آپ کے ہاتھ میں پہنچتا ہے۔ کارخانہ قدرت میں لاکھوں مشینیں اور کروڑوں ہاتھ کام کر رہے ہیں۔ جب ایک روٹی اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہے، پانی کا ایک گلاس جو آپ کے ہونٹوں تک پہنچتا ہے۔ یہ کن کن مشقتوں سے گذر کر آتا ہے۔ اسی طرح لباس کی تیاری میں کتنی مشینیں، کتنا خام مال، کتنے انسانی دماغ اور ہاتھ کام کرتے ہیں۔ تب جا کر

---

[1]

[2] گلستانِ سعدی ص ۲

زینت اور ستر پوشی کے لیے کپڑا مہیا ہوتا ہے۔ یہ تمام چیزیں انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں کہ جس مالک الملک نے انسان کو اس قدر انعامات سے نوازا ہے۔ اس کی روزی استعمال کر کے کیا اس کا شکر یہ ادا کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ اسی لیے فرمایا کہ کس قدر ناانصافی کی بات ہوگی، اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں استعمال کرنے کے بعد اس کی فرمانبرداری نہ کرو۔

قرآن پاک میں دوسرے مقام پر آتا ہے " كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ " حلال اور طیب چیزیں کھاؤ جو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں " وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ " اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کے بندے ہو۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے۔ کہ ناداروں کو محروم نہ رکھو۔ تم سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے تم مالک ہو۔ مگر اس بات کی طرف غور نہیں کرتے کہ یہ نعمت آئی کہاں سے ہے۔ یہ کس کی عنایت ہے۔ یاد رکھو۔ اگر غریبوں مسکینوں اور محتاجوں کو محروم رکھو گے۔ ان کا حق ادا نہیں کرو گے تو یہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور مستحقین پر زیادتی ہوگی۔ ہر صاحب استطاعت کا فرض ہے۔ کہ وہ ناداروں کا خیال رکھے۔ اُسے دیکھنا چاہیئے۔ کہ سوسائٹی میں کوئی بھوکا یا ننگا نہ رہے۔ خاص طور پر سربراہان مملکت کا یہ منصبی ہے۔ کہ اپنے اپنے ملک میں حاجتمندوں کی خبر گیری کریں۔

ضیاء الدین برنی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ کہ بادشاہ یا حاکم حقیقت میں وہ ہے جس کی سلطنت میں کوئی شخص بھوکا ننگا نہ رہے۔ امور سلطنت اس طریقے پر سرانجام دینے چاہیئں کہ ہر شخص کو اس کی بنیادی ضروریات مہیا ہوں۔ بے شک اعلیٰ درجے کی ضروریات نہ بھی حاصل ہو سکیں۔ تو کم از کم ادنیٰ درجے کی تو ملنی چاہیئں۔ ہر شخص کے کھانے پینے، پہننے اور رہنے کے لیے انتظام ہونا چاہیئے۔ لہذا یہ انسانوں کا اجتماعی فریضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی استعمال کریں۔ اور اس کا شکریہ بھی ادا کریں۔

فساد فی الارض

افسوس کی بات یہ ہے۔ کہ اس زمانے میں نیکی کا تصور ہی ختم ہو گیا ہے، جس کے پاس دولت آئی ہے وہ اسے اپنے باوا کی سمجھتا ہے۔ نہ خدا کا حق نہ رسول کا حق اور نہ انسانیت کا ہو کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا۔ مستحقین پر خرچ کرنے کی بجائے رسم و رواج پر خرچ ہوتا ہے۔ مشرکانہ افعال پر خرچ ہوتا ہے۔ بے حیائی اور فحاشی پر خرچ ہوتا ہے یہ ساری ناشکر گزاری کی

مدّات ہیں۔ اس کا معنیٰ یہ نہیں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ حساب نہیں لے گا یا اس کی پکڑ نہیں ہوگی۔ ایک ایسا دن آنے والا ہے۔ جب ہر چیز کا محاسبہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ اسی لیے فرمایا کھاؤ اور پیو اللہ تعالیٰ کی روزی سے وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ چلو۔ فساد سے مراد خدا تعالیٰ کے قانون، شریعت اور دین کے خلاف چلنا ہے۔ سارے فساد کی جڑ یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا "کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ" حلال اور پاک چیزیں کھاؤ مگر شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ شریعت کے خلاف قدم اٹھانا شیطان کے نقشِ قدم پر چلنا ہے۔ بدعت، شرک، معصیت وغیرہ خلاف شریعت ہیں۔ اور اسی کو فساد کہا گیا ہے۔ جہاں فساد ہوگا وہاں امن و چین نصیب نہیں ہوسکتا۔ نہ ہم خدا تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کر رہے ہیں۔ نہ قانونِ شریعت کا احترام کر رہے ہیں۔ اسلام کا نام کتنے زور شور سے لیتے ہیں۔ مگر عمل صفر کے برابر ہے۔ البتہ ظلم و ستم کا کوئی شمار نہیں۔

اس ماہ کی ابتدائی تاریخوں کی اخباری خبر ہے۔ کسی گھر میں نوجوان لڑکی اور بچہ تھا۔ ماں باپ کہیں گئے ہوئے تھے۔ رات کے وقت دو سپاہی دونوں کو اٹھا کر لے گئے۔ اور ایک مکان میں بند کر دیا۔ اور اُس "بچی" کے ساتھ زیادتی کی۔ یہ تو ان سرکاری کارندوں کا حال ہے۔ جو خود دوسروں کی حفاظت پر مامور ہیں۔ جب ان کا یہ حال ہے۔ تو دوسرے لوگوں کا کیا ہوگا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مجرموں کی نشاندھی ہونے کے باوجود اگر اُن تک قانون کا ہاتھ نہیں پہنچتا تو اس صورت میں کیا خدا تعالیٰ کا قہر نازل نہیں ہوگا۔ بہرحال اس قسم کے واقعات فساد فی الارض کے نمونے ہیں۔ وجہ یہ ہے۔ کہ ہم سب نے خدا تعالیٰ کے قانون کو چھوڑ رکھا ہے۔ اسی وجہ سے دنیا میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ شیطان کے نقشِ قدم پر چلنا اسی کا نام ہے۔

الغرض فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ روزی سے کھاؤ پیو۔ مگر زمین میں فساد برپا نہ کرو۔

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ
یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا
وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ
هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ
عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ۶۱ ع

رکوع ۷

مترجمہ ہ:۔ اور جب کہا تم نے اے موسیٰ! ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک ہی قسم کے کھانے پر۔ پس اپنے پروردگار سے ہمارے لیے دعا کر کہ وہ ہمارے لیے وہ چیزیں نکالے جن کو زمین اگاتی ہے۔ اپنی ترکاریوں سے اور اپنی ککڑیوں سے اور اپنے گندم سے اور اپنے مسور سے اور اپنے پیاز سے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کیا تم بدل لیتے ہو اس چیز کو جو ادنیٰ ہے اس سے جو بہتر ہے۔ کسی شہر میں اُتر جاؤ۔ بے شک تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا۔ جو تم نے مانگا۔ اور اُن پر ذلت اور مسکنت مسلط کی گئی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا عذاب لیکر لوٹے اس وجہ سے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے تھے۔ اور اللہ کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ بات اس وجہ سے ہوئی کہ انہوں نے نافرمانی کی۔ اور وہ حد سے آگے نکل جاتے تھے ۶۱

ربط آیات

اللہ تعالیٰ کے بنی اسرائیل پر انعامات ان کی سرکشی اور تمرد اور پھر اُن پر اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کا تذکرہ گذشتہ دروس سے چلا آرہا ہے۔ فرعون کے مظالم۔ بنی اسرائیل کا مصر سے خروج۔ پھر چالیس سال تک صحرائے سینا میں سرگردانی۔ شام و فلسطین میں داخلہ۔ من و سلویٰ اور پانی کی فراہمی کے تمام واقعات تفصیلاً آچکے ہیں۔ اب اس آیت میں جس واقعہ کی طرف

اشارہ ہے۔ وہ بھی بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں ہی پیش آیا۔

غلامی کے اثرات

دراصل مسلسل غلامی کی وجہ سے بنی اسرائیل کی اخلاقی قدریں بالکل ختم ہو چکی تھیں۔ ان میں طرح طرح کی کمزوریاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اسی غلامی کے متعلق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا تھا: ع

غلامی میں بدل جاتا ہے۔ قوموں کا ضمیر

مقصد یہ کہ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم کی غلام بن جاتی ہے۔ تو پھر نہ ان کا جسم اپنا ہوتا ہے۔ اور نہ ان کا ذہن اپنا ذہن ہوتا ہے۔ بلکہ یہ دونوں چیزیں غالب قوم کی تابع ہو جاتی ہیں۔ قرآن پاک میں بھی موجود ہے "عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ" غلام مملوک کسی چیز پر نہیں ہوتا۔ اس کا ضمیر تک بدل جاتا ہے۔ اس کی رائے اپنی رائے نہیں رہتی۔ اس کے ں کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل لمبے عرصے تک فرعون کے غلام رہ چکے تھے۔ لہذا مذکورہ ساری کمزوریاں ان میں پائی جاتی تھیں۔

بنی اسرائیل کو صحرا میں رکھنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی۔ کہ وہاں رہ کر ان میں جفاکشی پیدا ہو۔ بھوک پیاس اور مشقت برداشت کرنے کی قوت پیدا ہو۔ اور غلامی کے دور کی کمزوریاں دور ہو جائیں۔ تاکہ یہ لوگ آئندہ زمانے میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ کسی ملک کے وارث بن کر نظم و نسق چلانے کے اہل بن سکیں۔ مگر ستر سال تک یہ لوگ غلامی کے اثرات میں گرفتار رہے۔ اپنے اصلی مقام سے غافل رہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے بار بار کہنے کے باوجود ذہنی غلامی کے خول سے باہر نہ نکل سکے۔

جب پرانی نسل ختم ہوئی تو نئی نسل نے کروٹ لی۔ خواب غفلت سے بیدار ہوئے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد یوشع علیہ السلام نبی ہوئے۔ تو ان کی قیادت میں بنی اسرائیل کی نئی نسل نے شام و فلسطین کو فتح کیا۔ "مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا" مشرق اور مغرب کے سارے علاقے اللہ تعالیٰ نے ان کو دلا دیے۔

طعام کی تبدیلی

ارشاد ہوتا ہے وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ اے بنی اسرائیل اس واقعہ کو یاد کرو۔ جب تم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا۔ کہ ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ صحرائے سینا میں بلا مشقت من و سلویٰ کھاتے کھاتے بنی اسرائیل کے مزاج بھر

چکے تھے۔ اور وہ کھانے میں تبدیلی چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی۔ کہ ہم ایک کھانے پہ ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ حالانکہ حقیقت میں من اور سلویٰ دو مختلف کھانے تھے۔ مگر مسلسل یہی کھانا کھانے کی وجہ سے انہوں نے انہیں ایک ہی کھانا کہا۔ کہ اب ہم زیادہ دیر تک اس کھانے سے شکم پری نہیں کر سکتے۔ اسرائیلی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے[1] وہ کہنے لگے کہ ہمیں تو مصر کی مچھلی یاد آ رہی ہے۔ وہاں ہمیں مختلف قسم کی سبزیاں اور ترکاریاں میسر آتی تھیں۔ اور یہاں پہ ایک ہی قسم کا کھانا کھا کر تنگ آ چکے ہیں۔ اے موسیٰ (علیہ السلام) فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ آپ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کریں۔ يُخْرِجْ لَنَا کہ وہ نکالے ہمارے لیے مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وہ چیزیں جن کو زمین اگاتی ہے۔ مِنْ بَقْلِهَا اپنی ترکاریوں سے وَقِثَّائِهَا اور اپنی ککڑیوں سے وَفُومِهَا اور گندم سے وَعَدَسِهَا اور اپنی مسور سے وَبَصَلِهَا اور اپنے پیاز سے۔ یعنی اے موسیٰ! ہمیں تو ان چیزوں کی ضرورت ہے۔ اپنے رب سے کہہ کر ہمیں یہ دلوا دے۔ من و سلویٰ جیسی قوت بخش غذا سے ان کا جی بھر گیا تھا۔ اور وہ اس قسم کی چٹ پٹی چیزوں سے اپنے منہ کا ذائقہ بدلنا چاہتے تھے۔

بنی اسرائیل کی اس فرمائش پہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی سرزنش کی۔ قَالَ اور فرمایا! أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ کیا تم ایک ادنیٰ اور گھٹیا چیز کو اعلیٰ اور بڑھیا چیز سے بدلنے کے خواہش مند ہو۔ تم کتنے بیوقوف ہو۔ کہ اللہ تعالیٰ تو تمہیں من و سلویٰ جیسی بہترین غذا فراہم کر رہا ہے۔ اور تم سبزی ترکاری اور لہسن پیاز کے پیچھے پھر رہے ہو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[2] کہ اللہ تعالیٰ نے بالکل مفت من و سلویٰ دے رکھا تھا۔ اور پھر وہ حساب و کتاب سے بھی بری تھے۔ ان چیزوں کا کوئی حساب کتاب نہیں تھا۔ پھر ان کے مطلوبہ لہسن پیاز پہ تو حساب کتاب بھی ہوگا۔ یہ بھی ان کے گھاٹے کا سودا تھا۔ مگر وہ اسی پر مصر تھے۔

کاشتکاری مشقت طلب کام ہے

جب بنی اسرائیل کا اصرار حد سے بڑھ گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے

---

[1] تفسیر حقانی صفحہ ۱۵۶/۲۶ مطبوعہ دہلی ، [2] تفسیر مظہری صفحہ ۷۶/۱

کہلوایا۔ کہ اگر تم یہی چیزیں چاہتے ہو۔ اِهۡبِطُوۡا مِصۡرًا تو کسی شہر میں اتر جاؤ۔ وہاں جاکر کھیتی باڑی کرو، ہل چلاؤ۔ آبپاشی کرو۔ اور اپنے لیے اپنی مرضی کی چیزیں کاشت کرو۔ فَاِنَّ لَکُمۡ مَّا سَاَلۡتُمۡ ؕ پس جو کچھ تم چاہتے ہو۔ تمہیں مل جائے گا۔ البتہ ذرا محنت مشقت کرنی پڑے گی۔

بعض فرماتے ہیں، کہ اعمش کی قراءۃ میں اِهۡبِطُوۡا مِصۡرَ واپس مصر چلے جاؤ۔ وہاں جاکر اسی طرح کھیتی باڑی کرو، جس طرح فرعونی کرتے تھے۔ اور سبزیاں وغیرہ حاصل کرلو۔ مگر دوسری قراءۃ یعنی مِصۡرًا۔ ر کی تنوین کے ساتھ زیادہ راجح ہے۔ یعنی کسی شہر یا قصبے میں اُتر جاؤ۔ اور کاشتکاری کرو۔ تم اپنی مطلوبہ چیزیں حاصل کرلو گے۔ تم ایک اعلیٰ چیز چھوڑ کر اسکے بدلے میں معمولی چیزیں چاہتے ہو۔ یہ چیزیں تمہیں محنت و مشقت کے بعد حاصل ہوں گی۔

پیشے بلحاظ فضیلت

حضرت ابو امامہؓ کی روایت میں آتا ہے[1] کہ حضور علیہ السلام نے کسی گھر میں ہل کا پھال دیکھا تو فرمایا۔ یہ جہاں بھی ہو، وہاں ذلّت کا دور دورہ ہوتا ہے کاشتکاری بذاتِ خود ایک مشقّت طلب کام ہے۔ اس کے علاوہ مالیہ اور آبیانہ وغیرہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ شہری تہذیب سے دُور انسان بہت سی اچھی چیزوں سے محروم رہتا ہے۔

کاشتکاری ایک اچھا پیشہ بھی شمار ہوتا ہے۔ اس کی تعریف بھی آئی ہے۔ اس پیشے کو فضیلت کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔ بہترین پیشہ جہاد ہے، اس کے ذریعے حاصل ہونے والا مال پاکیزہ ترین ہوتا ہے۔ دوسرے نمبر پر تجارت کا پیشہ ہے۔ رزق کا زیادہ تر حصہ اللہ تعالیٰ نے تجارت میں ہی رکھا ہے۔ اس کے بعد کاشتکاری یا کھیتی باڑی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[2] کہ کوئی شخص کوئی فصل کاشت کرتا ہے۔ کوئی دانہ بوتا ہے یا پودا یا درخت لگاتا ہے۔ اس کے پھل میں سے اگر کوئی جانور وغیرہ کھائے گا۔ تو بونے والے کو صدقے کا ثواب ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے کاشتکاری کو یہ فضیلت بخشی ہے۔ اس طرح فرمایا چوتھے نمبر پر صنعت و حرفت کا پیشہ ہے۔ دینی نقطہ نگاہ سے مختلف پیشوں کی یہ درجہ بندی ہے۔

یہودیوں کی ذلّت و رسوائی

بنی اسرائیل کے جتنے بھی واقعات ذکر کئے جا رہے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ اسی ترتیب کے

---

[1] ابن کثیر ص ۱۰۲ ج ۱، درمنثور ص ۷۳ ج ۱، [2] بخاری ص ۳۱۲ ج ۱، [3] بخاری ص ۳۱۲ ج ۱، مسلم ص ۱۶ ج ۱

ساتھ واقع ہوئے ہوں جس ترتیب کے ساتھ انہیں بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کا بیان محض عبرت اور تنبیہ کے لیے ہے۔ کہ نوعِ انسانی ان واقعات سے سبق حاصل کرے۔ اور برائیوں سے اجتناب کرے۔ ان کے ضمن میں یہودیوں کو بار بار خطاب کیا جا رہا ہے۔ کہ دیکھو تمہارے آباؤ اجداد میں یہ یہ خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ ان سے عبرت حاصل کرو۔ اور ایسی برائیوں سے باز آجاؤ۔ انکی انہی نافرمانیوں کی وجہ سے وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ اُن پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی۔ مسکنت مال کی کمی کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ذلت و رسوائی کی لعنت اُن پر اس وقت مسلط کی گئی جب وہ بحیثیت قوم عادی مجرم بن گئے۔

یہ عام مشہور بات ہے۔ کہ یہودی دنیا میں امیر ترین قوم ہیں۔ مگر یہ درست نہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ یہودیوں میں بھی مال و دولت تھوڑے لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ ورنہ اکثریت ان کی بھی محتاج ہی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر یہودی مالدار بھی ہوں تو پھر بھی ان کی حالت خستہ ہی ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو مسکین ہی ظاہر کرتے ہیں۔

حکومت سے محرومی بھی ذلت و رسوائی کی نشانی ہے۔ یہ قوم دو تین ہزار سال تک حکومت سے محروم رہی۔ دنیا میں کسی جگہ ان کی سلطنت نہیں تھی۔ یہ لوگ اتنے لمبے عرصہ تک دربدر مارے مارے پھرتے رہے۔ ان کو کسی دوسری حکومت نے بھی برداشت نہ کیا۔ جرمنی والے ان کے دشمن۔ اٹلی والے ان کے دشمن۔ یہ سازشی ذہن کے لوگ ہیں۔ انہیں کوئی بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

آج اعتراض ہوتا ہے۔ کہ مسلمانوں کا دعوےٰ تھا۔ کہ دنیا میں یہودیوں کو کبھی اقتدار نصیب نہیں ہوگا۔ ان کا کوئی ملک نہیں ہوگا۔ مگر ان کی سلطنت قائم ہو چکی ہے۔ معاذ اللہ قرآن پاک کا دعوےٰ غلط ہو گیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ چوتھے پارے میں موجود ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس قوم کو کبھی اقتدار نصیب نہیں ہوگا۔ مگر دو شرطوں کے ساتھ "اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ" یعنی یا تو اللہ تعالیٰ کی رسی کو پکڑ لینے سے یا پھر لوگوں کی رسی کو تھام لینے کی وجہ

---

[1] تفسیر عثمانی ص۱۲ مطبوعہ دار التصنیف کراچی۔ التفسیر عزیزی فارسی ص۲۶۵ پارہ ۱

ہے۔ ہاں قرب قیامت میں دجال کے ظہور کے وقت ان کو عروج حاصل ہو گا۔ تو اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رسی کے تو یہ قریب بھی نہیں جاتے۔ البتہ انہوں نے لوگوں کی رسی کو پکڑ رکھا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس وغیرہ کے دامن سے چمٹے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ان کو وطن بھی حاصل ہو گیا ہے۔ اور باقی دنیا کو آنکھیں بھی دکھانے لگے ہیں۔ ان کی سلطنت کا قیام محض امریکہ کی بے ایمانی کا نتیجہ ہے۔ آج امریکہ اگر اپنا ہاتھ اٹھالے تو یہودی سلطنت دو دن بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ الغرض! اگر آج یہودیوں کو کسی خطۂ زمین پر عروج حاصل ہے تو وہ بھی قرآن پاک کے بیان کردہ اصول کے مطابق ہی ہے۔ ورنہ اس قوم کی حقیقت بھی ہے۔ وَبَآءُ وْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہی لے کر لوٹے۔

آیاتِ الٰہی کا انکار

فرمایا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ بنی اسرائیل کی ذلت و رسوائی کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔ جب کوئی انسان نافرمانی کرتا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت برستی ہے۔ ابلیس کا بھی یہی حال ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِىْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ" جاؤ تم پر قیامت تک میری لعنت برستی رہے گی اسی طرح کافروں کے متعلق فرمایا کہ جو کفر کی حالت میں مر گیا اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ" ان پر اللہ تعالیٰ۔ اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت مسلط ہو گئی۔ اس کی وجہ یہی ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ کے احکام کو ٹھکراتے تھے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ ذلت و رسوائی کے سوا اور کیا ہو گا۔

انبیاء علیہم السلام کا قتل

بنی اسرائیل پر لعنت مسلط ہونے کی دوسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ کہ وہ انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ میں[1] ملتا ہے۔ کہ انہوں نے برمیاہ نبی شعیا نبی۔ حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے دیگر سینکڑوں نبیوں کو قتل کیا۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے[2] کہ بنی اسرائیل نے ایک دن میں خدا تعالیٰ کے تین سو انبیاء علیہم السلام کو شہید کیا۔ جب اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں نے ایسا کرنے

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۶۶ پارہ ۱، ابو السعود ص ۸۵ ج ۱، تفسیر مدارک ص ۵۲ ج ۱، [2] در منثور ص ۷۳ ج ۱، ابن کثیر ص ۱۰۲ ج ۱

سے منع کیا اور انہیں طعن و ملامت کی تو ان کو بھی شہید کر دیا گیا۔ یہ قوم اس قسم کی عادی مجرم بن چکی تھی جس کی وجہ سے یہ مغضوب اور ملعون ٹھہری۔

یہاں پر "بِغَیْرِ الْحَقِّ" پر اعتراض وارد ہوتا ہے۔ کہ نبیوں کے ناحق قتل کا کیا مطلب ہے؟ جب کہ نبی کا قتل تو بلاشبہ ناحق ہی ہو گا۔ نبی کا قتل برحق تو ہو ہی نہیں سکتا۔ تو مفسرین کرام اس اشکال کا یہ جواب دیتے ہیں[1] کہ یہاں پر ناحق کا لفظ اس لیے استعمال ہوا ہے۔ کہ قاتل خود سمجھتے تھے۔ کہ وہ غلط کام کر رہے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے[2] کہ سخت عذاب روزِ قیامت اس شخص کو ہو گا۔ جس نے کسی نبی کو قتل کیا ہو گا یا جس کو کسی نبی نے قتل کیا ہو گا۔ دونوں قسم کے اشخاص سخت ترین سزا کے مستحق ہوں گے۔ امیہ بن خلف کی مثال موجود ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے خود اپنے نیزے سے اس ملعون کو مارا تھا۔ مشرکین مکہ میں سے یہ بڑا خرانٹ قسم کا کافر تھا؟

نافرمانی اور حد سے تجاوز

الغرض! سابقہ بنی اسرائیل کی خرابیاں اور ان کی سزائیں بیان کر کے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بنی اسرائیل کو سمجھایا جا رہا ہے۔ کہ اب بھی سمجھ جاؤ۔ خدا کا آخری نبی آ گیا ہے "اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ" جو کچھ میں نے نازل کیا ہے۔ اس پر ایمان لے آؤ۔ معافی کا دروازہ اب بھی کھلا ہے۔ اگر تم ٹھیک ہو جاؤ۔ اپنے اخلاق و اعمال درست کر لو۔ تو تم آج بھی عروج حاصل کر سکتے ہو۔ مگر وہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی کو تسلیم کرنے والے نہیں تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر ہمیشہ کے لیے لعنت مسلط کر دی گئی۔ انکارِ آیات اور قتل انبیاء کے بعد تیسری وجہ یہ بیان فرمائی۔ "ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا" کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ عصیان کا معنیٰ اللہ تعالیٰ کے حقوق کو ضائع کرنا ہے۔ وہ لوگ حقوق اللہ کی بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اس کے کسی حکم کی تعمیل کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ نیز یہ کہ "وَكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ" وہ حد سے نکل جاتے تھے۔ تعدّی کا معنیٰ انسانوں کی جانوں اور مالوں کا تلف کرنا ہے۔ بنی اسرائیل کا ذوق ہی بدل چکا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ صحیح مومن کی پہچان یہ ہے۔ کہ وہ نیکی اور

---

[1] ابو السعود ص ۸۵ ج ۱، مدارک ص ۵۲ ج ۱، مظہری ص ۷۶ ج ۱

[2] مسند احمد ص ۴۰۷ ج ۱، ابن کثیر ص ۱۰۳ ج ۱، تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۶۶ پارہ ۱

بدی میں تمیز کرتا ہے۔[1] حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ جب تمہاری نیکی تمہیں اچھی لگے۔ اور بُرائی سے نفرت ہو۔ تو سمجھ لو کہ تم مومن ہو اور اگر نیکی اور بدی میں تمیز باقی نہیں رہی تو سمجھ لو کہ تمہیں روحانی بیماری لاحق ہو گئی ہے۔

اس کی مثال انسانی جسم کے ساتھ دی جا سکتی ہے۔ جب آدمی تندرست ہوتا ہے۔ تو اس کی زبان کا ذائقہ درست ہوتا ہے۔ اسے میٹھی چیز میٹھی لگتی ہے۔ اور کڑوی چیز کڑوی لگتی ہے مگر جب جسم بیمار ہو جاتا ہے۔ تو اس کی زبان کا ذائقہ بھی بدل جاتا ہے۔ اسے میٹھی چیز بھی کڑوی محسوس ہوتی ہے۔ مقصد یہ کہ اگر کوئی شخص نیکی اور بدی میں تمیز کرتا ہے۔ تو وہ صحیح مومن ہے۔ ورنہ وہ بیمار ہے۔

بنی اسرائیل کے لوگ بیمار تھے۔ وہ تعدی کی بیماری میں مبتلا تھے۔ نہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کا پاس رکھتے تھے۔ اور نہ بندوں کے حقوق کا خیال کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے معصوم نبیوں کو قتل کیا۔ جو خدا تعالیٰ کی رحمت اور انسانوں کے لیے نمونہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی کھلی خلاف ورزی، انکے احکام کو حیلوں، بہانوں یا تاویلوں کے ذریعے ٹھکرانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کی برائیوں کی تفصیلات سورۃ بقرہ، سورۃ آل عمران۔ سورۃ نساء اور مائدہ وغیرہ میں آ رہی ہیں۔ ان کی برائیاں بیان کر کے مسلمانوں کو تنبیہ کی جا رہی ہے۔ کہ کہیں تم بھی اسی قسم کی خرابیوں میں مبتلا نہ ہو جانا، "وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ" تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کہا۔ کہ ہم نے سن لیا۔ حالانکہ وہ انکار ہی کرتے رہے۔ اے مسلمانو! اگر تم بھی انہیں لوگوں کی روش پر چلو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ تمہاری صحت ایمانی بھی جاتی رہے گی۔ اور ذائقہ ایمانی بھی تبدیل ہو جائے گا۔

---

[1] جامع صغیر مع شرح فیض القدیر صفحہ ۳۷۴ بحوالہ مستدرک ابن حبان، طبرانی و بیہقی شعب الایمان و مسند احمد صفحہ ۲۵۱/۵

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

ترجمہ:- جو لوگ مسلمان ہوئے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے اور جو نصرانی ہوئے اور صابی، جو شخص بھی ایمان لایا ـــــ اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر اور اچھے کام کیے۔ پس ان کے لیے ان کا اجر ہے۔ ان کے رب کے پاس اور ان پر کچھ خوف نہیں ہوگا۔ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ﴿۶۲﴾

قانونِ نجات

اس سے پہلی آیات میں بنی اسرائیل کی نافرمانیوں، فساد فی الارض۔ اس کے نتیجے میں ان پر مسلط کی جانے والی ذلت اور مسکنت کا ذکر تھا۔ آیت زیرِ درس کے بعد بنی اسرائیل کی بقیہ دیگر خرابیوں کا ذکر ہوگا۔ اس درمیانی آیت میں اللہ تعالیٰ نے وہ قانون بتلا دیا ہے۔ جس کی پابندی اختیار کر کے اور جس پر عمل پیرا ہو کر انسان کو نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ قانون کسی خاص فرقے یا گروہ کے لیے نجات مختص نہیں کرتا، بلکہ جو بھی شخص اس میں دیے گئے اصول کی پابندی کرے گا۔ وہ نجات پا جائے گا۔ خواہ وہ کسی خاندان کسی نسل یا کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ دراصل بنی اسرائیل کے نسبی تفاخر اور مذہبی فوقیت کی تردید ہے۔ جس میں وہ مبتلا تھے۔ اور اسی نام نہاد برتری کی وجہ سے اپنے آپ کو نجات یافتہ سمجھتے تھے۔

مذاہبِ عالم

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے چار گروہوں یعنی مؤمنین، یہود، نصاریٰ اور صابئین کا ذکر فرمایا ہے۔ البتہ سورۃ حج میں پانچویں گروہ مجوسیوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت جو فرقے پائے جاتے تھے۔ ان میں مشرکین، یہود، نصاریٰ اور صابی ہیں۔ حضرت مولانا شیخ الہندؒ، اپنی تفسیر کے حاشیہ پر لکھتے ہیں[1] کہ یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت

---

[1] قرآن مجید مترجم صـ۱۳ مطبوعہ دار التصنیف کراچی

ہے اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کو کہتے ہیں البتہ صابی ایک ایسا فرقہ ہے۔ جس نے مختلف ادیان سے بعض ایسی چیزوں کو اختیار کر لیا ہے۔ جنہیں وہ اچھا سمجھتے ہیں۔ اس فرقہ کے پیروکار حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتے ہیں۔ فرشتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ زبور پڑھتے اور کعبے کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ بہت سی جائز باتوں میں اختلاف بھی کرتے ہیں۔

اہل ایمان

اس آیت میں جن مذاہب کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ ان میں سرفہرست اہل ایمان ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے یعنی مسلمان ہوئے صرف اٰمَنُوْا میں وہ تمام لوگ آجاتے ہیں۔ جو بظاہر ایمان لے آئے۔ اور ان میں منافقین بھی شامل ہیں۔ کیونکہ بظاہر تو وہ بھی کلمہ پڑھتے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ نمازیں بھی ادا کرتے تھے۔ نبی علیہ السلام کی مجلس میں بھی بیٹھتے تھے۔ اور پھر آپ کی اطاعت کا دعویٰ بھی کرتے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ اٰمَنُوْا کی فہرست میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یہاں اٰمَنُوْا سے مراد وہ اہل ایمان ہیں۔ جو صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ پر، اس کے رسولوں پر، اس کی کتابوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس خطاب کے مصداق ایسے ہی لوگ ہیں۔ محض زبانی دعوائے ایمان سے نجات ممکن نہیں ہے۔

ھَادُوْا کا مفہوم

دوسرے نمبر پر فرمایا۔ وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے۔ یہاں پر مطلقاً یہودی نہیں فرمایا۔ بلکہ فرمایا جو یہودی ہوئے۔ اس میں امتیاز یہ ہے۔ کہ یہود ایک نسلی مذہب ہے یہ تبلیغی مذہب نہیں ہے۔ یہودی وہ ہیں۔ جو نسلی طور پر بنی اسرائیل ہیں۔ اور یہودی ہوتے سے مراد وہ لوگ بھی ہیں۔ جو اگرچہ نسلی طور پر یہودی نہیں ہیں۔ مگر انہوں نے یہودی مذہب قبول کر لیا۔

نزول قرآن کے وقت مدینہ کے گرد و نواح میں بنی قریظہ وغیرہ ایسے قبائل تھے۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور یا اس سے بھی پہلے جب بڑے بڑے حوادثات پیش آئے۔ تو یہ لوگ اپنے اس وطن سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہو گئے تھے۔ یہاں پر ان کے قلعے اور آبادیاں تھیں یہ لوگ صاحب علم کہلاتے تھے۔ یہ لوگ اصل یہودی تھے۔ مگر بعض لوگ ایسے بھی تھے۔ جو اصلاً عربی النسل تھے۔ مگر یہودیوں سے متاثر ہو کر اس مذہب میں داخل ہو گئے تھے۔ انہیں کے

متعلق کہا گیا ہے کہ جو یہودی ہوئے۔

یہود کی وجہ تسمیہ

یہودیوں کو یہود کہنے کی دو وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ پہلی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ نام حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے یہودا کے نام پر ہے۔ اس نام کی دوسری توجیہہ یہ بیان کی جاتی ہے۔ کہ سورۃ اعراف میں آتا ہے "اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ" هَادَ۔ هُوْدًا کا معنیٰ ہوتا ہے۔ رجوع کرنا۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کا دعائیہ کلمہ ہے۔ جب بنی اسرائیل نے سخت گستاخی کی۔ اور کہا کہ ہم ہرگز اس کتاب کو نہیں مانیں گے۔ جب تک اللہ تعالیٰ خود ہم سے ہم کلام ہو کر اس کتاب کی تصدیق نہ کرے۔ تو موسیٰ علیہ السلام قوم کے ستر آدمیوں کو ساتھ لے کر کوہ طور پہ گئے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ان کا مطالبہ پورا کر دیا۔ مگر یہ پھر بھی ایمان نہ لائے۔ تو اللہ تعالیٰ کا قہر بجلی کی صورت میں نازل ہوا۔ اور وہ ستر آدمی ہلاک ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام سخت رنجیدہ خاطر ہوئے۔ کہ مولا کریم! میں قوم کو جا کر کیا بتاؤں گا۔ وہ کہیں گے کہ ہمارے آدمی وہاں لے جا کر مروا دیئے۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت عاجزی کے ساتھ دعا کی تھی۔ اور عرض کیا تھا۔ "اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ" اے مولا کریم! ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا تھا۔ تو بعض فرماتے ہیں[2] کہ یہودیوں کو یہود کا لقب اس هُدْنَا کے مادے سے دیا گیا تھا۔

یہودی عقائد

اس وقت پوری دنیا میں یہودیوں کی تعداد دو کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ بر خلاف اس کے نصاریٰ کم و بیش دو ارب کی تعداد میں ہیں۔ یہودی اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پہ کاربند کہتے ہیں۔ مگر ان میں ابتدائے زمانہ ہی میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ ان میں سرکشی کا مادہ وافر مقدار میں موجود تھا۔ بعد میں یہ عادی مجرم بن گئے۔ عصیان ان کی سرشت میں داخل ہو گیا۔ اور یہ لوگ حقوق العباد کو ضائع کرنے لگے۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا۔ یہ لوگ اپنے آباؤ اجداد کے شنیع افعال پہ نادم ہونے کی بجائے۔ ان پہ فخر کرتے تھے۔ کہ وہ بہت اچھا کام کرتے رہے ہیں۔ ان کے عقائد، اعمال اور اخلاق میں بے شمار قبائح پیدا ہو چکے تھے۔ اور آج تک موجود ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۱۰۳ ج ۱، [2] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۹۸ پارہ ۱، ابن کثیر ص ۱۰۳ ج ۱

یہودیوں کا ایک عقیدہ یہ ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جسمانی صورت کے معتقد ہیں۔ اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کو جسمانیت سے مبرا سمجھتے ہیں۔ مگر کہتے ہیں کہ اس کا تعلق جسم کے ساتھ بھی ہے۔ اس جسم کو وہ مثالی اور نورانی مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی جسمانیت شعاع کی طرح ہے۔ جو پھیل جاتی ہے۔ اور سکڑ جاتی ہے۔ اسی لیے انہوں نے رؤیت الٰہی کا مطالبہ پیش کر دیا "لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً" ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کو ظاہری طور پر نہ دیکھ لیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر گریہ، ہنسی، حزن اور غم کا بھی اطلاق کرتے ہیں۔

یہودی انبیاء علیہم السلام کے بارے میں بھی بڑی بدگمانی رکھتے ہیں، بلکہ ان پر تہمتیں لگاتے ہیں۔ توراۃ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام پر کیا کیا بہتان باندھے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پہ تہمت لگائی۔ کہ آپ ہارون علیہ السلام سے حسد کرتے تھے اس لیے آپ نے حضرت ہارون علیہ السلام کو قتل کیا[1] (العیاذ باللہ) حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو حضرت ہارون علیہ السلام کے بارے میں سفارشی تھے کہ "وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ (٣٢) كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا" اے پروردگار! میرے بھائی کو میرے ساتھ تبلیغ میں شریک فرما۔ آپ نے یہی تو دعا کی تھی "هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا" وہ مجھ سے زبان میں زیادہ فصیح ہے۔ اے اللہ میری زبان میں لکنت ہے "رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ" اسے میرا معاون بنا دے جو میری تصدیق کرے۔ کہیں فرمایا اسے میرا وزیر بنا دے۔ ہم مل کر تیرے دین کی تبلیغ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى"۔ اے موسیٰ تیرا سوال پورا کر دیا گیا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے مگر یہ بدبخت یہودی کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو قتل کر دیا تھا۔

یہودیوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبی نہیں مانتے بلکہ ولی مانتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ نبی تو محض ایلچی ہوتا ہے۔ مگر ولی نبی سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس میں تقرب الی اللہ کا مادہ زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ عقیدہ بالکل باطل ہے۔

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص۲۶۵ پارہ ۱

ان بدبختوں کا یہ بھی عقیدہ ہے۔ کہ سونے کا بچھڑا خود حضرت ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا یا انہوں نے بنانے کا مشورہ دیا تھا (العیاذ باللہ) اسی طرح انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام پر یہ تہمت لگائی۔ کہ انہوں نے اپنے کمانڈر انچیف اوریا کو قتل کر دیا اور اس کی بیوی کو گھر میں رکھا (العیاذ باللہ) انہیں لوگوں نے سحر کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا۔ کہ یہ جادوگر اور طلسمات کا ماہر ہے۔ جو کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے بارے میں بہت بڑا جھوٹ ہے۔

یہودی یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت دائمی ہے۔ جو کبھی منسوخ نہیں ہوگی۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھی منکر ہیں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے تو انہوں نے سخت مخالفت کی۔ اور انکو دجّال تک کہا۔ ان بدبختوں نے ان کے منہ پر تھوکا اور انہیں سولی پر لٹکانے کی کوشش کی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر زنا کی تہمت انہی ظالموں نے لگائی۔[1] (العیاذ باللہ) یہودیوں کی بد اخلاقی، بدعقیدگی اور ان کی بُری خصلتوں کی تفصیلات قرآن پاک میں موجود ہیں۔ بعض چیزیں تفاسیر میں ملتی ہیں۔ اور بعض تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔

نصاریٰ کی وجہ تسمیہ

مؤمنین اور یہود کے تذکرہ کے بعد تیسرے گروہ کے متعلق فرمایا وَالنَّصٰرٰی اور نصرانی جو اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لفظ نصاریٰ، نصرانی کی جمع ہے۔ اور نصرت کے معنی مدد کرنے کے ہوتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[2] کہ یہ لوگ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اذیت پہنچاتے تو آپ لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتے "مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ" اللہ تعالیٰ کے راستے میں کون میرا مددگار ثابت ہوگا۔ "قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ" تو حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے راستے میں مدد کے لیے تیار ہیں چنانچہ اسی لفظ سے ان کو نصاریٰ کا نام دیا گیا۔ یعنی نصرت کرنے والے۔ مدد کرنے والے۔ بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں[3] کہ جس بستی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام رہتے تھے۔ اس بستی کا نام

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۶۸ پارہ ۱، [2] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۶۸ پارہ ۱، تفسیر ابن کثیر ص ۱۰۳ ج ۱
[3] معالم التنزیل ص ۳۰ ج ۱، در منثور ص ۷۵ ج ۱

ناصرہ تھا۔ چنانچہ اس بستی کی نسبت سے اس گروہ کو نصرانی کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مدینہ کی نسبت کرکے مدنی کہا جاتا ہے۔ یا کسی کو مکی یا شامی وغیرہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

نصاریٰ کے عقائد باطلہ

نصاریٰ بھی عجیب وغریب عقائد رکھتے تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کا عقیدہ بالکل بگڑ چکا ہے۔ آج کل کے مسیحی پولس نامی ایک شخص کے بگاڑے ہوئے ہیں۔ یہ شخص مسیحیت کا مبلغ تھا۔ اس نے دینِ مسیحی کا بالکل حلیہ بگاڑ دیا۔ پولس نے بھی عیسائیت کو اس طرح خراب کیا جس طرح عمرو بن لحی نے دینِ ابراہیم کو بگاڑ دیا تھا۔ عرب اقوام تقریباً دو ہزار سال تک حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے مذہب پر قائم رہے۔ اتنے عرصہ تک یہ توحید پرست رہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل اس شخص نے عربوں میں بت پرستی کا طریقہ ایجاد کیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ نزول قرآن کے وقت سارا عرب شرک میں غرق ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ خانہ کعبہ کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔

پولس نے مسیحیت کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بندہ اور رسول ماننے والے لوگ آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ اور تثلیث کا مسئلہ ان میں رواج پا گیا۔ آگے سورۃ مائدہ میں آ رہا ہے۔ کہ انہوں نے "اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ" کا عقیدہ بنا لیا۔ اور اس طرح گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ اُس وقت انہوں نے چار گروہ بنا لیے۔ مگر اس وقت کے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں گروہ مشرک ہیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی توحید پر قائم نہیں رہا۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا۔ یا خدا کا بیٹا یا تیسرا خدا یا ابن اللہ کہا۔ انہوں نے یہ عقیدہ بھی قائم کر لیا۔ کہ خدا عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کر گیا ہے۔ یہودیوں نے بھی یہی کہا تھا۔ کہ خدا بچھڑے میں حلول کر گیا ہے۔ اس طرح کا باطل عقیدہ عیسائیوں نے وضع کر لیا۔

سید علی ہجویری صاحب کشف المحجوب میں لکھتے ہیں[1]۔ کہ صوفیائے کرام کے بارہ فرقے ہیں۔ ان میں سے دو فرقے مردود ہیں۔ اور باقی دس فرقے مقبول ہیں۔ دو مردود فرقے ہی حلول

---

[1] کشف المحجوب فارسی صلا ۱۸۳ مطبوعہ دائرۃ المعارف پنجاب یونیورسٹی لاہور

والے فرقے ہیں۔ وحدت الوجود کا عقیدہ بھی انہی لوگوں کا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ خدا تعالےٰ بندے کے اندر داخل ہو گیا ہے (العیاذ باللہ) تو بہر حال یہ لوگ بھی اس قسم کی بدعقیدگی کا شکار ہو چکے ہیں وَالصّٰبِئِیْنَ اور صابی۔

صابی کون ہیں؟

مفسرین کرام فرماتے ہیں[۱]۔ کہ صابی کا عام فہم معنیٰ بے دین ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص ایک دین چھوڑ کر دوسرے دین میں داخل ہو جائے تو اسے صابی کہتے ہیں۔ اسی بنا پر عرب کے مشرکین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صابی کہتے تھے۔ یعنی انہوں نے پرانا دین چھوڑ کر نیا دین اختیار کر لیا ہے تاہم اس مقام پر جس صابی فرقہ کا تذکرہ ہے۔ مفسرین نے اس کی بہت سی تفصیلات بیان کی ہیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[۲]۔ کہ اس فرقہ کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے۔ کہ نیک بختی اور سعادت حاصل کرنے کے لیے انسان کسی نبی کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ اگر وہ روحانیات اور فرشتوں کے ساتھ رابطہ قائم کرے تو اس کے لیے یہی کافی ہے۔ انہیں سے انسان فیض حاصل کر سکتا ہے۔ یہ لوگ مختلف قسم کے ہیکل بناتے ہیں۔ مثلاً آفتاب، ماہتاب ستاروں اور ملائکہ کے نام کے ہیکل بنائے جاتے ہیں۔ جس طرح ہم لوگ قبلہ کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ ستاروں کو مسجود بناتے ہیں۔ اور انہیں قبلہ تصور کرتے ہیں۔

صابیوں کے عقائد

اس فرقہ کے متعلق یہ بھی لکھا ہے۔ کہ یہ تین نمازیں پڑھتے تھے۔ اس زمانہ میں صابیوں کے جانشین پرویزی اور چکڑالوی ہیں۔ چکڑالوی بھی تین نمازوں کے قائل ہیں۔ ان کے بعض لوگ دو نمازیں پڑھتے ہیں اور بعض صرف ایک۔ یہ سب گمراہ فرقے ہیں اسی طرح پرویز کا عقیدہ یہ ہے کہ موجودہ نماز کی کوئی حقیقت نہیں۔ صحیح نماز وہ ہوگی جو حکومت مقرر کرے گی۔

صابیوں کی اور بھی بہت سی تفصیلات ملتی ہیں۔ مثلاً ان کا عقیدہ ہے کہ مردے کو کوئی شخص ہاتھ لگائے۔ تو اس کے لیے غسل ضروری ہو جاتا ہے یہ لوگ گدھے اور کتے کے گوشت کو تو نہیں کھاتے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اونٹ اور پنجے دار جانور کے گوشت کو بھی یہودیوں کی طرح حرام سمجھتے ہیں۔ یہ پیاز اور باقلی کو بھی حرام سمجھتے ہیں۔ مارماہی۔ یا مار مچھلی یعنی سانپ کی مانند مچھلی بھی ان کے ہاں حرام ہے۔ یہ لوگ شراب کو حلال اور جائز سمجھتے ہیں۔ مگر نشے کو حرام گردانتے

۱؎ تفسیر عزیزی فارسی ص۲۶۹ پارہ ۱، تفسیر ابن کثیر ج۱ ص۱۰۴، ۲؎ تفسیر عزیزی ص۲۶۹ پارہ ۱

ہیں۔ طلاق کے متعلق ان کا شرعی مسئلہ یہ ہے۔ کہ حاکمِ وقت کی اجازت کے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی۔ ان کے ہاں ایک سے زیادہ نکاح بھی جائز نہیں۔ کہتے ہیں۔ کہ ایک وقت میں صرف ایک عورت سے ہی نکاح ہو سکتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز رح نے صابیوں کے مختلف ہیکلوں کی شکل و صورت کا بھی تذکرہ کیا ہے مثلاً وہ فرماتے ہیں[۱]۔ کہ یہ لوگ علتِ اولیٰ (FIRST CAUSE) یعنی تخلیق پر بھی ہیکل بناتے ہیں۔ عقل کا ہیکل الگ ہوتا ہے۔ سیاست کا الگ۔ اسی طرح صورت کا ہیکل بناتے ہیں۔ اور پھر نفس کا ہیکل گول شکل کا بناتے ہیں۔ زحل سیارے کا ہیکل مسدس شکل کا ہوتا ہے۔ اور مشتری کا ہیکل مثلث شکل کا۔ آفتاب کا ہیکل مربع شکل کا ہوتا ہے۔ اور مہتاب کا ہیکل مثمن یعنی آٹھ پہلو کا ہوتا ہے۔ یہ لوگ قیامت کا بالکل انکار کرتے ہیں۔ اس کی بجائے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ چھتیس ہزار چار سو پچیس (۳۶۴۲۵) سال کا ایک دور ہوتا ہے۔ جب ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ تو پھر ہر ذی روح کا ایک ایک جوڑا پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً انسان، چرند، پرند، کیڑے مکوڑے وغیرہ ہر ایک کا ایک جوڑا پیدا ہوتا ہے۔ جس سے آئندہ نسل چلتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ موجودہ دور جب تک موجود ہے یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا۔ اس کے بعد یہ تناسخ کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا۔ اور پھر دوسرا دور شروع ہو جائے گا۔ علیٰ ہذا القیاس۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں کلدانیوں کی ایک بہت بڑی تہذیب گذری ہے اس کا مرکز بابل شہر تھا۔ جو کہ کم و بیش ایک سو میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ شہر بغداد سے قریباً ستر یا سو میل دور تھا۔ اس سے پہلے آشوریوں کی تہذیب کا دور دورہ تھا۔ وہ ختم ہوئی ہو تو کلدانی تہذیب کو عروج حاصل ہوا۔ انہیں کے مقابلے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھیجا تھا۔ آپ وہاں تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ مگر مجبور ہو کر وہاں سے ہجرت کی اور شام و فلسطین کو مرکز بنایا۔ پھر خانہ کعبہ کی تعمیر کے لیے مکہ مکرمہ آئے۔ تو صابیوں کی طرح یہ کلدانی بھی ستاروں اور روحانیت کے قائل تھے۔ اور ان کو قبلہ بنا کر ان کی طرف سجدہ کرتے تھے

۱؎ تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۶۹ پارہ ۱۔

حنیفی بمقابلہ صابی

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ دنیا میں دو قسم کے مذاہب ہیں۔ ایک حنیفی اور دوسرا صابی۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک صابی دور تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد دورِ حنیفیت شروع ہو چکا ہے اب حنیفیت کی آگے تین شاخیں ہیں۔ یعنی مسلمان، یہود اور نصاریٰ۔ ان میں سے صرف مسلمان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین (ملت) پر قائم ہیں۔ باقی دونوں گروہ اصل دین سے ہٹ چکے ہیں۔

دورِ ابراہیمی سے پہلے جو صابی گروہ تھا۔ وہ اب بھی موجود ہے۔ آگے اس کی بھی تین شاخیں ہیں، یعنی مجوس، برہمن اور بدھ۔ مجوسیوں کو زیادہ تر عروج ایران میں ہوا۔ وہاں ان کی تاریخی حیثیت مسلّم ہے۔ تاریخ کی ایک مشہور کتاب ایران بعہد ساسانیاں میں موجود ہے۔ کہ مجوس کی بھی دو قومیں ہیں ایک کا نام ایرج ہے۔ اور دوسری کا طور۔ قدیم زمانے میں ایران کے بادشاہ فریدون کے دو بیٹے ایرج اور طور تھے۔ انہیں کے نام پر مجوس کی دو شاخیں پھیل گئیں۔ مجوسی بھی دراصل اہل کتاب تھے۔ مگر ہندوؤں کی طرح انہوں نے بھی مذہب کو بگاڑ دیا۔

حضرت علیؓ کی روایت میں آتا ہے[2]۔ کہ مجوسیوں کے کسی بادشاہ نے اپنی بہن کے ساتھ زنا کیا۔ اور پھر اُسے جائز قرار دینے کے لیے وقت کے علماء کو ساتھ ملایا۔ خود غرض مفتیوں اور عالموں نے بادشاہ کے حق میں فتویٰ دے دیا کہ ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کی شریعت میں بھی تو بہن کے ساتھ نکاح جائز تھا۔ گویا مجوسیت میں اس قسم کی بے حیائی بھی روا تھی حتیٰ کہ ماں کے ساتھ نکاح بھی جائز سمجھتے ہیں۔ مجوسیوں کی دوسری شاخ برہمن ہے۔ جو ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور تیسرے بدھ ہیں۔ جو چین اور جاپان میں آباد ہیں۔ یہ سب کی سب صابی امتیں ہیں۔

ایمان باللہ

ان چار گروہوں یعنی اہل ایمان۔ یہود، نصاریٰ اور صابی کا تذکرہ کر کے اب وہ اصول بتائے جا رہے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ تو فرمایا ان چاروں گروہوں میں سے مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا۔ یعنی کوئی شخص کسی بھی گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔ کتنا بڑا کافر اور مجرم ہو۔ بدترین قسم کا ظالم ہو۔ اگر اس نے صدقِ دل سے توبہ کر لی۔ اور

---

[1]
[2] تحفۃ الاحوذی ج ۳۹۲/۲، بحوالہ مصنف عبدالرزاق

اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لے آیا۔ تو اس کی توبہ قبول ہو جائے گی۔ اور وہ نجات حاصل کر لے گا۔
ایمان میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پہ ایمان لانا کافی نہیں۔ بلکہ اس کی صفات، اس کی تقدیر وحدانیت، اس کے انبیاء علیہم السلام اور اس کے فرشتوں پہ بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو۔ کہ خدا نبی نہیں بھیجتا یا حکم جاری نہیں کرتا۔ تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص اگر بغیر توبہ کے مر گیا، تو وہ جہنمی ہے۔ نبی بھیجنا، حکم جاری کرنا، شریعت دینا یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔
اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کا انکار بھی دوسرے معنوں میں اللہ تعالیٰ کی صفت کا انکار ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیض پہنچانے والی مخلوق ہے۔ یہ لطیف اجسام والی نورانی، پاک اور منزہ مخلوق ہے۔ ان پہ ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

ایمان بالآخرۃ

فرمایا ایمان حاصل کرنے کا دوسرا قانون ایمان بالآخرۃ ہے۔ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ یہ وہی دن ہے جو اس جہان کا آخری دن (LAST DAY OF THIS WORLD) ہوگا۔ پچاس ہزار سال کے اس دن میں تمام انسانوں کا حساب کتاب ہوگا۔ اور اس کے بعد دوسرا دور شروع ہو جائے گا۔ گویا قیامت کے دن کو ماننا بھی اتنا ہی لازم ہے۔ جتنا اللہ تعالیٰ پہ ایمان لانا۔ جو شخص روزِ جزا کا انکار کرے گا۔ وہ بھی کفر میں داخل ہو جائے گا۔

اعمال صالحہ

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے بعد تیسرا قانون وَعَمِلَ صَالِحًا ہے۔ یعنی نجات کا حقدار وہ شخص ہوگا۔ جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پہ ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اعمال صالحہ بھی انجام دیتا ہو۔ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ فرماتے ہیں کہ بنیادی طور پہ اعمال صالحہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ہیں۔ فقہائے کرام البتہ جہاد کو بھی بنیادی اعمال میں شمار کرتے ہیں۔ تو جو لوگ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے ساتھ ان بنیادی اعمال کو بھی انجام دیں گے۔ ان کے متعلق فرمایا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ان کو ان کے رب کے پاس بدلہ ملے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ان پہ مستقبل میں کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اور نہ وہ سابقہ اعمال

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج

پر غمگین ہوں گے۔ جیسا کہ روایات میں آتا ہے۔ کہ قیامت کے دن سب لوگ خوفزدہ ہوں گے۔ مگر یہ طبعی اور عارضی ہوگا۔ بالآخر وہ ہر قسم کے خوف سے بچ جائیں گے۔ بعض اوقات دنیا میں بھی بعض نیک لوگوں کو مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ اور وہ ملال و حزن سے دوچار ہوتے ہیں مگر یہ عارضی چیز ہے۔ نتیجے کے اعتبار سے ایسے لوگوں کو خوف نہیں ہوگا۔ حتیٰ کہ حشر والے دن کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا " لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ " بڑے دن کی گھبراہٹ بھی انہیں خوفزدہ نہیں کرے گی۔ اللہ ان کے دل کو سکون کی دولت سے مالا مال کرے گا۔ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ فرشتے ملاقات کریں گے تو انہیں تسلّی دیں گے۔ کہ گھبراؤ مت اب تمہارے لیے امن ہی امن ہے۔ اور آئندہ بھی کوئی خوف نہیں ہوگا۔ کہ ہم سے کسی وقت کوئی نعمت چھن جائے گی۔ یا کوئی تکلیف پہنچے گی۔ وہ لوگ دنیا میں انجام دیے گئے اپنے کسی عمل پر بھی غمگین نہیں ہوں گے۔

الغرض! اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نجات کا یہ قانون سمجھا دیا کہ نجات کسی خاص فرقہ یا گروہ کے لیے مختص نہیں ہے۔ ایمان کا دعویدار ہو یا یہودیت کا۔ کوئی عیسائی مذہب رکھتا ہو یا صابی۔ نجات کے لیے واحد قانون یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔ آخرت کے دن پر ایمان لائے اللہ تعالیٰ کے نبیوں، کتابوں اور فرشتوں پر ایمان لائے اور اعمال صالحہ انجام دے۔ اس کے بغیر نجات نہیں ہے۔ ہر گروہ اپنے ہی فرقے کو افضل اور حق پر سمجھتا ہے مگر نجات کا دارومدار اسی قانون پر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا۔ آگے قانون کی مزید تشریح آ رہی ہے۔

درس بست وہشت ۲۸

(آیت ۶۳ تا ۶۴)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

ترجمہ :- اور اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا۔ اور ہم نے تمہارے اوپر طور کو بلند کیا۔ جو کچھ ہم نے دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑو۔ اور یاد کرو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ ﴿۶۳﴾ پھر تم اس کے بعد پھر گئے۔ پس اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاتے ﴿۶۴﴾

بنی اسرائیل کا عہد

ان آیات میں بھی بنی اسرائیل کی خرابیوں کا ہی ذکر ہے۔ اس سے پچھلی آیت میں قانون نجات کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔ کہ نجات کسی خاص فرقہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس کا دارومدار ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ اور اعمال صالحہ پر ہے۔ آیات زیر درس میں بنی اسرائیل کی توجہ اس واقعہ کی طرف دلائی جا رہی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ جو کتاب میں تمہیں دے رہا ہوں اس کے احکام کی پابندی کرو گے۔ مگر وہ کہنے لگے کہ یہ احکام تو بڑے مشکل ہیں ہم سے عمل نہیں ہو سکے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ڈرانے کے لیے ان کے سروں پر کوہ طور کو کھڑا کر دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ جب بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات حاصل ہو گئی۔ فرعون اور اس کے تمام لشکر ہلاک ہو گئے۔ تو بنی اسرائیل نے خود ہی موسیٰ علیہ السلام سے فرمائش کی۔ کہ ہمارے لیے کوئی شریعت مقرر کرو۔ جس کی ہم پابندی کریں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص۲۷۱ پارہ ۱

تورات عطا فرمائی مگر وہ طرح طرح کے حیلے بہانوں سے اس کے احکام کو ٹالنے کی کوشش کرنے لگے۔ اولاً تو انہوں نے تورات کے منزّل من اللہ ہونے پر شک وشبہ کا اظہار کیا۔ اور اعتراض یہ کیا۔ کہ ہم اس کتاب پر ایمان لانے کیلئے تیار نہیں جب تک خود اللہ تعالےٰ اس کی تصدیق نہ کرے۔ کہ یہ اس کی عطا کردہ کتاب ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام ستّر آدمیوں کو لے کر کوہِ طور پر گئے۔ ان لوگوں نے اپنے کانوں سے اللہ تعالیٰ کا کلام سُنا۔ مگر اس کے باوجود گستاخی کی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دی۔ بجلی آئی اور سب کو خاکستر کر گئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے پھر انہیں زندگی عطا کی۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں[1]۔ کہ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود طور سے واپس آنے والے لوگوں نے اپنی قوم سے کہا۔ کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہم سے ہمکلام ہوا ہے۔ اور اس نے کہا ہے کہ یہ کتاب میں نے ہی دی ہے۔ مگر اس کے تمام احکام پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ اللہ تعالےٰ نے کہا۔ کہ جس قدر ممکن ہو۔ اس پر عمل کر لینا اور باقی کو چھوڑ دینا۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی فیصلہ کر لیا۔ کہ تورات کے جملہ احکام تو بہت مشکل ہیں۔ لہٰذا ہمیں ساری تورات پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور انہوں نے صریح احکام کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے اس کتاب پر عمل کرنے کا پختہ عہد کر لیا تھا۔ چنانچہ اسی کو فرمایا گیا ہے۔ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ

ارتفاعِ طور

فرمایا وَرَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ الطُّوۡرَ۔ اور ہم نے تمہارے اوپر طور کو بلند کیا۔ جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے۔ مطلب واضح ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے طور پہاڑ کو اٹھا کر ان کے سروں پر سائے کی طرح کھڑا کر دیا تھا یہ اتنی خوفناک صورت حال تھی کہ پہاڑ کسی وقت بھی اُن پہ گر کر اُن کو چکنا چور کر سکتا تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے پوچھا کہ تم تورات کے احکام پر عمل کرو گے یا نہیں۔ تو انہوں نے عہد کیا کہ مولا کریم! ہم سے یہ مصیبت ٹال دے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تیرے احکام پر عمل پیرا ہوں گے۔

معجزات کے بعض منکرین رَفَعۡنَا کی مختلف تاویلیں کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

---

[1] قصص القرآن صفحہ ۴۷۳ ج ۱ و صفحہ ۴۷۴

کہ پہاڑ کو بنی اسرائیل کے سروں پہ معلق نہیں کیا گیا تھا، بلکہ بنی اسرائیل کو پہاڑ کے دامن میں اس طرح کھڑا کیا گیا تھا کہ پہاڑ کا کچھ حصہ ان پہ جھکا ہوا تھا۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے سورۃ اعراف میں "نَتَقْنَا" کا واضح لفظ آتا ہے جس کا مطلب اٹھا کر کھڑا کر دینا ہے اور معجزانہ طور پر ایسا ہو جانا کونسی بعید بات ہے۔ جو اللہ تعالےٰ پتھر سے پانی نکال سکتا ہے سمندر کو پھاڑ کر اس میں بارہ راستے بنا سکتا ہے۔ منّ اور سلویٰ نازل کر سکتا ہے وہ اگر کسی پہاڑ کو اٹھا کر سروں پہ معلّق کر دے تو کون سی بڑی بات ہے۔ بلکہ تورات میں تو یہ تفصیل بھی آتی ہے کہ نہ صرف پہاڑ معلق ہو گیا تھا۔ بلکہ ساتھ دھواں اٹھ رہا تھا۔ اور آگ کے شعلے سامنے نظر آ رہے تھے الغرض ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے وہ عہد لیا۔ جس کا تذکرہ اس آیت میں آیا ہے

لغوی طور پہ طور ایسے پہاڑ پہ بولا جاتا ہے۔ جو سرسبز ہو۔ یعنی اس پہ بکثرت درخت پائے جائیں۔ خشک پہاڑ کے لیے طور کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ یہاں پہ جس پہاڑ کا ذکر ہے یہ وہی طور ہے۔ جو صحرائے سینا کے اطراف میں واقع ہے۔ اور اس کی ایک چوٹی پہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ سے شرفِ تکلم حاصل ہوا تھا۔ اسی پہاڑ پہ آپ کو توراۃ ملی تھی۔

دین میں جبر نہیں

بنی اسرائیل کے سروں پہ طور معلق کر کے عہد لینے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ تو جبری عہد ہو گیا۔ جو کہ ٹھیک نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے "لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ" یعنی دین میں جبر نہیں ہے۔ مگر یہاں پہ جبراً عہد کرایا گیا۔ مفسرین کرام[1] اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ بیشک دین میں جبر نہیں۔ مگر اس سے مراد یہ ہے کہ کسی کو کوئی دین اختیار کرنے پہ مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ اس کا دل مانے یا نہ مانے۔ کم از کم اسلام میں تو ایسا نہیں ہے۔ اسلام تو یہ چاہتا ہے۔ کہ تبلیغ کی جائے۔ اسلام کی خوبیاں بیان کی جائیں۔ اس کے متعلق اگر کوئی غلط فہمیاں ہیں۔ تو انہیں دور کیا جائے۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔ اور اسے اسلام کی دعوت دی جائے۔ اسلام کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمانوں نے کسی بھی زمانے میں کسی پہ جبر نہیں کیا۔ نہ کسی کو زبردستی مسلمان بنایا۔ البتہ کمیونسٹوں اور عیسائیوں کی تاریخ واضح ہے۔ کہ انہوں نے کیسے کیسے ظلم کیے۔ مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنایا گیا۔ اور بعض کو تہ تیغ کیا گیا۔

---

[1] تفسیر عزیزی ص ۲۷۶ پارہ ۱

کسی غیر مسلم کو اسلام میں داخل کرنے کے لیے قطعاً جبر روا نہیں ۔ البتہ فی الجملہ اسلام میں جبر ہے ۔ جو قانون شکنی کا مرتکب ہو گا ۔ اس پر جبر بھی ہو گا ۔ بنی اسرائیل پر پہاڑ معلق کرنے کا مقصد بھی یہی تھا ۔ کہ جو عہد کیا تھا ۔ اس کی پابندی کرو ۔ ورنہ یہ پہاڑ تمہارے اوپر گرا دیا جائے گا ۔ تورات میں تو یہ الفاظ آتے ہیں ۔ کہ اگر تم نے عہد کی پابندی نہ کی تو تمہارا مدفن یہیں بنے گا ۔

اگر قانون کی پابندی کے لیے جبر کو جبر فی الدین سمجھ لیا جائے ۔ تو سارا معاملہ ہی درہم برہم ہو جائے گا ۔ حدود اور تعزیرات کا سلسلہ بند کرنا پڑے گا ۔ جب کسی ملزم کو سزا دی جائے گی ۔ تو وہ جبر جبر کی دہائی دینے لگے گا ۔ کہ اس پر زیادتی ہو رہی ہے ۔ اُسے جبراً کوڑے لگائے جا رہے ہیں یا اُسے جبراً قید میں ڈالا جا رہا ہے ۔ حالانکہ یہ اس پر جبر نہیں ہو گا ۔ بلکہ قانون کی خلاف ورزی پر تعزیر ہو گی ۔ الغرض ! اسلام میں داخل کرنے کے لیے کسی پر جبر نہیں کیا جا سکتا ۔ البتہ قانون کی پابندی کرانے کے لیے جبراً سزا دی جا سکتی ہے ۔

مسلمانوں کے انحطاط کے زمانہ میں سلطان سلیم ترکیؒ نے عیسائیوں کی سازشوں سے تنگ آ کر حکم دے دیا ۔ کہ ترکی کی عملداری میں تمام عیسائیوں کو جبراً مسلمان بنا لیا جائے ۔ اُس زمانے کے شیخ الاسلام کو اس حکم کی خبر ملی ۔ تو فوراً سلطان کے پاس پہنچے اور اس سے اس حکم کے متعلق دریافت کیا ۔ سلطان نے تسلیم کیا ۔ کہ اُس نے عیسائیوں کی سازشوں سے تنگ آ کر یہ حکم صادر کیا ہے ۔ تو شیخ الاسلام نے دو ٹوک الفاظ میں سلطان سے کہا ۔ کہ آپ کا یہ حکم اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔ " لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ " کہ دین میں جبر نہیں ہے ۔ مگر آپ غیر مسلموں پر جبر کر رہے ہیں ۔ کہ وہ اسلام میں داخل ہوں ۔ سلطان بات کو سمجھ گیا اور اپنا حکم واپس لے لیا یہ تاریخی واقعہ ساری دنیا کو معلوم ہے ۔

استمساک بالکتاب

جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا ۔ اور انہوں نے اس کی پابندی کا اقرار کیا ۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ جو کچھ ہم نے دیا ہے ۔ اُسے مضبوطی سے پکڑ لو ۔ استمساک بالکتاب کا مطلب یہ ہے ۔ کہ اسے تسلیم کرو ۔ اس پر ایمان لاؤ ۔ اور پھر اسی کے مطابق عمل کرو ۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ پوری کوشش اور جانفشانی کے ساتھ اس کا

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۷۲ پارہ ۱

پڑھنا پڑھانا سیکھنا سکھانا۔ اس میں مندرج قوانین کی پابندی کرنا انسان کی ترقی اور حظیرۃ القدس کا ممبر بننے اور علیین تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ غرض کتاب کو مضبوطی سے پکڑنے کا مطلب مضبوط ہاتھوں سے پکڑنا نہیں۔ بلکہ اس کے قوانین پر سختی کے ساتھ عملدرآمد کرنا ہے۔ محض خالی خولی دعووں سے کام نہیں بنے گا۔

قوانین کی پابندی

استمساک بالکتاب کے بعد دوسرے نمبر پر فرمایا وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ اور جو کچھ اس میں ہے اُسے یاد کرو۔ یعنی اس کو پڑھتے پڑھاتے رہو۔ یہ قرآن پاک قانونِ خداوندی ہے۔ سنّت رسول اس کی شرح ہے۔ مگر آج کتنے لوگ ہیں۔ جو قرآن و سنّت سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ اس آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے بات ہمیں سمجھائی جا رہی ہے۔ کہ جو کچھ قرآن پاک میں قانون نازل ہوا ہے۔ اسے یاد کرو۔ اس کو خود پڑھو اور دوسروں کو پڑھاؤ۔ اس کی تشہیر کرو۔ تاکہ قانون کی تفصیلات عوام الناس تک پہنچ سکیں۔ جس طرح ایک عام دنیوی حکومت کے قانون کی تشہیر ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قانون قرآن پاک کو عام کرنا بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں۔ کہ حاکم وقت کو اپنی رعایا پر اس طرح مہربان ہونا چاہیئے۔ جیسے کوئی باپ اپنی اولاد پر ہوتا ہے۔ ایک باپ کی یہ انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اچھی تربیت کرے۔ ہر شریف النفس باپ ایسا ہی چاہے گا۔ بلکہ باپ تو یہ پسند کرے گا۔ کہ اس کا بیٹا اس سے زیادہ ترقی کرے۔ اسی طرح حاکم کو بھی اپنی رعایا کی تربیت اولاد کی طرح کرنی چاہیے۔ اور اپنے قانون کی خوب تشہیر کرنی چاہیئے۔ تاکہ رعایا کا کوئی فرد اس سے ناواقف نہ رہے۔ اور قانون پر عمل پیرا ہو جائے۔ اب اگر حاکم خود اپنے قانون کی پابندی کرے گا۔ تو رعایا بھی اس پر کاربند ہو گی۔ اور اگر وہ خود پابندی نہیں کرتا تو وہ دوسروں سے کیسے پابندی کروائے گا۔ جو شخص خود فاسق و فاجر اور بدکار ہے وہ دوسروں کو نیکی اور بھلائی کا کیا درس دے گا۔ جو خود جوا کھیلتا ہے۔ وہ دوسرے جواریوں کو کیسے سزا دے گا۔ شرابی حاکم شرابیوں سے کیسے

لہ

نپیٹے گا۔ لہٰذا ضروری ہے۔ کہ حاکم پہلے خود قانون کی پابندی کرے اور پھر دوسروں سے سختی کے ساتھ پابندی کروائے۔ اس کے بعد جو کوئی قانون شکنی کرے اسے سخت ترین سزا دے۔

فرمایا وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ اس میں جو کچھ لکھا ہوا ہے۔ اسے یاد کرو۔ اور اس کے پڑھانے کے لیے وسائل بھی مہیا کرو۔ مدرسے قائم کرو۔ معلّم مقرر کرو تاکہ ہر خاص و عام اس کی تعلیمات سے مستفید ہوں۔ اُسے علم ہونا چاہیئے۔ کہ ہمارا قانون بہترین قانون ہے۔ اس دستور سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دستور نہیں۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے۔ کہ میں تمام شریف ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کو چیلنج کرتا ہوں کہ اگر وہ پوری نیک نیتی کے ساتھ غور کریں گے تو اسلام سے بہتر کوئی قانون نہیں پائیں گے۔ لہٰذا میں تمہیں دعوت دیتا ہوں۔ کہ جس طرح میں نے اس دستور کو قبول کر لیا ہے۔ آؤ تم بھی اسے گلے لگا لو۔ اور فلاح پا جاؤ۔ کہ اس سے بڑھ کر کوئی ضابطۂ حیات نہیں ہے۔ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ کا یہی مطلب ہے۔

وہ کون سے جرائم ہیں۔ جو اس دنیا میں نہیں ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے "وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى" کہ زنا کے قریب تک نہ جاؤ۔ مگر آج آپ کے سامنے کیا کیا واقعات پیش ہو رہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ زنا بالجبر اور پھر انہیں ہلاک کر دینا ایک عام معمول بن چکا ہے جس سرزمین پہ اس قسم کے واقعات پیش آتے ہوں۔ وہاں پہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کیسے نازل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا غضب ہی آسکتا ہے ۱۹۱۷ء میں روس میں کیا ہوا۔ پونے دو کروڑ انسانوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ بڑے بڑے مالداروں کو ٹانگوں سے باندھ کر کئی کئی میل تک گھسیٹا گیا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ وہ سرمایہ داروں کی طرفداری کرتے تھے یہ لوگ انسانیت کے دشمن تھے۔ جس معاشرے میں اس قسم کے ظلم ہونے ہوں اور ان کے انسداد کا کوئی بندوبست نہ ہو۔ اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ عنقریب دنیا کے سامنے آجائے گا۔

فرمایا جو کچھ اس کتاب میں موجود ہے اسے یاد کرو۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ کہ تم متقی بن جاؤ گے۔ اگر انسان کا عقیدہ صحیح ہو۔ قرآن پاک کو پڑھتا پڑھاتا رہے۔ فریضۂ تبلیغ انجام دیتا رہے۔ تو متقیوں کی فہرست میں شامل ہو جائے گا۔ اور تقویٰ ایک ایسی چیز ہے۔

جس کو اختیار کرنے سے شریعت کے احکام کی تعمیل انسان کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک کو "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کی عہد شکنی

فرمایا اے بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ سے پختہ عہد کرنے کے بعد ثُمَّ تَوَلَّيْتُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ تم اس کے بعد اس عہد سے پھر گئے۔ اسے پورا نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے پھر بھی تم پر مہربانی کی اور تمہیں موقع دیتا رہا۔ کہ تم اپنے عہد کی پاسداری کر سکو۔ حتیٰ کہ یہ آخری موقع بھی دیا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن پاک بھی نازل ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا آخری نبی علیہ السلام بھی آچکا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ ایفائے عہد کرتے ہوئے" وَآمِنُوا بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ" اس چیز پر ایمان لے آؤ جو میں نے نازل کی ہے۔ یعنی قرآن پاک جو کہ اس چیز کی تصدیق کرتا ہے۔ جو پہلے سے تمہارے پاس ہے۔ یعنی توراۃ اور دیگر کتب سماویہ۔ لہٰذا اب بھی موقع ہے۔ کہ ایمان لے آؤ" وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ" اور اس کے ساتھ اولین کفر کرنے والے نہ بنو اگر ایسا کرو گے تو آنے والی نسلیں بھی تمہارے ہی نقش قدم پر چل کر راہِ راست سے بھٹکی رہیں گی۔

فرمایا اس کے باوجود فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی لَكُنتُم مِّنَ الْخَاسِرِينَ تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہوتے۔ فوراً ہلاک ہو جاتے اور تمہیں دوبارہ موقع بھی نہ ملتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے۔ کہ وہ تمہیں بار بار موقع دے رہا ہے۔ کہ اب بھی سمجھ جاؤ اور راہ راست پر آجاؤ۔ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری کوتاہیوں اور غلطیوں کی طرف دیکھے تو فوراً ہلاک کر دے اور توبہ کا موقع بھی نہ مل سکے۔

درس بست و نہ ۲۹

(آیت ۶۵ تا ۶۶)

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

ترجمہ:۔ اور البتہ تحقیق تم جانتے ہو، ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے ہفتے کے دن زیادتی کی تھی۔ پس ہم نے ان کو کہا کہ ذلیل بندر بن جاؤ ﴿۶۵﴾ اور بنا دیا ہم نے اُن لوگوں کو عبرت ان کے لیے جو اس وقت موجود تھے۔ اور جو پیچھے آنے والے تھے۔ اور متقیوں کے لیے نصیحت بنا دیا ﴿۶۶﴾

یہود کا مقدس دن ہفتہ

گذشتہ آیات میں اُس عہد و پیمان کا ذکر ہوا جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے لیا تھا۔ کہ وہ تورات پر عمل پیرا ہوں گے۔ اب ان آیتوں میں خداوند تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا وہ واقعہ یاد دلایا ہے۔ جس میں ان نافرمانوں کو سزا دی گئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ یعنی اے اسرائیلیو! تم ان لوگوں کو جانتے ہو۔ جنہوں نے ہفتے کے دن تعدی اور زیادتی کی تھی ہفتے کے دن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تورات میں حکم نازل فرمایا تھا۔ کہ اس دن کوئی شخص کوئی کام کاج نہ کرے، نہ تجارت کرے نہ زراعت کرے، نہ مزدوری کرے اور نہ کوئی دوسرا کام انجام دے حتیٰ کہ گھر میں کھانے پکانے کی بھی ممانعت کر دی۔ اور حکم دیا کہ اس روز صرف عبادت کی جائے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہ کیا جائے۔ اور ساتھ تنبیہ کر دی۔ کہ جو کوئی ہفتے کے روز اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے۔ کوئی کاروبار کرے گا، وہ ہلاک ہو جائے گا۔

جمعہ کی فضیلت

یہودیوں کے لیے ہفتہ اور نصاریٰ کے لیے اتوار کا دن مقدس ہے۔ مگر اہل اسلام کے لیے جمعہ کا دن مبارک ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[1]۔ کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی

---

[1] بخاری ص ۱۲۰ ج ۱، مسلم ص ۲۸۲ ج ۱

امتّوں کو بھٹکا دیا۔ کہ وہ جمعہ کا دن نہ پا سکیں۔ بلکہ یہ فضیلت اللہ تعالیٰ نے آخری امت کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ کیونکہ جمعہ تمام ایّام سے زیادہ فضیلت والا دن ہے۔ آپ نے فرمایا اَلْیَھُوْدُ غَدًا یعنی یہود نے جمعہ سے اگلا دن اختیار کیا وَالنَّصٰرٰی بَعْدَ غَدٍ اور نصاریٰ نے اس کے بعد یعنی اتوار کا دن منتخب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی حد تک اختیار دے دیا تھا کہ وہ اپنے لیے بہتر دن منتخب کر لیں۔ اور انہوں نے یہ ایّام پسند کیے۔ اور جمعہ کو منتخب نہ کیا۔ جو کہ مسلمانوں کے مقدر میں تھا۔ یہودیوں نے ہفتے کا دن اس لیے اختیار کیا کہ کائنات کی تخلیق ہفتہ کے روز شروع ہوئی تھی۔ اس لیے ان کے ہاں یہ سب سے متبرک دن سمجھا گیا۔

یہود کی قانون شکنی

جیسا کہ بیان ہو چکا۔ اللہ تعالیٰ نے ہفتے کا دن خالص عبادت کے لیے مقرر کیا تھا اور اس روز دیگر ہر قسم کے کام کی ممانعت کر دی تھی۔ مگر یہود نے اس حکم کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ اس خلاف ورزی کی تفصیل قرآن پاک میں کئی ایک مقامات پر آئی ہے۔ تاہم سورۃ اعراف میں ایک پورا رکوع اسی موضوع پر ہے۔ وہاں پر ہفتے کے روز تعدی کرنے والوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ کہ یہ لوگ بحیرہ قلزم کے کنارے واقع بستی میں رہتے تھے۔ تورات کے مطابق اسی بستی کا نام ایلہ تھا۔ جسے آج کل عقبہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ چونکہ یہ ساحلی لوگ تھے۔ ان کا پیشہ عام طور پر ماہی گیری تھا۔ تاہم انہیں ہفتہ کے علاوہ باقی چھ دنوں میں مچھلیاں پکڑنے کی عام اجازت تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا امتحان لینا چاہا۔ کہ یہ لوگ کس حد تک میرے حکم کی پابندی کرتے ہیں۔ لوگوں نے مشاہدہ کیا۔ کہ ہفتہ کے روز بہت زیادہ مچھلیاں نظر آتی تھیں۔ جب کہ باقی دنوں میں خال خال ہی پکڑی جاتی تھیں۔ تو انہوں نے زیادہ تعداد میں مچھلیاں حاصل کرنے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی۔ کہ سمندر کے کنارے حوض بنائے۔ جن میں ہفتے کے روز سمندر کا پانی چھوڑ دیتے جب بہت سی مچھلیاں ان حوضوں میں جمع ہو جاتیں۔ تو پیچھے بند لگا دیتے تاکہ یہ مچھلیاں واپس سمندر میں نہ چلی جائیں۔ چنانچہ وہ لوگ ہفتہ کے روز واقعتہً مچھلیوں کو نہ پکڑتے بلکہ انہیں حوض میں جمع کر کے اگلے روز یعنی اتوار کو پکڑ لیتے۔ گویا اس طرح وہ حیلہ سازی سے احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے جب اُن سے کہا جاتا کہ بھائی! اللہ تعالیٰ نے ہفتے کے روز مچھلیاں پکڑنے سے منع کر

رکھا ہے۔ تم ایسا کیوں کرتے ہو۔ تو وہ کہتے کہ ہم ہفتے کے روز شکار نہیں کرتے بلکہ اگلے روز کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ کوئی خلاف ورزی نہیں ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں[1] کہ یہ لوگ کافی عرصہ تک یہی حیلہ استعمال کرتے رہے۔ حتیٰ کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ آیا۔ تو انہوں نے لوگوں کو سختی سے منع کیا اور بتایا کہ اس روز شکار کرنا حرام ہے۔ یہ حیلہ سازی بہت بُری بات ہے۔ وہ کہنے لگے کہ یہ کام تو ہم اپنے آباؤ اجداد سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس میں کوئی بُرائی کی بات نہیں ہے۔ کفار مکہ بھی یہی کہتے تھے۔ کہ جس چیز کو تم شرک بتاتے ہو۔ یہ کام تو ہم نسلاً بعد نسلٍ کرتے چلے آرہے ہیں۔ اگر یہ واقعی برائی کا کام ہوتا تو اللہ تعالیٰ ضرور ہمیں روکنے کے لیے ہمارے ہاتھ بند کر دیتا۔ چونکہ آج تک ایسا نہیں ہوا۔ لہٰذا یہ کوئی بُرا کام نہیں۔

یہود کے تین گروہ

الغرض! حضرت داؤد علیہ السلام نے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام سنایا۔ انہیں نیکی کی تلقین کی اور برائیوں سے منع کیا۔ انہوں نے اچھی طرح تنبیہہ کی۔ کہ اگر تم اپنی بُری خصلتوں سے باز نہیں آؤ گے۔ تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجاؤ گے۔ آپ کی اس تبلیغ سے تقریباً بارہ ہزار لوگ نہ صرف خود اس غلط کام سے باز آگئے۔ بلکہ انہوں نے دوسروں کو بھی روکنا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی۔ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے باز آنے کے لیے تیار نہ تھے۔ گویا ایک گروہ فاسقین کا تھا۔ تو ان کے مقابلے میں صالحین کا ایک گروہ بھی پیدا ہو گیا۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ ایسا تھا۔ جو خود تو بُرائی کا ارتکاب نہ کرتا تھا مگر دوسروں کو روکتا بھی نہ تھا۔ آگے قرآن پاک میں آتا ہے۔ کہ یہ گروہ برائی سے منع کرنے والوں کو کہتا تھا۔ کہ تم انہیں کیوں روکتے ہو۔ کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ انہیں اپنے حال پہ چھوڑ دو۔ مگر صالحین کا گروہ انہیں جواب دیتا "مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ" کہ بھائی! اللہ تعالیٰ کے سامنے عذر داری کے لیے انہیں روکتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے پوچھ لیا۔ کہ تم نے انہیں برائی سے کیوں نہ روکا تو ہمارا کیا جواب ہوگا۔ قیامت کے روز ندامت اٹھانی پڑے گی۔

اہل علم کے لیے ضروری ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان اور اس کی عطا کردہ شریعت

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی پارہ ۱ صفحہ ۲۷۴

لوگوں تک پہنچائیں۔ اور تبلیغ کا حق ادا کریں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی تبلیغ سے کوئی شخص راہ راست پر آجائے اسی واسطے بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے[1] کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو جھنڈا عطا کیا اور جہاد کے لیے روانہ کیا تو فرمایا لَاَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ اَنْ يَّكُوْنَ لَكَ حُمُرُ النَّعَمِ اگر ایک آدمی نے بھی تمہاری وجہ سے ایمان قبول کر لیا۔ تو یہ تمہارے لیے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت سے بھی بہتر ہوگا۔ جہاد کا اصل مقصد جنگ و جدال نہیں بلکہ اس کا مقصد فتنہ و فساد کو مٹانا اور درندہ صفت لوگوں کو راستے سے ہٹانا ہے

انسان بندر بن گئے

وقت گذرتا گیا۔ اور یہ تینوں گروہ اپنی اپنی بات پر اڑے رہے۔ آخر کار صالحین نے سوچا کہ ہم ان نافرمانوں کے ساتھ کب تک گذارا کریں گے۔ کیوں نہ ہم ان سے الگ ہو جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے اور ہم بھی اس میں مبتلا ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے باقی دو گروہوں کا بائیکاٹ کر دیا اور قریب ہی اپنے علیحدہ علاقے میں منتقل ہو گئے۔ ان دونوں علاقوں کے درمیان دیوار یا کوئی اور آڑ تھی جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ البتہ ایک دوسرے کی آوازیں سنتے تھے۔

ایک دن ایسا ہوا۔ کہ صالحین کے گروہ نے دوسرے گروہ کے کسی آدمی کی آواز نہ سُنی۔ اور نہ ہی اُن کی کوئی حرکت وغیرہ محسوس کی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد جب انہوں نے جھانک کر دیکھا۔ تو اللہ تعالیٰ کا حکم آچکا تھا فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ پس ہم نے کہا کہ تم سب ذلیل بندر بن جاؤ۔ چنانچہ صالحین نے دیکھا۔ کہ اس گروہ کے بڑے بوڑھے خنزیروں کی شکل میں اور نوجوان طبقہ بندروں کی صورت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ شکلیں تبدیل ہو چکی ہیں مگر شعور باقی ہے۔ اپنے کیے پر نادم ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں کہ یہ ہمارے فلاں رشتہ دار ہیں۔ اور یہ فلاں رشتہ دار ہیں۔ اس مقام پر صرف بندروں کا ذکر ہے تاہم دوسرے مقام خنازیر بھی آتا ہے " وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ " کہتے ہیں کہ یہ لوگ اس شکل و صورت میں تین دن تک زندہ رہے۔ اس کے بعد ہلاک ہو گئے۔

---

[1] بخاری ص۶۰۶ ج۲، مسلم ص۲۷۹ ج۲

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ انسان بندر اور خنزیر کیسے بن گئے۔ حالانکہ اس زمانے میں ڈارون کی تھیوری کا بھی عام چرچا ہے۔ جو کہتا ہے۔ کہ موجودہ انسان بندروں کی ترقی یافتہ نسل ہے پہلے سب بندر ہی تھے۔ مگر ترقی کرتے کرتے انسان بن گئے۔ اس کا دعویٰ اس دلیل پر مبنی ہے۔ کہ بندر کی شکل انسانی شکل کے مشابہ ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان بندر یا خنزیر کی نسل نہیں ہے۔ اور نہ بندر انسان کی نسل سے ہیں۔ بلکہ یہ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ بندر اور انسان پہلے بھی علیحدہ علیحدہ نسلیں تھیں اور آج بھی ویسی ہی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے۔ کہ معترضین ڈارون کی تھیوری کو تسلیم کرنے میں تو کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ مگر جب قرآن پاک کہتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ان انسانوں کو بندروں کی شکلوں میں تبدیل کر دیا۔ تو انہیں یقین نہیں آتا۔

حیلہ سازی بری خصلت ہے

بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے[۱]۔ کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا لَعَنَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی۔ یہود و نصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو منع کیا تھا کہ تمہارے لیے چربی کا استعمال جائز نہیں۔ خواہ حلال جانور ہی کی ہو۔ مگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم میں اس طرح حیلہ سازی کی۔ کہ چربی خود تو نہیں کھاتے تھے۔ مگر اسے پگھلا کر فروخت کر دیتے تھے۔ اور اس کی قیمت کھا جاتے تھے۔ جب ان سے کہا جاتا۔ کہ تمہارے لیے چربی حرام ہے تم اسے کیوں کھاتے ہو۔ تو وہ کہتے کہ ہم چربی تو نہیں کھاتے۔ بلکہ اُسے فروخت کر دیتے ہیں۔ اسی لیے حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے[۲] لَا تَرْتَکِبُوْا مَا ارْتَکَبَتِ الْیَھُوْدُ اے ایمان والو! اس چیز کا ارتکاب نہ کرو۔ جس کا یہود کرتے تھے۔ فَتَسْتَحِلُّوْا مَحَارِمَ اللّٰہِ بِاَدْنَی الْحِیَلِ کہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو حیلے بہانے سے حلال کر لیتے تھے۔ کہیں تم بھی ان کی پیروی کر کے مغضوب علیہ نہ بن جانا۔

یہود بعض برائیاں کھلے عام کرتے تھے۔ مثلاً سود علی الاعلان کھاتے تھے اسی طرح دوسروں کا مال ناحق کھا جاتے تھے۔ مگر ان برائیوں پر اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں مسخ نہیں کیں۔ ایسا کیا ہے۔ تو اُن جرائم پر جن کا ارتکاب انہوں نے حیلے بہانے سے کیا۔ معلوم ہوا کہ ناجائز

---

[۱] مسلم ج۲ ص۲۳، بخاری ج۱ ص۲۹۶، [۲] تفسیر ابن کثیر ج۱ ص۱۰۷

حیلہ سازی بہت بُری خصلت اور بہت بڑا جرم ہے جس پہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خنزیروں اور بندروں کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ تم حیلہ سازی سے خدا تعالیٰ کے قانون کو نہ توڑنا۔ یہ بڑا سخت جرم ہے ایسا کہنے والوں کی اگرچہ اب شکلیں تو تبدیل نہیں ہوں گی۔ مگر ان کا باطن بالکل ایسا ہی ہوگا۔ اب کیا کچھ نہیں ہوتا۔ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے حیلہ سازی کی جاتی ہے۔ سود اور رشوت کی تاویلیں کی جاتی ہیں۔ اور اس کے جواز کا فتویٰ لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ حیلہ سازی اور حرام ہے۔

جائز حیلہ سازی

اگر نیت نیک ہو اور حیلہ سازی حرام سے بچنے کے لیے کی جائے تو یہ جائز ہے۔ حضور علیہ السلام نے بعض امور میں خود حیلہ سازی کا طریقہ بتلایا ہے۔ مثلاً حدیث شریف میں آتا ہے[1]۔ کہ حضرت بلال رضؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ خیبر سے بہت اعلیٰ قسم کی کھجوریں لائے۔ آپ نے دریافت فرمایا اَکُلُّ تَمرِ خَیبَرَ ھٰکَذَا کیا خیبر کی سب کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضور! بعض گھٹیا اور ناقص قسم کی کھجوریں بھی وہاں پائی جاتی ہیں۔ آپ کے مزید دریافت کرنے پر صحابہؓ نے بتایا کہ ہم ادنیٰ قسم کی دو صاع کھجوروں کے عوض اعلیٰ قسم کی ایک صاع کھجوریں لے لیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ذٰلِکَ الرِّبٰو یہ تو سود ہو گیا۔ ایک ہی جنس کا لین دین تو برابری کی بنیاد پہ ہونا چاہیئے۔ نہ کہ کم و بیش۔ ایسا نہ کرو۔ یہ حرام ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارے مسئلہ کا حل یہ ہے۔ کہ پہلے ادنیٰ قسم کی کھجوروں کو کسی دوسری جنس مثلاً گندم، جَو کے عوض بیچ ڈالو۔ یا ان کی نقد قیمت وصول کر لو۔ اور پھر اس سے اعلیٰ درجے کی کھجوریں خرید و۔ یہ حیلہ جائز ہے۔

اس قسم کی مثالیں قرآن پاک میں بھی ملتی ہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کسی معمولی بات پہ ناراض ہو گئے۔ تو قسم کھائی۔ کہ تندرست ہو گیا۔ تو بیوی کو سو لاٹھیاں یا کوڑے ماروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تمہاری بیوی نیک خاتون ہے۔ اس کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو۔ بلکہ اپنی قسم پوری کرنے کے لیے سَو چھڑیوں کا ایک گٹھا لے لو۔ اور ایک ہی دفعہ بیوی کو ضرب لگا دو یہ کافی ہے۔ گویا سو کوڑوں کی سزا سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ حیلہ سازی بتلائی۔

---

[1] سنن نسائی صفحہ ۲۱۹ ج ۲، بخاری صفحہ ۱۰۹۲ ج ۲

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں بھی حیلہ سازی کا ذکر آتا ہے۔ کہ آپ اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ مگر اس ملک کے قانون کے مطابق وہ انہیں نہیں روک سکتے تھے اُدھر اسرائیلی قانون کے مطابق جو شخص چوری کا ارتکاب کرے اُسے سال بھر غلامی کرنا پڑتی تھی ۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائی کو روکنے کے لیے اسرائیلی قانون کا سہارا لیا۔ اور اس کے لیے حیلہ یہ بنایا۔ کہ اس کے سامان سے پیمانہ برآمد کر لیا۔ اسی حیلہ سازی کو قرآن پاک نے اس طرح بیان فرمایا "كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ" ہم نے یوسف علیہ السلام کو ایسا کرنے کی تدبیر بتائی تھی۔

البتہ ناجائز حیلہ سازی بہرحال حرام ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کے لیے زیور بیوی کے نام ہبہ کر دیا۔ جب اس کے پاس سال پورا ہونے لگا۔ تو بیوی نے خاوند کے نام ہبہ کر دیا۔ گویا نہ کسی کے ہاں زیور پر پورا سال گذرے اور نہ اُس کی زکوٰۃ دینی پڑے ۔ یہ حیلہ سازی ناجائز ہے اسی طرح کسی بھی فرض، روزہ، نماز، جہاد وغیرہ سے بچنے کے لیے کوئی حیلہ سازی کرے گا تو مجرم ٹھہرے گا۔

تبدیلی اشکال کی توجیہہ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان نافرمانوں کو جانوروں کی شکل میں اور خاص طور پر خنزیروں اور بندروں کی شکل میں کیوں تبدیل کیا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک قانون مقرر کیا تھا۔ کہ ہفتے کے دن سوائے عبادت کے کوئی کاروبار نہیں کریں گے۔ مگر انہوں نے حکم خداوندی کو توڑ کر مچھلی کا شکار شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا کے طور پر خنزیر اور بندر بنا دیا۔

محققین فرماتے ہیں[1] کہ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے۔ کہ انسان اور جانور میں یہی فرق ہے۔ کہ انسان قانون کی پابندی کرتا ہے ۔ اور جانور اس سے مستثنیٰ ہے۔ اب اگر انسان بھی قانون کی خلاف ورزی شروع کر دے تو ظاہر ہے کہ وہ انسانیت کے درجے سے گر کر حیوانیت کے درجے پر آ گیا۔ اور ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے انسان بندر سے زیادہ مشابہ ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں بندر کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ شکل و صورت کے علاوہ بندر حس اور شعور میں

---

[1] الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن از حضرت سندھیؒ صفحہ ۴۹/۱ مطبوعہ کبیر والا

بھی انسان سے مشابہ ہوتا ہے۔ یہ بڑا نقال جانور ہے۔ جس طرح انسان کو کرتے ہوئے دیکھے اسی طرح کرنے لگتا ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے اُن نافرمانوں کو جانوروں کی اس قسم میں تبدیل کیا جو اُن سے زیادہ مشابہ ہیں۔

مفسرین فرماتے ہیں[1] کہ جب اکیلا آدمی کسی ضابطے کی پابندی کرتا ہے۔ تو اسے اخلاق کا نام دیا جاتا ہے۔ اور جب کوئی دو افراد آپس میں کوئی معاملہ طے کرتے ہیں۔ تو اسے قانون کہا جاتا ہے۔ قانون کی ادنیٰ ترین صورت میاں بیوی کے درمیان نکاح کا ضابطہ ہے۔ جس کی پابندی دونوں فریقوں پر لازم ہے۔ اگر کوئی فریق اس قانون کو توڑے گا۔ تو وہ انسانیت کے درجے سے گر کر حیوانیت کے زمرے میں شامل ہو جائے گا۔ اس کی مزید وضاحت یوں سمجھیں کہ عقد نکاح کے قانون کے مطابق کوئی عورت ایک ہی مرد کے ساتھ مختص ہوتی ہے۔ یہ ایک معاہدہ یا (AGREEMENT) ہوتا ہے۔ جس کی پابندی ضروری ہے۔ اگر اسی ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عورت ایک مخصوص مرد کی بجائے کسی دوسرے مرد کی خلوت میں بھی چلی جائے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ وہ جانور کی سطح پہ آجائے گی۔ جس پر کسی ایسے قانون کی پابندی لازم نہیں۔ اسی طرح مرد اگر اپنی منکوحہ عورت کی علاوہ کسی دوسرے عورت کی طرف نظر بد سے دیکھتا ہے۔ تو وہ قانون کی خلاف ورزی کر کے انسانیت کے درجے سے گر جائے گا۔

اب نکاح کی بھی شرائط ہیں۔ نکاح ایسے مرد اور عورت کے درمیان ہو سکتا ہے۔ جو آپس میں محرمات میں سے نہ ہوں۔ اگر محرم ہوں گے۔ تو نکاح جائز نہیں ہوگا۔ اگر ایسا کریں گے تو قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[2] کہ ان تمام شرائط کے ساتھ جو کام ہوگا وہ درست ہوگا۔ ورنہ قانون شکنی کی زد میں آجائے گا۔ اسی طرح مباشرت کے لیے بھی بعض شرائط ہیں۔ کہ کوئی شخص اپنی عورت کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے مرد کے ساتھ جائز نہیں۔ جب مرد اور عورت آپس میں ملیں گے۔ وہ بھی فطری طریقے سے۔ غیر فطری راستے سے انتفاع بھی خلافِ قانون ہے، جو کسی طرح جائز نہیں۔

---

[1] الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن ص۴۹ ج۱   [2]

قانون شکنی پہ خنزیر اور بندر کی سزا اللہ تعالیٰ نے اس واسطے دی ہے۔ کہ یہ دونوں جانور اخلاقی طور پہ دوسرے جانوروں کی نسبت زیادہ گرے ہوئے ہیں۔ خنزیر ایک ایسا جانور ہے۔ کہ اس کی مادہ کے ساتھ کئی کئی نر بیک وقت جفتی کرتے ہیں۔ یہ اس قسم کا بے غیرت جانور ہے۔

اور بندر کی ایک بہت بری خصلت یہ ہے۔ کہ یہ اپنے ہی ہم جنس بندر کے ساتھ بھی قضائے شہوت کر لیتا ہے۔ خنزیر قانون کی ایک شق کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ تو بندر دوسری شق کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ سور کا گوشت کھانے والے لوگ بے غیرت ہوتے ہیں۔ انگریز اور سکھ جو خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں۔ ان میں بے غیرتی کا مادہ کثرت سے پایا جاتا ہے۔ الغرض جب یہود نے اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑ ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں ان جانوروں میں تبدیل کر دیں۔ جو خود قانون شکن ہے۔

نماز کا ایک اہم قانون ہے۔ کہ مقتدی امام سے آگے نہ نکلے۔ رکوع، سجود، قومہ، قعدہ، ہر مقام پہ امام کی اقتدا میں ہے۔ اور اگر کوئی نمازی امام سے آگے نکلنے کی کوشش کرے گا تو اس کی مثال گدھے کے ساتھ دی گئی ہے۔ جو کہ بڑا بیوقوف جانور ہے۔ گویا جو شخص نماز کے قانون کو توڑتا ہے۔ وہ گدھے کی مانند ہے۔ یہ تو اس کی باطنی صورت ہے۔ فرمایا[1] امام سے آگے نہ نکلو کہیں ایسا نہ ہو یَجْعَلُ اللّٰہُ صُوْرَتَہٗ صُوْرَۃَ حِمَارٍ کہ اللہ تعالیٰ اس کی شکل گدھے کی نہ بنا دے یعنی کہیں ظاہری طور پہ بھی قانون شکن گدھا ہی نہ بن جائے قانون شکنی پہ سخت وعید آئی ہے۔

نشانِ عبرت

فرمایا اے بنی اسرائیل! تم جانتے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے ہفتے کے دن تعدی کی اور حکم بجا نہ لائے۔ بلکہ حیلہ سازی سے اس کی حرمت کو توڑا۔ تو ہم نے انہیں کہا۔ کہ ذلیل و خوار بندر بن جاؤ۔ پھر جب وہ بندروں کی شکلوں میں تبدیل ہو گئے۔ تو باقی دنیا کے لیے وہ نشانِ عبرت بن گئے۔ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا ہم نے انہیں موجودہ اور آئندہ آنے والے لوگوں کے لیے عبرت کا نشان بنا دیا۔ لوگوں کی زبانوں پہ اور تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہو گیا۔ کہ فلاں قوم نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں خنزیر اور بندر

---

[1] بخاری ص ۹۶ ج ۱، مسلم ص ۱۸۱ ج ۱

بنا دیا۔ یہ اس لیے کہ اس واقعہ کو یاد کر کے آئندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچیں۔
فرمایا تبدیل اشکال محض عبرت کے لیے ہی نہیں بلکہ اسے وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ بھی بنا دیا۔ کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لیے اس واقعہ میں نصیحت ہے۔ کہ اگر آئندہ بھی کسی نے اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑا۔ تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے متقیوں کے لیے اس واقعہ کو نصیحت بنا دیا۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ
قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾

ترجمہ: اور جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے۔ بیشک اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ تو انہوں نے کہا۔ کیا تو بناتا ہے ہم کو ٹھٹھا کیا ہوا موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ پناہ بخدا۔ اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں ﴿۶۷﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی حیلہ سازی کا تذکرہ بیان فرمایا تھا۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کو کس طرح توڑتے تھے۔ اس جرم کی پاداش میں ان کی شکلوں کو تبدیل کر دیا گیا۔ اور بالآخر وہ ہلاک ہو گئے۔ آیت زیر درس میں بنی اسرائیل کے ایک اور واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں اس قوم کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ مگر انہوں نے اس حکم کو ٹالنا چاہا۔ اور اس ضمن میں طرح طرح کے سوال کئے۔ گویا بال کی کھال اتارتے رہے ہیں۔ من حیث القوم یہ خرابی بھی بنی اسرائیل میں موجود تھی۔ اس آیت میں اسی بات کا ذکر کیا گیا ہے۔

واقعاتی ربط

دراصل گائے ذبح کرنے کا حکم ایک خاص مقصد کے تحت دیا گیا تھا۔ جس کا ذکر اگلے رکوع کی پہلی آیت میں ہے۔ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا "جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا۔ اور الزام ایک دوسرے کے سر تھوپنے لگے" وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ "اور اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے۔ جس کو تم چھپاتے ہو۔ قتل تو ہو گیا مگر قاتل کا پتا نہیں چلتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔ کہ تم ایک گائے ذبح کرو اور اس کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم پر مارو، تو وہ زندہ ہو کر خود بتا دے گا۔ کہ اس کا قاتل کون ہے، چنانچہ قاتل کا پتہ چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ جس کا تذکرہ آیت زیر درس میں ہو رہا ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جس مقصد کی خاطر گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا۔

اس کو تو بعد میں بیان کیا ہے۔ مگر اس حکم کا تذکرہ پہلے کر دیا گیا ہے۔ گویا واقعات کے تقدم و تاخر کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس کے متعلق مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ قرآن پاک کا اسلوب بیان یہ ہے۔ کہ جو چیز زیادہ ضروری ہوتی ہے اُسے پہلے بیان کیا جاتا ہے۔

اس واقعہ کے دو اجزاء ہیں۔ ایک اصل قتل جس میں مقتول کا حق ضائع ہوا۔ اور دوسرا جزو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً ط اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے۔ کہ گائے ذبح کرو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم بندوں کے حق پر مقدم ہے۔ اس لیے گائے ذبح کرنے کے واقعہ کو مقدم رکھا اور اصل واقعہ قتل کو مؤخر کر دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں بعض دوسری مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے حق کو بندوں پر مقدم رکھا گیا ہے مثلاً وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ط تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنا حق پہلے بیان کیا اور والدین یعنی بندوں کا بعد میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح سورۃ لقمان میں آتا ہے: وَاِنْ جَاھَدٰکَ عَلٰٓی اَنْ تُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْھُمَا "اگر ماں باپ اللہ تعالیٰ کے حقوق ضائع کرنا چاہیں یعنی تمہیں شرک پر آمادہ کریں۔ تو اُن کی اطاعت مت کرو، یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کو والدین کے حق پر مقدم رکھا اس واقعہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے ذبح گائے کو مقدم رکھا۔ کہ یہ اس کا اپنا حق ہے اور مقتول کے حق یعنی دیت یا قصاص وغیرہ کو مؤخر کر دیا۔

اس واقعہ سے حیات بعد الممات کا مسئلہ بھی حل ہوتا ہے: "کَذٰلِکَ یُحْیِ اللّٰہُ الْمَوْتٰی" کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر اُس مردہ کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ اور اس نے اپنے قاتل کی نشاندھی کر دی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے روز تمام مردوں کو دوبارہ زندہ کر دے گا۔ اور پھر حساب کتاب اور جزا و سزا کے تمام واقعات پیش آئیں گے۔

وجہ قتل

ملا علی قاریؒ دسویں صدی کے بڑے پائے کے محدث گزرے ہیں آپ کا اصل وطن ہرات تھا۔ مگر مکہ میں آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے عربی میں مرقات کے نام سے مشکوٰۃ شریف کی بلند پایہ شرح لکھی ہے۔ اپنی اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں۔ کہ بنی اسرائیل میں ایک بڑا دولتمند

ل

شخص تھا۔ جس کی ایک بیٹی تھی۔ کسی نے اُسے نکاح کا پیغام بھیجا مگر اس شخص نے قبول نہ کیا جس کی وجہ سے اُسے قتل کر دیا گیا۔[1]

عام طور پر مفسرین کرام وجہ قتل یہ بیان کرتے ہیں[2] کہ عامیل نامی ایک دولت مند شخص تھا۔ جو کہ لاولد تھا۔ اُس کے بھائی کے لڑکے اس کی جائیداد کے وارث تھے۔ چنانچہ اس کے بھتیجے اس تاک میں تھے۔ کہ یہ مرے تو اس کی جائیداد پر قبضہ کریں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ؒ لکھتے ہیں[3]۔ کہ اُس شخص کے بھتیجے مناسب موقع کی تلاش میں رہے۔ آخر ایک دن اُسے کسی کام کے بہانے کہیں دوسری جگہ لے گئے اور ویرانے میں جا کر قتل کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے خود ہی رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ کہ کسی نے ان کے چچا کو قتل کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ قریبی بستی والوں پر قتل کا الزام لگایا۔ اور ان سے دیت بھی طلب کی۔ مگر بستی والوں نے اس قتل میں ملوث ہونے کی نفی کی، اور کہا کہ ہم اس معاملہ میں بالکل بے گناہ ہیں۔ "فَادّٰرَءْتُمْ فِیْھَا" میں یہی بات بیان کی گئی ہے۔ کہ تم قتل کا الزام ایک دوسرے پر لگا رہے تھے۔

قانون قسامت یہ ہے[3] کہ اگر کسی مقتول کے قاتل کا پتا نہ چلتا ہو۔ تو وقوعہ قتل سے قریب ترین بستی کے لوگوں سے قتل کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔ اگر وہ انکار کریں تو ان میں سے پچاس آدمی منتخب کر کے قسم دلائی جائے گی۔ کہ نہ انہوں نے خود قتل کیا ہے۔ اور نہ وہ قاتل کو جانتے ہیں۔ ایسا کرنے سے وہ لوگ قتل کے الزام سے تو بری ہو جائیں گے۔ تاہم انہیں مقتول کے ورثا کو دیت یعنی خون بہا دینا پڑیگا۔ قانون قسامت

اس واقعہ کے متعلق مفسرین کرام کی مختلف آراء ہیں بعض کہتے ہیں[4]۔ کہ قتل کے اس واقعہ کے وقت بنی اسرائیل میں قسامت کا قانون رائج تھا۔ جس کا ذکر توراۃ میں بھی موجود ہے۔ اور یہ ہماری شریعت میں بھی موجود ہے۔ بنی اسرائیل کا قانون قسامت یہ تھا۔ کہ قاتل نامعلوم ہونے کی صورت میں وقوعہ کی قریبی بستی سے معتبرین کو نکالا جائے گا۔ اور وہ لوگ بچھیا (گائے) لیں جس نے نہ حل چلایا ہو۔ بلکہ درمیانی عمر کی ہو۔ اور بے عیب ہو۔ وہ لوگ بچھیا کو پاس بہنے والی ندی پر لیجا کر

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۱۰۸ ج ۱ [2] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۷۸ پارہ ۱ [3] ہدایہ ص ۵۴۶، ۵۴۷ ج ۴

[4] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۷۸ پارہ ۱

اس کی گردن توڑ دیں ۔ اور پھر لاوی خاندان کے کاہن اس پر کچھ پڑھیں پڑھائیں۔ یہ لوگ اس ندی پہ اپنے ہاتھ دھوئیں اور یوں کہیں کہ اے پروردگار ہم اس خون سے بری ہیں۔ نہ ہم کو علم ہے کہ یہ خون کس نے کیا ہے۔ جب وہ ایسا کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کو معاف کر دے گا۔

کثرتِ سوال سے بچو

بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں[1] کہ جس وقت قتل کا یہ واقعہ پیش آیا۔ اس وقت تک توراۃ نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔ چونکہ ان کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود نہیں تھا۔ اس لیے وہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نبی بھی تھے اور ظاہری طور پہ حکومت بھی موسیٰ علیہ السلام کی تھی۔ چنانچہ آپ نے ان لوگوں کو فرمایا کہ بھائی! ایک گائے ذبح کرو تو تمہارے مسئلہ کا حل نکل آئے گا۔ صحیح حدیث میں آتا ہے[2] کہ اگر بنی اسرائیل اس وقت لیت و لعل نہ کرتے بلکہ کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو بات بن جاتی۔ مگر ان کی طبیعتوں میں تعمق تھا۔ وہ بال کی کھال اتارنا جانتے تھے۔ انہوں نے پیغمبر کا حکم ماننے کی بجائے طرح طرح کے سوالات کرنے شروع کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جوں جوں سوال کرتے گئے۔ توں توں سختی بڑھتی گئی حتیٰ کہ بچ نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ اور وہ مجبور ہو گئے۔ مگر اس حیلہ سازی میں کافی عرصہ گذر گیا۔ اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم پہ عمل نہ کیا۔ اسی لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے[3] کہ تعمق اچھا نہیں ہر بات میں بال کی کھال نہ اتارو بلکہ حکم پہ عمل کرو۔ جس قدر زیادہ باریکی میں جاؤ گے۔ اسی قدر سختی میں مبتلا ہو گے۔ اور آخر مجبور ہو جاؤ گے۔

قاتل کی تلاش کے لیے موسیٰ علیہ السلام نے ایک لمبا راستہ اختیار کیا۔ کہ اس طرح گائے ذبح کرو اور پھر اس کے جسم کا ایک ٹکڑا مقتول کی لاش پہ مارو تو وہ خود اپنے قاتل کا نام بتا دے گا۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔ انہیں بذریعہ وحی بھی قاتل کی خبر مل سکتی تھی اور وہ ان کو بتا سکتے تھے۔ اس کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اسرائیلیوں کے دماغوں میں تعمق بھرا ہوا تھا۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام براہ راست قاتل کی نشاندہی کر دیتے تو قوم بگڑ جاتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی عادات کو خوب سمجھتے تھے۔ جب وہ توراۃ لے کر آئے تھے۔ تو اس وقت بھی اسرائیلیوں

---

[1] معالم التنزیل ج۱ ص۳۲، [2] تفسیر مظہری ج۱ ص۸۰، در منثور ج۱ ص۷۷، ابن کثیر ج۱ ص۱۱۱، [3]

نے اسے اللہ تعالیٰ کی کتاب ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر مجبور ہو کر انہوں نے اسے تسلیم کیا۔ پھر انہوں نے عہد و پیمان کو بھی توڑا۔ اور جب ان پر جبر کیا گیا کوہِ طور ان کے سروں پر معلق کر دیا گیا، پھر وہ راہِ راست پر آئے۔ اور تورات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔

نبی سے قطع تعلقی

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[۱]۔ کہ اس قسم کی برائیاں نبی کے علم و عمل سے علیحدگی کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں۔ اور نبی سے لاتعلقی تین وجوہ سے ہوتی ہے۔ اولاً بے خبری یعنی اُمتی کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ نبی کا عمل اور عقیدہ کیا ہے۔

ثانیاً یہ کہ طبیعتوں میں بگاڑ پیدا ہو جائے۔ اُمتی اصل راستے سے بھٹک جائیں تو بھی نبی سے تعلق کمزور پڑ جاتا ہے۔

تیسری وجہ ماحول کا اثر ہے۔ جب لوگ معاشرے کے دیگر لوگوں سے متاثر ہو کر ان کا طریقہ اختیار کر لیں، تو پھر بھی اپنے نبی سے قطع تعلقی پیدا ہو جاتی ہے۔ بنی اسرائیل میں یہ تینوں بیماریاں موجود تھیں جن کی وجہ سے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بات بات میں تکرار کرتے تھے۔ حجت بازی اور حیلہ بازی کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو ٹالنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ بیماریاں آج امت محمدیہ میں بھی موجود ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[۲] لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ یعنی اے میری امت! ایک وقت آئے گا۔ جب تم بھی پہلی قوموں کی طرح ہی ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ ان کمزوریوں سے محفوظ رکھے۔ اور نبی علیہ السلام کی صحیح اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔

ٹھاحرام ہے

ارشاد ہوتا ہے وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً " اس واقعہ کو یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ گائے ذبح کرو۔ بقرہ کا لفظ عربی زبان میں عام طور پر گائے پر بولا جاتا ہے۔ مگر یہ لفظ اسم جنس کے طور پر بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی نر اور مادہ یا گائے اور بیل دونوں پر استعمال ہوتا ہے۔ بعض[۳] کہتے ہیں کہ جس جانور کو اللہ تعالیٰ نے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ گائے نہیں بلکہ بیل تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام

۱ـ

۲ـ بخاری صـ۱۰۸۸ ج۲، مسلم صـ۳۳۹ ج۲

۳ـ تفسیر عزیزی فارسی صـ۲۸۱ و صـ۲۸۲ پارہ ۱

نے قوم کو سمجھایا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیکر تمہارے مسئلہ کا حل فرمایا ہے۔ تم حکم کے مطابق گائے یا بیل ذبح کرکے اس کے گوشت کا ٹکڑا مقتول کے جسم پر لگاؤ۔ تو یہ زندہ ہو کر خود اپنے قاتل کا نام بتادے گا۔ مگر وہ ظالم قوم تعمیل حکم کی بجائے کہنے لگی۔ اے موسیٰ علیہ السلام قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ کیا آپ ہمارے ساتھ ٹھٹھا (مذاق) کرتے ہیں۔ بھلا ایسا بھی کبھی ہوا ہے۔ کہ مُردہ دوبارہ زندہ ہوجائے اور اپنے قاتل کی نشاندھی کرے۔ یہ تو آپ ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہیں۔

هُزُوًا مصدر مبنی للمفعول ہے۔ لفظی معنیٰ یہ ہے کہ کیا تو ہمیں ٹھٹھا کیا ہوا بناتا ہے۔ دیکھو! حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا عظیم اور صاحب کتاب نبی ہے۔ مگر قوم اس قدر بگڑی ہوئی ہے۔ کہ معجزہ کا انکار کر رہی ہے۔ حالانکہ تھوڑا عرصہ قبل ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر کئی ایک معجزات کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرعون کی غلامی سے نجات دلائی پھر یہ چالیس سال تک صحرا میں سرگرداں پھرتے رہے۔ من وسلویٰ کھاتے رہے۔ پانی کے لیے بارہ چشمے جاری ہوئے۔ اس کے باوجود مزاج فاسد ہیں۔ صاف کہہ دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس بات پر سخت غصہ آیا قَالَ فرمانے لگے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں۔ اس بات سے کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ اے نادانو! تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں خدا تعالیٰ کا نبی ہو کر خدا تعالےٰ کا حکم سُنا رہا ہوں۔ تم کہتے ہو کہ مخول کر رہا ہوں۔ یہ تو جاہلوں کا کام ہے۔ اسی لیے ہماری شریعت میں ٹھٹھا حرام ہے۔ سورہ حجرات میں آتا ہے۔ "لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ" کوئی قوم کسی قوم سے ٹھٹھا نہ کرے۔ یہ ہنسی مذاق جس سے دوسرے کی تحقیر ہوتی ہو۔ سخت منع ہے۔ ہاں ایسا مذاق جس سے دوسرے کی تحقیر کا پہلو نہ نکلتا ہو جائز ہے۔ تاہم اس کی زیادتی بھی مناسب نہیں۔

خوش طبعی جائز ہے

صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں[1]۔ کہ بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ خوش طبعی بھی فرمایا کرتے تھے۔ ہم نے عرض کیا۔ کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہو کر خوش طبعی کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں میں خوش طبعی کرتا ہوں۔ مگر میری خوش طبعی اور عام لوگوں کی خوش طبعی میں بنیادی طور پر فرق ہے۔ اِنِّیْ لَآ اَقُوْلُ اِلَّا حَقًّا[2] میں حق کے بغیر کچھ نہیں کہتا۔ خواہ خوش طبعی ہی ہو حدیث شریف میں موجود ہے

[1] ترمذی ص۲۹۳ و شمائل مع ترمذی ص۵۸۵ [2] ترمذی ص۲۹۳ و شمائل مع ترمذی ص۵۸۵

کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا۔ حضور! میں جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ مگر میرے پاس سواری نہیں ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ تمہیں اونٹ کے بچے پر سوار کر دیں گے۔ اُس نے سمجھا کہ شاید حضور اونٹ کا کوئی چھوٹا بچہ عنایت فرمائیں گے۔ کہنے لگا مگر میں اس پر سواری کیا کروں گا۔ اُس کی تو حفاظت کرنی پڑے گی۔ نامعلوم کتنے سال بعد وہ بچہ سواری کے قابل ہو گا۔ اُس کی یہ بات سُن کر حضور علیہ السلام مسکرائے اور فرمایا کہ تم نے اونٹ کے بچے کو بالکل چھوٹا بچہ کیوں سمجھ لیا۔ بڑا اونٹ بھی تو کسی اونٹ کا بچہ ہی ہوتا ہے۔ میں تمہیں اونٹ کا وہ بچہ دوں گا جو سواری کے قابل ہو گا۔

اسی طرح ایک بڑھیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور عرض کیا۔ اللہ تعالےٰ کے نبی! میرے لیے جنّت کی دعا فرمائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ اے اُمِّ فلاں! کوئی بڑھیا جنّت میں داخل نہیں ہو سکتی۔ وہ بیچاری پریشان ہو گئی۔ جب وہ روتی ہوئی جانے لگی۔ تو حضور علیہ السلام نے اُسے واپس بلوایا اور فرمایا کہ میں نے صحیح بات کی ہے۔ جنّت میں بوڑھی عورت نہیں جائیگی۔ بلکہ جو بھی جائے گی۔ جوانی کے عالم میں جائے گی۔ جنتی مرد اور عورتیں سب تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ سال کے پیٹے میں ہوں گے۔ جب وہ جنّت میں جائیں گے۔

الغرض! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا پناہ بخدا کہ میں ٹھٹھا کر کے جاہل بن جاؤں یہ شانِ نبوّت کے خلاف ہے۔ میں تو تمہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا رہا ہوں۔ اس کا حکم سُنا رہا ہوں اور تم اسے ٹھٹھے پر محمول کر رہے ہو۔ اب وہ سمجھے کہ یہ تو سنجیدہ بات ہے۔ چنانچہ انہوں نے سوالات کرنے شروع کر دیے۔ جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا
بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا
تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ
قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا
تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ
إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾
قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي
الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ
فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾ ع وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ ع ۸ ۱۰ ۸
فِيهَا ۖ وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ
بِبَعْضِهَا ۚ كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ
تَعْقِلُونَ ﴿٧٣﴾

ترجمہ: انہوں نے کہا کہ اپنے پروردگار سے دعا کرو، ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہے (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ عمر خوردہ (بوڑھی) اور نہ بچھیا (نو عمر) ہو۔ بلکہ اس کے درمیان میں ہو۔ پس کر ڈالو جو تم کو حکم دیا جاتا ہے ﴿۶۸﴾ انہوں نے کہا کہ اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کریں کہ وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ اس گائے کا رنگ کیا ہے (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ زرد رنگ کی گائے ہے ،اس کا رنگ گہرا ہے۔ جو دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے ﴿۶۹﴾ ان لوگوں نے کہا۔ کہ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہے۔ بیشک گائے ہم پر

مشتبہ ہوگئی ہے ۔ اور بیشک اگر اللہ نے چاہا تو ہم راہ پالیں گے (۷۰) (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ کہ وہ ایسی گائے ہے ۔ جو کہ نہ محنت کرنے والی ہو جو جوتتی (پھاڑتی) ہو زمین کو اور نہ سیراب کرتی ہو کھیتی کو ۔ صحیح سلامت ہو ۔ اور اس میں کوئی داغ نہ ہو ۔ ان لوگوں نے کہا ۔ کہ اب آپ ٹھیک بات لائے ہیں ۔ پس انہوں نے اس گائے کو ذبح کیا ۔ اور وہ ایسا کرنے کے قریب نہیں تھے (۷۱) اور (اے بنی اسرائیل) اس واقعہ کو دھیان میں لاؤ ۔ جب تم نے ایک جان کو قتل کر ڈالا ۔ اس میں تم جھگڑا کرنے لگے ۔ (ایک دوسرے کے سر پر دھرنے لگے) اور اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے ، اس چیز کو جس کو تم چھپاتے تھے (۷۲) پس ہم نے کہا کہ مارو اس مردہ کو گائے کے بعض حصّے کے ساتھ ۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ مُردوں کو زندہ کرے گا ۔ اور اسی طرح وہ تم کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے ۔ تاکہ تم سمجھو (اور غور و فکر کرو) (۷۳)

ربطِ آیات گذشتہ درس میں بنی اسرائیل کی حیلہ سازی کا ذکر ہو چکا ہے ۔ انہوں نے احکامِ الٰہی حیلے بہانے سے ٹالنے کی کوشش کی ۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے تعمق اختیار کیا ۔ اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے ۔ پھر جوں جوں سوالات کرتے گئے ۔ توں توں ان کی سختیاں بڑھتی گئیں ۔ آخر انہوں نے مجبور ہو کر گائے کو ذبح کیا ۔ اور اس کا ایک ٹکڑا مردہ کے جسم کے ساتھ لگایا ۔ تو وہ زندہ ہو گیا ۔ پھر اس نے بتایا کہ اُسے اس کے بھتیجوں نے دولت پر قبضہ کرنے کے لیے قتل کیا ہے ۔ اس طرح اللہ تعالےٰ نے ان کی مخفی بات کو ظاہر کر دیا ۔

قاتل کا یہ بھی ارادہ تھا ۔ کہ وہ مقتول چچا کی لڑکی کو حاصل کرلے گا ۔ کیونکہ اس کی جائیداد کی وارث تو وہی تھی ۔ نیز وہ اس لالچ میں تھا ۔ کہ مقتول کی لاش کو جس علاقے میں پھینکا گیا ہے ۔ اس کی قریبی بستی کے لوگوں سے مقتول کی دیت بھی وصول کرلے گا ۔ یہ تمام باطل خیالات اس کے دِل میں جاگزیں تھے ۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس چیز کو تم چھپاتے ہو ۔ اس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے ۔ چنانچہ ان کی ساری تدبیر ناکام ہو گئی ۔ جب وہ قتل کا یہی مقدمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس لے کر گئے ۔ تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے ۔ کہ گائے ذبح کرو ۔ یہ سُن کر پہلے تو وہ بگڑ گئے ۔ کہ اے موسیٰ علیہ السلام کیا آپ ہم سے ٹھٹھا کرتے ہیں ۔ مگر اللہ تعالےٰ کے نبی نے کہا ۔ کہ میں ٹھٹھا نہیں کرتا ۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ۔ جو تمہیں پہنچا رہا ہوں ٹھٹھا کرنا تو

جاہلوں کا کام ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اس بات کو سنجیدگی سے لیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے[1]۔ کہ اگر بنی اسرائیل اللہ تعالےٰ کے حکم کی فوراً تعمیل کر دیتے اور کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے۔ تو ان کا مسئلہ حل ہو جاتا۔ مگر اُن کے مزاج میں فساد آچکا تھا۔ وہ لیت و لعل کرنے لگے۔ چنانچہ سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور وہ خود ہی پابندیوں میں جکڑے گئے۔

مصلحتِ الٰہی

مفسرین کرام فرماتے ہیں[2]۔ کہ بنی اسرائیل کے سوالات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے جس قسم کی گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تلاش میں کافی وقت گذر گیا۔ تاہم اس میں بھی اللہ تعالےٰ کی خاص مصلحت یہ تھی۔ کہ اس طریقہ سے ایک غریب آدمی کی پرورش مقصود تھی۔ روایات میں آتا ہے[3]۔ کہ بنی اسرائیل کا ایک پرہیز گار آدمی فوت ہو گیا اور اپنے پیچھے بیوہ، ایک بچہ اور ایک بچھڑا چھوڑ گیا۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی جائیداد نہیں تھی۔ مرنے سے قبل اس شخص نے دعا کی تھی۔ کہ مولا کریم! میرے بچے کے لیے اس بچھڑے میں برکت ڈال دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔

اس بچے کی نیک بختی اور سعادت مندی کے متعلق دو روایات آتی ہیں۔ امام ابن کثیرؒ نے یہ واقعہ نقل کیا ہے[4]۔ کہ ایک دفعہ اس کا باپ سویا ہوا تھا۔ اتنے میں باہر سے کوئی تاجر آیا۔ ہیرا فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے بچے کو اسّی ہزار میں ہیرا فروخت کرنے کی پیش کش کی۔ مگر بچے نے جواب دیا کہ میں اپنے باپ کی اجازت کے بغیر تم سے سودا نہیں کر سکتا۔ جب وہ اُٹھے گا تو بات کریں گے۔ تاجر نے کہا کہ باپ کو جگا لو۔ میں کم قیمت پر بھی ہیرا بیچ دوں گا۔ مگر لڑکا باپ کے آرام میں مخل ہونے پر رضا مند نہ ہوا۔ تاجر کم سے کم قیمت لینے پر بھی تیار ہوا۔ مگر لڑکے نے کہا۔ کہ میں اسّی ہزار کی بجائے ایک لاکھ روپیہ دینا پسند کروں گا۔ مگر باپ کو بے آرام نہیں کروں گا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس لڑکے کی نیکی کی بدولت اللہ تعالےٰ نے اُسے برکت سے نوازا۔

بعض دوسری روائتوں میں آتا ہے[5]۔ کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتہ انسانی شکل میں اس بچے کے پاس

---

[1] تفسیر در منثور ص۷۷ ج۱، تفسیر ابن کثیر ص۱۱۱ ج۱، [2] تفسیر عزیزی فارسی ص۲۷۹ پارہ ۱، [3] تفسیر عزیزی فارسی ص۲۷۹ پارہ ۱
[4] تفسیر ابن کثیر ص۱۰۹ ج۱، [5] تفسیر عزیزی فارسی ص۲۸۷ پارہ ۱، معالم التنزیل ص۲۳ ج۱

آیا اور بچھڑے کی قیمت دریافت کی۔ اور پھر دو دینار کی پیش کش بھی کر دی۔ لڑکے نے کہا۔ کہ میں اپنی والدہ سے پوچھے بغیر قیمت طے نہیں کروں گا۔ جب والدہ سے دریافت کیا تو وہ اتنی قیمت پہ رضامند نہ ہوئی۔ فرشتے نے زیادہ قیمت لگا دی۔ بچّے نے پھر کہا کہ میں اپنی والدہ سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ مگر والدہ نے پھر انکار کر دیا۔ غرض! فرشتہ قیمت بڑھاتا رہا۔ اور لڑکا بار بار والدہ سے مشورہ کرتا رہا۔ مگر والدہ کسی قیمت پہ بھی بچھڑا بیچنے پہ راضی نہ ہوئی۔ لہٰذا بچّے نے گاہک کو مطلقاً جواب دیدیا۔ اب فرشتے نے کہا۔ کہ تم بڑے سعادتمند بیٹے ہو۔ جو اپنی والدہ کی رائے کے بغیر ایک قدم نہیں چلتے۔ تو سنو! اس بچھڑے کو خریدنے کے لیے تمہارے پاس لوگ آئیں گے۔ مگر تم تھوڑی قیمت پہ بچھڑا فروخت نہ کرنا۔ یہ تمہیں مالدار کر دے گا۔

ادھر بنی اسرائیل کو ایسے بچھڑے کی تلاش ہوئی۔ جو اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ نشانیوں پہ پورا اترے پھرتے پھرتے انہیں یہی بچھڑا مل گیا۔ جس میں بیان کردہ تمام صفات پائی جاتی تھیں۔ جب انہوں نے قیمت چکانا چاہی۔ تو سودا نہ بن سکا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آکر بتایا کہ مطلوبہ بچھڑا تو مل گیا ہے۔ مگر اس کا مالک مناسب قیمت پہ بیچنے کو تیار نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس شخص کو بلا بھیجا۔ اور بچھڑا نہ دینے کی وجہ دریافت کی۔ اس نے عرض کیا۔ کہ آپ اللہ تعالےٰ کے رسول ہیں۔ آپ ہی بتائیں۔ جب کہ میں اس کا مالک ہوں۔ کیا میں اپنی مرضی کے مطابق اس کو تصرف میں لانے کا مجاز نہیں ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا بیشک تجھے اپنی مرضی کے مطابق تصرف کی اجازت ہے۔ تو اس نے کہا۔ کہ میں اس بچھڑے کے بدلے اس کا ہم وزن سونا لوں گا۔ اس سے کم قیمت پہ راضی نہیں ہوتا۔ بعض دوسری روایتوں میں آتا ہے[1] کہ اس نے بچھڑے کی عام قیمت سے دس گنا زیادہ قیمت طلب کی۔ تاہم ہم وزن سونے والی روایت زیادہ مشہور ہے چنانچہ بنی اسرائیل نے وہ بچھڑا اس کے وزن کے برابر سونا دے کر حاصل کیا[2] اور پھر اسے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ذبح کیا۔

گائے کی نشانیاں

الغرض! بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں فوری طور پہ کوئی گائے یا بچھڑا لے کر

---

[1] در منثور ص۷۶ ج۱، تفسیر طبری ص۲۵۵ ج۱، [2] تفسیر طبری ص۲۵۵ ج۱

ذبح نہ کیا۔ بلکہ اس کے متعلق سوالات کرنے شروع کر دیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں سوال وجواب کی تفصیل بتائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ کہ جب انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ تو کہنے لگے قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۔ اے موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے دعا کیجیے۔ کہ وہ ہمیں تفصیل سے بتائے کہ جس گائے کو ذبح کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ وہ کیسی ہو۔ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ وہ گائے نہ تو بوڑھی ہے۔ اور نہ نوعمر بلکہ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ دونوں عمروں کے درمیان ہو۔ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ پس کر ڈالو جس چیز کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ مقصد یہ تھا۔ کہ اب بھی زیادہ سوال وجواب کے چکر میں نہ پڑو۔ بلکہ درمیانی عمر کی کوئی گائے لے کر ذبح کر دو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ جس کی فوری تعمیل ہونی چاہیے۔ مگر وہ بدبخت قوم پھر بھی تعمیل حکم پر آمادہ نہ ہوئی۔ بلکہ دوسرا سوال کر دیا قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یعنی اے موسیٰ علیہ السلام ہمیں اپنے رب سے یہ پوچھ دیں يُبَيِّنْ لَّنَا وہ ہمیں واضح طور پر بتائے مَا لَوْنُهَا کہ اس گائے کا رنگ کیسا ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر اللہ تعالیٰ سے دریافت کر کے انہیں بتایا قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا وہ گائے گہرے زرد رنگ کی ہو۔ کہ وہ زرد بھی ہو اور گہرا بھی ہو۔ یہ رنگوں کے مختلف نام ہیں۔ اور پھر آگے اُن کی صفات ہیں۔ سفید رنگ کو ابیض اور سُرخ کو احمر کہتے ہیں تو اس گائے کے رنگ کے متعلق فرمایا کہ وہ گہرا زرد ہو، تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ جو لوگوں کا دل لبھانے والا ہو۔ جسے دیکھ کر لوگ خوش ہو جائیں۔

بنی اسرائیل کے دل ودماغ میں تعمق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے تیسرا سوال کر دیا۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ اے موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے دعا کریں يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہو۔ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا بیشک گائے ہم پر مشتبہ ہو گئی ہے۔ یعنی ہم ابھی تک اس کی ٹھیک ٹھیک نشانیاں نہیں جان سکے۔ اگر ہمیں اس کی پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا جائے وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ تو بے شک اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہم راہ پا لیں گے۔ اس دفعہ انہوں نے اپنے مطالبہ کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ منسلک کیا گویا یہ آخری بات تھی جو انہوں نے دریافت کی۔ عام قانون بھی ہے۔ کہ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ

اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ" یعنی جب کبھی کوئی مستقبل میں کام کرنا ہو۔ تو یوں نہ کہو کہ کل یا پرسوں ضرور کر دوں گا۔ بلکہ اس فعل کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ معلق کر دو۔ کہ اگر اللہ تعالےٰ نے چاہا تو ایسا کر دوں گا۔ مومن کی یہی شان ہے۔ کہ وہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی توفیق کا طلبگار ہوتا ہے۔

اس آخری سوال کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے کہا قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ ذلول کے لفظی معنیٰ ہے ہموار کی گئی۔ اس لیے جس اونٹنی کو سواری کے لیے ہموار کیا گیا ہو۔ اُسے نَاقَةٌ ذَلُوْلٌ کہتے ہیں۔ اور ہموار کرنے کے لیے محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو یہاں لَا ذَلُوْلٌ کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس سے محنت نہ کرائی گئی ہو۔ کہ تُثِيْرُ الْاَرْضَ کہ وہ زمین اکھاڑتی ہو۔ یعنی وہ کبھی ہل میں بھی نہ جوتی گئی ہو۔ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ اور اس نے کبھی کھیتی کو سیراب نہ کیا ہو۔ یعنی کبھی اس سے پانی کھینچنے کی محنت بھی نہ لی گئی ہو۔ بلکہ گائے ایسی ہونی چاہیئے۔ مُسَلَّمَةٌ جو بالکل صحیح سلامت ہو۔ لَا شِيَةَ فِيْهَا اس میں کوئی عیب نہ ہو۔ بالکل بے داغ ہو۔

بالآخر مجبور ہو گئے

الغرض! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو ان کے تمام سوالات کے جوابات دے دیے۔ کہ مطلوبہ گائے کس عمر کی ہو۔ اس کا رنگ کیسا ہونا چاہیئے۔ اور پھر وہ ایسی ہونی چاہیئے۔ جس سے محنت کا کوئی کام نہ لیا گیا ہو۔ بلکہ صحیح سلامت اور بے داغ ہونی چاہیئے۔ اب ان کے لیے فرار کا کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ آخر مجبور ہو کر کہنے لگے۔ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ اے موسیٰ علیہ السلام اب آپ نے ٹھیک بات کہی ہے۔ حالانکہ بات تو انہوں نے پہلے بھی درست ہی بتائی تھی۔ مگر ان کے اپنے دماغ خراب تھے۔ جو عملدرآمد میں لیت و لعل کر رہے تھے اب انہوں نے سوچا کہ تعمیل حکم کرنی ہی پڑے گی۔ فَذَبَحُوْهَا تو مطلوبہ گائے تلاش کرنے اور اس کی بھاری قیمت ادا کرنے کے بعد اسے ذبح کر ہی دیا۔ وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ حقیقت یہی ہے۔ کہ وہ ایسا کرنے پر تیار نہیں تھے۔ مگر اب مجبور ہو گئے تھے۔

فضول رسومات کا شاخسانہ

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل خود اپنے اوپر پابندیاں عائد کر کے مجبور ہو گئے۔ یہ اصول آج بھی جاری ہے۔ کہ جو شخص خود اپنے اوپر کوئی پابندی لگا لے گا۔ وہ خود ہی تنگ ہو گا۔ آجکل

فضول رسومات میں کیا ہو رہا ہے۔ جوں جوں لوگ بُری رسمیں اپنے اُوپر عاید کر رہے ہیں۔ ان میں جکڑے جا رہے ہیں۔ نہ خدا راضی اور نہ اُس کا رسول راضی اور نہ خود ہی راضی رہ سکتے ہیں۔ یہی جہیز کی رسم کو لے لیں۔ اس نے کس حد تک طول پکڑا ہے۔ فلاں چیز چاہیئے۔ فلاں چیز چاہیئے۔ لڑکے والے خود مطالبہ کر رہے ہیں۔ کبھی ٹیلیویژن کی فرمائش کبھی ریفریجریٹر چاہیئے۔ کبھی کوٹھی اور کار کا مطالبہ۔ یہ سب کچھ کیا ہے۔ ایک ایک گھر کے اشیا میں اضافہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ ایک آدمی کی دسترس سے باہر ہو گیا۔ یہ سب اپنی ہی عائد کردہ پابندیوں کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

واقعہ قتل

فرمایا وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا جب تم نے ایک جان کو قتل کیا پھر ایک دوسرے کے سر تھوپنے لگے۔ یہ ہے وہ اصل واقعہ جس کی وجہ سے بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ اور جسے بظاہر مقدم آنا چاہیئے تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے حکم کو پہلے رکھا گیا اور اس واقعہ کو مؤخر کیا گیا۔

یہ واقعہ بھی میں نے عرض کر دیا ہے۔ کہ بنی اسرائیل کے ایک دولتمند عامیل نامی آدمی کو اس کے بھتیجوں نے مال و دولت اور اس کی بیٹی کے حصول کی خاطر قتل کر دیا۔ اور پھر خود دیت وصول کرنے کے لیے قریبی بستی کے لوگوں پر قسامت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو تمام ظاہر اور مخفی چیزوں کو جانتا ہے۔ اُس پروردگار نے ان کا راز فاش کر دیا اور یہ طریقہ بتایا کہ گائے ذبح کر کے اس کے جسم کا ایک حصہ مقتول کو لگاؤ تو وہ زندہ ہو کر خود اپنے قاتل کا نام بتائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسی چیز کو یہاں بیان فرما رہے ہیں۔ کہ تم تو حقیقت کو چھپا رہے تھے ۔ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ مگر اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے۔ اس چیز کو جو تم چھپاتے ہو۔

زر، زن اور زمین کی خاطر ظلم و ستم اور قتل و غارت ہر زمانے میں معمول رہا ہے اور آج بھی موجود ہے۔ مگر یہ چیز ہر خواہشمند کو زور بازو سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے کہ وہ کسی کو کس طرح عطا کرتا ہے۔ یہاں تو بڑی بڑی عقلوں والے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور بڑی بڑی تکالیف اٹھاتے ہیں۔ مگر ایک احمق آدمی زر و جواہرات سے کھیل رہا ہوتا ہے۔ یہ تو منشائے ایزدی ہے کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں۔

احیائے موتیٰ بطور معجزہ

الغرض! قاتل کا پتا چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ یعنی گائے کے گوشت کا ایک حصہ اس مقتول کی لاش پر مارو۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کَذٰلِكَ یُحْیِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى اس طریقے سے اللہ تعالیٰ اس مُردے کو زندہ کر دے گا۔ اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ اس کے قاتل کون ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور مردہ زندہ ہو گیا۔

اس چیز میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کہ گائے کا کون سا حصہ تھا جو مردہ پر مارا گیا۔ بعض روایات میں دُم آتا ہے، بعض میں قلب اور بعض میں زبان بیان کیا گیا ہے[۱]۔ بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا۔ اور معجزانہ طور پر ایسا ہوا تھا۔ گائے کے گوشت میں ایسی کوئی تاثیر نہیں تھی۔ جس سے مُردہ زندہ ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو قصاب ہزاروں جانور روزانہ ذبح کرتے ہیں۔ وہ تو تمام مردے زندہ کر لیں۔ اصل میں وہ تو خدا تعالیٰ کا حکم تھا۔ کہ اس طریقہ سے مُردہ زندہ ہو کر اُن کی پوشیدہ بات کو ظاہر کر دے گا۔

احیائے موتیٰ بالکل اسی طرح کا معجزہ تھا۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا۔ "فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ" کہ اس پتھر پر اپنی لاٹھی مارو تو اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔ لاٹھیاں ہمارے پاس بھی ہیں۔ اور پتھر بھی بے شمار ہیں۔ مگر پانی نہیں نکلتا۔ اسی طرح جب اللہ تعالےٰ نے پانی میں مارنے کا حکم دیا۔ تو بارہ راستے بن گئے۔ یہ سب معجزات تھے۔

بہر حال گائے کا ایک ٹکڑا مُردے کو لگانے سے معجزانہ طور پر مُردہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس سے پُوچھا کہ تمہیں کس نے قتل کیا تھا۔ تو اُس نے صاف بتلا دیا کہ اُس کے قاتل اُس کے بھتیجے ہیں اور یہ راز مجمع عام میں کھُلا، لوگوں کو حقیقت کا علم ہو گیا۔ اس کے بعد وہ مردہ پھر اپنی مردہ حالت میں تبدیل ہو گیا۔ اس واقعہ میں یہ سبق پایا جاتا ہے۔ کہ جو مالک الملک اپنے حکم سے ایک مردہ کو زندہ کر سکتا ہے۔ وہ قیامت کے روز تمام مُردوں کو قبروں سے زندہ نکالنے پر بھی قادر ہے اور اس قسم کے واقعات کا مشاہدہ اس لیے کرایا جاتا ہے۔ وَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ تاکہ اللہ تعالےٰ تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دے جس سے تم عبرت حاصل کرو۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ تاکہ تم غور و فکر کر سکو۔ اللہ تعالیٰ کی ان آیات کے پیش نظر اپنے لیے آخرت کی راہ متعین کر سکو۔

قاتل وراثت سے محروم ہے

بھتیجوں نے چچا کو اس لیے قتل کیا تھا۔ کہ وہ اس کی وراثت میں اس کا مال حاصل کرنا چاہتے

---

[۱] تفسیر مظہری صفحہ ۸۳ جلد ۱، معالم التنزیل صفحہ ۳۳ جلد ۱، تفسیر مدارک صفحہ ۵۶ جلد ۱، تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۸۹ پارہ ۱

تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قاتل نہ صرف وراثت سے محروم ہو گئے۔ بلکہ الٹا انہیں مقتول کی دیت ادا کرنا پڑی۔

ہماری شریعت میں بھی قاتل وراثت سے محروم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے[1] اَلْقَاتِلُ لَا یَرِثُ قاتل وراثت کا حقدار نہیں ہوتا۔ اُس نے جرم ہی ایسا بڑا کیا ہے۔ کہ وہ اپنے جائز حصے سے بھی محروم ہو گیا۔ امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے۔ کہ اگر قتل عمداً کیا ہو تو قاتل مقتول کی وراثت سے محروم ہو گا۔ اور اگر خطاءً قتل ہوا ہے۔ تو وراثت کا حقدار ہے۔ باقی ائمہ اس بات کے قائل ہیں۔ کہ قتل خواہ عمداً ہو یا غلطی سے۔ ہر حالت میں قاتل اپنے مقتول مورث کی وراثت سے محروم ہو جائے گا۔[2] اسی طرح مسلمان غیر مسلم کا اور غیر مسلم مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان[3] ہے۔ لَا یَرِثُ الْمُسْلِمُ الْکَافِرَ وَلَا الْکَافِرُ الْمُسْلِمَ مثلاً اگر بیٹا مرزائی ہو جائے۔ تو وہ مسلمان باپ کی وراثت سے محروم ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر باپ مذہب تبدیل کر لے۔ تو وہ بیٹے کی وراثت سے حصہ نہیں پا سکے گا۔

۱؎ احکام القرآن للجصاصؒ ص ۳۶/۱۶ ، ۲؎ احکام القرآن للجصاصؒ ص ۳۶/۱۶

۳؎ بخاری ص ۱۰۰۱/ج۲ مسلم ص ۳۳/ج۲

ثُمَّ قَسَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالۡحِجَارَةِ اَوۡ اَشَدُّ قَسۡوَةً ‌ؕ وَاِنَّ مِنَ الۡحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنۡهُ الۡاَنۡهٰرُ ‌ؕ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخۡرُجُ مِنۡهُ الۡمَآءُ ‌ؕ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ‌ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۷۴﴾

ترجمہ: پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ پس وہ پتھروں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت ہیں اور بیشک بعض پتھروں میں سے البتہ وہ ہیں کہ جن سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور بیشک ان پتھروں میں سے بعض ایسے ہیں جو پھٹ جاتے، ان سے پانی نکلتا ہے۔ اور بیشک ان پتھروں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نیچے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کاموں سے غافل نہیں ہے۔ جو تم کرتے ہو ﴿۷۴﴾

قساوتِ قلبی

بنی اسرائیل کی بہت سی برائیوں کا ذکر گذشتہ آیات میں آچکا ہے۔ اور بعض کا ذکر آگے بھی آئے گا۔ آیت زیرِ درس میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام برائیوں کا نتیجہ بیان فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کی طرف سے کتمانِ حق، بچھڑے کی پرستش، قانون کی خلاف ورزی، قتل انبیاء علیہم السلام وغیرہ یہ تمام ایسی بیماریاں تھیں۔ جن کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ بنی اسرائیل کے دِل سخت ہو گئے۔ سورۃ مائدہ میں بنی اسرائیل کی قساوتِ قلبی کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے " فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ لَعَنّٰهُمۡ وَجَعَلۡنَا قُلُوۡبَهُمۡ قٰسِيَةً " یعنی بنی اسرائیل کے عہد و پیمان توڑنے کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت بھیجی اور اُن کے دلوں کو سخت کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ اس قسم کے کام کرتے تھے کہ " يُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ " اللہ تعالیٰ کے کلام کو اپنے مقام سے تبدیل کر دیتے۔ گویا آسمانی کتاب میں تحریف کے مرتکب ہوتے تھے۔ جس کی وجہ سے قساوتِ قلبی جیسی لعنت میں گرفتار ہوئے۔ بلکہ اُن کے فہم بھی اُلٹ گئے۔ اُن میں ضعفِ ہمت کی بیماری بھی پیدا ہو گئی۔ جس کی وجہ سے وہ جہاد کے لیے بھی آمادہ نہ ہوئے۔ بلکہ کہنے لگے کہ اے

موسیٰ علیہ السلام! آپ اور آپ کا خدا جا کر جہاد کریں۔ ہم تو یہیں بیٹھیں گے۔

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے[1]۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے لَا تُکْثِرُ الْکَلَامَ بِغَیْرِ ذِکْرِ اللّٰہِ یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے علاوہ زیادہ کلام نہ کرو۔ کیونکہ فضول باتیں کرنے کی وجہ سے انسان میں قساوتِ قلبی پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے بعید ترین وہ شخص ہے۔ جس کا دل سخت ہو۔ خدا تعالیٰ سے دوری مسافت کے اعتبار سے نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے درمیان پردے پڑ جائیں۔ انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہو جائے۔ اسی لیے فرمایا کہ ذکر الٰہی کے علاوہ کثرت کلام سے اجتناب کرو۔

مسند احمد اور ترمذی شریف کی روایت میں ہے[2]۔ کہ ایک شخص نے عرض کیا حضور! میں اپنے دل میں سختی محسوس کرتا ہوں۔ اس کا علاج بتائیے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ یتیم کے سر پر ہاتھ رکھو۔ غریبوں اور مسکینوں کی پرورش کرو۔ انسانوں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہاری قساوتِ قلبی دور فرمائیں گے۔ ایک دوسری حدیث میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے[3] کہ قساوتِ قلبی چار چیزوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ اولاً جمود العین یعنی اس کی آنکھیں منجمد ہو کر رہ جائیں۔ اُن سے خشیت الٰہی کی وجہ سے کبھی آنسو نہ نکلیں۔ ثانیاً۔ قساوۃ القلب یعنی اس کا دل سخت ہو جائے جو نرم نہ ہو۔ ثالثاً۔ طول الامل لمبی امید۔ رابعاً۔ حرص علی الدنیا یعنی اس کے دل میں دنیا کی محبت حد سے زیادہ ہو۔

پتھروں سے زیادہ سخت دل

بنی اسرائیل اس قساوتِ قلبی کا شکار ہو چکے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا "ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ حالانکہ تم خدا تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں یعنی اس کی طرف سے معجزات دیکھ چکے تھے اس کے باوجود تمہارے دلوں میں نرمی پیدا نہ ہو سکی۔ بلکہ وہ تو ایسے ہو گئے۔ جیسے پتھر ہوتے ہیں۔ فَھِیَ کَالْحِجَارَۃِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَۃً" بلکہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے لفظ اَوْ دو معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔ اگر اس کا معنی بل۔ (بلکہ) کیا جائے تو مطلب ہو گا۔ تمہارے دل پتھروں

---

[1] ترمذی ص ۳۴۷، [2] مسند احمد ج ۲ ص ۲۸۷، ترمذی ص ـ [3] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۱۴ بحوالہ بزار مرفوعاً

کی طرح سخت ہو گئے ——————— بلکہ اُن سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔

اور یہ أو تنویع کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی تمہارے دِل پتھروں کی طرح سخت ہو گئے۔ اب دیکھئے۔ لوہا پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے "كُونُوا حِجَارَةً اَوْ حَدِيدًا" یعنی پتھر یا لوہا ہو جاؤ۔ کیا تمہارے خیال میں اس سے زیادہ سخت چیز بھی کوئی ہے وہاں پر بھی قساوتِ قلبی کو پتھروں اور لوہے سے تشبیہہ دی گئی ہے مطلب یہ کہ بنی اسرائیل کے دِل پتھروں کی طرح سخت ہو چکے تھے یا پتھروں سے بھی زیادہ قساوت ان میں پیدا ہو چکی تھی۔

پتھروں کے فوائد

بنی اسرائیل کی قساوت کو مزید اس مثال سے بیان فرمایا۔ کہ دیکھو وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ یعنی بعض پتھر ایسے ہیں کہ اُن میں سے نہریں پھوٹتی ہیں۔ جن سے مخلوقِ خدا سیراب ہوتی ہے وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ اور بعض پتھر ایسے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ اور ان سے پانی بہ نکلتا ہے۔ جو کہ انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ اور بعض ایسے پتھر بھی ہیں جو خوفِ خدا سے نیچے گر پڑتے ہیں۔ مگر یہ بنی اسرائیل ایسی بدبخت قوم ہے کہ ان میں پتھروں والی خصوصیات بھی نہیں پائی جاتیں۔ پتھر بلاشبہ سخت ہیں۔ مگر پھر بھی اُن سے مخلوقِ خدا فائدہ حاصل کرتی ہے۔ مگر یہ قوم پتھروں سے بھی گئی گذری ہے۔ جن سے کچھ حاصل نہیں۔

سجدہ تقرب الی اللہ کی علامت ہے

مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ پتھروں کا بلندی سے پستی کی جانب گر پڑنا خشیتِ الٰہی کی بناء پر ہوتا ہے۔ اور درحقیقت یہ پتھر کا اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ہوتا ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی اور نیازمندی کی انتہائی شکل سجدہ ہے۔ اور یہ بہت بڑی حقیقت ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا اتصال پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔ "وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ" یعنی سجدہ کرو اور قربِ خداوندی حاصل کرو۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے[2]۔ اَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ

---

[1] معالم التنزیل ص ۳۴ ج ۱، تفسیر مدارک ص ۵۷ ج ۱، تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۹۴ پارہ ۱
[2] مسلم ص ۱۹۱ ج ۱، ابوداؤد ص ۱۲۷ ج ۱، نسائی ص ۱۷۰ ج ۱

اَلْعَبْدُ مِنْ رَّبِّہٖ فَھُوَ سَاجِدٌ یعنی جن حالتوں میں اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے۔ ان میں حالتِ سجدہ سب سے اولیٰ ہے۔ اس حالت میں جس قدر عجز وانکساری ہوگی اُسی قدر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اتصال سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی اتصال کی بدولت انسان کی حالت درست رہ سکتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ جو شخص پتھروں جیسے اوصاف کا حامل بھی نہیں ہے۔ یعنی نہ تو اُس سے مخلوق کو عام فائدہ پہنچتا ہے۔ نہ وہ شخص محدود پیمانہ پر مفید ہے۔ اور نہ ہی اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اتصال ہے۔ تو پھر ایسا انسان بلا شبہ بدبخت اور شقی ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ انہیں قدرتِ خداوندی کی نشانیاں نظر آتی ہیں۔ بلکہ جو ان کے ساتھ چلنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ بھی اس نعمت سے محروم نہیں رہتے اور پھر ان کی وجہ سے بڑی بڑی باتوں کا ظہور ہوتا ہے۔

بعض اکابر دین

ہمارے بعض ایسے اکابر قریبی زمانہ میں ہوئے ہیں جو یقیناً مقربین الٰہی میں سے ہیں سید احمد شہید بریلویؒ سادات کے خاندان میں سے حسنی تھے۔ وطن مالوف رائے بریلی تھا۔ دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بیعت کی اور علم حاصل کیا۔ شاہ صاحبؒ نے مزید تربیت کے لیے اپنے برادرِ خورد شاہ عبدالقادرؒ کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے تین سال تک سید احمد شہید بریلویؒ کی تربیت کی۔ یہ وہی شاہ عبدالقادرؒ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے قرآن پاک کا اُردو ترجمہ کیا۔ صاحب کشف بزرگ تھے ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے۔

شاہ عبدالعزیزؒ کی عمیق نظروں نے جانچ لیا کہ سید احمد شہیدؒ بریلوی عظیم صلاحیت کے مالک ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے ہی لوگوں سے بہت اہم کام لے لیتا ہے۔ چنانچہ تین سالہ تربیت مکمل کر لینے کے بعد شاہ صاحبؒ نے سید احمد شہیدؒ کو ٹونک جا کر فوجی تربیت حاصل کرنے کا حکم دیا۔ لہٰذا آپ نے چھ سال تک فوجی تربیت بھی حاصل کی۔ گویا سید احمد شہیدؒ۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے تربیت یافتہ اور اُن کے مجاز تھے۔

خود شاہ عبدالعزیزؒ برصغیر میں اپنے باپ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بعد بہت بڑے عالم اور فقیہہ تھے۔ آپ محدث اور مفسر قرآن تھے۔ آپ کے داماد مولانا عبدالحیؒ بھی بڑے پائے

کے بزرگ تھے۔ آپ سید صاحبؒ سے زیادہ عالم تھے۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ، شاہ عبدالغنیؒ کے بیٹے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے پوتے تھے قرآن پاک کے علاوہ تیس ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ صبح کی نماز پڑھ کر قرآن پاک کی تلاوت شروع کرتے اور سورج نکلنے تک ختم کر لیتے ادھر عصر کے بعد شروع کرتے تو مغرب کی اذان کے ساتھ ختم کر لیتے۔ اللہ تعالےٰ نے اس قدر انعام فرمایا تھا۔

ایک مرتبہ آپ کے ہاتھ میں شیخ عبدالحق محدثؒ کا وہ رسالہ آگیا۔ جس میں نماز کی ترکیب لکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس طریقے کے مطابق ہی نماز پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ رات کے وقت دو رکعت ایسی نماز پڑھنے کی توفیق میسر آجائے جس کے دوران کوئی وسوسہ نہ آئے، ایسی کوشش میں رات بھر میں سو رکعات نماز ادا کی۔ مگر مقصد حاصل نہ ہوا اس بات کا ذکر آپ نے سید احمد شہید بریلویؒ سے کیا، کہ شیخ عبدالحق محدثؒ کے رسالہ میں مذکور طریقے سے نماز پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں مگر کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ محض کتاب میں طریقہ پڑھ کر مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ آؤ میرے ساتھ دو رکعت نماز ادا کر لو۔ چنانچہ جب سید صاحبؒ کی اقتدا میں نماز پڑھی تو اللہ تعالیٰ نے حضور قلب عطا کیا۔ اور مطلوبہ کیفیت حاصل ہوگئی، اس واقعہ کا ذکر آپ نے حضرت مولانا عبدالحیؒ کے پاس بھی کیا۔ کہ حضورِ قلب کے لیے انہوں نے کتنی کوشش کی مگر یہ چیز سید احمد شہیدؒ کے ساتھ نماز پڑھنے سے حاصل ہوئی، یہ سن کر مولانا عبدالحیؒ کو بھی اشتیاق پیدا ہوا۔ سید صاحبؒ سے عرض کیا۔ تو انہوں نے انہیں بھی اپنے پیچھے نماز پڑھائی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی وہی کیفیت عطا کر دی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ یہ دونوں صاحبان یعنی شاہ اسماعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحیؒ ہمیشہ سید احمد بریلویؒ کے ہمراہ رہے۔ شاہ اسمٰعیلؒ کو تو اللہ تعالےٰ نے شہادت کا مرتبہ عطا کیا۔ مگر مولانا عبدالحیؒ اسی سفر کے دوران سرحد کے علاقہ پنج تار میں جا کر بیمار ہوئے اور وہیں پر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

بالاکوٹ کی تاریخی جنگ میں شاہ اسمٰعیل شہیدؒ فوج کے سالار تھے اور مولانا عبدالحیؒ سید احمد شہید کے لشکر میں عہدہ قضا پہ فائز تھے۔ اس اسلامی فوج کے امیر سید احمد شہید بریلویؒ تھے۔ سرحد میں ان کی قائم کردہ اسلامی حکومت تین سال تک چلی۔ اس کے بعد مسلمانوں کی نالائقی کی وجہ سے آگے نہ چل سکی۔ اسی دوران مولانا عبدالحیؒ بیمار ہوئے جب ان کی زندگی کی امید باقی نہ رہی تو سید صاحبؒ

نے پوچھا کوئی خواہش ہو تو بتائیں کہنے لگے خواہش تو شہادت کی موت کی تھی۔ جو پوری نہیں ہو سکی۔ اب چاہتا ہوں۔ کہ اس آخری وقت میں آپ کا قدم میرے سینے پر ہو۔ سیّد صاحبؒ نے ان کی خواہش کو پورا کیا۔ اور آپ نے اس کے بعد اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

مسلمانوں کی ناکامی کی وجہ

مسلمانوں کی ناکامی کی بڑی وجہ ان کی اپنی غداری ہے۔ یہ غداری ابن علقمی کے دور کے بعد ساتویں صدی میں شروع ہوئی۔ اسی وجہ سے سلطنتیں تباہ ہوئیں۔ اور مسلمان روبہ زوال ہی رہے پھر یہ اپنے قدموں پر جم نہ سکے۔

تو بہر حال میں عرض یہ کر رہا تھا۔ کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا اتصال نصیب ہوتا ہے۔ حقیقی معنوں میں وہی کامیاب ہوتے ہیں۔ اور جن لوگوں میں پتھروں والی تین صفات بھی نہیں پائی جاتیں۔ وہ بدبخت اور شقی ہوتے ہیں۔ ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں۔ بلکہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت۔ بنی اسرائیل کی مثال واضح ہے۔ یہ پتھروں سے بھی گئے گزرے ہیں۔ ان کا وجود غیر مفید بلکہ بنی نوع انسان کے لیے مضر ہے گویا یہ سارا اسرائیلیوں کی خرابیوں کا ذکر ہے۔

فرمایا وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ یاد رکھو اللہ تعالیٰ تمہارے کسی فعل سے غافل نہیں ہے۔ تمہاری تمام کرتوتیں اس کی نگاہ میں ہیں۔ ایک وقت آنے والا ہے۔ جب اللہ جل شانہٗ تمہارے اعمال کا انجام تمہارے سامنے رکھ دے گا۔ یہ سارا بنی اسرائیل کو خطاب ہے۔ کہ اب بھی سمجھ جاؤ اور راہِ راست پہ آجاؤ۔ تو اچھے انجام کو پہنچ جاؤ گے۔ ورنہ تم اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔

الٓمّٓ ١

درس سی وسہ ۳۳

(آیت ۷۵ تا ۷۹)

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ
كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ
﴿٧٥﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى
بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ
عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٧٦﴾ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ
مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٧﴾ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ
الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿٧٨﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ
الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۙ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا
بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ
وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿٧٩﴾

النصف

ترجمہ:۔ (اے اہل ایمان) کیا تم توقع رکھتے ہو۔ کہ (اہل کتاب) ایمان لائیں گے تمہاری بات پر۔ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ کا کلام سنتے تھے۔ پھر اس کو بدل ڈالتے تھے۔ بعد اس کے کہ انہوں نے اسے سمجھ لیا تھا۔ اور وہ جانتے بھی ہیں ﴿٧٥﴾ اور جب وہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم بھی ایمان لائے۔ اور جب الگ ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض، بعض کے پاس، تو کہتے ہیں، کیا تم ان (مسلمانوں) کے پاس ایسی چیزیں بیان کرتے ہو۔ جو اللہ نے تم پر ظاہر کی ہیں۔ تاکہ وہ ان کے ذریعے تمہارے ساتھ تمہارے رب کے ہاں جھگڑا کریں، کیا تم سمجھتے نہیں ﴿٧٦﴾ کیا یہ لوگ اس بات کو نہیں جانتے کہ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جس چیز کو یہ چھپاتے ہیں اور جس کو ظاہر کرتے ہیں ﴿٧٧﴾ اور ان میں سے بعض ان پڑھ ہیں، جو نہیں جانتے کتاب کو مگر چند جھوٹی آرزوئیں۔ اور نہیں ہیں وہ مگر گمان کرتے ﴿٧٨﴾ پس ہلاکت ہے

ایسے لوگوں کے لیے جو لکھتے ہیں کتاب کو اپنے ہاتھوں سے، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ تاکہ خریدیں اس کے ذریعے تھوڑی قیمت۔ پس ہلاکت ہے اُن کے لیے جو لکھا ہے۔ اُن کے ہاتھوں نے، اور ہلاکت ہے اُن کے لیے جو کمایا ہے۔ انہوں نے ⑦٩

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں بنی اسرائیل کی بہت سی برائیوں کا تذکرہ ہو چکا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بہت سی نشانیاں دیکھنے کے بعد بنی اسرائیل کے دل سخت ہو گئے بلکہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔ فرمایا بعض پتھر بھی مفید ہوتے ہیں۔ مگر یہ قوم تو ان پتھروں سے بھی بدتر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے غافل ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔ ان کے سب کام اس کے علم میں ہیں۔ آیات زیرِ درس میں بھی یہودیوں کی بعض دوسری خرابیوں کا ذکر ہے۔ مگر یہاں روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے۔

یہود کی طرف سے ناامیدی

ارشاد ہوتا ہے اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ یعنی اے اہلِ ایمان! کیا تم توقع کرتے ہو کہ یہود تمہارے کہنے پر ایمان لے آئیں گے فرمایا ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ یہ بڑی بدبخت قوم ہے۔ یہ تمہاری بات کی ہرگز تصدیق نہیں کریں گے۔ یہ لوگ دینِ اسلام کو قبول کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو یہ بات سمجھا دی کہ گمان مت کرو یہ تمہارے ساتھ شریک ہو جائیں گے۔ کیونکہ شرکت دو وجوہ کی بنا پر ہو سکتی ہے۔ یا تو کوئی شخص دوسرے کا مقتدا بن کر ساتھ چلے یا اس کا تابع ہو جائے۔ جب تک ان دو میں سے کوئی ایک چیز شامل نہ ہو۔ مل کر چلنا محال ہوتا ہے۔ مگر حقیقتِ حال یہ ہے کہ یہودیوں میں نہ مقتدا بننے کی اہلیت ہے اور نہ تابع بننے کی صلاحیت یہ لوگ مقتدا اس لیے نہیں بن سکتے کہ ان کی فکر خراب ہو چکی ہے ذہنیت بگڑ چکی ہے۔ ان کا دین تبدیل ہو چکا ہے اسی طرح تابع وہ شخص ہو سکتا ہے جو منصف مزاج اور بے لوث ہو۔ مگر یہودی ان تمام صلاحیتوں سے محروم ہیں۔ اس لیے ان کی شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اے ایمان والو! تم ان کے پیچھے نہ پڑو۔ بلکہ ان کو راہِ راست پر لانے کی اگر کوئی امید تمہارے دل میں ابھی تک موجود ہے۔ تو اُسے منقطع کر دو۔ یہ لوگ انتہائی درجے کے متعصب، ضدی اور عنادی ہیں۔ حیلہ ساز اور فریب دہندہ لوگ ہیں۔ دنیا کی خاطر دین کو بگاڑ دینا ان کا عام مشغلہ ہے۔ لہٰذا ان سے کسی بھی بھلائی کی توقع نہ رکھو۔

احکام میں تحریف

فرمایا ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ اُن میں سے بعض لوگ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے۔ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ پھر اُسے سمجھنے کے باوجود بدل دیتے تھے۔ وَهُمْ يَعْلَمُونَ اور وہ جانتے بھی تھے کہ کیا کرتوت کر رہے ہیں۔ گویا وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب توراۃ میں جان بوجھ کر تحریف کرتے تھے۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں[1]۔ کہ یہاں پر تحریف سے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنا مراد ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ستر آدمیوں کو ساتھ لے کر کوہ طور پہ گئے تھے۔ تاکہ وہ خود اللہ تعالیٰ کا کلام سن لیں۔ کہ یہ کتاب واقعی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی۔ مگر ان لوگوں نے تحریف یہ کی کہ کہا بیشک یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ مگر اس کے احکام پر سختی سے عمل کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ کہا ہے۔ کہ جسقدر آسانی سے عمل ہو سکے کر لینا، باقی کو چھوڑ دینا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن ستر آدمیوں کو بجلی کے ذریعے خاکستر کر دیا تھا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے انہیں پھر زندگی عطا کی۔ مقصد یہ ہے۔ کہ بنی اسرائیل کے ان لوگوں نے دیدہ دانستہ تحریف کی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو بدل دیا۔

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے کے اہل کتاب خصوصاً یہود کی تحریف کی بھی واضح مثالیں موجود ہیں۔ آگے آئے گا کہ یہود کا وطیرہ یہ تھا۔ کہ "يَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ" وہ جانتے تھے۔ کہ نبی آخر الزمان کا دین سچا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو پیشن گوئیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق توراۃ میں بیان کی ہیں۔ وہ سب کی سب آپ پر پورا اترتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود لوگوں کو صحیح بات بتانے کے لیے تیار نہ تھے۔ بلکہ توراۃ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کردہ نشانیوں کو چھپاتے تھے۔ اور لوگوں کو اُلٹی سیدھی باتیں بتا کر آپ پر ایمان لانے سے روکتے تھے۔

سورۃ مائدہ میں آئے گا۔ کہ ان لوگوں نے توراۃ کے احکام میں بھی تحریف کی۔ توراۃ میں رجم کا حکم موجود تھا۔ کہ شادی شدہ زانی کو سنگسار کیا جائے۔ مگر یہودیوں نے یہ حکم چھپا لیا۔ توراۃ میں حضور علیہ السلام کا حلیہ مبارکہ موجود تھا۔ کہ آپ خوش شکل ہوں گے۔ آپ کے بال گھنگریالے اور

---

[1] معالم التنزیل صفحہ ۳۵ ج ۱، مظہری صفحہ ۸۶ ج ۱، تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۹۹ پارہ ۱

آنکھیں سیاہ ہوں گی۔ قد درمیانہ اور رنگ گندمی ہو گا۔ مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لے آئے۔ اور آپ نے اپنی نبوت کا اعلان فرما دیا۔ تو یہودیوں نے توراۃ میں آپ کے بیان کردہ حلیے کو بدل دیا۔ اور لوگوں سے یہ کہنے لگے۔ کہ نبی آخر الزمان (علیہ السلام) لمبے قد والے ہوں گے آپ کی آنکھیں نیلی ہوں گی۔ اور بال سیدھے ہوں گے۔ اس طرح انہوں نے لوگوں کو آپ پہ ایمان لانے سے روکنے کی کوشش کی۔

یہود کی ہٹ دھرمی

الغرض! اہل ایمان کو سمجھایا جا رہا ہے۔ کہ یہود سے یہ توقع نہ رکھو۔ کہ تمہاری تبلیغ سے یہ لوگ ایمان لے آئیں گے، یہ تو سخت قسم کے ہٹ دھرم لوگ ہیں۔ جانتے بوجھتے ہوئے بھی یہ راہ راست سے دور ہی رہیں گے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[1] کہ اس وقت یہودیوں کے دس بڑے عالم موجود ہیں۔ اگر یہ دس آدمی ایمان قبول کر لیں تو کوئی بھی یہودی باقی نہیں رہے گا۔ سب ایمان لے آئیں گے۔ مگر یہ عالم اپنی ہٹ دھرمی پہ قائم رہے۔ ان میں سے صرف ایک آدمی نے ایمان قبول کیا۔ باقی سب اپنی ضد پہ اڑے رہے۔ نصاریٰ کا بھی یہی حال ہے حضور علیہ السلام کو چودہ سو سال گذر چکے ہیں۔ مگر انہوں نے آج تک انہیں تسلیم نہیں کیا۔ آپ کا ارشاد ہے[2] کہ نصاریٰ اسی طرح دنیا میں موجود رہیں گے۔ حتیٰ کہ جب مسیح علیہ السلام قرب قیامت میں نازل ہوں، تو اس وقت ان کی سرکوبی ہوگی۔ اور پھر یہ دنیا سے ختم ہو جائیں گے۔

یہود کے ساتھ موافقت اور ان کی مخالفت

ابتدائے زمانہ میں اللہ تعالےٰ نے یہود کے ساتھ موافقت کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ انہیں ترغیب ہو۔ اور یہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں اس قسم کے احکام ملتے ہیں آگے دوسرے پارے میں قرآن پاک میں بھی آئے گا۔ کہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم یہودیوں کی ترغیب کے لیے ہی تھا۔ خود حضور علیہ السلام نے سر کے بالوں کے بنانے میں اہل کتاب کا طریقہ اختیار کیا۔ اس زمانے میں مشرکین سر میں مانگ نکالا کرتے تھے۔ مگر یہود مانگ نہیں نکالتے تھے، بلکہ ویسے ہی بالوں کو پیچھے کی طرف ڈال دیتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے موافقت کی خاطر ان کا طریقہ اپنایا۔ لہذا آپ مانگ نہیں نکالا کرتے تھے۔ مگر

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۵۶۲ [2] بخاری ج ۱ ص ۴۹۰، مسلم ج ۱ ص ۸۷

یہودی سخت متعصب تھے۔ ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ لہٰذا بعد میں آپ نے مانگ نکالنا شروع کر دیا[1]۔ آپ نے دیکھ لیا کہ یہ لوگ کسی طرح راہِ راست پر آنے کے لیے تیار نہیں۔

اس کے بعد آپ نے دوسرا طریقہ اختیار فرمایا۔ اور اکثر اعمال میں اہل کتاب کی مخالفت شروع کر دی، چنانچہ ایسے کئی ایک مسائل ہیں۔ جن میں اہل کتاب خصوصاً یہودیوں کی مخالفت کا حکم ہے۔ یہود محرم الحرام کی دسویں تاریخ کا روزہ رکھتے تھے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[2] کہ تم ان کی مخالفت کرو اور دسویں تاریخ کے ساتھ نویں تاریخ کا روزہ بھی رکھا کرو۔ اسی طرح یہود حیض والی عورت کو گھر میں نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ علیحدہ کر دیتے تھے۔ آپ نے فرمایا تم عورت کو ہر حالت میں اپنے گھر میں رکھو۔ فرمایا[3] حیض والی عورت گھر کے سارے کام انجام دے سکتی ہے۔ سوائے اس کے کہ اس کے ساتھ مباشرت جائز نہیں۔ میاں بیوی اکٹھے لیٹ سکتے ہیں ایک برتن میں کھانا کھا سکتے ہیں تاہم مباشرت نہیں کر سکتے۔

اہل کتاب بالوں کو رنگنا ناجائز سمجھتے تھے۔ حضور علیہ السلام نے اس کام کی اجازت مرحمت فرمائی[4]۔ یہ ان سے مخالفت کی بنا پر تھا۔ اسی طرح یہود تہ بند نہیں باندھتے تھے۔ آپ نے شلوار پہننے اور تہ بند باندھنے کا حکم دیا مقصد یہ کہ شروع شروع میں مدینہ کے یہودیوں کی خاطر ان کی موافقت میں بعض امور انجام دیئے۔ مگر جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ بڑے ضدی اور ہٹ دھرم لوگ ہیں۔ تو آپ نے ان کے بعض امور کی مخالفت کا حکم دیا۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ اسی بات کو بیان فرما رہے ہیں۔ کہ اے اہل ایمان! تم اہل کتاب سے کسی موافقت کی امید نہ رکھو۔ بلکہ یہ تو سخت عنادی لوگ ہیں۔ یہ کبھی تمہاری بات ماننے پر تیار نہیں ہوں گے۔ بلکہ ان کا وطیرہ تو یہ رہا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سننے کے بعد اس پر عمل نہ کیا۔ بلکہ اس میں تحریف شروع کر دی۔

منافقین کی چالاکیاں

اہل کتاب میں سے تو ایک گروہ ایسا تھا۔ جو علانیہ طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرتا تھا۔ اور آپ کی مخالفت کرتا تھا۔ البتہ ایک مختصر گروہ ایسا بھی تھا۔ جو بظاہر تو دائرہ اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔ مگر درپردہ ان کی ہمدردیاں یہودیوں کے ساتھ تھیں۔ اگلی آیت میں ایسے ہی لوگوں کی دو عملی

---

[1] شمائل مع ترمذی ص ۵۷ [2] مسلم ص ۳۵۹ ج ۱ [3] مسلم ص ۱۴۳ ج ۱ [4] ترمذی ص ۲۶۶

کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا یعنی ایسے لوگ جب اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لا چکے ہیں وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ اور جب یہ الگ ہوتے ہیں اہلِ ایمان کے علاوہ بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ تو قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ کہتے ہیں کیا تم مسلمانوں کو ایسی باتیں بتاتے ہو۔ جو اللہ تعالیٰ نے تم پر ظاہر کی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ یہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے ہاں اس بات میں تمہارے ساتھ جھگڑا کریں گے۔ ان کا مقصد یہ تھا۔ کہ تم مسلمانوں کو توراۃ کے احکام سے کیوں آگاہ کرتے ہو۔ جن میں لکھا ہے کہ نبی آخر الزمان کی یہ نشانیاں ہیں۔ اور یہ کہ توراۃ قرآن پاک کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ کہتے تھے۔ کہ ایسی باتیں اہل ایمان کو نہ بتاؤ۔ یہ آخرت میں اسی سے تمہارے خلاف دلیل قائم کریں گے۔ کہتے تھے کہ یہ ایسی گہری بات ہے۔ جو ہمارے خلاف جاتی ہے اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کیا تم نہیں سمجھتے۔ یعنی تمہیں اس نکتہ کی کیوں سمجھ نہیں آتی کہ یہ چیزیں ہمارے حق میں نہیں ہیں۔

اہل کتاب کی ان تمام تر چالاکیوں کے متعلق ارشاد خداوندی ہے۔ کہ ان کی ہوشیاری کسی کام نہیں آئے گی۔ اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی ہر اُس بات کو جانتا ہے۔ جو یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں وہ سمجھتے تھے۔ کہ منافقت کا یہ چکر چلا کر وہ اہل کتاب اور اہل ایمان دونوں کے ساتھ تعلقات برقرار رکھ سکیں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا پردہ فاش کر دیا۔ اور فرمایا۔ کہ یہ لوگ جو بے ایمانی کر رہے ہیں۔ احکام کی غلط تاویلیں کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ اُن کی کوئی چال کامیاب نہیں ہوگی۔

یہودیوں کی موہوم آرزوئیں

فرمایا تحریفِ کلام اور منافقت تو عام لوگوں کی بیماریاں تھیں۔ یعنی یہ خصائل ان لوگوں کے تھے۔ جو تھوڑا بہت علم رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض لوگ ایسے بھی تھے وَمِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ جو بالکل ان پڑھ تھے انہیں کتاب کا بالکل علم نہیں تھا۔ فرمایا ایسے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتے اِلَّآ اَمَانِیَّ سوائے چند خود ساختہ آرزوؤں کے جن کا ذکر آگے آئیگا یعنی یہ کہ جنّت صرف یہودیوں کے لیے وقف ہے۔ یا یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام

دوزخ کے دروازے پر پھڑے ہوں گے، اور قیامت کے دن کسی یہودی کو جس نے ختنہ کی ہوگی اس میں نہیں گرنے دیں گے۔ یا اگر بنی اسرائیل دوزخ میں چلے بھی گئے۔ تو محدودے اتنے ایام کے لیے جتنے دن ان کے آباؤ اجداد نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔ اس کے بعد پھر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ بنی اسرائیل کے جاہل اور ان پڑھ اس قسم کی آرزوئیں لیے بیٹھے تھے۔ بلکہ ان کا عقیدہ یہاں تک تھا۔ کہ عربوں کا مال ہضم کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ سود کو حلال کرنے کے لیے طرح طرح کی تاویلیں کرتے تھے رشوت کو جائز قرار دیتے تھے وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ اور نہیں ہیں مگر وہ گمان کرتے۔

تورات میں تحریف

تحریف فی الکتاب کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ کہ بنی اسرائیل کا حال یہ ہے۔ کہ اس جرم کی بنا پر فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ق ہلاکت ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھ سے کتاب یعنی تورات لکھتے ہیں ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ پھر کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ گویا اپنی تحریر کو اللہ تعالیٰ کی تحریر کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس قدر ظالم لوگ ہیں۔ اور یہ تحریف اس لیے کرتے ہیں لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ط تاکہ اس کے ذریعے حقیر سا معاوضہ وصول کر لیں۔ مثلاً جب کسی زانی کو رجم کی سزا سے بچانا مقصود ہوتا تو کہہ دیتے تھے۔ کہ تورات کا حکم یہ ہے۔ کہ ایسے شخص کا منہ کالا کرو اور گدھے پر سوار کر کے شہر بھر پھراؤ۔ یا زیادہ سے زیادہ کوئی جرمانہ کر دو۔ اس طرح زانی کی جان بچا لیتے۔ اس کے علاوہ ان کے اور بھی بے شمار من گھڑت مسائل تھے جنہیں تورات کی طرف منسوب کرتے تھے۔

تحریف کی دونوں صورتیں ان میں پائی جاتی تھیں۔ یا تو الفاظ ہی بدل دیتے تھے۔ جیسا کہ بیان ہوا۔ یا پھر الفاظ تو نہیں بدلتے تھے۔ بلکہ ان کی تاویل غلط کر کے اپنا مقصد پورا کر لیتے تھے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی یہ قباحت بھی بیان کر دی۔ کہ وہ کتاب الٰہی میں تحریف جیسی قبیح حرکت کے مرتکب ہوتے تھے۔

تحریف اور مسلمان

تحریف کا دائرہ مسلمانوں تک وسیع ہو چکا ہے۔ آج کے دور میں انصاف کی نظر سے دیکھیں گے۔ تو پتا چلے گا۔ کہ اکثریت کے عقیدے خراب ہو چکے ہیں۔ کتنے خود ساختہ اور جھوٹے عقیدے ہیں۔ جنہیں آج کل کے نام نہاد علماء قرآن و سنت کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ تحریف فی الکتاب و سنت نہیں تو اور کیا ہے۔ آج کے واعظ قبر پرستی، رسومات فاسدہ اور دیگر

بدعات سے متعلق کتنی بناوٹی حدیثیں لوگوں کو سناتے ہیں۔ یہ بالکل یہودیوں کا طریقہ ہے۔ جو مسلمانوں نے بھی اختیار کر لیا ہے۔ اس دور میں نیکی کا وہ معیار کہاں رہ گیا ہے۔ جو کتاب اللہ سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا اقوالِ صحابہؓ کا تھا۔ اصل دین کہاں چلا گیا۔ دورِ حاضر میں دین چند رسومات اور جھوٹے عقائد تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ قرآن و سنّت کی طرف کون رجوع کرتا ہے۔ نہ اُسے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور نہ عمل کرنے کی، شرک و بدعت پر دین کا دارومدار ہے۔ اس کی تبلیغ کرنے والے وہ لوگ ہیں۔ جو جھوٹے قصے کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ یہی چیزیں نعتوں میں ہیں اور غزلوں میں ہیں اور انہیں پر عمل ہو رہا ہے۔ بڑے دکھ سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ آج چند رسوم کو دین کا نام دے دیا گیا ہے۔ اور لوگ حقیقت سے بہت دور جا چکے ہیں۔ دین کو سمجھنے والے لوگ بالکل قلیل تعداد میں ہیں۔ آج کتنے لوگ ہیں۔ جو مفسرین، فقہاء، اور ائمہ دین کی طرز پر ریسرچ کا بیڑا اٹھائیں۔ اور دین کو اس کا صحیح مقام دلائیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشادِ گرامی ہے۔[1] قربِ قیامت میں فتنوں کا دور آئے گا۔ اُس وقت دین کو ہاتھ میں پکڑنا اس قدر مشکل ہو جائے گا۔ جیسے جلتے ہوئے کوئلوں کو پکڑنا۔ آج آپ کسی قبیح رسم کی تردید کر کے دیکھیں، ساری برادری اور خاندان ناراض ہو جائے گا۔ شادی بیاہ کی رسمیں دیکھ لیں۔ پیدائش اور فوتیدگی کی رسوم کی طرف نگاہ ڈالیں۔ میلوں اور عرسوں کی طرف دیکھیں۔ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ قبروں پر چادریں چڑھائی جا رہی ہیں۔ میلے لگائے جا رہے ہیں۔ قوالیاں ہو رہی ہیں۔ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی قبر پر دو ہزار روپے کی چادر لے کر ایک آدمی گیا، یہ کون سا دین ہے؟ مسٹر جناح کی قبر پر بیش قیمت گنبد کی تعمیر کون سی شریعت ہے؟ ہر جگہ عرسوں کی بھرمار ہے۔ قبروں کو غسل دیا جا رہا ہے۔ یہ کس شریعت کی باتیں ہیں؟ کیا یہ یہود کا طریقہ نہیں ہے؟

دین کی بعض چیزیں ایسی ہیں جنہیں بدلنے کے لیے لوگ علماء کو مجبور کرتے ہیں اور پھر دین فروش علماء ان کی اس خواہش کو تحریف کے ذریعے پورا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں نکاح و طلاق کے مسائل کی مثال واضح ہے۔ جلد بازی میں طلاق دے دیتے ہیں جب اپنے کیے پر ندامت ہوتی ہے تو اس کے لیے رستہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔ طلاق کے کتنے ہی ایسے معاملات ہیں جن میں لوگ غلط فتوے حاصل کر لیتے ہیں۔ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ طلاق جیسی اہم اور دوررس چیز کو عائد کرنے سے پہلے اس پر

[1] موارد الظمآن ص ۴۵۸

اچھی طرح غور کیا جاتا، کسی صائب الرائے عالم سے مشورہ لیا جاتا۔ طلاق دینے اور پھر اس کے اثرات کے متعلق پوچھا جاتا۔ مگر ہمارے معاشرے کا اصول یہ ہے۔ کہ طلاق دینے کے بعد اس کے ازالے کے لیے فتوٰی حاصل کرنے آتے ہیں کہ جی غلطی ہوگئی ہے لڑکے نے غصے میں آکر طلاق دے دی ہے۔ اب اس کا کوئی حل بتائیں۔ ہم چوبیس سال سے یہی کچھ دیکھ رہے ہیں اتنے عرصے میں صرف ایک آدمی نے طلاق دینے سے پہلے مشورہ کیا ہے۔ کہ میرا بیٹا اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہے پوری کوشش کے باوجود نباہ کی صورت نظر نہیں آتی۔ آپ ہمیں طلاق دینے کا صحیح طریقہ بتائیں۔ ورنہ باقی سب طلاق دینے کے بعد ہی آئے ہیں۔ کہ اب کسی طرح حلال کر دو۔ یہ دین میں تحریف نہیں اور کیا ہے۔

تحریف کرنیوالوں کو وعید

اسی لیے اللہ تعالٰی نے تحریف کرنے والوں کے متعلق ارشاد فرمایا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ پس ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا یعنی خود لکھ کر اسے اللہ تعالٰی کی طرف منسوب کیا اور تحریف کے مرتکب ہوئے وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ اور ہلاکت ہے ان کے لیے جو انہوں نے کمایا ہے۔ یعنی غلط فتوے دے کر اور تحریف کر کے جو دنیا انہوں نے کمائی وہ ان کے لیے باعث ہلاکت ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حلال کی بجائے حرام کمایا ہے۔ اور حرام کھایا ہے تو اس کی قسمت میں تباہی ہی آئے گی اسی بات کو دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ یعنی کتنے ہی پیر اور عالم ہیں۔ جو لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھا جاتے ہیں۔ یہ باطل طریقے ہی ہیں۔ جو شرکیہ اور بدعتیہ رسوم کو اپنا کر اختیار کیے جاتے ہیں۔ جھوٹی کہانیاں سنا کر اور باطل عقیدے پھیلا کر لوگوں کا مال ہضم کیا جاتا ہے۔ اور ان کے ایمان ضائع کیے جاتے ہیں۔ تو فرمایا اس قسم کی کمائی پر بھی لعنت، تباہی اور بربادی ہے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کے باطل عقائد کی تفصیل آرہی ہے۔ اور قانونِ نجات کا دوبارہ تذکرہ ہو گا۔ جیسا کہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔

درس سی و چہار ۳۴ (آیت ۸۰ تا ۸۲)

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ
اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ۸۰ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَیِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓـَٔتُهٗ
فَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۸۱ وَالَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ
فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۸۲ ع ۹

ترجمہ: اور (یہ یہودی) کہتے ہیں کہ ہرگز نہیں چھوئے گی ہم کو (دوزخ کی) آگ مگر چند دن کے لیے۔ (اے پیغمبر) آپ فرما دیجیے کیا تم نے پکڑا ہے اللہ تعالیٰ کے پاس کوئی عہد پس ہرگز نہیں خلاف کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے عہد کا — بلکہ تم اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہتے ہو، جو تم نہیں جانتے ۸۰ کیوں نہیں جس شخص نے برائی کمائی اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہوں نے، وہی لوگ دوزخ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۸۱ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے۔ وہی لوگ جنّت والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۸۲

یہودیوں کے باطل عقائد

اس رکوع میں اہل کتاب کی خرابیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کافروں سے امید قطع کرنے کا حکم دیا۔ کہ یہ بڑے متعصب لوگ ہیں۔ آپ ان سے ایمان لانے کی امید نہ رکھیں۔ اس کے بعد ان کے دو طبقوں یعنی اہل علم اور ان پڑھ لوگوں کا ذکر ہوا۔ کہ ان جاہل لوگوں کے پاس دین نہیں۔ بلکہ چند جھوٹی آرزوئیں ہیں مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی ایک جھوٹی آرزو یہ ہے۔ کہ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ وہ کہتے ہیں کہ ہم دوزخ میں نہیں جائیں گے اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً مگر چند دن کے لیے جنّت تو ہمارے لیے مقدر ہو چکی ہے۔ دوسری جگہ ان کی بات کو یوں بیان فرمایا "لَنْ یَّدْخُلَ

الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی آگے اسی سورۃ میں آرہا ہے۔ کہ یہود کا ادعا یہ ہے کہ جنّت میں صرف وہ جائیں گے۔ اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ جنّت صرف ان کے لیے ہے۔ اس قسم کی اور بھی باتیں ان کے اعتقاد میں داخل ہیں۔ مثلاً توراۃ کی شرح اور ان کی دیگر دینی کتابوں میں لکھا ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہوں گے۔ اور وہ کسی مختون اسرائیلی کو دوزخ میں نہیں جانے دیں گے۔ ختنہ کی ابتدا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہی ہوئی تھی۔ البتہ مشرکوں میں بعض کرتے ہیں اور بعض نہیں کرتے۔ وہ کہتے تھے۔ کہ بالفرض اگر ہم دوزخ میں چلے بھی گئے تو چند دن سے زیادہ وہاں نہیں رہیں گے۔ بلکہ جنّت میں چلے جائیں گے۔

اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً سے کیا مراد ہے۔ اس میں مختلف آراء ہیں۔ بعض کہتے ہیں[۱] کہ یہودیوں کا اعتقاد یہ ہے۔ کہ دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے۔ اور ہر ہزار سال کے بدلے ایک دن یہودی دوزخ میں رہیں گے۔ گویا زیادہ سے زیادہ سات دن انہیں دوزخ میں رہنا پڑے گا۔ بعض کہتے ہیں[۲] کہ اتنے دن دوزخ میں رہیں گے۔ جتنے دن موسیٰ علیہ السلام طور پر اعتکاف بیٹھے تھے اور انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔ یعنی چالیس دن ایک تیسرے گروہ کا خیال ہے۔ کہ جتنی عمر انہوں نے اس دنیا میں گذاری ہے۔ اُتنے سال، مہینے، دن دوزخ میں گذار کر پھر بہشت میں پہنچ جائیں گے۔ الغرض! اس سلسلے میں مختلف قیاس آرائیاں ہیں۔ جو یہودیوں نے پھیلا رکھی ہیں۔

عہدِ خداوندی

حضور علیہ السلام نے فرمایا[۳] یہ سب ان کی خام خیالیاں ہیں۔ جنّت اور دوزخ میں جانے کا یہ اصول ہرگز نہیں۔ جو بنی اسرائیل نے خود بنا رکھا ہے۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو یہ پیغام دیا قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا آپ ان سے فرما دیں۔ کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد پکڑ رکھا ہے۔ کہ تم ضرور ہی جنّت میں جاؤ گے اور یہ کہ تم چند دن سے زیادہ دوزخ میں نہیں رہو گے۔ وہ کون سا عہد ہے۔ جس کی پابندی اللہ تعالیٰ ضرور کرے گا۔

---

[۱] تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۰۶ پارہ ۱، تفسیر ابن کثیر ص ۱۱۸ ج ۱، معالم التنزیل ص ۳۶ ج ۱ [۲] تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۰۶ پارہ ۱، تفسیر ابن کثیر ص ۱۱۸ ج ۱، معالم التنزیل ص ۳۶ ج ۱
[۳] تفسیر ابن کثیر ص ۱۱۸ ج ۱

فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اور اللہ تعالیٰ اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی وعدہ تم سے نہیں کر رکھا ہے۔ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ بلکہ تم اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہتے ہو۔ جو تم نہیں جانتے۔ البتہ ایمانداروں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر رکھا ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا میں سکھایا۔ کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح کہا کرو[1] اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعْهَدُ اِلَيْكَ فِیْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی اے اللہ! میں تیرے سامنے اس دنیا کی زندگی میں عہد کرتا ہوں بِاَنَّكَ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ یہ کہ تو ایک ہے۔ اور تیرا کوئی شریک نہیں وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُوْلُكَ اور بے شک حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے بندے اور تیرے رسول ہیں وَاِنِّیْ لَا اَثِقُ اِلَّا بِرَحْمَتِكَ اور مجھے صرف تیری رحمت پر ہی بھروسہ ہے۔ اِنْ تَكِلْنِیْ اِلٰى نَفْسِیْ اگر تو مجھے میرے نفس کی طرف سونپ دے گا۔ تُقَرِّبْنِیْ مِنَ الشَّرِّ تو مجھے شر سے قریب کر دے گا۔ وَتُبَاعِدْنِیْ مِنَ الْخَيْرِ اور نیکی اور بھلائی سے دُور کر دے گا۔ فَاجْعَلْ لِّیْ عِنْدَكَ عَهْدًا تُوَفِّيْنِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ پس تو میرے لیے عہد بنا دے کہ اس کو قیامت والے دن پورا کرے۔ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ بے شک تو وعدے کا خلاف نہیں کرتا۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا، جو شخص اس دعا کو دنیا میں پڑھے گا۔ تو اس کو قیامت والے دن اس کا بدلہ ملے گا۔ اور ظاہر ہے۔ کہ اگر کوئی عہد کرنا ہو تو وہ ایمان کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے ایمان کے بغیر کوئی عہد نہیں ہو سکتا۔ جو انسان کے لیے دوزخ سے نجات کا ذریعہ بن سکے۔ مگر اے بنی اسرائیل تمہارے پاس تو ایمان موجود نہیں۔ لہٰذا تم یہ دعوےٰ کیسے کر سکتے ہو۔ کہ ہم اوّل تو دوزخ میں جائیں گے نہیں۔ اور اگر گئے بھی تو چند روز سے زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔ بلکہ جنّت میں آجائیں گے۔ یہ تو تمہارا عقیدہ بالکل فاسد ہے۔

باطل عقائد کی بنیاد

فرمایا اللہ تعالیٰ کے ہاں بنی اسرائیل کے عقائدِ باطلہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے جنّت میں پہنچنے اور دوزخ سے نجات کا قانون تو آگے آ رہا ہے۔ جس چیز کو بنی اسرائیل

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۱۳۸ ج ۳

بیان کر رہے ہیں۔ اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ جب امت کا رشتہ علم وعمل نبی سے منقطع ہو جاتا ہے۔ تو آرزوئیں اور خواہشات عقیدے بن جاتے ہیں۔ یہی حال یہودیوں کا تھا۔ اُن کے تمام افعال نبی سے قطع تعلقی پہ دلالت کرتے ہیں۔ انہوں نے نبی کی تعلیم کو پس پشت ڈال کر اپنی مرضی کے عقیدے وضع کئے ہوئے ہیں۔ اور انہیں من گھڑت عقیدوں بلکہ خواہشات کی بنا پہ وہ اس زعم میں مبتلا ہیں۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں دوزخ سے بچالیں گے۔

مسلمانوں کے باطل عقائد

اس قسم کے غلط عقیدوں کا دائرہ یہودیوں تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ مسلمانوں تک وسیع ہو چکا ہے۔ شفاعت کا مسئلہ ہی لے لیں۔ یہاں پہ یاشَفِیعَ الْمُذْنِبِیْنَ کے نعرے مارے جاتے ہیں۔ کہ ہم جو چاہے کرتے پھریں۔ حضور علیہ السلام ہماری شفاعت کر دیں گے اور ہم نجات پا جائیں گے۔ حالانکہ شفاعت کا مسئلہ قرآن پاک نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ شفاعت لوگوں کی خواہش پہ نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ تو اللہ جل جلالہ کی مرضی پہ موقوف ہے۔ لَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر تو کوئی بھی سفارش نہیں کریگا۔ تم کس زعم میں مبتلا ہو۔ یہ عقیدہ کہ فلاں ضرور ہماری سفارش کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اُسے ضرور ہی قبول فرمائے گا۔ یہ تو یہودیوں والا عقیدہ ہے محض میلاد منعقد کر لینا، جلوس نکال لینا یا گیارہویں منا لینا کافی سمجھ رکھا ہے۔ بس شفاعت کے حقدار ہو گئے۔ شیعہ بھی یہی کہتے ہیں۔ حضرت حسینؓ کا نام لے لو۔ ماتم برپا کر لو۔ بس بخشے جاؤ گے کسی نماز روزے کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کے باطل عقیدے اس وقت پیدا ہوتے ہیں۔ جب علم وعمل کا تعلق نبی سے کٹ جاتا ہے۔ پھر خواہشات عقیدے بن جاتے ہیں۔ اور ساری عمر لوگ اسی ڈھول کو پیٹتے رہتے ہیں۔ یہ یہودیوں والے عقائد ہیں۔ سفارش کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ جو لوگوں نے سمجھ لیا ہے۔ کہ خدا چاہے راضی ہو یا ناراض، نبی۔ ولی، جبری سفارش کریں گے۔ اور ہمیں بچالیں گے یہودیوں نے بھی یہیں ٹھوکر کھائی۔ اور ہم بھی اُسی راستے پر چل نکلے ہیں۔ ان میں اور ہم میں کیا فرق رہ گیا ہے

فرمایا اے بنی اسرائیل النجات کا قانون وہ نہیں ہے۔ جو تم نے بنا رکھا ہے۔ کہ جنت میں پہنچنے کے لیے صرف یہودی ہونا کافی ہے۔ بَلٰی بلکہ قانونِ نجات یہ ہے۔ کہ مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّاَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْٓئَتُہٗ جس شخص نے بھی گناہ کمایا۔ اور اس کے گناہوں نے اسکو گھیر لیا۔ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ یہی لوگ دوزخی ہیں۔ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ وہ

ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ وہی گناہ انسان کو گھیرے گا۔ جو سب سے بڑا ہوگا۔ اور چاروں طرف چھایا ہوگا۔ اور یہ گناہ کفر و شرک کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ آدمی بہت سے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ مگر وہ گناہوں سے گھرا ہوا نہیں ہوتا۔ جب تک کفر و شرک کا ارتکاب نہ کرے۔ قرآن پاک میں آتا ہے "وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" سب سے بڑے ظالم کافر ہیں۔ نیز فرمایا "اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وضاحت کے ساتھ فیصلہ کر دیا "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ" مشرک کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ "وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ" اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے معاف فرمادے۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو بغیر توبہ کے بھی کسی کو معاف فرمادے۔ وہ مالک ہے۔ مگر شرک اور کفر جیسے عظیم گناہوں کو معاف نہیں کرے گا۔ یہ اُس کا اٹل فیصلہ ہے۔ ہاں اگر سکراتِ موت طاری ہونے سے پہلے پہلے اُس نے توبہ کرلی، تو وہ معاف کر دے گا۔ کیونکہ توبہ کا دروازہ اس وقت تک کھلا ہے۔ جب تک کسی پر موت کے آثار ظاہر نہ ہو جائیں۔ فرمایا "اِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ" انسان کی توبہ غرغرہ طاری ہونے سے پہلے پہلے مقبول ہے اس کے بعد نہیں۔

کافر اور مشرک دائمی جہنمی ہیں

اسی لیے فرمایا "وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" جس شخص نے اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا انکار کیا "فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا" ایسا شخص گمراہ ہو کر دور جا پڑا۔ اور ابدی جہنمی ہے اس کے لیے دوزخ سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔

یہ ایسے شخص کی مثال ہے۔ جسے ایمان کی دولت نصیب نہیں ہوئی۔ بلکہ کھلم کھلا کفر پہ اڑا رہا۔ البتہ ایک دوسری صورت یہ بھی ہے۔ کہ انسان اللہ تعالیٰ پہ اور دوسری چیزوں پر ایمان لائے۔ اور ساتھ ساتھ شرک کا ارتکاب بھی کرتا جائے۔ یعنی اُس نے اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ ملا لیا ہے۔ اور اپنے ایمان کو خراب کر لیا ہے۔ قرآن پاک نے اس مضمون کو بڑی تاکید کے ساتھ

ؔ ترمذی ص۵۰۸

بیان کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام منادی کرتے تھے۔ اے لوگو! خوب اچھی طرح سن لو" اُعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ" اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے۔ اور تمہارا بھی رب ہے۔ اپنی حاجتوں میں غیر اللہ کو مت پکارو، اور نہ اُن کی ایسی تعظیم کرو۔ جو اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے، ورنہ شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے، اور نجات سے محروم ہو جاؤ گے" اِنَّهٗ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ" جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا، اللہ تعالیٰ نے اُس پر جنت حرام کر دی ہے۔ "وَمَاْوٰىهُ النَّارُ" اور اس کا ٹھکانا دوزخ میں ہو گا۔

اسی طرح کافروں کے متعلق فرمایا کہ اُن کے لیے آسمانوں کے دروازے نہیں کھلیں گے۔ "لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ" یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گذر جائے نہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گذرے اور نہ کفار کے لیے جنت کے دروازے کھلیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن پر جنت حرام کر دی ہے۔

جنت کی چابی

جس طرح کفر اور شرک عظیم گناہ ہیں۔ اسی طرح ایمان عظیم ترین نیکی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ صحابہؓ نے عرض کیا اَیُّ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ۔ حضور! کونسا عمل افضل ترین ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا[1] اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا۔ یہ تمام اعمال کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسی لیے فرمایا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا جو لوگ ایمان لائے وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور نیک اعمال کیے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ادا کیا۔ اس کے بعد جہاد اور نیکی کے دیگر کام انجام دیے، ان کے متعلق فرمایا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یہی لوگ جنت والے ہیں۔ جنت کی چابی ان کے پاس ہے۔ اور یہ کوئی عارضی مقام نہیں ہو گا، بلکہ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں سے کبھی بھی نکالے نہیں جائیں گے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا قانونِ نجات ہمارے پاس ہے۔ تم کفر اور شرک کا ارتکاب کرتے ہو۔ دنیا کی دیگر برائیوں میں ملوث ہوتے ہو۔ اس کے باوجود اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تمہیں دوزخ میں نہیں گرنے دیں گے۔ یہ بالکل باطل خیال ہے۔

---

[1] مسلم ص۶۲ ج۱

درس سی و پنج ۳۵ (آیت ۸۳)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ط ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

ترجمہ: اور اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور قرابت داروں کے ساتھ۔ اور یتیموں کے ساتھ اور مساکین کے ساتھ۔ اور کہو لوگوں کے لیے نیک بات اور نماز کو قائم رکھو۔ اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ پھر پھر گئے تم (اے بنی اسرائیل) مگر بہت تھوڑے تم میں سے اور تم اعراض کرنے والے ہو ﴿۸۳﴾

ربط آیات

ان آیات میں بنی اسرائیل کی مختلف خرابیاں بیان ہو رہی ہیں۔ پچھلے درس میں ان کے ان غلط عقائد کا رد تھا۔ کہ یہودیوں اور نصاریٰ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص جنت میں نہیں جا سکتا یہ اللہ تعالیٰ پر افتراء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایسا کوئی عہد نہیں کیا۔ البتہ خود اللہ تعالیٰ نے تورات میں جو عہد بنی اسرائیل سے لیا تھا۔ اس کا ذکر ہے۔ اور وہ ایسا عہد تھا۔ جو کہ نہ صرف تورات میں تھا۔ بلکہ تمام سابقہ انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں بھی موجود تھا اور اس کی تمام باتیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں بھی آگئی ہیں۔

توحید کے دو پہلو

اس آیت میں جس عہد کا ذکر آرہا ہے۔ وہ عہد توحید ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اس واقعہ کو یاد کرو۔ جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا۔ میثاق پختہ عہد کو کہتے ہیں۔ جو بڑا مضبوط اور پکا ہو۔ اور وہ عہد یہ تھا۔ کہ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ لَا تَعْبُدُوْنَ کا لفظی معنی تو یہ ہے کہ تم عبادت نہیں کرو گے یہ خبر کی صورت ہے۔ مگر حقیقت میں یہ حکم ہے۔ یعنی لَا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ۔ اللہ تعالیٰ

کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ایسی بات کو خبر کی شکل میں ذکر کرنے کا مقصد اس میں زور پیدا کرنا ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دو پہلو ہیں۔ مثبت پہلو تو پہلے گذر چکا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ "اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ" اپنے رب کی عبادت کرو۔ اس کی توحید کو تسلیم کرو۔ وحدانیت کا دوسرا پہلو منفی ہے۔ یعنی لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ جہاں تک پہلے حصے کا تعلق ہے۔ وہ تو واضح ہے۔ اور اس میں اختلاف بھی پیدا نہیں ہوتا کہ بھئی اپنے رب کی عبادت کرو۔ مگر توحید کے دوسرے حصے میں جا کر اکثر گڑبڑ پیدا ہوتی ہے۔ اور لوگ شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ صورتِ حال اُس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب لوگ حقیقی رب کی عبادت کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی عبادت بھی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بائیبل میں اگرچہ بہت کچھ تحریف ہو چکی ہے مگر توحید کا مسئلہ آج بھی اس میں موجود ہے۔ اور وہ اس طرح ہے کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اُوپر خدا کے غیر کی عبادت نہ کرو۔ سجدہ نہ کرو۔ صرف خداوند جو بنی اسرائیل کا خدا ہے۔ اس کی عبادت کرو۔ مقصد یہ کہ توحید ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جو تمام انبیاء علیہم السلام کی شرائع میں قدر مشترک کے طور پر موجود رہا ہے۔ آیت زیرِ درس میں بھی یہی مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کے مختلف عہد

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے مختلف اوقات میں مختلف عہد لیے۔ منجملہ اُن کے تورات میں یہ عہد تھا۔ جسے قرآن پاک نے بیان کیا "وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ" یعنی اے بنی اسرائیل اس بات کو یاد کرو۔ جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا۔ اور تمہارے سروں پر کوہ طور کو معلق کر دیا تھا۔ نیز یہ بھی کہ "خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ" جو کچھ ہم نے عطا کیا ہے۔ اس کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ اور اس کے مطابق عمل کرو۔

اور پھر یہ بھی کہا تھا "وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ" جو کچھ ہم نے تورات میں نازل کیا ہے اس کو یاد کرو۔ تورات میں یہ عہد بھی لیا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب لوگوں کے سامنے ظاہر کرو گے چھپاؤ گے نہیں۔ یہ لوگ اصل احکام کو چھپا لیتے تھے۔ اور ان کی جگہ خود ساختہ مسائل لوگوں کو بتاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم "لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ" پر عمل نہیں کرتے تھے۔

معرفت الٰہی

الغرض! اس مقام پر جس عہد کا ذکر ہے وہ یہ تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ بلکہ صرف اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرنا۔ عبادت کے لیے ضروری ہے۔

ہے۔ کہ جس کی عبادت کرتا ہے۔ اس کی صحیح پہچان بھی ہو۔ اسی لیے سب سے پہلے رب تعالیٰ کی پہچان کرائی گئی ہے۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ① الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ② مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ③ یہ سب اللہ تعالیٰ کی پہچان ہی تو ہے۔ یعنی رب وہ ہے جو ان صفات کا مالک ہے۔ "اَلَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ" وہی تمہارا بھی خالق ہے۔ اور تم سے پہلے آنے والے لوگوں کا بھی وہی مالک ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات کا جاننا بھی ضروری ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ علمِ محیط کا مالک ہے۔ اُسے ذرّے ذرّے کا علم ہے "اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ" اس صفت کی پہچان ہوگئی تو توحید سمجھ میں آجائے گی۔ اسی طرح قادرِ مطلق ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی صفات خاصہ میں سے ہے "اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" وہ قادرِ مطلق ہے۔ جو چاہے کرتا ہے۔ اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی صفت یہ ہے۔ کہ وہ واجب الوجود ہے۔ اُس کا وجود اپنی ذات سے ہے۔ باقی تمام چیزوں کا وجود مستعار ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ وہ خالق ہے۔ کسی چیز کا حکم دینا یا کسی چیز سے منع کرنا بھی اس کی صفت ہے۔

اس کے علاوہ اُن چیزوں کی پہچان بھی ضروری ہے۔ جن کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز نہیں مثلاً اللہ تعالیٰ عاجزی اور جہالت سے پاک ہے۔ رافضیوں کا عقیدہ بالکل باطل ہے جو کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو بدا بھی ہوتا ہے۔ یعنی پہلے وہ کام کرلیتا ہے، بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ کام نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ یا جس طرح یہودیوں کا باطل عقیدہ ہے۔ کہ بعض کام کرکے اللہ تعالیٰ نادم بھی ہوتا ہے۔ توراۃ کے پہلے باب میں موجود ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کو پیدا کرکے خود پچھتایا۔ تو ایسی بیہودہ باتوں کا جاننا بھی ضروری ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا۔ تو فرمایا۔ بھائی! سب سے پہلے ان لوگوں کو توحید اور رسالت کی دعوت دینا فَاِذَا عَرَفُوا اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ جب وہ اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح سے پہچان لیں، تو پھر انہیں خدا تعالیٰ کے احکام یعنی نماز، روزہ

عا مسلم صہ۳۷/ج۱

زکوٰۃ اور حج وغیرہ کے احکام بتلانا۔ کہ اُس خدا تعالیٰ نے تم پر یہ فرائض عائد کیے ہیں۔ انہیں انجام دینا لازم ہے۔

والدین سے حسن سلوک

بہر حال عہد کا پہلا حصہ یہ تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اور اُس کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہ کرو۔ عہد کا دوسرا حصہ فرمایا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آو۔ والدین کے ساتھ نیکی کرنا صرف بنی اسرائیل کی شریعت میں ہی ضروری نہیں تھا۔ بلکہ یہ تو شریعت محمدیہ کا بھی ایک لازمی جزو ہے۔ "وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا" یعنی خدا تعالیٰ کا یہ اٹل فیصلہ ہے۔ کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ گویا اللہ تعالیٰ کے حق کا ذکر کیا۔ اور پھر ساری مخلوق میں والدین کو سب سے اوّل نمبر پر شمار کیا۔ یہ احکام تمام انبیاء علیہم السلام کے شرائع میں موجود رہے ہیں۔ توراۃ[1] اور قرآن پاک میں بھی موجود ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حسن سلوک کے سلسلے میں والدین کو کیوں مقدم رکھا ہے۔ مفسرین کرام بیان کرتے ہیں۔ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ خالق اور حقیقی مربی ہے۔ اسی طرح والدین بھی اس مادی دنیا میں اولاد کی پرورش میں حصہ لیتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا حق مقدم رکھا ہے۔ والدین جو احسان اولاد کے ساتھ کرتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ساتھ ملتا جلتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کسی پر مہربانی فرما کر اس سے معاوضہ طلب نہیں کرتا اسی طرح والدین کے اپنی اولاد پر بے مثال احسان ہوتے ہیں۔ لہٰذا ماں باپ کے حقوق کو اللہ تعالیٰ نے دوسرے لوگوں پر فوقیت دی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ماں اور باپ میں سے کون مقدم ہے۔ تو اس کے متعلق حدیث پاک میں آتا ہے[2] کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا۔ یارسول اللہ میں کس کے ساتھ اچھا سلوک کروں۔ آپ نے فرمایا اُمّک یعنی اپنی ماں کے ساتھ، اس شخص کے تین بار کے سوال کے جواب میں آپ نے ماں کا ذکر کیا۔ حتیٰ کہ چوتھی دفعہ پوچھنے پر آپ نے فرمایا

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۳۱۲ پارہ ۱، [2] ترمذی صفحہ ۲۸۲ مسلم صفحہ ۳۱۴ ج ۲، بخاری صفحہ ۸۸۳ ج ۲

اَبَاكَ یعنی اپنے باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ گو یا خدمت کے سلسلے میں ماں کو باپ سے بھی مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کی پیدائش اور پرورش میں ماں زیادہ تکالیف برداشت کرتی ہے۔ لہٰذا خدمت کی زیادہ حقدار بھی وہی ہے۔ قرآن پاک نے ماں کے متعلق فرمایا "حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ" یعنی ماں نے تکلیف پر تکلیف اٹھا کر بچے کو پیٹ میں رکھا۔ اسی لیے محدثین عظام فرماتے ہیں[۱] کہ اگر ماں اور باپ دونوں کو پیاس لگی ہوئی ہو۔ تو پہلے ماں کو پانی پلاؤ۔ کہ خدمت میں اس کا حق فائق ہے۔ مگر جہاں ادب و احترام مقصود ہو گا تو وہاں باپ مقدم ہو گا۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں[۲]۔ کہ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کی ایک صورت ترک ایذا ہے۔ ماں باپ کو قول سے یا فعل سے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ کیونکہ یہ احسان کے خلاف ہے۔ بلکہ اولاد کا فرض ہے۔ کہ اپنے جسم اور مال کے ساتھ ماں باپ کی خدمت کرے۔ اگر والدین مالی طور پر ضرورتمند ہیں۔ تو ان کی ضروریات پوری کی جائیں۔ ورنہ جسمانی طور پر تو لازماً ان کو راحت پہنچائیں۔ مثلاً ان کی مٹھی چاپی کریں۔ ان کو کھلائیں پلائیں۔ ان کو نہلائیں دھلائیں وغیرہ وغیرہ۔

ماں باپ کی فوتیدگی کے بعد ان کے لیے بخشش کی دعا کرنا بھی اُن کی خدمت کے مترادف ہے۔ ان کے لیے استغفار کرو۔ صدقہ و خیرات کرو۔ تاکہ اُن کے لیے آخرت میں راحت کا سبب بنے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے[۳]۔ کہ اگر ماں باپ نے کوئی وصیت کی ہے۔ تو اولاد کو چاہیئے کہ اُسے پورا کریں۔ حتیٰ کہ ماں باپ کے دوستوں کے ساتھ حسنِ سلوک بھی ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک سمجھا جائے گا۔

مسلم اور ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے[۴]۔ کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ گدھے پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک بدّو ملا۔ آپ نے اپنا گدھا اس بدّو کو دے دیا۔ آپ کے سر پر پگڑی تھی۔ وہ بھی بدّو کے سر پر رکھ دی۔ ساتھیوں نے عرض کیا۔ حضرت! آپ کے پاس یہی ایک گدھا تھا۔ جو سواری کے کام آتا تھا ——— مگر آپ نے اس دیہاتی کو دے دیا۔ دیہاتی لوگ

۱؎ کوکب الدری صـ ۱۷/۲ج ۲؎ تفسیر عزیزی فارسی صـ ۳۱۳/پارہ ۱۵
۳؎ ابوداؤد صـ ۳۴۴/۲ج، ابن ماجہ صـ ۲۶۰، ۴؎ مسلم صـ ۳۱۴/۲ج، جمع الفوائد صـ ۱۶۹/۲ج، بحوالہ مسلم، ترمذی، ابوداؤد

تو معمولی چیز پر بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ آپ نے اپنی قیمتی سواری تک دے دی۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ بھائی! اس کا باپ میرے والد کا دوست تھا۔ اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ باپ کے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا باپ کے ساتھ نیکی میں شریک ہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کی بعض حدود بھی متعین ہیں۔ سورۃ لقمان میں واضح ہے "وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا" اگر ماں باپ تمہیں شرک پر آمادہ کریں تو پھر ان کی اطاعت نہیں کرنی البتہ دنیا میں ان سے اچھا سلوک کرو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ اگر والدین ترکِ فرض پر مجبور کریں، تو ان کی بات نہیں ماننی چاہیئے۔ مثلاً کسی پر حج فرض ہو گیا ہے۔ مگر ماں باپ روکتے ہیں۔ تو ان کی بات کی پرواہ نہیں کی جائے گی۔ قربانی واجب ہے۔ اگر والدین اس سے روکیں تو نہیں رکنا۔ البتہ اگر سنّت مؤکدہ کی ادائیگی میں رکاوٹ ڈالیں۔ تو ان کے کہنے پر ایک دو دفعہ ٹالا جا سکتا ہے تاہم سنّت مؤکدہ کی ادائیگی کرنی ہو گی۔ نفلی عبادت کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں[2]۔ کہ اگر ماں باپ روکتے ہیں، تو قطعی طور پر رُک جاؤ۔ ماں باپ کی بات مانو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مسجد میں جا کر نفل پڑھنا چاہتا ہے۔ اور والدین کہتے ہیں۔ کہ ان کو تنہائی میں وحشت ہوتی ہے۔ لہٰذا نوافل کے لیے مسجد میں نہ جاؤ۔ تو ماں باپ کی خدمت مقدم ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہے۔ کفر و شرک پر آمادگی تو کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں۔ اس کے علاوہ اگر ماں باپ بدعات پر آمادہ کریں۔ تو ان کی اطاعت نہیں کرنا ہو گی۔ مثلاً وہ کہیں کہ قبر پر سجدہ کرو۔ یا داتا صاحب بکرا چڑھاؤ۔ فلاں جگہ نیاز دے کر آؤ۔ تو ایسی باتوں کو نہیں ماننا۔ بلکہ ایسی چیزوں کی مخالفت ضروری ہو جاتی ہے۔ تاہم ان تمام تر حدود و قیود کے باوجود والدین سے حسن سلوک ہر حالت میں لازم ہے۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا کا یہی مطلب ہے۔

قرابتداروں کے حقوق

والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بعد فرمایا وَذِي الْقُرْبٰى یعنی قرابتداروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو۔ قرابتداروں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم محرم قرابتداروں کی ہے۔ یعنی وہ قرابتدا

---

[1] تفسیر عزیزی صہ ۳۱۳ پارہ ۱ ، [2] تفسیر عزیزی فارسی صہ ۳۱۳ پارہ ۱

جو آپس میں محرم ہوں اور جن کا آپس میں نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ مثلاً بھائی، بہن، چچا، بھتیجی، پھوپھی بھتیجا وغیرہ۔ قرابتداروں کی دوسری قسم غیر محرموں کی، جیسے ماموں زاد، خالہ زاد، چچازاد وغیرہ۔ فرمایا ان سب کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ کسی کو ایذا نہ پہنچاؤ۔ رضاعی ماں کی خدمت کرو۔ دور والے رشتہ داروں کی مالی خدمت زیادہ موزوں ہے۔ ایک مالدار شخص اپنے محتاج عزیزوں کی خبر گیری نہیں کرے گا۔ تو مجرم ٹھہرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئے گا۔ فرمایا "وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ" قرابتداروں کو اُن کا حق ادا کرو۔ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے۔ تو اُن کی امداد کرو۔ یہ ان کا حق ہے

یتیم، مسکین اور فقیر

اس کے بعد فرمایا وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی نیک سلوک کرو۔ یتیم وہ نابالغ بچہ ہوتا ہے، جس کے سر پر والدین کا سایہ نہ ہو۔ اس کی پرورش کرنے والا کوئی نہ ہو۔ اس کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم ہے۔ تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔

کہتے ہیں کہ جانوروں میں یتیم وہ سمجھا جاتا ہے۔ جس کی ماں موجود نہ ہو۔ باقی چیزوں میں یتیم وہ چیز ہے۔ جس کی نظیر نہ ہو۔ اور وہ نادر چیز ہو۔ جیسے دُرِّ یتیم۔ نادر قسم کا عمدہ بیمثال موتی۔

مسکینوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ مسکین اس شخص کو کہتے ہیں جس کا خرچ اس کی آمدنی سے پورا نہ ہوتا ہو۔ بیچارہ کثیر العیال، محنت مشقت کرتا ہے۔ مگر جو کچھ کماتا ہے۔ اس میں گذر اوقات نہیں ہوتی۔ ایسا شخص بھی حسن سلوک کا مستحق ہے۔ اس کی مدد کرنی چاہیئے۔

محتاجوں میں ایک قسم فقیر کی بھی ہے۔ اور فقیر ایسے شخص کو کہا جاتا ہے۔ جو بالکل ہی نادار ہو، اور جس کے پاس دو وقت کا کھانا بھی میسر نہ ہو۔ ایسا شخص بھی حقدار ہے۔ اس کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہیئے۔

الغرض! اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ اے بنی اسرائیل! اس وقت کو یاد کرو، جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ماں باپ کے حسن سلوک سے پیش آؤ۔ قرابتداروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْۤ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ط ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

ترجمہ :- اور اس واقعہ کو یاد کرو۔ جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا کہ تم اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔ اور قرابتداروں کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ اور مسکینوں کے ساتھ۔ اور کہو لوگوں سے نیک بات اور نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ پھر پھر گئے تم اے بنی اسرائیل مگر بہت تھوڑے تم میں سے۔ اور تم اعراض کرنے والے ہو ﴿۸۳﴾

گذشتہ سے پیوستہ

ان آیات میں بنی اسرائیل کی خرابیوں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے ان کی حیلہ سازی کے ذریعے احکام شریعت سے اعراض کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کی مفسدانہ باتوں اور انبیاء علیہم السلام کی ایذارسانی کا ذکر بھی آیا ہے۔ بنی اسرائیل نے آزادی حاصل کرنے کے بعد خود شریعت کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے تورات عنایت فرمائی۔ پھر خود ہی کہنے لگے۔ کہ ہم اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالےٰ نے اُن سے عہد لیا تھا۔ جب انہوں نے لیت ولعل کیا۔ تو اُن کے سروں پر کوہ طور معلق کر کے انہیں ڈرایا گیا۔ اس عہد کی تفصیلات سورۃ اعراف میں آئی ہیں۔

جیسا کہ گذشتہ درس میں عرض کیا تھا۔ کہ یہ دوسرا عہد ہے۔ جو اللہ تعالےٰ نے تورات کے ذریعے بنی اسرائیل سے لیا۔ اور وہ یہ تھا۔ کہ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ یعنی اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ اور ماں باپ، قرابتداروں، یتیموں اور مسکینوں سے حسن سلوک سے پیش آنا۔ اس سلسلے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے [1]۔ کہ ایک شخص نے عرض کیا، حضرت!

---

[1] مسلم صـ۹۲ جـ۱

اَیُّ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ زیادہ بہتر عمل کونسا ہے۔ توآپ نے ارشاد فرمایا اَلصَّلٰوۃُ لِوَقْتِھَا یعنی نماز اپنے وقت پر ادا کرنا۔ اس شخص نے دوبارہ عرض کیا۔ حضور! اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے۔ توخاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بِرُّ الْوَالِدَیْنِ یعنی والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔ کہ یہ بنیادی چیز ہے۔ اُس شخص نے سہ بارہ پوچھا کہ اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے، توآپ نے فرمایا جہاد فی سبیل اللہ۔

تہذیب اخلاق

اصل بات یہ ہے۔ کہ علم سے دو چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ تہذیبِ اخلاق اور اجتماعی حقوق تہذیب اخلاق میں آگے دو چیزیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی اصلاح عقیدہ اور اعمال صالحہ، جب تک عقیدے کی اصلاح نہیں ہوگی، کوئی بھی عمل مقبول نہیں ہوگا۔ لہٰذا سب سے پہلے اصلاح عقیدہ ضروری ہے۔ اور اس میں بنیادی چیز توحید ہے۔ جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کی عبادت نہ کرو۔ جب عقیدہ درست ہوجائے تو پھر اعمال صالحہ بھی مقبول ہوں گے۔

تہذیبِ اخلاق کا دوسرا جزو اجتماعی حقوق ہیں۔ ان کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اور اس میں والدین کے ساتھ حسُنِ سلوک کو اولیت حاصل ہے۔ ماں باپ کو اپنے بچوں کی اچھی تربیت کا صلہ ملنا چاہیئے۔ اولاد کی پرورش کے لیے والدین کو بڑی تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اس کی مکافات یہ ہے۔ کہ اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ قرآن پاک کی بیشتر سورتوں میں والدین کے ساتھ حسُنِ سلوک کے احکام موجود ہیں۔

اجتماعی حقوق میں قرابتداروں کا حق بھی ہے۔ اس کے بعد یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسُنِ سلوک کی تائید ہے۔ یہ لوگ اپنے گھر کے ہوں، گلی محلے یا شہر یا ملک کے۔ سب کے سب اجتماعی حقوق میں آتے ہیں۔ چونکہ یہ بھی انسان کے ساتھ احسان کرتے ہیں۔ اس لیے اجتماعی طور پر اس کا بدلہ دینا بھی ضروری ہے اسی کو عدل کہتے ہیں۔ عدل اور احسان تقویٰ کے دو اجزا ہیں لہٰذا یہ سب چیزیں تہذیب اخلاق میں آجاتی ہیں، یہ ایک بنیادی تعلیم ہے۔ جو محض بنی اسرائیل کے لیے خاص نہیں ہے۔ بلکہ ہماری اُمت کے لیے بھی یکساں طور پر قابل عمل ہے۔

حسُن کلام

الغرض! آیت زیرِ درس کے پہلے حصے کی تشریح گذشتہ درس میں پیش کر دی تھی جس میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ والدین، قرابتداروں،

یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ آج آیت کے دوسرے حصہ کا ذکر ہے۔ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا اور کہو لوگوں کے لیے اچھی بات۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ کوئی فرد واحد عام لوگوں کے ساتھ نہ بدنی نیکی کر سکتا ہے۔ اور نہ مالی نیکی کر سکتا ہے۔ ایسے افعال وہ محدود لوگوں کے ساتھ ہی انجام دے سکتا ہے۔ مثلاً والدین کی خدمت مالی اور بدنی دونوں طریقوں سے کر سکتا ہے۔ اس طرح قرابتداروں اور دوستوں کی مالی اعانت کر سکتا ہے۔ مگر یہ دونوں چیزیں عوام الناس کے لیے انجام دینا ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ اجتماعی نیکی حاصل کرنے کے لیے قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا کا حکم دیا۔ کہ اگر تم بدنی اور مالی خدمت نہیں کر سکتے۔ تو عام لوگوں کو اچھی بات ہی کہہ دو۔

اچھی بات کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ مثلاً حضور علیہ السلام فرماتے ہیں[2]۔ جب آپس میں ملو۔ تو ایک دوسرے کو سلام کرو۔ اور پھر اچھا مسلمان وہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرتا ہے۔ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ جس کو پہچانتے ہو اس کو بھی سلام کرو۔ اور جس کو نہیں پہچانتے اس کو بھی سلام کرو۔ بخاری شریف اور مسلم شریف کی روائتوں میں آتا ہے[3]۔ کہ سلام جو ہے۔ یہ مِنْ خَیْرِ خِصَالِ الْاِیْمَانِ اَوْ قَالَ اِسْلَامِ ایمان کی بہترین خصلتوں میں سے ہے۔ یا فرمایا اسلام کی بہترین خصلتوں میں سے۔ سلام کرنے کی حکمت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی کہ ایسا کرنے سے محبت بڑھتی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں مقام عطا کرے گا جب کوئی سلام کرے تو اس کو اچھے طریقے سے جواب دو۔ قرآن پاک میں موجود ہے۔ "رُدُّوْهَا" سلام کا جواب ویسے ہی لوٹا دو یا اس سے بہتر لوٹاؤ۔ فرمایا اگر ایک شخص تمہیں اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہتا ہے۔ تو تم اسے بہتر لوٹاؤ اور کہو وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهٗ صرف اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہنے والے کو دس نیکیاں ملیں گی اور وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهٗ کہنے والے کو تیس ۳۰ نیکیاں حاصل ہوں گی۔

کسی کی نیکی کی طرف راہنمائی کرنا اور برائی سے روکنا یہ بھی حسن کلام میں داخل ہے جب

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۱۶ پارہ ۱ — [2] ترمذی ص — ابوداؤد ص ۳۵۰ ج ۲، مسند احمد ص ۱۶۸ ج ۲، بخاری ص ۹۲۱ ج ۲، مسلم ص ۴۸ ج ۱

[3] بخاری ص ۹۲۱ ج ۲، مسلم ص ۴۸ ج ۱ — [4] ترمذی ص ۳۸۵، ابوداؤد ص ۳۵۰ ج ۲

دو مسلمان آپس میں ملیں تو نرمی کے ساتھ نیکی کی دعوت دیں۔ آپس میں دوستی کا اظہار کریں۔ اور ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کریں۔ جب ایک مسلمان دوسرے کو پکارے، تو اچھے لقب سے پکارے قرآن پاک میں موجود ہے۔ "وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ" ایک دوسرے کو برے القاب سے مت پکارو۔ یہ سب باتیں قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا میں داخل ہیں۔

اسی طرح فرمایا کسی غیر حاضر بھائی کا ذکر کرو تو اچھے طریقے سے کرو۔ اس کو برائی کیساتھ یاد نہ کرو۔ اگر کوئی مسلمان تم سے مشورہ طلب کرے۔ تو اس کو صحیح صحیح مشورہ دو۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔[1] اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ جس سے مشورہ طلب کیا جائے اُسے امین سمجھا جاتا ہے، اگر وہ غلط مشورہ دے گا۔ تو خائن متصور ہوگا۔ اگر کسی کو دیکھو کہ وہ نادانستہ طور پر منکرات میں پڑا ہوا ہے۔ تو اُسے حسنِ اخلاق کے ساتھ روکنے کی کوشش کرو۔ مگر اس سلسلے میں سختی نہیں کرنی چاہیئے۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں۔[2] کہ سختی اور نرمی دونوں اپنے اپنے مقام پہ روا ہیں۔ تبلیغ و تعلیم کرتے وقت ہمیشہ نرم رویّہ اختیار کرنا چاہیئے۔ قرآن پاک کا مطالعہ کیجیے۔ جب اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف تبلیغ کے لیے بھیجا۔ تو فرمایا "فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا" اس سے نرم لہجے میں بات کرنا "لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى" شاید کہ وہ نصیحت پکڑے یا اس کے دل میں خوفِ خدا پیدا ہو جائے۔ خود حضور علیہ السّلام کے متعلق قرآن پاک نے بیان کیا ہے " فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ" اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ نرم مزاج ہیں۔ " وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ" اگر آپ سخت مزاج ہوتے" لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ " تو لوگ آپ کے ارد گرد سے پھر جاتے۔ کیونکہ سخت مزاج شخص سے لوگ دور رہنا پسند کرتے ہیں۔ مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے آپ کو نرم مزاج بنایا۔ آپ کو حسنِ کلام کی توفیق بخشی اور اس طرح لوگوں کو آپ کے گرد جمع کیا۔

جب کسی کے ساتھ بحث و تمحیص کی نوبت آجائے۔ تو فرمایا "اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" تو اچھے طریقے سے دفاع کرو۔ مناظرے کے وقت بھی اخلاق کا دامن نہ چھوڑو۔ اخلاق سے گری

---

[1] ترمذی صفحہ ؟ [2] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۳۱۸ پارہ ۱

ہوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔ نہ ہی گالی گلوچ تک نوبت پہنچنی چاہیے۔ بلکہ نہایت احسن طریقے سے گفتگو ہونی چاہیے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے[1] مَا دَخَلَ الرِّفْقُ فِی شَیْءٍ اِلَّا زَانَهٗ جس چیز میں نرمی آجائے گی، وہ اُسے زینت بخشے گی۔ اور جس چیز میں سختی آئے گی۔ وہ اسے عیب دار کر دیگی۔ (مَا دَخَلَ الْخُرْقُ فِی شَیْءٍ اِلَّا شَانَهٗ)

فرمایا ہر جگہ نرمی ہی سے کام نہیں چلے گا۔ بلکہ بعض مقامات پر سختی کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ مثلاً تعزیر کے طور پر سزا مطلوب ہو یا جہاد میں کفار سے مقابلہ ہو تو وہاں پر سختی کرنا پڑے گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کو حکم دیا "جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ" آپ کافروں کے ساتھ جہاد کریں۔ "وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ" اور اُن پر سختی کریں۔ کفار کے ساتھ جہاد تلوار کے ذریعے ہوگا اور منافقوں کے ساتھ زبانی طور پر۔ یعنی اُن کے نفاق کو کھول کر بیان کریں تاکہ دوسرے مسلمان اُن سے بچ سکیں۔ یہ دونوں طریقے سختی کے ہیں۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے۔ کہ نرمی ملحوظ رکھتے ہوئے۔ شریعت کی حدود کا بھی خیال رکھا جائے۔ نرمی بھی اس وقت تک ہی گوارا ہے۔ جب تک شریعت کی حدود کے اندر ہو۔ اگر ایسی نرمی برتنے سے شریعت کے اتباع میں فرق آتا ہو۔ تو ایسی نرمی جائز نہیں۔ اگر ایسا کرنے لگ جائیں گے۔ تو شریعت کے احکام پر عمل ناممکن ہو جائے گا۔ ایسی نرمی جس سے دین میں مداہنت پیدا ہوتی ہو تو وہ حرام ہے

امام محمد باقرؒ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا کا معنیٰ یہ کرتے ہیں۔ کہ لوگوں سے ایسی اچھی بات کہو، جو تمہیں خود بھی پسند ہے۔ جو خود پسند نہیں کرتے وہ بات دوسروں کو کیوں کہتے ہو۔ فرماتے ہیں کہ اچھی بات میں دعوت الی اللہ، دعوت الی التوحید، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر شامل ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد الٰہی ہے "وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ" اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ خود نیک عمل کرتا ہے اور زبان سے یوں کہتا ہے۔ کہ

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص۳۱۹، پارہ ۱

اللہ تعالیٰ کا مطیع اور فرمانبردار ہوں۔ گویا یہ سب سے اچھی بات ہے۔ اسی کو فرمایا قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خیبر میں جھنڈا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ میں دیا تو فرمایا۔ فَوَاللّٰہِ لَاَنْ یَّھْدِیَ اللّٰہُ بِکَ رَجُلًا وَاحِدًا خَیْرٌ لَّکَ مِنْ اَنْ یَّکُوْنَ لَکَ حُمْرُ النَّعَمِ۔ یعنی اے علی! اگر تمہاری وجہ سے ایک آدمی کو بھی ہدایت نصیب ہو جائے۔ تو یہ بات تمہارے لیے عمدہ قسم کے اونٹوں سے بہتر ہے۔ مقصد یہ کہ لڑائی اصل مقصود نہیں بلکہ اس کے ذریعے اسلام کے راستے میں درپیش رکاوٹوں کو دور کرنا ہے۔ یعنی " وَقٰتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ " کفار سے اسوقت تک جنگ کرو۔ جب تک تمام فتنے ختم نہ ہو جائیں گویا لوگوں کو ایمان کی دعوت دینا بھی قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا میں داخل ہے۔

نماز اور زکوٰۃ

بنی اسرائیل کے عہد کا اگلا حصہ یہ تھا وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ[۱] یعنی نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ نماز بدنی عبادت ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[۲] کہ نماز اُمُّ الْعِبَادَاتِ الْمُقَرِّبَۃ ہے۔ یعنی جو عبادات انسان کو اللہ تعالیٰ سے قریب تر کرنے والی ہیں، ان کی بنیاد اور جڑ نماز ہے۔ نماز کے ذریعے تعلق باللہ استوار ہوتا ہے۔ انسان دن میں پانچ مرتبہ اپنا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم کرتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ نماز کو قائم کرو۔ اس میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔

مالی عبادتوں میں زکوٰۃ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں پاکیزگی اور طہارت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ زکوٰۃ بخل کو دور کر کے غرباء اور مساکین سے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ جو کہ تہذیب اخلاق کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت قرآن پاک کی اس آیت سے واضح ہوتی ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ یعنی تم اس وقت تک نیکی کو نہیں پہنچ سکتے۔ جب تک اپنی محبوب چیز خرچ نہ کرو۔ اور یہ مقصد زکوٰۃ سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ بشرطیکہ مال کمانے اور اس کے خرچ کرنے میں حلال و حرام کی تمیز روا رکھی جائے۔ اگر یہ تمیز اُٹھ جائے۔ تو روحانیت کیسے آئے گی۔ ہمارے ملک میں سارا معاشی نظام سرمایہ دارانہ ہے۔ جس میں سود کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ سود کی موجودگی میں تقویٰ کیسے حاصل

---

[۱] بخاری ص ۵۲۵ ج ۱، مسلم ص ۲۷۹ ج ۲

[۲] حجۃ اللہ البالغہ ص ۷۳ ج ۱ اسرار صلوٰۃ

ہوگا۔ اور پاکیزگی کیسے پیدا ہوگی۔

دوسری طرف کفر و الحاد ہے۔ جس کی بنیاد انکار خدا پر ہے۔ ہر دو نظام ہائے معاش کا مقصد حصول دولت، عیاشی اور فحاشی ہے۔ سب کی سوچ دنیا تک محدود ہے۔ صنعت و حرفت سائنس اور ٹیکنالوجی غرض مادی ترقی منتہائے مقصود ہے۔ لہٰذا انہیں انسانیت کی ترقی کا کوئی علم نہیں۔ کہ وہ کیسے حاصل کی جاسکتی ہے۔ جس پر آخرت اور دائمی زندگی کا دار و مدار ہے۔

بہرحال یہاں پر نماز اور زکوٰۃ دونوں عبادات کا ذکر ہے۔ ایک جسمانی عبادت ہے اور دوسری مالی عبادت۔ قرآن پاک میں ان دونوں کا اکٹھا ذکر بتیس ۳۲ مرتبہ آیا ہے۔ بنی اسرائیل کو بھی تاکید تھی۔ کہ ہر حالت میں نماز پڑھو اور اگر مال نصاب تک پہنچ جائے۔ تو اس کی زکوٰۃ بھی ادا کرو۔ نماز کی اس قدر تاکید ہے۔ کہ کسی حالت میں بھی معاف نہیں ہے۔ "فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا" پس اگر کسی قسم کا خوف ہو تو بھی نماز معاف نہیں ہے۔ تم پیدل ہو یا سواری پر ہو۔ نماز بہرحال پڑھنی پڑے گی۔ سورۃ مائدہ میں بنی اسرائیل سے یہی فرمایا لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ" یعنی اگر تم نماز قائم کرتے رہو گے، زکوٰۃ ادا کرتے رہو گے۔ اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی مدد کرو گے۔ تو میری مہربانیاں تمہارے شامل حال رہیں گی مگر بنی اسرائیل نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی نہ کی۔ بلکہ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ پھر اے بنی اسرائیل! تم پھر گئے اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ مگر تم میں سے بہت تھوڑے ایسے تھے، جو اس عہد پر قائم رہے۔ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ اور تم اعراض کرنے والے ہو۔ تم نے اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کے احکام سے اعراض کیا۔ اور آج بھی ایسا ہی کر رہے ہو۔ تمہیں علم نہیں۔ کہ اس کا نتیجہ کتنا بُرا نکلے گا۔ اور تمہارا حشر کتنا عبرتناک ہوگا۔

درس سی و ہفت ٣٧

(آیت ٨٤ تا ٨٦)

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ
أَنفُسَكُم مِّن دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ
﴿٨٤﴾ ثُمَّ أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ
فَرِيقًا مِّنكُم مِّن دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِم بِالْإِثْمِ
وَالْعُدْوَانِ وَإِن يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ
عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ۚ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ
بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ
فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ
وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٨٥﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا
الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ
وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٨٦﴾ ع ١٠

ترجمہ: اور اس واقعہ کو یاد کرو، جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا۔ کہ آپس میں خونریزی نہ کرو گے۔ اور نہ ایک دوسرے کو اپنے شہروں سے نکالو گے۔ پھر تم نے اقرار کیا۔ اور تم اس پہ گواہ ہو (٨٤) پھر تم وہی ہو۔ جو ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو۔ اور نکالتے ہو تم ان کو وطنوں سے۔ تم چڑھائی کرتے ہو ان پہ گناہ اور زیادتی کے ساتھ۔ اور اگر وہ گروہ تمہارے پاس قیدی ہو کر آئیں۔ تو فدیہ دیکر ان کو چھڑا لیتے ہو۔ حالانکہ ان کا نکالنا بھی تم پر حرام ہے۔ کیا تم کتاب کے بعض حصے پہ ایمان لاتے ہو۔ اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو۔ پس جو کوئی ایسا کرتا ہے تم میں سے۔ تو اس کا بدلہ سوائے اس کے نہیں ہے۔ کہ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں رسوائی ہے۔ اور قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ان باتوں

سے بے خبر نہیں ہے۔ جو تم کرتے ہو (۸۵) یہی لوگ ہیں۔ جنہوں نے دنیا کی زندگی
کو آخرت کے بدلے میں خرید لیا ہے۔ پس ان سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا
اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی (۸۶)

گذشتہ سے پیوستہ

بنی اسرائیل کی عہد شکنیوں کا ذکر آ رہا ہے۔ اس سے پیشتر اس عہد کا بیان ہو چکا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اجتماعی حقوق اور انسانی حقوق سے متعلق بنی اسرائیل سے بذریعہ توراۃ لیا تھا۔ مگر انہوں نے اس عہد کو پورا بھی نہ کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ پھر چند آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے۔ اور تم تو اعراض کرنے والے ہی ہو

خونِ ناحق اور جلا وطنی

خونِ ناحق اور جلاوطنی بڑے گناہوں میں سے ہیں۔ ان دو برائیوں سے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے توراۃ میں عہد لیا تھا۔ کہ ان گناہوں کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ مگر یہ قوم اس عہد پر بھی قائم نہ رہی۔ ارشاد ہوتا ہے وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَکُمْ کہ تم ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے۔ یعنی اپنے ہی بھائی بندوں اور اپنے ہم مذہب اور اپنی ہی ملت والوں کا قتل ناحق نہیں کرو گے اجس طرح یہ حکم آج تک بائیبل میں موجود ہے۔ یہی حکم قرآن پاک میں موجود ہے۔ آگے سورۃ نساء سورۃ بنی اسرائیل اور سورۃ فرقان میں آئے گا۔ کہ ایک دوسرے کا خون نہ بہاؤ۔ یہ قطعی حرام ہے اور اکبر الکبائر یعنی سب سے بڑے گناہوں میں شمار ہوتا ہے۔

توراۃ میں دوسرا حکم یہ تھا وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ یعنی تم اپنے ہم مسلک لوگوں کو ان کے گھروں سے نہیں نکالو گے۔ مگر تم نے اس عہد کا بھی پاس نہ کیا۔ فرمایا ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ یہ الفاظ توراۃ میں موجود ہیں۔ کہ اے بنی اسرائیل! تم نے اقرار کیا کہ وعدہ کو ایفا کریں گے۔ اور توراۃ کے احکام کی پابندی کریں گے۔ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ اور تم خود اس بات کے گواہ ہو کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ تم نے اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ اقرار کیا تھا۔ کہ تم اپنے بھائیوں کا خون نہیں بہاؤ گے اور نہ ہی انہیں جلاوطن کرو گے۔

بنی اسرائیل کی عہد شکنی

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ کہ اے بنی اسرائیل! تم ان تمام تر وعدوں کے باوجود ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَکُمْ یہ تمہیں ہی ہو، جو ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو

ناحق خون بہاتے ہو۔ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ اور ایک گروہ کو ان کے گھروں سے بھی نکالتے ہو۔ یہی نہیں بلکہ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ تم ان پر چڑھائی کرتے ہو گناہ اور تعدی کے ساتھ۔ کسی پر حملہ کرنا انہیں جانی اور مالی نقصان پہنچانا گناہ بھی ہے۔ اور مظلوموں کے ساتھ زیادتی بھی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کر کے گناہ کے مرتکب ہوئے۔ اور خلق خدا کے حقوق ضائع کر کے زیادتی کا ارتکاب کیا۔ یہ اثم اور عدوان میں آتا ہے۔

فرمایا تمہاری عجیب ذہنیت ہے۔ کہ جن لوگوں کو تم جلاوطن کرتے ہو وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى جب یہی لوگ تمہارے پاس قیدی بن کر آتے ہیں تُفٰدُوْهُمْ تم انہیں فدیہ دیکر چھڑا لیتے ہو۔ پہلے خود ہی انہیں گھروں سے نکال کر اور پھر اُن کا معاوضہ دیکر انہیں واپس لیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ان کا جلاوطن کرنا ہی تم پر حرام تھا۔ تمہیں ایسا کام کرنا ہی نہ چاہیئے تھا۔ جس کی وجہ سے تمہیں فدیہ کا مالی بوجھ بھی برداشت کرنا پڑا۔

دراصل بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے تھے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں قیدیوں کی رہائی کی تلقین کی تھی۔ اور یہ اچھی بات تھی مگر جہاں یہ لوگ اس حکم پر عمل کرتے تھے وہاں دوسرے دو احکام یعنی قتل ناحق اور جلاوطنی کے معاملہ میں عمل نہیں کرتے تھے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کیا تم کتاب کے بعض احکام پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کر دیتے ہو؟

فرمایا جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتے ہیں۔ کہ جس حصے پر چاہا عمل کر لیا۔ اور جس کو چاہا چھوڑ دیا۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ تم میں سے ایسا کرنے والوں کی جزا اس کے سوا کچھ نہیں۔ کہ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا دنیا میں انکی جزا ذلت ہوگی۔ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ اور قیامت کے روز سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے۔ کہ یہودیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ یہود۔ بنو قریظہ، بنو نضیر اور خیبر والے سب ذلیل و خوار ہو کر مغلوب ہوئے۔ بنو قریظہ سخت سازشی قسم کے لوگ تھے۔ ان کا حشر بہت بُرا ہوا۔ بعض قتل ہوئے اور بعض کو جلاوطن کیا گیا۔ اسی طرح قبیلہ بنو قینقاع والوں نے بھی ذلت و رسوائی کا منہ دیکھا۔ اس کا ذکر سورۃ حشر میں

تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تو اُن کی زندگی میں عذاب ہوا۔ فرمایا آخرت کا عذاب تو سخت ترین ہو گا۔ اور یہ لوگ اس میں بھی مبتلا ہو گئے۔

یہودیوں کی باہمی لڑائیاں

ان آیات میں یہودیوں کی جس باہمی جنگ و جدل اور جلا وطنی کا ذکر ہے۔ اس کے متعلق حضرت شیخ الہند رح حاشیہ میں لکھتے ہیں[1]۔ کہ مدینہ کے دو بڑے قبیلے اوس اور خزرج تھے۔ جو اکثر آپس میں دست و گریبان رہتے تھے۔ ان کی آبادی ہزاروں کی تعداد تک پہنچتی تھی۔ جب مدینہ میں اسلام کی شمع روشن ہوئی تو انصار مدینہ کی اکثریت بھی انہیں دو قبائل میں سے تھی۔ اب بنو قریظہ قبیلہ اوس کے حامی تھے۔ اور بنو نضیر قبیلہ خزرج کے طرفدار تھے۔ گویا یہودی اس طریقے سے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے ان میں اکثر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ جب ایک قبیلہ دوسرے پر غالب آتا، تو وہ مغلوب کو جلا وطن کر دیتا یا ان کو قتل کر دیتا اور ان کے مکانوں کو گرا دیتا۔ یہ سب ہم مذہب تھے۔ مگر دوسرے قبیلے کے ساتھ منسلک ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ پھر یہی لوگ جنہوں نے انہیں جلا وطن کیا تھا مال اکٹھا کرتے اور ان کا معاوضہ ادا کر کے انہیں قید سے رہائی دلاتے۔ یہ لوگ قیدی کو چھڑانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ مگر کشت و خون اور جلا وطنی کے احکام کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اسی خصلت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مفسرین کرام مشرکین کی ایک دوسری لڑائی کا بھی تذکرہ کرتے ہیں[2]۔ جسے حرب بعاث کہا جاتا ہے۔ یہ لڑائی چالیس سال تک جاری رہی۔ اس لڑائی میں بھی یہودی مختلف گروہوں میں منقسم تھے۔ یہودیوں کا ایک قبیلہ ایک فریق جنگ کے ساتھ تھا۔ جب کہ دوسرا قبیلہ دوسرے کے ساتھ تھا۔ اس جنگ میں بھی یہودیوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔ اگر کوئی ہم مذہب بھی سامنے آگیا اُسے بھی مار ڈالتے تھے۔

امام ابن کثیر رح نے بھی ایک واقعہ نقل کیا ہے[3]۔ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رض کے عہد میں مسلمان ایران کی طرف کسی جہاد میں مصروف تھے۔ اسلامی فوج میں حضرت عبداللہ بن سلام بھی شامل تھے۔ جو ایک یہودی عالم تھے مگر اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دولت سے مشرف کیا تھا۔ جب جہاد میں مسلمانوں

---

[1] ترجمہ شیخ الہند ص ۱۶ مطبوعہ دار التصنیف کراچی [2] تفسیر ابن کثیر ص ۳۸۹/۱ [3] تفسیر ابن کثیر ص ۱۱۲/۱

کو فتح حاصل ہوئی۔ تو بہت سے قیدی بھی ہاتھ آئے۔ جن میں وہ یہودی بھی شامل تھے، جو کہ مجوسیوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ ان میں ایک یہودی عورت لونڈی بن کر آئی۔ جسے حضرت عبداللہ بن سلام رضؓ نے نوسو درہم میں خرید لیا۔ جب آپ کوفہ میں واپس آئے۔ تو وہاں کے ایک مشہور و معروف یہودی راس الجالوت سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے یہودی کو وہ لونڈی فروخت کرنے کی پیش کش کی۔ وہ رضامند ہوگیا۔ اور قیمت دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اسے نوسو درہم میں خریدا ہے۔ مگر اب میں چار ہزار درہم سے کم پر نہیں دوں گا۔ پہلے تو راس الجالوت اتنی بڑی رقم دینے پر تیار نہ ہوا۔ پھر حضرت عبداللہ بن سلام رضؓ نے اس کے کان میں توراۃ کی وہی آیت پڑھی وَاِنْ یَّاْتُوْکُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْھُمْ یعنی جب تمہارا کوئی ہم مسلک قیدی بن کر آئے تو اسے چھڑا لو۔ یہ سن کر یہودی مجبور ہوگیا۔ اور اس نے چار ہزار کے بدلے میں ہی خریدنا منظور کر لیا۔ مگر حضرت عبداللہ بن سلام رضؓ نے دو ہزار درہم لے لیے اور باقی دو ہزار واپس کر دیے۔ اور اس طرح لونڈی اس کے پاس فروخت کر دی۔ مقصد یہ کہ یہودی قیدیوں کو چھڑانے والے حکم پر سختی سے کاربند تھے۔ اگرچہ دوسرے احکام کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

مسلمانوں کی حالتِ زار

یہودیوں کے جزوی ایمان کا جو نقشہ قرآن پاک نے ان آیات میں کھینچا ہے۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے۔ تو آجکل مسلمانوں کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں۔ آج مسلمانوں کی حالت بھی یہی ہے۔ کہ قرآن پاک کے کسی حصہ پر ایمان لاتے ہیں۔ اور بعض احکام کو نہیں مانتے۔ اسی لیے تو دنیا میں رسوا ہو رہے ہیں۔ غلامی سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے۔ جس کی وجہ سے تہذیب مٹ جاتی ہے۔ دیکھیے کابل والوں کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ افغانستان پر غیر کا قبضہ ہو چکا ہے۔ یہی حال اس سے پہلے سمرقند اور بخارا کا ہوا تھا فلسطین میں کیا ہو رہا ہے بنگالیوں کو کون سی عزت نصیب ہو رہی ہے۔ یہ سب ذلت و رسوائی نہیں تو اور کیا ہے۔؟

وجہ یہی ہے۔ کہ مسلمانوں نے بھی یہودیوں کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ جو حکم اُن کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے۔ اُسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور جو اُن کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے۔ اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ معاملہ نکاح و طلاق کا ہو یا سیاسی نوعیت کا ہو۔ اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتے ہیں، خدا تعالیٰ کے قانون کی پرواہ نہیں کرتے، عدل، احسان اور تقویٰ کو فراموش کر دیا ہے۔

محض نفسانی خواہشات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کا حشر بھی یہودیوں سے مختلف نہیں ہے جب انگریز نے ہندوستان میں تسلط قائم کیا، تو انہوں نے مسلمانوں سے بھی پوچھا تھا۔ کہ تم اپنے ذاتی معاملات میں شرعی قوانین کا اطلاق چاہو گے۔ یا مقامی رواج کے مطابق اپنے مسائل کا حل کرو گے کتنے ہی مسلمان ہیں جنہوں نے لکھ کر دے دیا تھا کہ ہمیں شریعت کا قانونِ وراثت منظور نہیں ہے۔ ہمارا فیصلہ رواج کے مطابق کیا جائے۔ حالت آج بھی یہی ہے۔ دعویٰ یہی ہے۔ کہ ہم قرآن و حدیث کو برحق مانتے ہیں۔ مگر ان کے احکام پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ عبادات تو تھوڑی بہت کر لیتے ہیں۔ مگر تعزیرات کے قانون پر کیوں عمل نہیں کرتے۔ جہاد جیسی اہم چیز کو نہیں اپناتے۔ جس کے لیے قرآن و حدیث کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اس معاملہ میں یہودی اور مسلمان برابر ہیں۔ نہ ان کا اپنی شریعت پر عمل ہے۔ اور نہ مسلمانوں کو احکام کا پاس ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ اس قسم کی دو رُخی کا نتیجہ سوائے تباہی و بربادی کے اور کیا ہو گا۔

اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے

فرمایا وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اُس سے غافل نہیں ہے۔ تم جو کچھ بھی کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ وہ تمہارے دلوں میں مخفی ارادوں تک سے واقف ہے۔ اس لیے وہ اسی کے مطابق جزا دے گا۔ جب خدا تعالیٰ کی گرفت آئے گی۔ تو سخت عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی ان کرتوتوں کی وجہ سے آخرت کی دائمی زندگی کے بدلے دنیا کی عارضی اور حقیر زندگی کو خرید لیا ہے ایسے لوگوں کا حال یہ ہو گا۔ کہ جب وہ عذاب میں جکڑے جائیں گے فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ تو پھر اُن کے عذاب میں تخفیف بھی نہیں ہو گی وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ اور نہ ہی کسی طرف سے انہیں امداد پہنچ سکے گی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَيْنَا
عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ
رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۫
وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ
بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ
كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ
يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا
كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ
اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ
مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى
غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

ترجمہ: اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔ اور ہم نے ان کے پیچھے بہت سے رسول بھیجے۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو بینات (واضح اور کھلی باتیں) دیں۔ اور ہم نے ان کی پاک روح کے ساتھ تائید کی۔ کیا جب بھی تمہارے پاس رسول کوئی ایسی چیز لے کر آیا، جسے تمہارے نفس نہیں چاہتے تھے۔ تو تم نے تکبر کیا پس ایک فریق کو تم نے جھٹلا دیا، اور ایک کو قتل کر دیا ﴿۸۷﴾ اور انہوں نے کہا، ہمارے دل غلافوں میں ہیں۔ نہیں بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ہے۔ ان کے کفر کی وجہ سے پس بہت تھوڑے ہیں جو ایمان لاتے ہیں ﴿۸۸﴾ اور جب ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب آئی، اس چیز کی تصدیق کرنے والی، جو ان کے پاس ہے۔ اور اس سے پہلے وہ کافروں پہ فتح مانگتے تھے۔ اور جب ان کے پاس وہ چیز آئی، جسے

انہوں نے پہچان لیا، تو اس کے ساتھ کفر کیا، پس کفر کرنے والوں پر اللہ تعالے کی لعنت ہے (۸۹) وہ بری چیز ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنے نفسوں کو بیچا ہے۔ کہ کفر کرتے ہیں اس چیز پر جس کو اللہ نے اتارا ہے۔ سرکشی کرتے ہوئے اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اتارتا ہے۔

پس یہ لوگ غضب پر غضب سے کر لوٹے اور کافروں کے لیے ذلت ناک عذاب ہے (۹۰)

کتاب اور رسُول

اس سے پہلے بنی اسرائیل کے مختلف عہدوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ جن کی پابندی کرنے سے یہ قوم قاصر رہی۔ اب بعض دوسرے انعامات کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ جو بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے کیے۔ اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ منجملہ اُن انعامات کے ایک یہ بھی تھا۔ کہ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ یعنی بے شک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب توراۃ عطا فرمائی۔ تاکہ بنی اسرائیل اُس کے ذریعے ہدایت اور راہنمائی حاصل کر سکیں۔ اور پھر یہ کہ صرف کتاب پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ کتاب میں مذکور احکام کی یاد دہانی کے لیے وَقَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِہٖ بِالرُّسُلِ اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد پے در پے رسول بھیجے۔ جو توراۃ کی تعلیم کی تبلیغ کرتے تھے۔ اللہ تعالےٰ کی طرف سے پیغمبر کا مبعوث ہونا بنی نوعِ انسان پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی اور شفقت ہے انبیاء علیہم السلام لوگوں کی مشکلات کا حل پیش کرتے ہیں۔ اور ان کی راہنمائی فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس قدر پیغمبر بھیجے ان میں سے بعض کا نام بھی قرآن پاک نے ذکر کیا ہے۔ جیسے حضرت داؤد علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام، یونس علیہ السلام، زکریا علیہ السلام، یحییٰ علیہ السلام اور پھر سلسلہ بنی اسرائیل کے آخری رسُول حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اسی طرح توراۃ اور یہودیوں کی دیگر کتب میں بھی بہت سے انبیاء علیہم السلام کا ذکر ملتا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[1]۔ کہ مجموعی طور پر تقریباً چار ہزار پیغمبر بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور معجزات

اللہ تعالیٰ نے سلسلہ بنی اسرائیل کے آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ آپ صاحب کتاب اور اللہ تعالیٰ کے عظیم المرتبت رسول ہیں۔ چنانچہ آپ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۲۵ پارہ ۱

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ اور ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں عطا کیں۔ اور ان سے مراد وہ معجزات ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کئے۔ اور جو قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ مثلاً مُردوں کو زندہ کرنا۔ کوڑھی کو تندرست کر دینا۔ اور مٹی کا پرندہ بنا کر اس میں پھونک مارنا اور اُسے ہوا میں اڑا دینا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بیّنات سے احکام اور دلائل بھی مراد لیا جاتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو احکام بھی دیئے تھے اور دلائل بھی دیے تھے۔

عیسیٰ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ عیسیٰ۔ یسوع یا الیسوع کا معنیٰ مبارک ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام مریم رضی اللہ عنہا تھا۔ آپ کی نانی نے نذر مانی تھی۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ اُسے بیٹا عطا کریگا۔ تو وہ اُسے بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کر دیگی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کہ اُس نے بیٹے کی بجائے بیٹی عطا کی۔ آپ کو پریشانی لاحق ہوئی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہیں بیٹی عطا کی ہے۔ ہم نے اُسے بہت برگزیدہ اور پاکیزہ بنایا ہے۔ بیٹا اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ حضرت مریمؑ کی فضیلت اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں بیان فرمائی ہے۔ "يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" یعنی اے مریم! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا۔ اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پہ تجھے برتری عطا کی۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ قرآن پاک میں جہاں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوگا۔ عموماً عیسیٰ ابن مریم کا نام ہوگا۔ آگے سورۃ مائدہ میں آئے گا۔ کہ آپ کے حواری بھی آپ کو عیسیٰ ابن مریم کے نام سے جانتے تھے، اور اسی نام سے خطاب کرتے تھے۔ وہ ابن اللہ کے نام سے یاد نہیں کرتے۔ نہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خود خدا تصور کرتے تھے، بلکہ یہ غلط عقیدہ تو بعد میں ایک عیسائی پادری پولس کا پیدا کردہ ہے۔ کہ حضرت مسیح علیہ السلام خود خدا، خدا کے بیٹے یا تینوں میں سے تیسرے ہیں۔ یہ بالکل کفریہ عقیدہ ہے۔

روح القدس

فرمایا ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں عنایت کیں۔ اور اس کے ساتھ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اس کی تائید ہم نے پاک روح سے کی۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں [1] کہ روح القدس سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ یعنی ہم نے جبرائیلؑ کے ذریعے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کی۔ اس بات کی تائید قرآن پاک کے دوسرے مقام پر بھی ہوتی ہے۔

[1] تفسیر ابن کثیر ص۱۲۲ ج۱، معالم التنزیل ص۳۸ ج۱

نزول قرآن کے متعلق ارشاد ہے " نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ " اس قرآن پاک کو روح الامین یعنی جبرائیل علیہ السلام نے آپ کے قلب مبارک پر نازل کیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے[1] کہ حضور علیہ السلام اپنے شاعر حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم فرماتے۔ تو وہ مشرکین کو شعروں میں جواب دیتے اور فرماتے روح الامین کی تائید تمہارے ساتھ ہوگی۔ تم ان کافروں کو جواب دو۔ تو یہاں بھی روح الامین سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہی ہیں۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں[2] کہ روح القدس سے مراد اسم اعظم ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے انسان کی دعا قبول ہو جاتی ہے اور اسی اسم اعظم کی برکت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر معجزے کا اظہار ہوتا تھا جب آپ مُردے کو زندہ کرتے تھے۔ یا مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتے تھے۔ تو یہ اسم اعظم کی برکت سے ہوتا تھا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں[3] کہ روح القدس ملاء الاعلیٰ کے فرشتوں کی مسلسل توجہ کا نام ہے۔ ان کی حکمت کے مطابق ملاء الاعلیٰ کے فرشتوں کا حظیرۃ القدس جیسے پاک مقام پر توجہ کرنا روح القدس کہلاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے ساتھ سلوک

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرے کے بعد بنی اسرائیل کے اپنے پیغمبروں کے ساتھ عام طرزِ عمل کا ذکر کیا۔ کہ اے بنی اسرائیل! اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ جب بھی تمہارے پاس کوئی رسول ایسی چیز لے کر آئے جسے تمہارے نفس پسند نہیں کرتے تھے اسْتَكْبَرْتُمْ تو تم نے تکبر کیا۔ تکبر کی بیماری اسرائیلیوں میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ احکام کی نافرمانی تکبر اور سرکشی کی وجہ سے ہی ہوتی ہے۔ فرمایا اے بنی اسرائیل! تم نے اسی تکبر کی وجہ سے فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ انبیاء علیہم السلام کے ایک گروہ کو تم نے جھٹلایا وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ اور ایک گروہ کو قتل کیا۔ قرآن پاک میں حضرت زکریا علیہ السلام کا تذکرہ موجود ہے۔ حدیث شریف میں تو ایسے سینکڑوں نبیوں

---

[1] مسلم ص ۳۰۱ ج ۲   [2] تفسیر ابن کثیر ص ۱۱۲ ج ۱، معالم التنزیل ص ۳۸ ج ۱   [3] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۶ ج ۱

کا ذکر آتا ہے۔ جنہیں اسرائیلیوں نے قتل کیا۔ کیونکہ وہ ان کی مرضی کے خلاف اللہ تعالےٰ کے احکام پہنچاتے تھے۔ جو بنی اسرائیل کے موافق نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک لوگ نفسانی خواہشات کی اتباع اور خدائی قانون کی خلاف ورزی کرتے رہیں گے انہیں فلاح نصیب نہیں ہوسکتی۔ الغرض! اسرائیلیوں میں یہ دو بیماریاں یعنی اتباع خواہشات اور تکبر پائی جاتی تھیں۔ جن کی وجہ سے انہوں نے بعض نبیوں کو جھٹلایا اور بعض کو قتل کر دیا۔

یہودیوں کا زعم باطل

یہودیوں کو ایک اور غلط زعم تھا۔ کہ وہ صاحب علم ہیں۔ ان پر کسی بیرونی تبلیغ کا اثر نہیں ہوسکتا۔ قرآن پاک کے الفاظ میں ان کا دعوےٰ تھا وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ کہ ہمارے دل غلافوں میں بند ہیں، یہ ان کی خود ستائشی تھی۔ کہ صاحب کتاب ہونے کی وجہ سے وہ ہر قسم کے اثرات سے محفوظ ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے دین پر پختہ ہیں۔ اس میں کوئی بگاڑ پیدا نہیں کرسکتا۔ مقصد یہ کہ جس طرح غلاف میں بند کوئی چیز بیرونی اثرات اور تغیر و تبدل سے محفوظ ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے دل بھی غلاف میں بند ہیں۔ اور ان کے اختیار کردہ دین میں کسی قسم کا بگاڑ پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا یہ نظریہ واقعی بلند پایہ تھا۔ بشرطیکہ ان کے پاس صحیح علم ہوتا، ان کے عقائد درست ہوتے اور وہ اپنے صحیح دین کو محفوظ کرسکتے۔ مگر حقیقت اس کے برخلاف تھی۔ وہ تو خود اپنا دین بگاڑ چکے تھے۔ غلط عقائد اختیار کر چکے تھے اور پھر ان پر اصرار کرتے تھے۔ جب بھی ان کے پاس حق بات لے کر انبیاء علیہم السلام آتے۔ وہ انہیں جھٹلا دیتے یا قتل کر دیتے۔

یہود پر اللہ تعالےٰ کی لعنت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کہ یہودیوں کا یہ دعوےٰ کہ ان کے دل محفوظ ہیں، درست نہیں ہے حقیقت یہ ہے بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی ہے۔ اور انہیں اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے۔ ان کے قلب معکوس ہو چکے ہیں۔ اور فہم الٹ گئے ہیں۔ یہ حق بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ کہ اُن کی بہت قلیل تعداد ایمان لاتی ہے۔ سورۃ مائدہ میں اسی چیز کو فرمایا وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ یعنی تم میں سے اکثر فاسق ہی ہیں۔ اگرچہ سارے کے سارے نافرمان نہیں تھے۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ لَيْسُوْا سَوَآءً مگر اکثریت ملعون ہی تھی۔ ایمان کی دولت چند لوگوں کے پاس ہی رہ گئی تھی۔

یہود اور نزولِ قرآن

یہ تذکرہ تو یہود کی اپنی کتاب توراۃ کا تھا۔ کہ انہوں نے اس کے احکام کی کس حد تک پابندی کی۔ اب اس بات کا بیان ہے۔ کہ جب قرآن پاک کا نزول ہوا تو اس کے ساتھ ان لوگوں نے کیا رویّہ اختیار کیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس وہ کتاب آگئی۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ جو ان کے پاس موجود ہیں۔ مصدق کتاب سے مراد قرآن پاک ہے۔ اور سابقہ کُتُب میں زبور، توراۃ، انجیل اور دیگر صحائف سماویہ ہیں۔ یعنی جب قرآن پاک نازل ہوا "كَفَرُوْا بِهٖ" تو بنی اسرائیل نے اس کا بھی انکار کر دیا۔ حالانکہ قرآن پاک اُن کے پاس موجود سابقہ کتابوں کی تصدیق کر رہا ہے۔

لفظ "كَفَرُوْا بِهٖ" بعد میں آتا ہے۔ آیت کے درمیانی حصّہ میں یہودیوں کی ایک اور بات کا ذکر ہے۔ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی نزول قرآن سے پہلے وہ کفار پر فتح مانگتے تھے۔ مفسرین کرام[1] نے يَسْتَفْتِحُوْنَ کے دو معنے کیے ہیں۔ فتح کے معنے کھولنے کے ہوتے ہیں۔ تو اس لحاظ سے معنی یہ ہے۔ کہ بنی اسرائیل کفار پر اس بات کو کھولتے تھے۔ یعنی بیان کرتے تھے۔ کہ آخری نبی اور اللہ تعالیٰ کی کتاب آنے والی ہے۔ اُس پر ایمان لانا۔ سورۃ اعراف میں موجود ہے "اَلَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ" یعنی وہ اپنی کتابوں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے تھے۔ کہ آخری نبی آنے والا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے صحیفہ میں بھی بشارت ہے کہ میں امیّوں میں اُمّی نبی بھیجوں گا۔

يَسْتَفْتِحُوْنَ کا دوسرا معنی فتح یا کامیابی ہے مفسرین کرام بیان کرتے ہیں[2] کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کافروں کے مقابلے میں فتح و کامرانی طلب کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے۔ یا اللہ ہمیں اس آنے والے نبی کی برکت سے کافروں کے مقابلے میں فتح نصیب فرما۔ تاکہ جب وہ نبی آئے تو ہم اس کی اتباع کر سکیں۔ گویا نبی آخر الزماں کے توسل سے مانگتے تھے۔

---

[1] طبری صفحہ ۴۱۱ تا ۴۱۲ ج ۱

[2] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۱۲۴ ج ۱

نظریہ توسل

نظریہ توسل ہمارے مذہب میں بھی روا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی مقرب بندے کی برکت سے یا اس کے طفیل سے کوئی دعا مانگی جائے اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ مانگنا تو اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔ صاحب وسیلہ اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ ہے اس نے ہمیں راہ راست کی تعلیم دی ہے۔ ہمیں اس سے محبت ہے۔ لہٰذا اس کے طفیل یا اس کی برکت سے خدا تعالیٰ ہماری دعا قبول کرے۔ ہاں شرک اس وقت ہوگا۔ جب اس کے توسل کی بجائے خود اُسی سے مانگنے لگے یا اس کو مشرکوں کی طرح شفیع سمجھے یا اس کو مختارِ مطلق سمجھے۔ کہ اسے دعا کے قبول کرنے یا کرانے کا اختیار حاصل ہے۔

بہر حال پہلے تو یہ لوگ اس قسم کی دعائیں مانگتے تھے۔ اور وعدہ کرتے تھے۔ کہ آنے والے نبی پر ایمان لائیں گے۔ فَلَمَّا جَآءَهُمْ پس جب وہ چیز آگئی جس کے وہ منتظر تھے۔ مَّا عَرَفُوْا اور اسے انہوں نے پہچان بھی لیا كَفَرُوْا بِهٖ اس کے باوجود اس کا انکار کردیا ان کی اس ہٹ دھرمی اور کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ایسے منکرین پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان ظالموں نے ایسی بُری حرکات کرکے کیا کمایا۔ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ انہوں نے نہایت ہی بُری چیز کے بدلے اپنی جانوں کو بیچا وہ کون سی چیز ہے جو انہوں نے جان کے بدلے خریدی اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وہ یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب، شریعت اور وحی کا انکار کردیا۔ اور یہ محض اس لیے بَغْيًا شرارت کرتے ہوئے۔ کہ نبی آخر الزمان دوسری قوم میں کیوں آگیا۔ وہ تو ہماری قوم بنی اسرائیل میں آنا چاہیے تھا۔ وہ بنو اسمٰعیل میں کیسے آگیا۔ چنانچہ قرآن پاک نے جگہ جگہ بیان کیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے کہاں کہا ہے کہ آخری نبی ضرور بنی اسرائیل میں آئے گا۔ فرمایا حقیقت یہ ہے اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ج اللہ تعالیٰ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے۔ اتار دیتا ہے۔ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ہزاروں نبی بھیجے۔ مگر نبی آخر الزمان کی بعثت بنی اسماعیل میں مقدر ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ وہیں تشریف لائے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے آخری نبی کا کوئی وعدہ نہیں کر رکھا تھا۔ اب جب کہ آخری نبی آگئے ہیں۔ تو بنی اسرائیل کا

فرض تھا۔ کہ وہ اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہوئے۔ اس پر ایمان لاتے اور ان کا اتباع کرتے۔ اس کے برخلاف انہوں نے سرکشی کا راستہ اختیار کیا اور اپنے خاندانی تفوق کا دم بھرنے لگے، جو ان کے لیے مناسب نہ تھا۔

غضب پر غضب

بنی اسرائیل کی سرکشی کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ وہ غضب پر غضب لے کر لوٹے۔ ان کا پہلا غضب تو یہ تھا۔ کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا۔ بادشاہ نے انہیں سولی پر لٹکانے کا حکم دیا۔ منہ پر تھوکا اور حضرت مسیح علیہ السلام کو معاذ اللہ دجّال کہا۔ انہیں ایذا پہنچائی۔ کتب سماویہ میں تحریف کا ارتکاب کیا۔ اور حیلے بہانوں سے خدائی احکام کو ٹالا۔ اور پھر اس غضب پر دوسرا غضب یہ تھا کہ جب نبی آخر الزمان علیہ السلام تشریف لائے اور آخری کتاب نازل ہوئی تو ان کا انکار کر دیا۔ یہ گویا غضب پر غضب ہو گیا۔ اسی لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا[1] اَلْیَهُوْدُ مَغْضُوْبٌ وَالنَّصٰرٰی ضَالٌّ یعنی یہود مغضوب علیہ ہیں اور نصاریٰ گمراہ۔

مغضوب اُسے کہتے ہیں جو دیدہ دانستہ احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ آج کا مسلمان بھی جانتا ہے۔ کہ شریعت برحق ہے۔ مگر اس پر عمل نہیں کرتا۔ یہی خرابی بنی اسرائیل میں بھی پائی جاتی تھی۔ وہ پہچانتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور یہ آخری نبی اور آخری کتاب ہے۔ مگر ایمان نہیں لائے۔ علاوہ ازیں ضلال وہ ہے۔ جسکے فہم میں خرابی آجائے۔ اور وہ بھٹک جائے۔ نصاریٰ ضلال ہیں۔ یہ غلطی کرنے والے ہیں۔ فرمایا وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ یاد رکھو! انکار کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں دردناک عذاب تیار ہے اگر اس عذاب سے بچنا ہے تو آج بھی راہِ راست پر آجاؤ۔ ورنہ وہ تو تمہارے مقدر میں ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہودیوں کے حالات منکشف کر کے مسلمانوں کو بھی تنبیہ کر رہے ہیں۔ کہ تم بھی یہودیوں کی روش اختیار نہ کر لینا۔ بلکہ ان کی خرابیوں کا ذکر سُن کر اپنی اصلاح کر لینا۔

---

[1] ترمذی ص۴۲۴

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ
عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ
قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ
﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ
بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا
فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۗ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ۗ قَالُوْا سَمِعْنَا
وَعَصَيْنَا ۚ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۗ قُلْ
بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ قُلْ
اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ
النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ
يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ
﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ
اَشْرَكُوْا ۛ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ
بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

مع ۲ عند المتاخرین = ع =

ترجمہ: اور جب ان (اہل کتاب) سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اُس چیز پر جس کو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے۔ (یعنی قرآن) تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اُس چیز پر ایمان رکھتے ہیں۔ جو ہماری طرف نازل کی گئی۔ (یعنی تورات) اور اس کے سوا کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ برحق ہے۔ اور تصدیق کرنے والی ہے اس کی جو ان کے پاس ہے۔ آپ فرما دیجئے، پس تم کیوں قتل کرتے تھے اللہ تعالےٰ

کے انبیاء کو اس سے پہلے اگر تم ایمان والے ہو (۹۱) البتہ تحقیق تمہارے پاس
موسیٰ (علیہ السلام) کھلی نشانیاں لائے۔ پھر اس کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔
اور تم ظلم کرنے والے تھے (۹۲) اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا۔ اور ہم نے
تمہارے اُوپر کوہ طور کو اٹھایا۔ پکڑو جو ہم نے دیا ہے تم کو مضبوطی کے ساتھ اور سنو۔
انہوں نے کہا کہ ہم نے سُنا اور نہ مانا۔ اور ان کے دِلوں میں بچھڑے کی محبت پلا دی
گئی ان کے کفر کی وجہ سے۔ آپ کہہ دیجئے کہ وہ بُری بات ہے، جس کے لیے تمہارا
ایمان تمہیں حکم دیتا ہے۔ اگر تم ایمان والے ہو (۹۳) آپ فرما دیجئے کہ اگر اللہ
کے نزدیک آخرت کا گھر دوسرے لوگوں کے سوا صرف تمہارے لیے خالص ہے
پس تم موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے ہو (۹۴) اور وہ اس موت کی ہرگز تمنّا نہیں
کریں گے کبھی بھی۔ اس وجہ سے کہ جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔ اور اللہ
تعالیٰ خوب جانتا ہے ظلم کرنے والوں کو (۹۵) اور البتہ تم ان لوگوں کو زندگی پر
زیادہ حریص پاؤ گے لوگوں سے بھی اور ان سے بھی زیادہ حریص جنہوں نے شرک
کیا۔ ان میں سے ہر کوئی پسند کرتا ہے کہ اُسے ہزار سال عمر دے دی جائے۔ حالانکہ
عمر اُسے خدا کے عذاب سے دور کرنے والی نہیں ہے اگر اس کو اتنی عمر دے
دی جائے۔ اور اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے، جو کچھ یہ کام کرتے ہیں (۹۶)

گذشتہ سے پیوستہ

یہودیوں کی قباحتیں اور ان کی سزائیں بیان ہو رہی ہیں۔ اس سے پہلی آیات میں یہودیوں کی برائیوں اور ان کے کفر پر اصرار کا ذکر تھا۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ خاتم النّبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے یہودی اُن کے منتظر تھے۔ کہ جب وہ نبی آخر الزمان آئے گا۔ تو اس کا ساتھ دیں گے۔ یہودی لوگ آپ کی برکت سے مشرکین پر غلبہ حاصل کرنے کی تمنا بھی کرتے تھے۔ اور اس کے لیے دعائیں بھی کرتے تھے۔ مگر جب وہ رسول آگیا جس کا انتظار تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب بھی آگئی اور اُن لوگوں نے پہچان بھی لیا، تو پھر انکار کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے دوہرے غضب میں مبتلا ہوئے۔

دعوتِ ایمان

ان آیات میں بھی یہودیوں کی ہٹ دھرمی کا ذکر ہے۔ البتہ یہاں ان کو قرآن پاک

اور ایمان کی دعوت دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ جب انہیں کہا جاتا ہے۔ کہ اس چیز پر ایمان لاؤ۔ جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے۔ یعنی قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ کی فرستادہ کتاب تسلیم کر لو۔ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہم تو اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے۔ یعنی توراۃ۔ کہتے ہیں۔ کہ ہم تو صرف توراۃ کو مانتے ہیں وَیَکْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ اور اس کے علاوہ ہر چیز کا انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ وَهُوَ الْحَقُّ قرآن پاک برحق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے اور مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ جو کچھ ان کے پاس ہے۔ یعنی توراۃ۔ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ان کا توراۃ پر ایمان لانے کا دعوے بھی جھوٹا ہے۔ اگر ان بدبختوں کا توراۃ پر ایمان ہوتا تو یہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لاتے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔

یہ ایک اصولی بات ہے کہ جب تک کوئی فرد یا قوم اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ تمام کتابوں پہ ایمان نہیں لائے گی، وہ مومن نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ تمام کتب سماویہ کی بنیادی تعلیم تو ایک ہی ہے یعنی ایمانیات اور عبادات کے معاملہ میں تمام کتابیں مساوی ہیں " شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا " یعنی تمہارے لیے بھی وہی دین مقرر کیا گیا ہے۔ جو حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے نبیوں کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ ہاں البتہ مختلف زمان و مکان کے لحاظ سے شریعت میں تھوڑا بہت فرق ضرور ہے۔ جیسے فرمایا " لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا "

قتل انبیاء علیہم السلام

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے جھوٹے ہونے کی ایک اور دلیل بیان فرمائی ہے۔ ان سے پوچھیے۔ کہ اگر توراۃ پہ تمہارا ایمان ہے قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِیَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ تو تم نے اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کیا ہے۔ قتل انبیاء علیہم السلام تمہاری کون سی کتاب جائز قرار دیتی ہے۔ یہ تو صریحاً کفر ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بعد میں آنے والے بنی اسرائیلی قاتلان انبیاء، اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرتے تھے۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو پھر ایسا کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ اپنے بڑوں کے

جرم میں تم بھی شریک ہو۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت یہودی بھی اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پہ چلتے ہوئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے درپے تھے۔ اس سلسلہ میں مدینہ کے یہودیوں نے کتنی سازشیں کیں۔ حتیٰ کہ حضور علیہ السلام کو زہر بھی دیا گیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ اچھا تمہارا دعویٰ ہے کہ توراۃ پہ تمہارا ایمان ہے۔ تو پھر یہ بتاؤ کہ قتل انبیاء علیہم السلام توراۃ میں کہاں لکھا ہے۔ تمہارا دعوئے ایمان باطل ہے۔ اگر تم ایمان والے ہو تو قتل انبیاء علیہم السلام میں کیوں ملوث ہوتے ہیں۔

گوسالہ پرستی

فرمایا تمہارا یہ دعویٰ درست نہیں۔ کہ تم توراۃ پہ ایمان رکھتے ہو اس کا ثبوت یہ ہے کہ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ جب موسیٰ علیہ السلام واضح نشانیاں یعنی معجزات لے کر آئے تو تم نے ان پہ ایمان لانے کی بجائے۔ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ یہ صریحاً شرک تھا۔ جو تمام آسمانی کتابوں کے مطابق گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ اور تم یا تمہارے اباؤ اجداد ظلم کرنے والے تھے۔

دیکھو! تم نے بار بار عہد و پیمان کو توڑا۔ از خود شریعت کا مطالبہ کیا۔ اور پھر جب وہ قانون تمہارے پاس آگیا۔ تو حیلے بہانے سے اُسے ٹالنا چاہا۔ اور کہہ دیا کہ اس پہ عمل ممکن نہیں۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا۔ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ اور تمہارے سروں پر کوہ طور کو معلق کر دیا۔ اور حکم دیا خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا جو کچھ ہم عطا کر رہے ہیں اُسے مضبوطی سے تھام لو اور سنو۔ یعنی اس پہ کماحقہٗ عمل کرو۔ مگر تم نے الٹا ہی جواب دیا قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا بظاہر تو عمل کا وعدہ کیا۔ مگر باطن میں کہا۔ کہ ہم نے سن لیا مگر ہم نے اُسے تسلیم نہیں کیا۔ یعنی زبان سے اقرار تو کرتے ہیں۔ مگر ہم سے اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اسکی وجہ یہ تھی وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت گھر کر چکی تھی۔ یہ ان کے کفر کی وجہ سے تھا۔ کہ وہ شرک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ لہذا انکا یہ دعوےٰ کہ توراۃ کو مانتے ہیں۔ غلط ہے۔

فرمایا قُلْ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ وہ بہت ہی بری چیز ہے۔ جس کے لیے تمہارا ایمان تمہیں حکم دیتا ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اگر تم واقعی مومن ہو۔ اور پھر گوسالہ پرستی بھی کرتے ہو۔ یہ تو بہت ہی بڑی بات ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ خالص ایمان کبھی قتل انبیاء علیہم السلام کا حکم نہیں کرسکتا۔ اور نہ ہی بچھڑے کی پرستش پر آمادہ کرتا ہے حقیقت یہ ہے۔ کہ توراۃ پر تمہارا ایمان ہی نہیں ہے۔ ورنہ اس قسم کی بری حرکات کے مرتکب نہ ہوتے۔

موت کی آرزو

پہلے آیت گذر چکی ہے۔ اور آگے بھی آئیگی۔ یہود و نصاریٰ دونوں اس زعم باطل میں مبتلا تھے۔ کہ جنت صرف انہیں کے لیے مخصوص ہوچکی ہے، کوئی دوسری قوم اس میں داخل نہیں ہوگی۔ ان کا دعویٰ تھا۔ کہ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى "اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ اے نبی علیہ السلام آپ ان کو فرما دیں۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک آخرت کا گھر محض تمہارے ہی لیے ہے۔ تمہارا یہ یقین ہے۔ کہ تم ضرور جنت میں جاؤ گے۔ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ تو پھر ذرا موت کی تمنا تو کرو۔ تمہاری سچائی کا پتا چل جائے گا۔ ظاہر ہے جسے آخرت میں اپنی کامیابی کا یقین ہوگا۔ وہ تو چاہے گا کہ کب موت آئے اور کب وہ دائمی آرام و راحت سے مستفید ہو۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ سب ان کے زبانی دعوے ہیں۔ کہ ہم جنتی ہیں۔ جنت میں پہنچنے کے لیے جس ذریعہ یعنی موت کی ضرورت ہے، اس کی کبھی تمنا نہیں کریں گے۔ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا کیونکہ وہ جانتے ہیں۔ کہ یہاں پر وہ کس قسم کی کرتوتیں کررہے ہیں بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ان کے ہاتھوں نے آگے کیا بھیجا ہے۔ اگر اپنی کامیابی پر انہیں یقین ہوتا تو ضرور موت کی تمنا کرتے۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ اللہ تعالیٰ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ کہ یہ کیا ظاہر کررہے ہیں۔ اور ان کے باطن میں کیا پوشیدہ ہے۔

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ اگر یہ لوگ قرآن پاک کا چیلنج قبول کرکے جھوٹ موٹ بھی موت کی تمنا کر بیٹھتے تو ہلاک ہوجاتے۔ اس لیے انہوں نے ایسا نہیں

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۱۲۷ ج ۱، تفسیر طبری ص ۴۲۴ ج ۱، معالم التنزیل ص ۳۹ ج ۱

کیا۔ قرآن پاک اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا یہ بہت بڑا ثبوت ہے۔ کہ یہودیوں نے قرآن پاک کا چیلنج قبول نہ کیا۔ وہ لوگ تو موت سے سخت خوفزدہ تھے۔ وہ اس کی تمنا کیسے کر سکتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ نصرانیوں کا ایک گروہ بھی مباہلے کے لیے آیا تھا۔ اگر وہ بھی مقابلے میں آجاتا اور مباہلہ کر بیٹھتا، تو وہ خود اور ان کے گھر بار سب ہلاک ہو جاتے۔

طویل العمری کی خواہش

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ یہودی موت کی تمنا کبھی نہیں کریں گے۔ بلکہ یہ طویل العمری کے خواہشمند ہیں۔ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ البتہ آپ انہیں زندگی پر لوگوں سے زیادہ حریص پائیں گے وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ان لوگوں سے بھی زیادہ حریص جو مشرک ہیں۔ مشرک کے نزدیک آخرت کا کوئی تصور نہیں۔ لہٰذا ان کا زندگی پر حرص کرنا تو واضح ہے۔ مگر یہ یہودی آخرت کو مانتے ہوئے بھی دنیوی زندگی کی خواہش کرتے ہیں۔ اور موت سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ جو لوگ صاحب ایمان ہیں وہ موت سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ صحابہ کرامؓ کے حالات ہمارے سامنے ہیں۔ وہ تو موت کو ابدی راحتوں کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ اور ہر وقت موت کے انتظار میں رہتے تھے۔ کہ کب اس پل کو عبور کر کے جنت کی وادیوں میں پہنچ جائیں۔ حضرت حذیفہؓ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو کہتے تھے[۱] جَاءَ حَبِيْبٌ عَلٰى فَاقَتِهٖ ضرورت اور حاجت کے وقت آنے والی چیز یعنی موت آگئی ہے۔ لَا اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنْ نَدِمَ آج جو نادم ہوگا۔ اُسے کبھی فلاح نصیب نہیں ہوگی۔ گویا ہم موت سے ڈرتے نہیں بلکہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ کہ یہ تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے۔ اس کے بغیر خدا تعالیٰ سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔

جنگ صفین میں حضرت علیؓ جبّہ پہنے ہوئے تھے۔ تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ حضرت حسنؓ نے کہا۔ کہ اے اباجان! یہ لباس جو آپ نے پہن رکھا ہے۔ یہ جنگی لباس تو نہیں ہے فرمانے لگے[۳] بیٹے! مجھے اس چیز کا خوف نہیں ہے۔ کہ موت مجھ پر گرے یا میں موت

---

[۱] تفسیر طبری صفحہ ۴۲۴ ج ۱، ابن کثیر صفحہ ۱۲۷ ج ۱ [۲] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۳۴۳ پارہ ۱ [۳] تفسیر عزیزی صفحہ ۳۴۳ پارہ ۱

پھوگموں۔ ہمیں تو شہادت کی تمنّا ہے۔ موت ہمیں خوفزدہ نہیں کر سکتی۔ حضرت عمار رضؓ بھی ایسا ہی کہتے تھے غدًا نَلْقَى الْاَحِبَّةَ مُحَمَّدًا وَحِزْبَهٗ کل یقیناً ہم اپنے دوستوں سے ملیں گے ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے گروہ سے ملنے والے ہیں۔ ہمیں موت کا ڈر نہیں، ظاہری طور پر موت بڑی خوفناک چیز ہے ________ مگر مومن اپنے ایمان اور عقل سے سمجھتا ہے۔ کہ یہ یقینی ہے۔ ڈروالی شئے نہیں، بلکہ خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے جب انسان کو اللہ تعالیٰ کے ہاں ابدی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ تو اُسے معلوم ہوگا کہ دنیا کی زندگی کتنی حقیر چیز ہے۔

موت وحیات کی طلب

ایک بات یاد رکھنے کی ہے۔ کہ اگر دنیا میں کوئی تکلیف پیش آجائے تو اس سے دل برداشتہ ہو کر موت کی تمنا نہیں کرنی چاہیئے۔ اس سے منع کیا گیا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[۱] لَا يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ لِضُرٍّ نَزَلَ بِهٖ کوئی شخص محض تکلیف کی وجہ سے موت کا طالب نہ ہو۔ بلکہ یوں دعا کرے۔ اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مَا كَانَتِ الْحَيٰوةُ خَيْرًا لِّيْ اے اللہ! جب تک زندگی میرے لیے بہتر ہو تو مجھے زندہ رکھ وَاَمِتْنِيْ مَا كَانَتِ الْمَوْتُ خَيْرًا لِّيْ اور جب میرے لیے موت بہتر ہو۔ تو وہ دے دے۔

فرمایا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ ان لوگوں کی حالت یہ ہے۔ کہ ان میں سے ہر ایک خواہش کرتا ہے۔ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ کہ اس کی عمر ہزار سال ہو جائے۔ فرمایا اگر ان کی یہ یہ خواہش پوری بھی ہو جائے۔ یعنی انہیں ہزار سالہ زندگی میسر آجائے۔ اس کے باوجود وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ اتنی لمبی عمر بھی انہیں عذاب سے نہیں بچا سکتی۔ وہ بالآخر خدا تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے۔ کیونکہ یہ ضدی اور عنادی لوگ ہیں۔ یہ لوگ کفر میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے قباحتیں اور شرور اکھٹے کر رکھے ہیں۔ اور اپنی روحانیت تباہ کر لی ہے۔ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں سب کچھ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہے۔ وہ ان کے عقائد اور اعمال اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ لوگ کسی طرح بھی اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

---

[۱] مسلم ص ۳۴۲ ج ۲

درس چہل نہم (آیت ۹۷ تا ۱۰۱)

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ
اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ
﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ
فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ج
وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ
فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ
رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ قلے كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

ترجمہ :- آپ کہہ دیجئے جو شخص جبرائیل علیہ السلام کا دشمن ہے۔ پس بے شک یہ (قرآن پاک) اُسی نے آپ کے دل پر نازل کیا، اللہ کے حکم سے۔ یہ تصدیق کرنے والا ہے ان کتابوں کی۔ جو اس سے پہلے ہیں۔ اور یہ اہل ایمان کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہے ﴿۹۷﴾ جو شخص دشمن ہو، اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کے رسولوں کا اور جبرائیل کا اور میکائیل کا۔ پس بے شک اللہ تعالیٰ کافروں کے ساتھ دشمنی رکھنے والا ہے ﴿۹۸﴾ اور البتہ تحقیق ہم نے آپ کی طرف واضح نشانیاں نازل کیں۔ اور اس کے ساتھ نہیں کفر کرتے مگر نافرمان لوگ ﴿۹۹﴾ کیا جب بھی انہوں نے کوئی عہد کیا۔ اس کو ان میں سے ایک گروہ نے پھینک دیا۔ بلکہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے ﴿۱۰۰﴾ اور جب اُن کی طرف اللہ کی طرف سے رسول آیا۔ جو تصدیق کرتا ہے۔ اُس چیز کی جو اُن کے پاس ہے۔ تو کتاب یافتہ لوگوں میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اپنی پشتوں کے پیچھے ڈال دیا۔ گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں ﴿۱۰۱﴾

شانِ نزول

یہودیوں کی خرابیوں کا تذکرہ تسلسل کے ساتھ چل رہا ہے۔ آیات زیرِ درس کے شانِ نزول کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں[1]۔ کہ حضرت نبی علیہ السلام کی ہجرت مدینہ کے وقت مدینہ کے گردونواح میں بہت سے یہودی آباد تھے۔ یہودی علماء میں سے صرف ایک عالم حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ایمان لائے باقی سب محروم ہی رہے۔ ان میں سے ابن صوریا یک چشم تھا۔ وہ بعض دوسرے یہودیوں کے ہمراہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے آیا۔ اور آپ سے مختلف سوال کیے۔ اُس نے کہا کہ آخری نبی کے خواب سے متعلق ہماری کتابوں میں بعض نشانیاں موجود ہیں۔ آپ اپنے خواب کی کیفیت بیان فرمائیں۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا اِنَّ عَیْنَیَّ تَنَامَانِ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ یعنی میری آنکھیں تو بیشک سوتی ہیں۔ مگر دل کبھی نہیں سوتا۔ اس کی اُس نے تصدیق کی۔ کہ آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔ ہماری کتابوں میں بھی نبی آخر الزمان کی یہی نشانی بتائی گئی ہے۔

اس شخص نے دوسرا سوال کیا۔ کہ رحمِ مادر میں جنس کی تفریق کیسے ہوتی ہے۔ یعنی بچے اور بچی کی پیدائش میں کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مرد کا مادہ منویہ سفید رنگ کا ہوتا ہے۔ اور عورت کے رحم کی رطوبت زرد رنگ کی ہوتی ہے۔ فرمایا مباشرت کی وقت جس مادہ کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ بچے کی شکل وصورت اس کے موافق ہوتی ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ غلبے سے کیا مراد ہے مقدار میں غلبہ ہوتا ہے۔ یا خروج میں سبقت ہوتی ہے، یا کسی صفت میں غلبہ ہوتا ہے یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی بتایا کہ مرد اور عورت میں سے جس کے مادہ میں غلبہ ہوتا ہے۔ وہ مشابہت میں بچے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یہودیوں نے کہا۔ کہ یہ بھی آپ نے درست جواب دیا۔ ہماری کتابوں میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

حضور علیہ السلام نے ان یہودیوں سے فرمایا۔ کہ جب تم میرے جوابات سے مطمئن ہو تو پھر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ کہنے لگے، ہم ایک اور سوال پوچھیں گے۔ حضرت! یہ فرمائیے۔

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۳۴۹ پارہ ۱، تفسیر طبری صفحہ ۴۳۱ ج ۱، ابن کثیر صفحہ ۱۲۹ ج ۱

کہ جو لوگ بہشت میں داخل ہوں گے، انہیں سب سے پہلے کونسی خوراک پیش کی جائیگی، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ جنتیوں کی اولین خوراک مچھلی کے جگر کا زائد حصہ ہوگا۔ اور پھر دوسرے نمبر پہ ان کو بیل کا گوشت پیش کیا جائے گا۔ جو جنت کے اطراف میں چرتا ہے۔ یہودیوں نے کہا۔ کہ یہ بھی آپ نے درست فرمایا ہے۔

اب حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ جب تم نے آخری نبی کی تمام علامتیں پہچان لی ہیں۔ تو پھر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ انہوں نے کہا کہ اچھا ایک بات اور بتایئے۔ کہ آپ کے پاس وحی کون لاتا ہے، آپ نے فرمایا، مجھ پہ جبریل علیہ السلام وحی لاتے ہیں۔ وہ کہنے لگے جبرائیل تو ہمارا دشمن ہے۔ اگر وہ وحی لاتا ہے تو ہم اس کو نہیں مانتے۔ ہاں اگر میکائیلؑ وحی لاتا تو ہم مان لیتے۔ کہنے لگے جبرائیل کو دو وجوہات کی بنا پہ ہم تسلیم نہیں کرتے۔ اول یہ کہ یہ قوموں پہ عذاب لاتا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اس نے ہمارے دشمن بخت نصر کی حمایت کی تھی۔ اس کی تفصیل انہوں نے یوں بیان کی۔ کہ ہمارے پیغمبروں نے ہمیں بتایا تھا۔ کہ بخت نصر نامی بادشاہ تمہیں تباہ و برباد کرے گا۔ لہٰذا اُسے بچپن میں ہی قتل کر دینا۔ پیغمبروں نے اس کی نشانیاں بتائیں اور یہ بھی بتایا کہ وہ اوائل عمر میں فلاں جگہ پہ ملے گا۔ اور فلاں کام کرتا ہوگا۔ چنانچہ ہمارے سرداروں نے بخت نصر کی تلاش میں چاروں طرف آدمی بھیج دیئے۔ اور انہوں نے شہر بابل میں انہی نشانیوں کے ساتھ بخت نصر کو تلاش کر لیا۔ جب اُسے ہلاک کرنے لگے تو جبرائیل علیہ السلام سامنے آ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے تم اس کو کیوں مارتے ہو۔ ہم نے کہا کہ یہ ہمارا قاتل ہے۔ اور ہماری تباہی کا باعث بنے گا۔ تو جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ اگر یہ واقعی قاتل ہے۔ تو تم اُسے ہلاک نہیں کر سکو گے۔ اور اگر یہ تمہارا قاتل نہیں ہے۔ تو خواہ مخواہ خونِ ناحق کے مرتکب ہوتے ہو۔ اس طرح جبرائیل علیہ السلام نے بخت نصر کو ہلاک ہونے سے بچا لیا۔ وہی بخت نصر جب بڑا ہوا۔ تو اُس نے شام اور فلسطین کے علاقوں میں بڑی تباہی مچائی۔ اور بیت المقدس کو گرا دیا۔ توراۃ کو جلایا یہودیوں کو قتل کیا اور ان کو غلام اور لونڈیاں بنایا۔ چنانچہ یہ لوگ سو سال تک غلامی میں مبتلا رہے اور بڑی ذلت و رسوائی اٹھائی۔

یہودیوں نے کہا۔ کہ جبرائیل علیہ السلام پہ ہمارا اور اعتراض یہ ہے۔ کہ یہ آپ کے

پاس ہماری چغلیاں کھاتا ہے۔ ہماری ساری باتیں آپ کو بتا دیتا ہے۔ لہذا اس کے ذریعے نازل ہونے والی وحی کو ہم ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یہودیوں کے ان اعتراضات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ اور ان کی گندی ذہنیت کا ردّ فرمایا۔ اور بتایا کہ جبرائیل علیہ السلام تو اللہ تعالےٰ کے مقرب فرشتے ہیں۔ وہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے کرتے ہیں۔ لہذا ان کے ساتھ دشمنی رکھنا کفر کے مترادف ہے۔

جبر، میک، سراف ان تینوں لفظوں کا معنیٰ عبد، بندہ یا مردِ خدا ہے۔ اور ایل عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ گویا دونوں لفظ مِل کر عبد اللہ کا معنیٰ دیتے ہیں۔ اس طرح جبرائیل ـ میکائیل اور اسرافیل کا معنیٰ اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوا[1]۔ ان میں عزرائیل کا نام شامل نہیں ہے۔ بعض کتابوں میں مذکور ہے۔ کہ عزرائیل ملک الموت کا لقب ہے۔

الغرض! جب یہودیوں نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اپنا دشمن قرار دیا۔ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ کہ کہہ دیجیے جو کوئی جبرائیل علیہ السلام کا دشمن ہے۔ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ اس نے تو قرآن پاک آپ کے قلب مبارک پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اتارا ہے۔ اس کے ساتھ کسی کی دشمنی کا کیا جواز ہے۔

نزول وحی کی مختلف صورتیں

نزول وحی کی مختلف صورتیں ہیں۔ عام صورت تو یہی ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ کے حکم سے جبرائیل علیہ السلام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل کرتے تھے۔ جب اللہ تعالےٰ کی طرف سے وحی لاتے تھے۔ تو حضور علیہ السلام کے قلب کے ساتھ رابطہ قائم ہو جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آج کل ٹیلیفون کا کنکشن مِل جاتا ہے یہ خاص قسم کی رَو ہوتی تھی جس کے ذریعے پیغمبر علیہ السلام اپنے کانوں سے اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے۔ اور اُسے خوب سمجھتے تھے۔ اور اس کے الفاظ کو جانتے تھے۔ اور بعض اوقات ایسا ہوتا تھا۔ کہ کوئی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ خواب بتادی جاتی تھی یا بعض دفعہ فرشتہ کسی شکل میں متشکل ہو کر آتا تھا۔ اور کلام الٰہی پیش کرتا تھا۔ تاہم عام طور پر پہلی صورت میں یعنی قلب مبارک سے رابطہ قائم ہوتا تھا۔

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۳۵۴ پارہ ۱، تفسیر ابن کثیر صفحہ ۱۳۰ جلد ۱

ایک دفعہ حضور علیہ السلام نے جبرائیل علیہ السلام سے فرمایا[1]۔ کہ ہم آپ کی آمد کے منتظر رہتے ہیں۔ آپ کثرت سے کیوں نہیں آتے تو جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا مَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ہم تو صرف آپ کے رب کے حکم سے نازل ہوتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ ہم حاضر ہو جاتے ہیں ہم اپنی مرضی سے نہیں آسکتے۔

مقرب فرشتے

حدیث شریف میں آتا ہے[2]۔ کہ ایک دفعہ جبرائیل علیہ السلام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو آپ کو بتایا کہ اب کی دفعہ میں اللہ تعالیٰ کے بہت ہی قریب پہنچ گیا۔ آپ نے دریافت کیا کہ جبرائیل یہ تو بتاؤ کہ تم اللہ تعالےٰ کے کس قدر قریب پہنچ گئے۔ عرض کیا۔ کہ میرے اور اللہ کے درمیان صرف ستر ہزار پردوں کا حجاب رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ کے اتنا قریب پہنچ گیا۔ اسی لیے ان کو اللہ تعالیٰ کے مقربین فرشتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے[3]۔ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبرائیل علیہ السلام کو ہر روز اجازت ہوتی ہے۔ کہ جنّت کی نہر کوثر میں غوطہ لگائیں۔ چنانچہ جبرائیل علیہ السلام ہر روز ایسا ہی کرتے ہیں جس کی وجہ سے غیر محدود روحانیت حاصل ہوتی ہے۔ آپ کے مختلف القاب میں ناموس اعظم، روح اعظم، روح القدس اور روح الامین وغیرہ شامل ہیں۔ جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سب سے مقرب فرشتے ہیں۔ تمام انبیاء علیہم السلام پر وحی حضرت جبرائیل علیہ السلام کے توسط سے ہی آتی رہی ہے۔

میکائیل علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دوسرے تکوینی امور کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ جیسے بنی نوع انسان کی روزی رسانی اور بارش کا نزول وغیرہ اسی طرح حضرت اسرافیل علیہ السلام عالم کے فنا کے لیے بگل بجانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور عزرائیل علیہ السلام جن کا لقب ملک الموت ہے وہ جانداروں کی روح قبض کرنے پر مامور ہیں قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[4]۔ کہ

---

[1] بخاری ص ۶۹۱ ج ۲، [2] زجاجۃ المصابیح ص ۲۰۷ ج ۱، مشکوٰۃ ص ۱۷، تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۵۹ پارہ ۱۰،
[3] تفسیر عزیزی ص ۳۵۹ پارہ ۱۰، [4] ص ۵ مجموعہ رسائل حضرت شاہ رفیع الدینؒ ص ۳۱

حدیث میں جن چار حاملین عرش فرشتوں کا ذکر ہے۔ وہ یہی فرشتے ہیں۔ قیامت کے دن عرش الٰہی کو اٹھانے والے آٹھ فرشتے ہوں گے۔ ان چار کے ساتھ چار اور معاون ہو جائیں گے۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام سے دشمنی

الغرض فرمایا۔ اے بنی اسرائیل، جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ تمہاری دشمنی بلا وجہ ہے قُلْ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ آپ فرما دیجئے۔ جو جبرائیلؑ کا دشمن ہے۔ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ اس نے تو یہ کلام الٰہی تمہارے قلب مبارک پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے نازل کیا ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم بجالاتا ہے۔ خواہ وہ چیز تمہاری موافقت میں جائے یا مخالفت میں جائے۔ اور پھر یہ کلام بھی ایسا ہے۔ جو قطعاً تمہاری مخالفت نہیں کرتا۔ بلکہ یہ تو مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور اس لحاظ سے یہ سابقہ کتب کی تعلیمات کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ دوسرے مقام پر "مُهَیْمِنًا" کا لفظ آتا ہے۔ قرآن پاک سابقہ کتب کا محافظ ہے۔ ان کا نچوڑ اس آخری کتاب میں آگیا ہے۔ اسی طرح پہلی کتابوں میں جو ملاوٹ ہو چکی ہے۔ ان کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ لہٰذا ایسی پاک کتاب کا انکار اور اس کے لانے والے سے دشمنی رکھنا کیسے جائز ہے۔ بلکہ یہ تو نہایت ہی قبیح فعل ہے۔ یہ تو ایسی عظیم الشان کتاب لاتا ہے۔ جس کے لیے نوع انسان ہمیشہ دعا گو رہی ہے۔ کہ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" اے اللہ! ہم کو راہ راست دکھا دے اور اس پر چلا دے

اہل ایمان کے لیے بشارت

فرمایا یہ کلام ایسا ہے۔ جو کہ وَهُدًی وَّبُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ہے اس کے ذریعے اللہ نوع انسان کو ہدایت بخشتا ہے۔ اور پھر اس ہدایت کی روشنی میں جو لوگ ایمان قبول کر لیتے ہیں۔ ان کے لیے دائمی کامیابی کی بشارت بھی سناتا ہے۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے "بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" اہل ایمان اور اعمال صالحہ کرنے والوں کو خوشخبری دے دیں۔ کن کن نعمتوں کی خوشخبری اس کا ذکر قرآن پاک نے بار بار کیا ہے۔ کہیں فرمایا "اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ" ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں رواں دواں ہوں گی۔ کہیں فرمایا فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ وہ اللہ رب العزت کی بیٹھک یعنی اس کے حضور میں بیٹھے ہوں گے، دوسری جگہ بشارت اس طرح ہے "فَاِنْ تُطِیْعُوْا یُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا" اگر اطاعت

کرو گے، تو اللہ تعالیٰ بہترین اجر عطا فرمائیں گے۔ بہرحال اہل ایمان کو اصلاح اور کامیابی کی بشارت سنائی گئی ہے۔ اب بتاؤ ایسا پاک کلام لانے والے جبرائیل علیہ السلام سے دشمنی کا کیا معنیٰ ہے۔

فرشتوں سے دشمنی اللہ تعالےٰ سے دشمنی ہے

فرمایا مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ یعنی اللہ تعالےٰ کے فرشتوں جبرائیل، میکائیل وغیرہ سے دشمنی رکھنا تو خود اللہ تعالیٰ سے دشمنی ہے۔ گویا یہ لوگ فرشتوں کے دشمن نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کے دشمن ہیں۔ فرمایا اگر ایسی بات ہے۔ تو پھر سن لو کہ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ اللہ تعالےٰ بھی کافروں کا دشمن ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ ملائکہ یا انبیاء علیہم السلام تو عالم بالا یعنی حظیرۃ القدس کے ترجمان ہیں۔ ان کے ساتھ دشمنی بڑی مہنگی پڑے گی۔ کیونکہ یہ خدا تعالیٰ سے دشمنی کے مترادف ہے

لفظ ملائکہ ملوکہ یا الوکہ سے مشتق ہے۔ اور ملوک عربی میں پیغام کو کہتے ہیں۔ اس کا ثبوت عرب کے قدیم شاعر عدی بن زید عبادی کے کلام سے ملتا ہے۔ اُسے نعمان شاہ عراق نے کسی بات پر خفا ہو کر قید میں ڈال دیا۔ بادشاہ اس کا رشتہ دار بھی تھا۔ بہرحال اس نے اپنے شعروں میں نعمان کو پیغام بھیجا تھا۔

ے اَبْلِغِ النُّعْمَانَ عَنِّيْ مَاْلُكًا ۔۔۔ اِنَّهٗ قَدْ طَالَ حَبْسِيْ وَانْتِظَارِيْ

نعمان کو میرا پیغام پہنچا دو۔ اس نے بلاوجہ مجھے لمبی قید میں ڈال رکھا ہے۔ میں اس کے حکم کا منتظر ہوں۔ کہ کب رہائی ملتی ہے۔ یہ کافی لمبا قصیدہ ہے۔

عرب کے ایک شاعر کے کلام میں بھی ایسا ہی ملتا ہے۔ یہ عربوں میں بہت مشہور تھا۔ اور اُسے عربوں کا باجا کہا جاتا تھا۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا شعر بہت شہرت حاصل کرتا تھا۔ اور پورے عرب میں فوراً پھیل جاتا تھا۔ اُس نے حضور علیہ السلام کا زمانہ پایا ہے۔ وہ شخص ایمان لانے کے لیے حضور علیہ السلام کی خدمت میں آ رہا تھا۔ کہ کفار نے سازش کے ذریعے اُسے راستے میں ہی روک لیا۔ وہ اپنے گاؤں میں بھی واپس نہ پہنچ سکا۔ بلکہ دورانِ سفر ہی اونٹ سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ وہ بھی کہتا ہے۔

ے اَبْلِغْ يَزِيْدَ بَنِيْ شَيْبَانَ مَاْلُكَةً ۔۔۔ اَبَا ثُبَيْتٍ اَمَا تَنْفَكُّ تَاْتَكِلُ

نیز یہ بنی شیبان سردار قبیلہ تک میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ اے ابو شبیب کیا تو ہمیشہ غلط بیانی ہی کرتا رہے گا۔ مطلب یہ کہ مالکا یا ملوکہ یا الوکہ کا معنی پیغام ہے۔ اور ملائکہ بھی اسی سے مشتق ہے۔ جس کا معنی پیغام لانے والے کے ہیں۔

مقربین کا عنادی لعنتی ہے

الغرض! جو کوئی اللہ تعالیٰ کے فرشتوں اور اس کے رسولوں سے دشمنی رکھتا ہے۔ وہ گویا اللہ تعالیٰ سے دشمنی مول لیتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے مقربین سے عناد رکھنے والا لعنتی ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں[1] کہ مقربین الٰہی اور صالحین سے عداوت رکھنے والا شخص ہمیشہ نجاست میں مبتلا رہتا ہے۔ گویا وہ ہمیشہ جنابت کی سی حالت میں ہے۔ اور یہ چیز موجب لعنت ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم علیہ السلام کی زبان مبارک سے کہلوایا۔ کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے[2]۔ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا جو میرے کسی ولی یا دوست سے دشمنی رکھتا ہے۔ اُسے میرا چیلنج ہے۔ کہ وہ میرے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ کون جنگ کر سکتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ایسا شخص ملعون ہے۔

واضح نشانیاں

جس وقت حضور علیہ السلام مدینہ منورہ میں تشریف لائے۔ تو اُس زمانے میں مدینے کے قرب و جوار میں یہودیوں کے دس بڑے عالم تھے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[3] کہ اگر یہ عالم ایمان لے آئیں۔ تو کوئی یہودی باقی نہ رہے۔ سب ایمان لے آئیں۔ ان میں سے صرف عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے۔ باقی سب بے ایمان ہی رہے۔ انہی میں ایک عالم ابن صوریا تھا۔ اُس نے حضور علیہ السلام سے کہا۔ کہ آپ نبی آخر الزمان ہونے کے دعویدار ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں آپ ہمیں کوئی واضح نشانی بتائیں جسے ہم پہچانتے ہوں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ ج یعنی ہم نے آپ کی طرف واضح نشانیاں نازل کی ہیں جس شخص میں ذرہ بھر بھی انصاف ہو گا۔ وہ ان نشانیوں کا انکار نہیں کر سکے گا۔ فرمایا وَمَا یَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ان کھلی نشانیوں کا انکار صرف نافرمان لوگ ہی کریں گے۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۵۶ ج ۱ [2] مستدرک حاکم ص ۳۲۸ ج ۴ [3] بخاری ص ۵۶۲ ج ۱ مسلم ص

کتاب اللہ سے روگردانی

فرمایا ان کمبختوں کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے کہ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا ان میں سے جب بھی کسی نے کوئی عہد کیا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ان میں سے ایک فریق نے اُس عہد کو توڑ دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ان کی اکثریت ایمان لانے سے قاصر رہی ہے۔ حتیٰ کہ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ جب ان کے پاس رسول اعظم، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ جو اس چیز کی تصدیق کرنے والے ہیں جو ان کے پاس ہے۔ یعنی زبور، توراۃ۔ انجیل۔ دیگر تمام صحف سماویہ۔ شرائع الٰہیہ وغیرہ۔ تو پھر یہ ہوا کہ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے پھینک دیا۔ كِتٰبَ اللّٰهِ اللہ کی کتاب کو وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ پس پشت۔ یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب توراۃ سے روگردانی اختیار کر لی۔ اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو کسی درجے میں بھی تسلیم کرتے۔ تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے اور قرآن پاک کو بھی مان لیتے۔ مگر انہوں نے کتاب اللہ کو پسِ پشت ڈال دیا یعنی اس میں تحریف کے مرتکب ہوئے۔ اس کے الفاظ کو تبدیل کر دیا۔ یا الفاظ کے معنے الٹ دیے اور یہ سب کچھ انہوں نے اس طرح کیا كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ گویا وہ جانتے ہی نہیں کہ کتاب اللہ میں کیا پیشن گوئیاں ہیں۔ اور کون سی علامتیں بتائی گئی ہیں۔ جن کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اور آخری رسول علیہ السلام کی پہچان ہو سکتی ہے۔ اگر ان میں کوئی بھی منصف مزاج آدمی ہوتا! تو وہ دونوں چیزوں کو بلاشک وشبہ پہچان لیتے۔ اس کے بعد یہودیوں کے سحر وغیرہ کا ذکر آئیگا۔

درسِ چہل و یک ۴۱ (آیت ۱۰۲ تا ۱۰۳)

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ
وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى
الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى
يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ
بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ ۭ وَلَقَدْ
عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڲ وَلَبِئْسَ
مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَھُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا
وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع ۱۲

ترجمہ:۔ اور انہوں نے اُس چیز کا اتباع کیا، جو شیاطین سلیمان (علیہ السلام) کی بادشاہی میں پڑھتے تھے۔ اور سلیمان (علیہ السلام) نے کفر نہیں کیا، بلکہ شیاطین کفر کرتے تھے۔ اور لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور وہ چیز جو اتاری گئی تھی بابل کے مقام پر دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر۔ اور وہ کسی کو نہیں سکھاتے تھے، یہاں تک کہ دونوں کہتے تھے۔ بیشک ہم تو آزمائش ہیں، پس تم کفر نہ کرنا۔ پس لوگ ان دونوں سے ایسی چیزیں سیکھتے تھے، جس کے ذریعے مرد اور عورت کے درمیان جدائی ڈالتے تھے۔ اور وہ اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ مگر اللہ کے حکم سے۔ اور وہ ان سے ایسی چیزیں سیکھتے ہیں جو انکو نقصان پہنچاتی ہیں۔ اور فائدہ نہیں پہنچاتی اور البتہ تحقیق انہوں نے جان لیا اس شخص کو جس نے اس (سحر) کو خریدا ہے۔ اُس کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور وہ بُری چیز ہے۔ جس کے بدلے میں انہوں نے اپنی جانوں کو بیچا ہے۔ اگر ان کو سمجھ ہوتی ﴿۱۰۲﴾ اگر یہ لوگ ایمان لاتے

اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ثواب اور بہتر اجر تھا۔ اگر یہ سمجھتے (۱۰۳)

شیطان کا اتباع

ان آیات میں بنی اسرائیل کی انتہائی پستی اور ان کے انحطاط کا ذکر ہو رہا ہے۔ گذشتہ آیت میں یہ بات بیان کی گئی تھی۔ کہ بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اس طور پر پس پشت ڈال دیا۔ کہ اُس سے بالکل لاتعلق ہو گئے۔ گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں کتاب اللہ کی تلاوت اور اس پر عملدرآمد کی بجائے وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ انہوں نے اس چیز کی پیروی کی جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جنوں اور انسانوں کا اختلاط ہوتا تھا۔ کیونکہ جن بھی آپ کے ماتحت تھے۔ لہٰذا اس دور میں جو کلام یا دیگر چیزیں جن پڑھتے تھے۔ بنی اسرائیل نے ان کا اتباع کیا۔ اس طرح سحر یا جادو انسانوں تک پہنچ گیا۔ اسی بات کو اس آیت میں یوں بیان فرمایا کہ بنی اسرائیل شیاطین یا جنوں کی تلاوت کردہ چیزوں کی پیروی کرنے لگے۔ گویا جادو میں ملوث ہو گئے اور کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام پر جادوگر ہونے کا الزام

جادو کو شیطانی کھیل جان کر کھیلتے رہتے تو اور بات تھی مگر بنی اسرائیل نے ستم بالائے ستم یہ کیا۔ کہ اس جادو کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا۔ حالانکہ سحر پر اعتقاد رکھنا اور اس پر عمل کرنا صریحاً کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السّلام کی برأت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا۔ یعنی انہوں نے یہ جادو وغیرہ تمہیں نہیں سکھایا۔ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا بلکہ یہ تو شیطانوں نے کفر کا ارتکاب کیا۔ جنہوں نے لوگوں کو جادو سکھایا ہے۔

سحر کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا بنی اسرائیل کا قبیح فعل ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کے نبی اور صاحب شریعت رسول تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور شیاطین کو آپ کے مطیع کر دیا تھا۔ اور ہوا کو آپ کے لیے مسخر کر دیا تھا "فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ" آپ ان چیزوں سے حسب منشا کام لیتے تھے۔ وہ کیسے جادو سکھا سکتے تھے۔ امام ابن جریرؒ نے ایک روایت [1]

---

[1] تفسیر طبری صفحہ ۴۵۱ ج ۱

بیان کی ہے۔ قَالَ بَعْضُ اَحْبَارِ الْیَھُوْدِ یہودیوں کے بعض علماء نے کہا اَلَا تَعْجَبُوْنَ مِنْ مُحَمَّدٍ اے لوگو! تم محمد پر تعجب نہیں کرتے۔ یَزْعَمُ اَنَّ ابْنَ دَاوٗدَ کَانَ نَبِیًّا جو یہ کہتے ہیں۔ کہ ابن داؤد (سلیمان علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔ حالانکہ مَا کَانَ اِلَّا سَاحِرًا وہ تو جادوگر تھے۔ گویا یہودیوں کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق یہ اعتقاد تھا۔ اس لیے فرمایا کہ سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا۔ بلکہ شیاطین نے کفر کیا۔ جو کہ یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ق لوگوں کا جادو کا علم سکھاتے تھے۔ اس بات کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا صریح کفر ہے۔

جادو کے ذرائع

مفسرین کرام فرماتے ہیں[1]۔ کہ جادو ۲ ذرائع سے دنیا میں آیا۔ اس کا پہلا ذریعہ تو جنات ہیں۔ یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جادو شیاطین سے انسانوں میں رائج ہوا۔ جادو کا دوسرا ذریعہ ہاروت اور ماروت دو فرشتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے لیے دنیا پر بھیجا۔ اسی کے متعلق فرمایا وَمَا اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ط

ہاروت اور ماروت کون تھے

عام مفسرین[2] نے یہی لکھا ہے۔ کہ ہاروت اور ماروت دو فرشتے تھے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے لیے بابل کے مقام پر اتارا۔ یہ بابل شہر وہی ہے۔ جو کلدانیوں کا دارالسلطنت اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جائے پیدائش ہے۔ وہاں سے ہجرت کر کے آپ شام اور فلسطین پہنچے۔ اور پھر حجاز میں خانہ کعبہ کی تعمیر کی۔ بہرحال لفظ مَلَکَیْنِ سے مراد دو فرشتے ہی ہیں کیونکہ "مَلَکٌ" فرشتے کو کہتے ہیں۔

تفسیری روائتوں میں آتا ہے[3]۔ کہ حضرت ادریس علیہ السلام یا کسی اور نبی کے زمانہ میں دنیا پر معصیت عام تھی۔ لوگ فسق و فجور میں مبتلا تھے۔ تو آسمان پر فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور شکایت کی کہ مولا کریم! تو نے یہ کیسی مخلوق پیدا کی ہے جو اس قدر گناہ میں ملوث ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ میں نے انسان میں مختلف قوتیں پیدا کی ہیں جیسے قوت شہوانیہ، قوت بہیمیہ اور قوت غضبیہ وغیرہ وغیرہ اور ان کے ساتھ ساتھ نیکی کرنے کی طاقت بھی عطا کی ہے اس لیے

---

[1] معالم التنزیل ص ۴۲ ج ۱ ابوالسعود ص ۱۰۸ ج ۱ تفسیر عزیزی ص ۳۷۱ پارہ ۱ [3] تفسیر ابن کثیر ص ۱۳۸ ج ۱ معالم التنزیل ص ۴۲ ج ۱

تم دیکھتے ہو کہ کچھ لوگ اگر گناہ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تو کچھ نیکوکار بھی ہیں۔ کیونکہ ان کے اندر ساری قوتیں موجود ہیں۔ برخلاف اس کے فرشتوں کو میں نے قوت ملکوتی سے نوازا ہے۔ اگر تم تجربہ کرنا چاہتے ہو تو میں تم کو زمین پر بھیجتا ہوں۔ تم اپنے میں سے دو فرشتے منتخب کرو۔ پھر دیکھیں گے کہ وہ کس طرح گناہ سے بچتے ہیں۔ الغرض فرشتوں نے اس آزمائش کے لیے ہاروت اور ماروت کو منتخب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں قوت شہوانیہ بھی رکھ دی۔ اور پھر انہیں بابل کے مقام پہ اتار دیا۔ انہیں خاص طور پر نصیحت کی گئی کہ برائی سے باز رہنا۔ زنا اور دیگر معصیت سے اجتناب کرنا اور عدل و انصاف سے وقت گذارنا۔

ایک دفعہ ایسا واقعہ پیش آیا۔ کہ ایک خوبصورت عورت ایک چھکڑے پر سوار جارہی تھی۔ اس نے کسی ضرورت کے تحت منہ سے کپڑا ہٹایا۔ تو اسے دیکھ کر فرشتے بے قابو ہو گئے۔ یہ ان کی آزمائش کا مرحلہ تھا۔ انہوں نے اس عورت سے فرصت میں ملاقات کی خواہش کی۔ جسے اس نے منظور کر لیا۔ بوقت ملاقات فرشتوں نے اس سے نفسانی خواہش کی تکمیل کی درخواست کی۔ اس عورت نے اس خواہش کی تکمیل کے لیے یہ شرط پیش کی کہ مجھے وہ اسم اعظم سکھا دو جسے پڑھ کر تم آسمانوں پر چلے جاتے ہو اور پھر واپس آجاتے ہو۔ فرشتوں نے اسم اعظم اس عورت کو سکھا دیا۔ پھر اس نے کہا کہ میرے ساتھ یہ لڑکا ہے۔ اسکو قتل کر دو۔ ورنہ یہ ہمارا راز فاش کر دے گا۔ فرشتوں نے ایسا کرنے سے معذرت کی۔ عورت نے کہا۔ اچھا یہ شراب ہی پی لو۔ یہ بڑی لذیذ چیز ہے۔ فرشتوں نے شراب پی لی۔ پھر نشے میں آکر انہوں نے لڑکے کو بھی قتل کر دیا اور زنا کے مرتکب بھی ہوئے۔ گویا سارے معاصی میں مبتلا ہو گئے۔ عورت تو اسم اعظم پڑھ کر اوپر چلی گئی۔ کہتے ہیں کہ زہرہ ستارے میں جا کر نابود ہو گئی اور فرشتے سزا میں مبتلا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ ان گناہوں کی سزا دنیا میں بھگتنا چاہتے ہو۔ یا آخرت میں انہوں نے دنیا کی سزا کو پسند کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں مسخ کر کے انہیں کسی تاریک اور عمیق کنوئیں میں الٹا لٹکا دیا۔ آج تک وہ اسی میں لٹکے ہوئے ہیں ان کے نیچے سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ اور وہ سخت اذیت پارہے ہیں۔ جب قیامت آئے گی۔ تو اس وقت وہ اس عذاب سے نجات پائیں گے۔ دیگر اسرائیلی روایتوں کی طرح یہ بھی ایک اسرائیلی روایت ہے

تاہم اس کی سچائی پر یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

ہاروت اور ماروت کی عینی شہادت

امام ابن منذرؒ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔[ل] کہ ایک موقع پر ایک بوڑھا آدمی عبدالملک بن مروان کے ساتھ تخت پر بیٹھا تھا۔ نووارد نے تعجب کیا۔ کہ یہ کون آدمی ہے۔ جو خلیفہ کے ساتھ بیٹھا ہے۔ تو انہوں نے بتایا۔ کہ یہ آدمی ہاروت ماروت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہے۔ لہذا اس کی عزت افزائی کی گئی ہے۔ اس شخص نے آگے بڑھ کر بزرگ آدمی کو سلام کیا اور عرض کیا حضرت ہاروت ماروت سے ملاقات کا کچھ حال مجھے بھی سناؤ۔ اس پر اس شخص کے آنسو جاری ہوگئے۔ اور اس نے واقعہ یوں سنانا شروع کیا۔ کہ بھائی! میں ابھی بچہ تھا۔ گھر میں مال و دولت کی فراوانی تھی۔ جسے میں فراخدالی سے خرچ کرتا۔ جب باپ فوت ہوگیا۔ تو ماں سے دولت حاصل کرتا اور خوب اڑاتا۔ ایک دن میں نے ماں سے دریافت کیا۔ کہ ماں یہ تو بتائیں کہ ہمارے پاس یہ مال و دولت کہاں سے آیا تھا۔ جو اتنا خرچ کرنے سے بھی کم نہیں ہوتا۔ ماں نے کہا، بیٹا تم جتنی چاہو دولت لٹاؤ یہ ختم ہونے والی نہیں ہے۔ پھر اس نے مجھے دولت سے بھرے ہوئے کمرے دکھائے۔ لڑکے میں شعور پیدا ہوچکا تھا۔ اس نے دوسرا سوال کیا۔ کہ میرے باپ نے یہ مال کس طریقے سے کمایا تھا ماں نے بتایا کہ تیرا باپ ساحر تھا اور اس نے یہ ساری دولت سحر کی وجہ سے کمائی۔ لڑکے کو خیال آیا کیوں نہ میں بھی وہی چیز سیکھ لوں جس کی وجہ سے میرے باپ نے اتنا مال پیدا کیا۔ اس نے سوچا کہ سحر کا علم اس کے باپ نے اپنے کسی شاگرد کو بھی سکھایا تھا۔ اس کا پتہ کرکے اس سے یہ علم سیکھنا چاہیئے۔ چنانچہ تلاش کرنے پر اسے ایک شخص مل گیا۔ جو اس کے باپ کا شاگرد تھا۔ لڑکے نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ تو وہ کہنے لگا۔ یہ بڑا خطرناک علم ہے۔ اسے نہ ہی سیکھو تو بہتر ہے لڑکے نے اصرار کیا تو اس نے کہا کہ اچھا اگر تم ضرور ہی یہ علم سیکھنا چاہتے ہو۔ تو میرے پیچھے پیچھے آجاؤ۔ مگر یاد رکھو، جہاں ہم جارہے ہیں۔ وہاں جاکر خدا کا نام نہ لینا۔

لڑکا بیان کرتا ہے۔ کہ میں اپنے باپ کے شاگرد کے پیچھے ہولیا۔ حتیٰ کہ ہم ایک غار پر پہنچے اور اس میں اتر گئے۔ ہم تین سو سیڑھیاں نیچے اترے تو وہاں ایک کنواں نظر آیا۔

ل تفسیر عزیزی صفحہ ۳۷۳ پارہ ۱

کنوئیں کے اندر دو شخص نظر آئے۔ جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے اُلٹے لٹک رہے تھے، ان کی شکلیں عجیب و غریب تھیں، ان کی آنکھیں ڈھال کی طرح بڑی بڑی اور بڑی چمکدار تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر میرے دل میں خوف پیدا ہوا۔ اور میری زبان سے بے ساختہ کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ نکل گیا۔ یہ کلمہ سن کر وہ دو شخص اور زیادہ مضطرب ہوئے۔ میں پھر گھبرایا اور میرے منہ سے پھر وہی کلمہ نکلا۔ دو تین دفعہ ایسا ہی ہوا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ کہ تم کون ہو؟ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا۔ پھر میں نے اُن سے پوچھا۔ کہ تم کون ہو؟ اور اس حال میں کس وجہ سے ہو؟ ——— اس پر انہوں نے بتایا کہ ہم ہاروت اور ماروت ہیں۔ اور یہاں سزا بھگت رہے ہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ تم کس امت میں ہو، تو میں نے بتایا کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی امّت میں ہوں۔ انہوں نے دریافت کیا کہ کیا آخری نبی کا ظہور ہو گیا ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ انہوں نے کچھ علامتیں بھی دریافت کیں۔ جو میں نے ان کو بتائیں۔ وہ دونوں بعض علامات پر خوش ہوئے۔ اور بعض پر ناراض ہوئے۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔ کہ ہم اُن علامات پر خوش ہوئے ہیں، جو قربِ قیامت سے متعلق ہیں۔ کیونکہ قیامت برپا ہونے پر ہم اس عذاب سے رہائی پا لیں گے۔

الغرض! وہ لڑکا اللہ تعالے کا نام لینے کی وجہ سے سحر سے تو محروم ہو گیا، تاہم اُسے حقیقت معلوم ہو گئی۔ اور وہ ہاروت ماروت کا عینی شاہد بن گیا۔

ہاروت ماروت کے واقعہ سے انکار

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں۔[1] وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ میں لفظ ما نافیہ ہے۔ یعنی بابل کے مقام پر ہاروت ماروت پر کوئی چیز نہیں اتاری گئی۔ یہ سب جھوٹے قصے ہیں۔ جو بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ ان مفسرین کی ذاتی تحقیق ہے۔

بعض اصحاب یہ بھی کہتے ہیں[2] کہ ہاروت ماروت کا سارا قصہ کہانی محض ہے چنانچہ بشار ابن برد شاعر سے کسی نے پوچھا۔ کیا آپ نے آل سلیمان سادات خاندان کے متعلق بھی کوئی قصیدہ لکھا ہے؟ یہ اونچے درجے کا شاعر تھا۔ کہنے لگا۔ اُس خاندان کے متعلق کچھ زیادہ

---

[1] تفسیر بیضاوی ص۱۸۷ ج۱، مظہری ص۱۰۷ ج۱، طبری ص۳۵۲ ج۱، [2] بیان القرآن ص۲۴۶ ج۱

تو نہیں لکھا۔ صرف یہ دو شعر کہے ہیں[1]:

دِیْنَارُ اٰلِ سُلَیْمَانَ وَدِرْهَمُهُمْ ۔ کَبَابِلِیَّیْنِ حُفَّا بِالْعَفَارِیتِ
لَا یُرْجَیَانِ وَلَا یُرْجٰی نَوَالُهُمَا ۔ کَمَا سَمِعْتَ بِهَارُوْتَ وَمَارُوْتِ

آل سلیمان بڑے کنجوس لوگ ہیں۔ ان کے درہم و دینار ایسے ہیں۔ جیسے دو بابلیوں کے اردگرد بہت سے بھوت جمع ہوں۔ اور وہ کسی کو نظر بھی نہ آئیں۔ اس طرح آل سلیمان کا مال و دولت بھی کسی کو نظر نہیں آتا۔ نہ ان سے کسی عطیے کی توقع ہے۔ اور نہ ان کے درہم و دینار کو دیکھنے کی امید۔ ان کی دولت ایسے ہی ہے جیسے تم نے ہاروت ماروت کا نام تو سُن رکھا ہے۔ مگر اُن کی حقیقت کچھ نہیں۔ غرضیکہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں۔ جو ہاروت ماروت کے قصے کو افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے۔

سحر کیا ہے

تاہم اکثر مفسرین کہتے ہیں[2]۔ کہ ہاروت ماروت فرشتے تھے۔ اگرچہ زہرہ والا واقعہ مصدقہ نہیں ہے۔ مگر ان فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے سحر کا علم دیکر نازل کیا تھا۔ تاکہ سحر اور معجزے میں فرق قائم کیا جا سکے۔ لغوی اعتبار سے سحر کا معنی لطیف، باریک یا مخفی شئے ہے۔ سحر میں چونکہ کوئی چیز ظاہری طور پر نظر نہیں آتی۔ اس لحاظ سے اُسے سحر کہتے ہیں۔

سحر کا دوسرا معنیٰ غذا ہے۔ جب انسان کوئی بھی غذا کھاتا ہے تو ہضم ہو کر باریک باریک رگوں کے ذریعے جسم کے ہر حصے میں پہنچتی ہے۔ یہ لطیف بھی ہوتی ہے کہ نظر نہیں آتی۔ گویا اسمیں اخفاء اور پیچیدگی بھی پائی جاتی ہے۔ زمانہ جاہلیت کے ایک مشہور شاعر امرءالقیس کا کہنا ہے

اُرَانَا مُوْضِعِیْنَ لِاَمْرِ غَیْبٍ ۔ وَنُسْحَرُ بِالطَّعَامِ وَبِالشَّرَابِ

ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہم اپنی سواریاں دوڑا رہے ہیں۔ مگر کسی ایسی منزل کی طرف۔ جس کا ہمیں علم نہیں۔ یعنی پردہ غیب میں ہے اور ادھر ہم پر کھانے پینے کے ذریعے سحر کیا جاتا ہے۔ یعنی خوراک کھا کر ہم غافل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ جسم ہی تیز رفتاری سے سواریاں دوڑا رہے ہیں۔ جسم کی مشینری اتنی تیزی سے کام کر رہی ہے گویا ہزاروں میل کی رفتار سے چلنے والے ہوائی جہاز

---

[1] الکامل المبرد ص ۱۱۲ ج ۳ ۔ [2] تفسیر کبیر ص ۲۲۰ و ۲۲۱ ج ۳

سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے۔ لیکن یہ سب کچھ پردہ غیب میں ہے۔

اسی طرح ایک شخص یوں کہتا ہے۔

ؔ فَاِنْ تَسْئَلِيْنَا فِيْمَ نَحْنُ فَاِنَّنَا عَصَافِيْرُ مِنْ هٰذَا الْاَنَامِ الْمُسَحَّرِ

اگر تو ہم سے پوچھے کہ ہم کس حال میں ہیں ۔۔ تو میں کہوں گا کہ ہم تو سحر زدہ مخلوق میں سے چڑیوں کی مانند ہیں۔ جو کھانے پینے کے ذریعے اڑتے پھرتے رہتے ہیں۔

عربی زبان میں سُحُر کا ایک معنی پھیپھڑا بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی مخفی ہوتا ہے۔ نظر نہیں آتا۔ لہذا اس لحاظ سے بھی سحر میں اخفا کا معنیٰ پایا جاتا ہے۔

کیا ہاروت ماروت انسان تھے؟

بعض فرماتے ہیںؔ۔ کہ ہاروت ماروت فرشتے نہیں۔ بلکہ انسان تھے اور نیک آدمی تھے ان کے متعلق رَجُلَيْنِ صَالِحَيْنِ کے لفظ آتے ہیں۔ وہ بابل میں رہتے تھے۔ اور سحر کا علم جانتے تھے۔ تاہم جب وہ لوگوں کو یہ علم سکھاتے تھے۔ تو انہیں خبردار بھی کرتے تھے۔ کہ یہ علم اچھا نہیں ہے۔ اس سے بچ جاؤ تو بہتر ہے۔ ورنہ ایمان ضائع کر بیٹھو گے۔ کیونکہ سحر پر اعتقاد رکھنا اور اس پر عمل کرنا کفر میں داخل ہے۔ تاہم اس علم کے نزول میں کوئی خاص قباحت نہیں ہے۔ یہ ایک علم ہے۔

بعض کہتے ہیںؔ۔ کہ ہاروت ماروت مَلَكَيْنِ (فرشتے) نہیں۔ بلکہ مَلِكَيْنِ یعنی بادشاہ تھے۔ اور بڑی سلطنت کے مالک تھے۔ ان کے پاس یہ علم تھا۔ ان کا خیال یہ ہے۔ کہ مَلَكٌ کا اطلاق فرشتوں کے علاوہ نیک آدمیوں پر بھی ہوتا ہے جیسے سورۃ یوسف میں مَلَكٌ کا لفظ یوسف علیہ السلام کے لیے بھی بولا گیا ہے "اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ" وہ انسان نہیں بلکہ بزرگ فرشتہ ہے۔

کیا سارا جادو کفر ہے

امام ابومنصور ماتریدیؒ اور ابوالحسن اشعریؒ تیسری چوتھی صدی کے بلند پایہ امام گزرے ہیں۔ یہ امام اعظمؒ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ آپ بڑے متکلم ہیں اور علم کلام میں آپ کو بڑا مرتبہ حاصل ہے۔ امام ابومنصور ماتریدیؒ فرماتے ہیں۔ کہ سحر کو مطلقاً کفر کہنا درست نہیں۔ کیونکہ اسکی

ؔ تفسیر کبیر ص ۲۱۸ ج ۳ ؔ تفسیر کبیر ص ۲۱۸ ج ۳

بعض قسمیں کفر ہیں۔ بعض فسق اور بعض بدعت۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ بھی اپنی تفسیر بیان القرآن میں فرماتے ہیں[1]۔ کہ سحر اُسی صورت میں کفر ہے جب کہ اس میں کفریہ یا شرکیہ کلمات پائے جائیں مثلاً استعانت بالشیاطین ہو یا مافوق الاسباب ذرائع سے مدد طلب کی جائے۔ تو ایسا سحر کفر ہوگا۔ کیونکہ غائبانہ استعانت صرف اللہ تعالیٰ سے رواہے۔ کسی دوسرے سے طلب نہیں کی جاسکتی۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کا یہی مطلب ہے کہ مافوق الاسباب اعانت اُسی ذاتِ خداوندی سے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ایسی استعانت خواہ شیاطین سے ہو، کواکب سے ہو۔ اصنام یا بتوں سے مطلوب ہو۔ سب شرک میں داخل ہے۔ ارواح خبیثہ کی تعظیم غیر اللہ کے نام کی نذر ماننا یا غیر اللہ کے نام پہ ذبح کرنا۔ یہ بھی کفر و شرک میں داخل ہے۔ اگر ایسا کرے گا، تو یقیناً کفر کا مرتکب ہوگا۔

اگر سحر میں پڑھے جانے والے کلمات شرکیہ نہ ہوں بلکہ مباح یا جائز کلام ہو۔ تو پھر اس کی حیثیت مختلف ہوگی۔ اگر اس سحر کے ذریعے کوئی خلاف شرع کام مطلوب ہے۔ کسی کی ایذا رسانی مقصود ہے۔ تو ایسی صورت میں یہ سحر فسق اور معصیت ہوگا۔ اور اگر سحر کے کلمات بھی مباح ہیں۔ شرکیہ نہیں ہیں، اور اس سے غرض بھی فاسد نہیں ہے۔ خلاف شرع نہیں ہے۔ تو اس صورت میں سحر تو بہر حال ناجائز ہوگا۔ مگر اسے زیادہ سے زیادہ بدعت کا درجہ دے سکتے ہیں۔ اُسے یہ کام نہیں کرنا چاہیئے۔ تاہم یہ کفر و شرک کے زمرہ میں نہیں آئے گا اور اگر کلمات مباح ہیں۔ ایذا رسانی بھی مقصود نہیں اور مطلوبہ کام بھی جائز ہے تو اس کو سحر نہیں کہیں گے۔ بلکہ اس کو عام اصطلاح میں عملیات اور عزیمت کہتے ہیں۔ جھاڑ پھونک، گنڈا تعویذ وغیرہ اسی ضمن میں آتے ہیں۔

جادوگر کی سزا

فقہاء اور محدثین کرام فرماتے ہیں[2]۔ کہ اگر جادو کے نتیجے میں کسی کی جان ضائع ہو جائے تو اس کے بدلے میں ساحر کو قتل کر دینا چاہیئے۔ اگر سحر کی وجہ سے جان بچ گئی ہے۔ کوئی دوسرا نقصان ہوا ہے۔ تو نقصان کی مناسبت سے ساحر کو تعزیری سزا دی جائے گی۔

---

[1] بیان القرآن ج۱ ص۵۵ مطبوعہ مجتبائی دہلی [2] احکام القرآن للجصاصؒ ج۱ ص۱۵ کوکب الدری ج۲ ص۵

ساحر کو پکڑنا مشکل کام ہے۔ کیونکہ جب تک مکمل ثبوت نہ ہو کسی پر جادو کرنے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ تاہم اگر ایسا ممکن ہو یا ساحر خود اقرار کرلے تو پھر مذکورہ سزا کا مستوجب ہوگا۔ بشرطیکہ حکومت بھی اسلامی ہو۔

امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق اگر ساحرہ عورت ہو تو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔[1] بالکل اسی طرح جس طرح مرتدہ عورت کو قتل کی سزا نہیں دی جاتی۔ بلکہ اُسے قید میں رکھا جاتا ہے اسی طرح ساحرہ کو بھی قید کردیا جائے گا۔ البتہ بعض ائمہ عورت کو بھی قتل کرنے کے حق میں ہیں۔ اگر انسانی جان کے تلف سے کم تر نقصان ہوا ہے۔ یعنی محض ایذاء رسانی کا ارتکاب ہوا ہے۔ تو ساحر کو وہی سزا دی جائے گی۔ جو ڈکیتی کے مقدمہ میں دی جاتی ہے۔ قرآن پاک نے ڈاکو کے لیے چار قسم کی سزائیں مقرر کی ہیں۔ یعنی سولی پر لٹکانا، قتل کرنا، الٹے سیدھے ہاتھ اور پاؤں کاٹنا، اور حبس یعنی قید میں ڈال دینا۔ لہٰذا ساحر کو بھی اُس کے جرم کے مطابق اسی قسم کی سزا دی جائے گی۔

میاں بیوی میں جدائی

بہرحال اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَا اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ وہ دو فرشتے ہاروت اور ماروت جب کسی انسان کو جادو کا علم سکھاتے تھے۔ تو اُسے واضح کردیتے تھے۔ کہ ہم تو آزمائش ہیں، تم یہ کفر نہ کرو۔ اگر ایسا کروگے تو ایمان ضائع کر بیٹھوگے۔ مگر اس کے باوجود لوگ اُن سے جادو کا علم سیکھتے تھے۔ جن میں اہل کتاب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا اور وہ ان فرشتوں سے ایسی چیزیں سیکھتے تھے مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ جن کے ذریعے وہ میاں بیوی میں جدائی ڈال دیتے تھے۔ یہ ایسا بُرا عمل ہے۔ جس پر شیطان بہت زیادہ خوش ہوتا ہے۔[2] اور جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے۔ تاہم سحر بھی ایک فن ہے۔ جس طرح دیگر فنون ہیں جیسے سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ وغیرہ وغیرہ۔

نافع اور ضار علم

فرمایا اگرچہ جادو ایذا رسانی کا ذریعہ ہے۔ مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے۔ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ایسا عمل کرنے والے ساحر

---

[1] احکام القرآن للجصاص ص۵۰ ج۱ [2] مسلم ص۳۷۶ ج۲

اللہ تعالیٰ کی مشیّت کے بغیر از خود کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ تاہم جادو کرنا، اس پر یقین رکھنا۔ چونکہ قباحت سے خالی نہیں۔ یہ مضر ہے۔ مفید نہیں۔ اس لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا ہے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُبِکَ مِنۡ عِلۡمٍ لَا یَنۡفَعُ اے اللہ! میں ایسے علم سے پناہ مانگتا ہوں۔ جو نفع مند نہ ہو۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔ عَلِّمۡنِیۡ مَا یَنۡفَعُنِیۡ اے اللہ! مجھے وہ علم عطا کر جو نفع بخش ہو۔ دنیا میں بھی اس سے فائدہ اٹھاؤں اور آخرت میں بھی فائدہ مند ہو۔ اسی بات کو فرمایا وَیَتَعَلَّمُوۡنَ مَا یَضُرُّھُمۡ وَلَا یَنۡفَعُھُمۡ ط یہ لوگ ایسا ہی علم سیکھتے ہیں۔ جو نفع کی بجائے انہیں نقصان پہنچاتا ہے۔

فرمایا وَلَقَدۡ عَلِمُوۡا لَمَنِ اشۡتَرٰہُ مَا لَہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنۡ خَلَاقٍ قف یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ انہوں نے اس علم کے ذریعے کیا خریدا ہے۔ یہ لوگ یاد رکھیں کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے۔ کہ آخرت میں ساحر کو اس علم کا کیا فائدہ ہوگا وہ تو الٹا عذاب میں مبتلا ہوگا۔ خاص طور پر اگر اس نے ایسا جادو کیا ہے۔ جس میں کفر و شرک پایا جاتا ہے۔ تو وہ یقیناً آخرت سے محروم رہے گا۔ آگے فرمایا وَلَبِئۡسَ مَا شَرَوۡا بِہٖۤ اَنۡفُسَھُمۡ ط انہوں نے بہت ہی بری چیز کے بدلے میں اپنی جانوں کو بیچا ہے۔ ان کا یہ سودا بہت ہی خسارے کا سودا ہے۔ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ اگر ان میں کچھ بھی سمجھ ہوتی تو ایسا کام نہ کرتے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہودیوں کی بداعمالیوں کا ذکر فرمایا ہے مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ اس وقت امتِ محمدیہ کا حال بھی اُن سے زیادہ مختلف نہیں ہے جب لوگ اللہ تعالیٰ کے دین سے غافل ہو جائیں۔ جہاد فی سبیل اللہ کو ترک کر دیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تہی دامن ہو جائیں۔ تو پھر پستی کی طرف ہی جانا ہوگا۔ آج انڈو پاک میں دیکھ لیں۔ دیگر ممالک پر نظر ڈال لیں۔ ہر طرف گندگی پھیلی ہوئی ہے۔ کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور دین کے لیے سعی و جہد کو ترک کر دیا گیا ہے۔ دین کا دار و مدار

۱؎ نسائی ص ۳۲۱ ج ۲

عملیات پر رہ گیا ہے۔ اس کام کے لیے یہ عمل کر لو۔ اُس کام کے لیے وہ وظیفہ کافی ہے علم وعمل ختم ہو چکا ہے۔ علمائے حق کا ایک مدھم سا دیا ٹمٹما رہا ہے۔ ورنہ ساری دنیا کفر و ضلالت کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی ہے۔

اہل کتاب کی طرح ہماری امت میں بھی حق و باطل خلط ملط ہو چکا ہے۔ صحیح اور غلط کی پہچان ایک عام شخص کے لیے مشکل ہو چکی ہے۔ دیہات میں حالات اور بھی خراب ہیں جہاں کے امام کے فرائض میں نماز پڑھانا بھی ہے۔ اور مُردے کو غسل دینا بھی، بچے کی پیدائش پر کان میں اذان بھی وہی کہتا ہے۔ عقیقہ کے لیے جانور ذبح کرنا ہو۔ تو امام صاحب کو بلایا جاتا ہے۔ اور اگر تعویذ گنڈے کی ضرورت پڑ جائے تو بھی میاں صاحب دیں گے۔ ان کا علم خطبہ جمعہ بھی تعارفی مسائل تک ہوتا ہے۔ دین کے علم سے بیچارے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ غرض یہ حالت یہودیت سے مشابہت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[ل] کہ میری امت بھی پہلے لوگوں کے نقش قدم پر بالکل اسی طرح چلے گی۔ جس طرح ایک جوتا دوسرے کے مشابہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

بعض علاقوں میں چار چار گاؤں کا ایک ہی امام ہے۔ بلکہ ہم نے خود سفر میں ملاحظہ کیا۔ کہ ایک علاقہ میں چھ سات گاؤں کا ایک ہی امام تھا۔ کہیں نکاح کرنا ہو۔ جنازہ پڑھانا ہو۔ وہی مولوی صاحب انجام دیں گے۔ تعویذ گنڈے کا کاروبار چل رہا ہے۔ نقش سلیمانی والی کتابیں ہیں۔ لکھنو والے کی کتاب نافع الخلائق ہے۔ یا تعویذ گنڈے والی دہلوی کی کتاب۔ فاناً مرہے۔ کسی مسئلہ کا حل مطلوب ہو۔ کتاب کھول کر معلوم کر لو۔ حتیٰ کہ چوری تک کی تفتیش عملیات کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہ کالا علم جھاڑ پھونک وغیرہ سفلی عملیات ہیں۔ یہی چیزیں یہودیوں میں رائج تھیں اور آج ہم میں بھی یہی پائی جاتی ہیں۔ بعض صحیح وظائف بھی ہیں۔ جیسے سورۃ یٰسین کا ورد ہے۔ سورہ مزمل کی روزانہ تلاوت ہے۔ رزق کی فراوانی، کسی جائز چیز کے حصول۔ یا کسی مصیبت سے رہائی کے لیے کسی کو کوئی اچھی بات بتا دی۔ مگر عام طور پر یہ گنڈے تعویذ یہودیوں والے ہیں۔ ذرا گھوم پھر کے دیکھ لیں۔ ماہرین عملیات کے ہاں عورتوں کی بھرمار ہے کوئی نہیں دیکھتا کہ مقصد جائز ہے، یا ناجائز، کفر ہے یا شرک، سب ایک ہی گاڑی ہیں

ل بخاری ج۲ صفحہ ۱۰۸۸ مسلم ج۲ ص ۳۳۹، ترمذی ص ۳۷۹

سوار چلے جاتے ہیں۔ یہی یہودیت کی موافقت ہے۔
اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا اگر یہ لوگ جادو کا کاروبار چلانے کی بجائے ایمان لاتے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے۔ شرک و بدعات سے اجتناب کرتے لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ تو وہ اللہ تعالیٰ کے بہتر اجر و ثواب کے مستحق ہوتے۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ اگر انہیں علم ہوتا۔

درس چہل و دو ۴۲ (آیت ۱۰۴ تا ۱۰۷)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ط
وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ
الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِیْنَ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ خَیْرٍ مِّنْ
رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِیْمِ ﴿۱۰۵﴾ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ
اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۰۶﴾
اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۱۰۷﴾

ترجمہ: اے ایمان والو امت راعنا بلکہ کہو انظرنا اور سنو اور کفر کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۱۰۴﴾ اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنہوں نے کفر کیا، وہ نہیں پسند کرتے، کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی اتاری جائے۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے، اپنی رحمت کے ساتھ خاص کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے ﴿۱۰۵﴾ جو ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو ہم اس سے بہتر یا اُس جیسی لے آتے ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ﴿۱۰۶﴾ کیا آپ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور تمہارے لیے اس کے سوا نہ کوئی حمایتی ہے اور نہ مددگار ﴿۱۰۷﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں بنی اسرائیل کی پستی اور انحطاط کا ذکر تھا۔ کہ انہوں نے اللہ تعالےٰ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا، دین کی سربلندی کے کام کو ترک کر دیا۔ جہاد سے منہ موڑ گئے اور سحر جادو ٹونے ٹوٹکے جیسے سفلی اعمال کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ لیا۔ انہوں نے ان برائیوں

خاص طور پر سحر کو انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب کیا۔ جو کہ ان کی ذلت کا انتہائی درجہ تھا۔

بنی اسرائیل کی اخلاقی پستی

ان آیات میں اللہ جل شانہ نے بنی اسرائیل کی اخلاقی پستی کا ذکر فرمایا ہے جس کے ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء علیہم السلام کو ذہنی تکلیف پہنچاتے تھے۔ یہودیوں نے اپنی اس ذلیل حرکت کا ارتکاب نہ صرف سابقہ انبیاء علیہم السلام کے زمانے میں کیا۔ بلکہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں بھی اس حرکت سے باز نہ آئے۔ اور آپ کو مختلف طریقوں سے ایذا پہنچائی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اس حرکت کا تذکرہ کر کے اہل اسلام کو خبردار کیا۔ کہ وہ کبھی کوئی ایسی بات نہ کہیں جس سے معاذ اللہ نبی علیہ السلام کی توہین کا پہلو نکلتا ہو۔

اس مقام پر جس خاص بات کی طرف اشارہ ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جب یہودی آپ کی مجلس میں آتے تھے۔ تو آپ کی توجہ مبذول کرانے کے لیے رَاعِنَا کا لفظ استعمال کرتے تھے جو کہ اُنْظُرْنَا کا ہم معنیٰ ہے مطلب یہ ہے کہ آپ ہماری رعایت کریں یعنی ہماری طرف توجہ فرمائیں۔ اُنْظُرْنَا کا معنیٰ بھی یہی ہے آپ ہماری طرف ذرا دیکھیں، نظر کریں۔ ہماری بات غور سے سنیں۔ بظاہر دونوں الفاظ کا معنیٰ ایک ہی ہے۔ مگر یہودی اپنی گندی ذہنیت کے اظہار کے لیے رَاعِنَا کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ اور پھر اس لفظ کو کھینچ کر اور گھما کر "رَاعِیْنَا" بولتے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ لَیًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ زبان میں ہیر پھیر کر کے لفظ ادا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے رَاعِیْنَا کہتے۔ یعنی ہمارا چرواہا۔ مزید برآں یہودیوں کی زبان میں یہ لفظ گالی کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ جس کا معنیٰ احمق اور بیوقوف ہے۔ گویا اس طرح یہ لوگ اپنی گندی ذہنیت کا اظہار کرتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر التفات

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خبردار کیا۔ کہ تم اہل کتاب کی پیروی نہ کرنا۔ ارشاد ہوتا ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا اے ایمان والو! جب تم نبی علیہ السلام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا چاہو۔ تو رَاعِنَا کا لفظ استعمال نہ کرو کیونکہ اس سے نعوذ باللہ نبی علیہ السلام

ف تفسیر ابن کثیر ص ۱۴۸ ج ۱، تفسیر طبری ص ۳۷۲ ج ۱

کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ اور نبی کی توہین کفر کے مترادف ہے۔

سورۃ مجادلہ میں یہودیوں کی ایک اور قبیح حرکت کا بھی ذکر آتا ہے جب یہ بدبخت حضور علیہ السلام کی مجلس میں آتے تھے تو السلام علیکم کی بجائے السَّامُ علیکم کہتے تھے۔ سام کا معنی موت یا ہلاکت ہے گویا السلام کا لفظ بگاڑ کر السام کہتے تھے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب یہودی سلام کہیں ان کے سلام کا جواب وعلیکم السَّلام کی بجائے صرف علیکم دیا کرو۔ جس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ جو کچھ تم نے کہا۔ وہ تم پر ہی ہو۔ یعنی اگر السلام کی بجائے السام بولا جائے۔ تو یہ ہلاکت تمہیں نصیب ہو۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اسی حرکت کے متعلق فرمایا "حَیَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ" یہ لوگ آپ کو ایسی دعا دیتے ہیں۔ جو اللہ تعالےٰ نے نہیں دی۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو متنبہ فرمایا کہ حضور علیہ السلام کے لیے کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کریں۔ جس سے آپ کی شانِ اقدس میں فرق آنے کا احتمال ہو۔ وَقُوْلُوْا انْظُرْنَا اور رَاعِنَا کی بجائے اُنْظُرْنَا کہو۔ یعنی ہماری طرف نظر کرم فرمائیں۔

اہل ایمان کو خطاب

سورۃ بقرہ میں یہ پہلا موقع ہے۔ جس میں اہل ایمان کو خطاب کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے عام لوگوں کو خطاب ہوتا رہا ہے۔ جیسے "یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ" اے نوع انسان! اپنے رب کی عبادت کرو۔ یا بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا "یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ" یعنی اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی۔ اب یہاں سے اہلِ ایمان سے خطاب ہو رہا ہے۔ اور پورے قرآن پاک میں اٹھاسی[۸۸] مرتبہ اہل ایمان کو خطاب کیا گیا ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی[۲] فرماتے ہیں کہ سابقہ کتب سماویہ میں اہل ایمان سے براہِ راست خطاب نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ انبیاء علیہم السلام سے خطاب ہوتا تھا۔ جو آگے اپنی اپنی امت تک احکام الٰہی کو پہنچاتے تھے۔ یہ صرف آخری امت کو شرف حاصل ہوا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اہلِ ایمان کو خطاب کیا ہے۔

۱ے مسلم ص ۲۱۳ ج ۲، ترمذی ص ۳۸۶

۲ے تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۸۷ پارہ ۱

زوائد مسند احمد میں یہ روایت ہے۔ اور امام بیہقیؒ نے اسے شعب الایمان میں بھی بیان کیا ہے[1]
کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ حضور! مجھے کوئی نصیحت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا۔ اے عبداللہ! جب تم قرآن میں یہ خطاب پڑھو "یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" تو پورے دل کے ساتھ متوجہ ہوجایا کرو۔ یہ سمجھ لیا کرو کہ اللہ تعالیٰ تم سے براہِ راست خطاب فرما رہے ہیں۔ اس سے بڑی نصیحت اور وصیت کیا ہوسکتی ہے۔ مقصد یہ تھا۔ کہ یہ ایسی اعلیٰ چیز ہے۔ کہ پوری توجہ کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو کر سنا کرو کہ اللہ تعالیٰ کیا حکم فرما رہے ہیں۔ کس چیز کے کرنے کا حکم ہے۔ اور کس چیز سے رُک جانے کی بات ہے۔

الغرض! اس خطاب میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام کی توجہ مبذول کرانے کے لیے رَاعِنَا کا لفظ استعمال نہ کرو بلکہ اُنْظُرْنَا سے خطاب کیا کرو۔ اس خطاب میں امر اور نہی دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تاکیداً فرمایا وَاسْمَعُوْا یعنی جو حکم ہو رہا ہے۔ اُسے خوب غور سے سنو۔ کیونکہ یہ ایک بڑا اہم حکم ہے۔

مشتبہ الفاظ کے استعمال کی ممانعت

حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے[2]۔ کہ عام گفتگو میں مشتبہ الفاظ استعمال نہ کرو۔ کوئی شخص اپنے غلام یا لونڈی کو عَبْدِیْ اور اَمَتِیْ کہہ کر نہ پکارے۔ لفظ عبد سے شبہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ پکارنے والا شاید اپنے آپ کو معبود سمجھ رہا ہے۔ حالانکہ معبود تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے عبد کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔ مگر معاملہ بالکل واضح ہونا چاہیئے۔ کسی قسم کا شبہ نہیں رہنا چاہیئے۔ اسی طرح لونڈی کو بندی کہہ کر پکارنے کی بجائے لونڈی کہہ کر پکارو۔ غلام اور لونڈی کو فَتَایَ اور فَتَاۃَ کہہ کر بھی بلایا جا سکتا ہے۔ یعنی اے جوان یا اے لونڈی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ عبد کا لفظ اس لیے مناسب نہیں کہ کُلُّکُمْ عَبِیْدُ اللّٰہِ کہ تم اللہ تعالیٰ کے بندے ہو۔ اسی طرح ساری عورتیں اللہ تعالیٰ کی بندیاں ہیں۔ یہ کسی انسان کے بندے یا بندیاں نہیں ہیں۔

لفظ مولیٰ بھی مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کو بلاتخصیص ہر جگہ استعمال کرنا اشتباہ پیدا کر سکتا ہے۔ مولیٰ کے کئی معنے ہیں جیسے دوست، صاحب، آقا، غلام، غلام

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۱۴۸/۱۴۰، تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۸ پارہ ۱ [2] مسلم ص ۲۳۸ پارہ ۲

آزاد کرنے والا وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سمجھائی۔ کہ اس لفظ کو غلط طور مت استعمال کرو۔ جس سے شبہ پیدا ہوتا ہو۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے[1]۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ لَا تَقُولُوا لِلْعِنَبِ الْكَرْمَ یعنی انگور کو کرم مت کہو بلکہ عنب کہو۔ یا حبلہ کہہ سکتے ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ کرم تو مومن کا دل ہے۔ جس میں ایمان پایا جاتا ہے۔ اور جس میں اخلاقِ حسنہ ہوتے ہیں۔ ایسی چیز کو انگور کے معنوں میں استعمال کرنا درست نہیں۔ انگور سے عام طور پر شراب تیار کی جاتی ہے۔ جب لوگ شراب کی تعریف کرتے ہیں۔ تو اس میں جب کرم کا نام آتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ شراب کرم یعنی بخشش اور فیاضی سے کشید کی گئی ہے۔ گویا اس لفظ سے بالواسطہ شراب کی تعریف ہوتی ہے۔ لہذا انگور کے لیے کرم کا لفظ استعمال کرنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لفظ لیڈر کا استعمال درست نہیں

لیڈر کا لفظ انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ جس کا معنی راہنمائی کرنے والا ہے۔ بلاشبہ پیغمبر بھی امت کی راہنمائی کرتا ہے۔ مگر یہ ایک ایسا لفظ ہے۔ جو ہر قسم کے راہنما کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عام طور پر اس کا اطلاق سیاسی لوگوں پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ اخلاقی اقدار اور دیانتداری سے بے بہرہ ہوں اور خواہ ان کی فکر بھی فاسد ہو۔ اہل اسلام میں سے ہوں یا غیر مسلم۔ متقی ہوں یا فاسق فاجر یہ لفظ سب کے یکساں طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور بین الاقوامی طور پر یہ لفظ چرچل، برزنیف ڈیگال، ریگن وغیرہ قسم کے لوگوں پر بولا جاتا ہے۔ لہذا اس قسم کا مشتبہ لفظ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ہرگز شایانِ شان نہیں۔ ہمارے زمانے کے بعض مفسرین نے اپنی تصانیف میں یہ لفظ حضور علیہ السلام کے لیے استعمال کیا ہے۔ جو قطعاً نامناسب ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مشتبہ لفظ کسی عام چیز کے لیے بھی استعمال نہ کیا جائے چہ جائیکہ خود حضور والا صفات علیہ السلام کی ذات اقدس کے لیے ایسا لفظ بولا جائے۔ پیغمبر کے لیے انگریزی کے متبادل الفاظ میسنجر MESSENGER یا پرافٹ (PROPHIT) وغیرہ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

الغرض فرمایا کہ نبی علیہ السلام کی ذات کے متعلق کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کرو جو آپ کی شان کے خلاف ہو۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو یاد رکھو وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ کلمہ کفر کہنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

---

[1] مسلم صفحہ ۲۳۸ ج ۲

بنو اسماعیل سے حسد

فرمایا مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِکِیْنَ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ کفار اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے، وہ نہیں پسند کرتے۔ کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بہتری کی چیز اتاری جائے۔ مشرکین مکہ میں ابوجہل، ابولہب، عقبہ اور شیبہ جیسے بڑے بڑے سردار تھے۔ وہ حضور علیہ السلام سے حسد کرتے تھے۔ کہ اگر وہ آپ کو نبی تسلیم کر لیتے تو ان کی سرداری حضور علیہ السلام کو منتقل ہو جاتی تھی۔ اور وہ بزعم خویش ناچیز ہو کر رہ جاتے تھے۔ دوسری طرف اہل کتاب تھے۔ جو امید لگائے بیٹھے تھے کہ نبی آخر الزمان بنی اسرائیل میں آئے گا۔ جب آخری نبی ہونے کا دعویٰ بنو اسماعیل کے قبیلہ قریش میں سے ہوا۔ تو وہ بھی حسد کی آگ میں جلنے لگے لہٰذا انہوں نے آپ کو اللہ تعالیٰ کا آخری نبی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی رکوع میں آگے آئے گا "حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِھِمْ" انہوں نے حسد کیا اور ایمان کی دولت سے محروم رہے اسی لیے فرمایا کہ اہل کتاب اور مشرکین نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ کا قرآن پاک آپ پر نازل ہو۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ کہ یہاں پہ تمہاری خواہشات اور توقعات کی بات نہیں بلکہ وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کیلئے خاص کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے اس نے یہ پسند کیا ہے کہ اپنی رحمت خاصہ بنو اسماعیل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس پہ نازل فرمائے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ بنو اسحاق پہ بے شمار رحمتیں نازل کر چکا ہے۔ اس قوم میں بڑے بڑے بادشاہ اور جلیل القدر رسول بھیجے "اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا" کا تفصیلی تذکرہ کسی گذشتہ درس میں گذر چکا ہے[1]۔ اس قوم میں اللہ تعالیٰ نے ہزاروں نبی مبعوث فرمائے۔ اور کتنوں کو بادشاہت بھی عنایت کی۔ ایسی حکومت اور بادشاہت یہود نیا میں کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ تو اب کیا اللہ تعالیٰ نے کوئی وعدہ کر رکھا ہے۔ کہ نبوت بنو اسحاق سے باہر نہیں جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی مشیّت اسی میں ہے کہ سلسلۂ نبوت

---

[1] درس ۱۹ احد ۱۸۷

کو بنو اسماعیل پر ختم کرنا تھا۔ لہٰذا اس میں بنو اسحٰق کے لیے حسد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

تنسیخ آیات کی وجوہات

بنی اسرائیل اور مشرکین کا ایک اعتراض یہ تھا۔ کہ جب قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ پہلی کتابوں کا مصدق بھی ہے۔ تو پھر یہ سابقہ کتُب کے احکام کو منسوخ کر کے نئی شریعت کیوں نافذ کرتا ہے۔ نیز اپنے ہی احکام کو بعض اوقات تبدیل کر دیتا ہے۔ بقول ان کے اس کا مطلب تو یہ ہے۔ کہ معاذ اللہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کو معاملے کا پوری طرح علم نہیں ہوتا تو حکم جاری کر دیتا ہے۔ مگر جب اس کا پوری طرح علم ہو جاتا ہے۔ تو حکم میں ترمیم کر دیتا ہے۔

دیانند سرسوتی ہندوؤں کی آریہ سماج تنظیم کا مشہور لیڈر ہوا ہے۔ اپنی نوعیت کا شرارت پسند آدمی تھا۔ یہی اعتراض —— اُس نے اپنی کتاب میں بھی کیا تھا کہ کسی اپنے ہی حکم کو منسوخ کر دینا جہالت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا جواب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دیا تھا[1] کہ احکام کی تنسیخ جہالت کی بنا پر نہیں بلکہ حکمت کی بنا پر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ہے۔ اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر حکم حالات کے تقاضوں کے مطابق جاری ہوتا ہے۔ جب حالات متقاضی ہوتے ہیں۔ تو پہلا حکم منسوخ کر کے دوسرا جاری کر دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال اس طرح بیان کی جا سکتی ہے۔ کہ ڈاکٹر یا حکیم کسی مریض کو صبح کے لیے اور دوا دیتا ہے اور شام کے لیے دوسری۔ یا ایک ہفتہ ایک دوا استعمال کراتا ہے تو دوسرے ہفتے کے لیے کوئی اور تجویز کرتا ہے۔ کیا ڈاکٹر بیوقوف ہے یا جاہل، جو مختلف اوقات کے لیے مختلف دوا تجویز کرتا ہے۔ بلکہ ڈاکٹر مریض کے حالات کے مطابق دوا کو منسوخ کر دیتا ہے یا تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی کسی قوم کے حالات کے تقاضے کے مطابق احکام نازل فرماتے ہیں۔ جیسا کہ ضرورت ہوتی ہے۔ بعض احکام کو تبدیل کر دیتے ہیں یا اپنی حکمت کی بنا پر احکام میں ترمیم کرتے ہیں۔ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو کہ تمام اقوام کے لیے یکساں طور پر نافذ العمل ہے۔ لہٰذا اس نے

---

[1] انتصار الاسلام

پہلے شرائع کو منسوخ کر کے ابدی احکام نافذ کر دیے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ دین تو ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ یہ کبھی منسوخ نہیں ہوا۔ البتہ مختلف شرائع میں بعض اختلافات رونما ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً کسی شریعت میں اونٹ کا گوشت حرام تھا۔ ہماری شریعت میں حلال ہے ____________

____________ کسی شریعت میں دو سگی بہنیں ایک نکاح میں آسکتی تھیں ہمارے ہاں حرام ہے "اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ" البتہ دین کے بنیادی اصول کبھی منسوخ نہیں ہوئے۔

تنسیخ آیات کو ایک دوسری مثال سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ کہ تکوینی امور میں جوں جوں حالات بدلتے ہیں۔ احکام بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جب انسان بچہ ہوتا ہے۔ تو اس کی ضروریات اس کی عمر اور اس کے حالات کے مطابق ہوتی ہیں۔ جب جوان ہوتا ہے۔ تو اس پہ دوسرے احکام نافذ ہوتے ہیں۔ پھر جب بوڑھا ہو جاتا ہے۔ تو حالات کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام بھی اقوامِ عالم کے حالات کے تقاضوں کے مطابق تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ یہ ایسی اعتراض والی بات نہیں ہے۔

الغرض ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِهَا ہم کسی آیت کو منسوخ نہیں کرتے یا اُسے نہیں بھلاتے۔ نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ مگر ہم اس سے بہتر آیت یا حکم لے آتے ہیں اَوْ مِثْلِهَا یا کم از کم اُس جیسا ہی لے آتے ہیں۔ نیا حکم بہر حال پہلے سے بہتر ہوتا ہے، کمتر نہیں ہوتا۔ بہتر سے مراد یہ ہے کہ نیا حکم پہلے کی بنسبت اجر میں بہتر ہوتا ہے۔ آیت یا حکم بھلانے کا مطلب یہ ہے کہ نبی کے ذہن سے ایسی آیت فراموش کر دی جائے آیات کا یاد کرانا یا بھلانا اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت میں ہے۔ سورۃ اعلیٰ میں فرمایا سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ہم عنقریب آپ کو اس طرح پڑھائیں گے کہ آپ بھولیں گے نہیں اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ہاں جس کو اللہ بھلانا چاہیں۔ وہ آپ بھول جائیں گے یہاں یہ بھی نُنْسِهَا کا مطلب یہی ہے کہ جس حکم کو تبدیل کرنا مقصود ہوتا ہے اُسے کلیتہً منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ یا اُسے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد اول باب الحاجۃ الی دین ینسخ الادیان

پیغمبر علیہ السلام کے ذہن سے محو کر دیا جاتا ہے۔ فرمایا اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنی حکمت اور منشار کے مطابق آیات نازل کرتا ہے۔ بعض کو قائم رکھتا ہے۔ اور بعض کو منسوخ کر دیتا ہے پھر اُن سے بہتر یا اُن جیسی اور لے آتا ہے۔ ایسا کرنا عقل و نقل کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ اس پر اعتراض کرنا حماقت کی نشانی ہے۔

پھر فرمایا اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اے مخاطب! کیا تم جانتے نہیں کہ زمین و آسمان کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے۔ جب وہ مالک الملک ہے۔ تو کیا اُسے یہ اختیار حاصل نہیں کہ کسی حکم کو منسوخ کر دے یا تبدیل کر دے۔ معاذ اللہ کیا وہ مجبور ہے کہ ہر حالت میں ایک ہی حکم کو جاری رکھے۔ اگر ایسا تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کی حاکمیت کو ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا وہ تنسیخ احکام پر پوری طرح قادر ہے۔ اور یہ اس کا حق بھی ہے۔ بادشاہی اللہ تعالیٰ کی ہے

فرمایا یاد رکھو! کہیں بھٹک نہ جانا وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ اس کے سوا تمہارا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں ہے۔ ولی کا معنی عام طور پر سرپرست ہوتا ہے۔ امام بیضاوی رح[1] فرماتے ہیں۔ کہ بعض اوقات سرپرست کمزور بھی ہوتا ہے۔ جو کہ مدد کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ مگر نصیر وہ ہوتا ہے۔ جو فی الواقع مدد کے قابل ہو۔ دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں۔ کہ ولی وہ ہوتا ہے جو زبانی طور پر مدد کرتا ہے۔ اور نصیر وہ ہے جو عملی طور پر مددگار ثابت ہو۔ گویا اللہ تعالیٰ ان دونوں صفات کا مالک ہے۔ وہ اپنی مخلوق کا ہر طرح مددگار ہے۔ وہ قادر مطلق بھی ہے اور علیم کل بھی ہے۔ جو نسا حکم چاہے نافذ کر دے اور جسے چاہے منسوخ کر دے اس کے ارادہ اور قدرت میں کوئی دوسرا مخل نہیں ہو سکتا۔ وہ خود ہی احکام جاری کرتا ہے۔ اور اپنی ہی مشیت سے بعض کو منسوخ کر دیتا ہے۔ اس پر اعتراض نامناسب ہے۔

---

[1] تفسیر بیضاوی صد ۱۲۰/۲

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ
وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ
(۱۰۸) وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ
مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۰۹) وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ
وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۱۱۰)

ترجمہ:۔ کیا تم یہ ارادہ کرتے ہو کہ اپنے رسُول سے اسی طرح سوال کرو۔ جس طرح اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا گیا۔ اور جو شخص ایمان کے بدلے میں کفر اختیار کرے گا، وہ سیدھے راستے سے گمراہ ہو گیا (۱۰۸) اہل کتاب میں سے بہت سے پسند کرتے ہیں۔ کہ مومن ہونے کے بعد تمہیں کفر کی طرف پلٹا دیں۔ اپنے نفسوں میں حسد کرتے ہوئے۔ بعد اس کے کہ اُن کے لیے حق ظاہر ہو گیا ہے۔ پس درگزر کرو، اور معاف کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لائے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے (۱۰۹) اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ اور بھلائی میں سے جو کچھ تم اپنے نفسوں کے لیے آگے بھیجو گے۔ اس کو اللہ کے پاس پالو گے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر کام کو دیکھنے والا ہے۔ (۱۱۰)

ربط آیات

بنی اسرائیل کی خرابیوں کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو "رَاعِنَا" کا لفظ استعمال کرنے سے منع فرمایا تھا۔ اس کی بجائے "اُنْظُرْنَا" استعمال کرنے کا حکم دیا تھا۔ کیونکہ یہودی دیدہ دانستہ "رَاعِنَا" کا لفظ بولتے تھے۔ جس سے

معاذ اللہ پیغمبر علیہ السلام کی توہین کا پہلو نکلتا تھا۔ گذشتہ درس میں اس بات کا انکشاف بھی کیا گیا تھا کہ اہل کتاب اور مشرکین میں سے کوئی نہیں چاہتا کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان پر کوئی بہتر چیز نازل فرمائے۔ یہ لوگ نبی کے ساتھ حسد کرتے تھے۔ پھر انہوں نے نسخ آیات کا مسئلہ بھی اٹھایا کہ اللہ تعالیٰ ایک حکم جاری کرنے کے بعد اُسے منسوخ کیوں کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ ایسا کسی لاعلمی یا جہالت کی بنا پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ جس طریقے پر نوعِ انسانی کی بھلائی چاہتا ہے۔ اس کے مطابق شریعت نازل فرماتا ہے۔ اسکی مثال ایسے ہی ہے۔ جیسے ایک ڈاکٹر کسی مریض کو مختلف اوقات میں مختلف دوائیں دیتا ہے۔ کسی کو منسوخ کر دیتا ہے۔ کسی کو تبدیل کرتا ہے اور کسی کو جاری رکھتا ہے۔ یہ مریض کے حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی لوگوں کے حالات کے مطابق شریعت میں ردّ و بدل فرماتے ہیں۔ وہ مالک الملک جس طرح چاہتا ہے حکم نازل فرماتا ہے۔ اس کے کسی حکم پر اعتراض کرنا اس کے قادرِ مطلق ہونے پر اعتراض کرنے کے مترادف ہے۔

یہودیوں کے سوالات

ان آیات میں یہودیوں کو تنبیہ کی گئی ہے۔ کہ تم نبی آخر الزمان سے ایسے سوالات کرتے ہو جیسے تمہارے آباؤ اجداد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیے۔ ارشاد ہوتا ہے اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ اس آیت میں روئے سخن اہل کتاب کی طرف ہی ہے۔ یہی لوگ حضور علیہ السلام سے طرح طرح کے بیہودہ سوالات کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم ان سے سوال کرتی ہے۔ آگے سورۃ نساء میں اس کی تفصیل آئے گی "يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ" اہل کتاب آپ سے سوال کرتے ہیں۔ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی کتاب بیک وقت اکٹھی کیوں نہیں لاتے۔ جیسا کہ تورات مکمل طور پر نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ آپ ان کے سوالات کو خاطر میں نہ لائیں۔ "فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ" ان بدنصیبوں

---

[1] معالم التنزیل ص۴۵ ج۱ تفسیر کبیر ص۲۳۵ ج۳

نے تو موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑا سوال کیا۔ کہنے لگے "اَرِنَا اللّٰہَ جَھْرَۃً" آپ اللہ تعالیٰ سے ہماری بالمشافہ ملاقات کرائیں۔ تب ہم مانیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اتاری ہے سورۃ بقرہ میں بھی اس قسم کے سوالات گذر چکے ہیں۔

مشرکین کے سوالات

بعض مفسرین فرماتے ہیں۔[1] کہ اس آیت کے مخاطبین اہل کتاب کے علاوہ مشرکین بھی ہیں۔ ان کے بیہودہ سوالات کا تذکرہ بھی قرآن پاک کے مختلف مقامات میں موجود ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل کے مطابق انہوں نے نبی علیہ السلام سے فرمائش کی کہ آپ سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جائیں۔ اور پھر وہاں سے کتاب لائیں۔ مکے کی سرزمین کو باغات میں تبدیل کر دیں۔ آپ کے ارد گرد فرشتوں کی جماعت ہونی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ خود ہمارے سامنے آکر آپ کی رسالت کی تصدیق کرے وغیرہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے تمام سوالات کا ایک ہی جواب دیا "قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ ھَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا" یعنی میں انسان ہوں اور اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ میں نے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ کہ میں قادر مطلق ہوں اور جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیّت اور ارادہ ہے۔ وہ جو چاہے کرتا ہے۔ مقصد یہ کہ یہود کی طرح مشرکین بھی طرح طرح کے سوال کرتے تھے۔ اس قسم کے سوالات کا مقصد محض نکتہ چینی ہوتا ہے اور کسی بات کو تسلیم نہ کرنے کا ایک بہانہ ہوتا ہے

صریح گمراہی

فرمایا اس طرح کے بے معنی سوالات نہ کیا کرو۔ کیونکہ اس کا نتیجہ بہت ہی برا ہو گا۔ وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ جو کوئی ایمان کے بدلے میں کفر اختیار کرے گا۔ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا گمراہ ہو گیا۔ کیونکہ اعتراض برائے اعتراض اور وہ بھی ایذا رسانی کے لیے کھلی گمراہی اور کفر ہے۔ یہاں پر اگرچہ روئے سخن اہلِ کتاب اور مشرکین کی طرف ہے۔ تاہم بات اہل ایمان کو بھی سمجھائی جا رہی ہے۔ کہ جو بھی اس قسم کے بیہودہ سوالات کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو تسلیم نہیں کرے گا۔ وہ بہرحال راستے سے بھٹک جائے گا۔

---

[1] معالم التنزیل ص ۹۵ ج ۱، ابن کثیر ص ۱۵۲ ج ۱، تفسیر کبیر ص ۲۳۵ ج ۳

کثرتِ سوالات کی ممانعت

بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ اَمۡ تُرِیۡدُوۡنَ کے مخاطب اہل ایمان ہیں اللہ تعالٰی نے ایمان والوں کو یہود اور مشرکین کی روش سے خبردار کیا ہے۔ کہ تم ان کے طریقوں کو نہ اپنانا یعنی تم بھی اپنے نبی آخر الزماں علیہ السلام سے بلا وجہ سوالات نہ کرنا جس طرح اس سے پہلے اہل کتاب نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیے اور ان سوالات کی وجہ سے انہیں طرح طرح کی تکالیف برداشت کرنا پڑیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے[۲]۔ کہ غزوہ حنین کے موقع پر حضور علیہ السلام نے دیکھا کہ مشرکین ایک خاص قسم کے درخت کو متبرک خیال کرتے ہیں۔ اس درخت کے ساتھ اپنے اسلحہ جات لٹکاتے تھے۔ اس کو ذات انواط کہتے تھے۔ یہ دیکھ کر صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا۔ حضرت! اِجۡعَلۡ لَّنَا ذَاتَ اَنۡوَاطٍ آپ ہمارے لیے بھی کسی درخت کو ذات انواط مقرر فرما دیں۔ جس پر ہم اپنے ہتھیار لٹکایا کریں۔ جیسا کہ مشرک کرتے ہیں۔ آپ یہ سن کر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا سُبۡحٰنَ اللّٰہِ یہ تو اس قسم والی بات ہو گئی۔ جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معیت میں بحیرہ قلزم عبور کیا، تو وہاں ایک قوم کو پایا۔ "یَعۡکُفُوۡنَ عَلٰۤی اَصۡنَامٍ لَّهُمۡ" جو اپنے معبودوں پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی پوجا کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر بنی اسرائیل نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا یٰمُوۡسَی اجۡعَلۡ لَّنَاۤ اِلٰـهًا كَمَا لَهُمۡ اٰلِهَةٌ "جس طرح ان لوگوں نے اپنے معبود بنا رکھے ہیں، اسی طرح ہمارے لیے بھی معبود مقرر کر دیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے ناراض ہوئے اور کہا اے بیوقوف قوم! یہ لوگ تو کفر میں مبتلا ہیں۔ کیا تم بھی اسی ہلاکت میں پڑنا چاہتے ہو۔ ابھی ابھی اللہ تعالٰی نے تمہیں طاقتور دشمن سے آزادی دلائی ہے۔ تو پھر کفر و شرک میں مبتلا ہونا چاہتے ہو۔ بلاوجہ ناجائز سوال نہ کیا کرو۔

حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے[۳]۔ کہ صحابہ کرامؓ بہت کم سوال کیا کرتے تھے۔ کیونکہ سورۃ مائدہ میں اللہ تعالٰی نے کثرت سوال سے منع فرما دیا۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ص ۱۵۲/۱، تفسیر کبیر ص ۲۳۵/۳ [۲] ترمذی ص ۲۱۷، تفسیر کبیر ص ۲۳۵/۳، تفسیر ابی السعود ص ۱۱۳/۱
[۳] تفسیر ابن کثیر ص ۱۵۲/۱

لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ" یعنی نزول وحی کے زمانے میں سوال نہ کیا کرو۔ اگر بعض چیزوں کے متعلق سوال کرو گے، تو وہ ظاہر کر دیا جائے گا۔ اور تم کو ناگوار گذرے گا۔ تمہارے لیے بدنامی کا باعث ہوگا۔ اس لیے صحابہ کرامؓ کثرتِ سوال سے اجتناب کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہی کا بیان ہے۔ وہ فرماتے ہیں[۱]۔ کہ میں نے اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کوئی قوم نہیں دیکھی۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال نہیں کیا کرتے تھے۔ ایسا کرنے سے ڈرتے تھے۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ باہر کا کوئی اعرابی سوال کرے تو وہ بھی مستفید ہوں۔ خود سوال کرنے میں بہت محتاط ہوتے تھے۔ قرآن پاک میں کل بارہ[۱۲] سوالات کا ذکر آتا ہے۔ جو صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السلام سے کیے۔ ان میں يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ" اور" يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى" يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ وغیرہ ایسے سوالات شامل ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی[۲] ہے۔ اے لوگو فضول اور بے مقصد سوال نہ کیا کرو۔ کیونکہ پہلی امتیں بھی اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں كَثْرَةُ مَسَائِلِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ[۳] کثرت سوال کی وجہ سے انہوں نے انبیاء علیہم السلام سے اختلاف کیا اور ہلاک ہوئے۔ لہٰذا کثرتِ سوال سے بچو۔ ہاں! کسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے یا کسی کام کے جواز یا عدم جواز کے لیے سوال کرنے کی ممانعت نہیں۔ زیادہ سوال کرنے میں قباحت یہ ہے۔ کہ ہو سکتا ہے۔ کہ اس سوال کا جواب تمہیں ناگوار گذرے یا بدنامی کا باعث ہو۔ اکثر سوال محض نکتہ چینی یا ایذا رسانی کے لیے کیے جاتے ہیں۔ اس لیے منع کیا۔ کہ اے اہل ایمان! تم یہود کی روش پر نہ چلنا اور کثرتِ سوال سے اپنے آپ کو بچانا

مسلمانوں کو سوالات کی ممانعت کی ایک وجہ تھی کہ اہل کتاب مسلمانوں کو اکساتے تھے کہ اپنے نبی سے یہ سوال پوچھو، اور اس سے ان کا مقصد فتنہ پردازی ہوتا تھا۔ اہل ایمان کو یہ بھی نصیحت ہے۔ کہ وہ یہودیوں کی باتوں پر اعتماد نہ کریں۔ پہلے گذر چکا ہے۔ کہ لوگ

۱۔ تفسیر ابن کثیر صفحہ ۱/۳۶۷ ۲۔ مسلم صفحہ ۲۶۲/۲۷

سحر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی فضول باتیں کرتے تھے۔ جس سے مسلمانوں کے دلوں میں شبہ ڈالنا مقصود تھا۔ تاکہ اہل ایمان اسلام سے دستبردار ہو جائیں۔ ان کی سازشوں سے محفوظ رہنے کے لیے فرمایا۔ کہ ان پر اعتماد کرتے ہوئے ایسے معنی سوال نہ پوچھا کرو۔

اہل کتاب کے باطنی ارادے

مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے۔ کہ یہودیوں کے ارادے بڑے خطرناک ہیں وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا بہت سے اہل کتاب چاہتے ہیں کہ تمہیں پھر ایمان سے کفر کی طرف لوٹا دیں، وہ ہر وقت اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ کہ کسی طرح مسلمان کمزور ہو جائیں۔ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، وہ بھی اپنے سابقہ دین پر پلٹ جائیں۔ یہ تو نزول قرآن کے زمانہ کی بات ہے۔ کہ اہل کتاب مسلمانوں کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی یہ کوشش آج تک جاری ہے۔ کہ کسی طرح مسلمانوں کو دوبارہ کفر کی طرف لوٹا دیا جائے۔ دنیا میں جتنی مشنریاں کام کر رہی ہیں۔ یہ سب اسی کام کے لیے ہیں۔ دوسرے مقام پر آتا ہے "فَتَكُونُونَ سَوَاءً" سب برابر سرابر ہو جائیں۔ جس طرح وہ خود گمراہ ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی ان کی روش پر چل نکلیں۔ جس طرح انہوں نے اللہ تعالے کی کتاب اور انبیاء علیہم السلام کا انکار کیا۔ اسی طرح مسلمان بھی کرنے لگیں۔ اہل کتاب کی دلی خواہش یہی ہے۔

فرمایا اہل کتاب کی اس گندی ذہنیت کے پیچھے ان کی ایک اور خباثت کارفرما ہے یعنی حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم ان کے نفسوں میں چھپا ہوا حسد ہے۔ جو انہیں مسلمانوں کے خلاف ابھار رہا ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے۔ کہ وہ ایسا کسی غلط فہمی یا لاعلمی کی بنا پر نہیں کرتے۔ بلکہ مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ یہ سب کچھ حق کے اظہار کے بعد کر رہے ہیں۔ انہیں حق اور باطل میں تمیز ہو چکی ہے مگر حسد اس بات پر کرتے ہیں کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم بنو اسمٰعیل کی بجائے بنو اسحاق میں کیوں نہیں آیا۔

حسد بدترین بیماری ہے

مفسرین کرام فرماتے ہیں[1]۔ کہ حسد دو وجوہ کی بنا پر ہوتا ہے۔ اولاً یہ کہ فلاں نعمت فلاں

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صد ۴۰۲ پارہ ۱

کو کیوں ملی ہے اور پھر اس کے زوال کی تمنا کی جاتی ہے، دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ فلاں نعمت اس کی بجائے مجھے ملنی چاہیئے۔ ایسی خواہش کرنا حرام ہے۔ یہ اخلاقی بیماری ہے۔ ابن ماجہ شریف کی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں۔ اِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ یعنی حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح خشک لکڑی کو آگ کھا جاتی ہے۔ حسد اتنی بُری چیز ہے۔

امیہ بن ابی صلت عرب کا عظیم شاعر اور حکیم تھا۔ خدا کو مانتا تھا۔ قیامت کا تصور ذہن میں موجود تھا۔ اسی لیے سچے مذہب کا متلاشی تھا۔ کبھی تورات کا مطالعہ کرتا کبھی انجیل پڑھتا کبھی اہل کتاب سے گفتگو کرتا۔ تاکہ حق کو پا سکے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا، تو یہ شخص حسد کی آگ میں جلنے لگا۔ یہ چاہتا تھا کہ وحی اس پہ نازل ہوتی۔ محض حسد کی وجہ سے دین خالص کا مخالف ہو گیا۔ اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہوئی۔

حسد تو قطعاً حرام ہے۔ البتہ غبطہ یا رشک جائز ہے۔ غبط کا مطلب یہ ہے۔ کہ کوئی شخص کسی کے پاس نعمت دیکھ کر تمنا کرے کہ اللہ تعالیٰ اُسے بھی ایسی نعمت سے سرفراز فرمائے حسد کا معنیٰ تو یہ ہے۔ کہ جس کو کوئی بہتری ملی ہے وہ اس سے محروم ہو جائے، مگر غبط میں کسی کے زوال کی تمنا نہیں ہوتی بلکہ اس کے حصول کی خواہش ہوتی ہے۔

بزرگانِ دین فرماتے ہیں مَا خَلَا جَسَدٌ عَنْ حَسَدٍ عام طور پہ کوئی جسم حسد سے خالی نہیں ہوتا۔ اسی لیے تعوذ کی تلقین کی گئی ہے " وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ " اے اللہ میں حاسد کے حسد سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ بہر حال حسد ایک بہت بڑی بیماری ہے اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔

غیر مسلم حاسد اقوام

جیسا کہ عرض کیا، غیر مسلم اقوام میں مسلمانوں کے خلاف حسد کی آگ نزول قرآن کے زمانے سے لے کر آج تک برابر بھڑک رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے۔ کہ اس وقت امریکہ، برطانیہ جرمنی اور فرانس وغیرہ کی عیسائی طاقتیں اربوں روپیہ اس مقصد کے لیے خرچ کر رہی ہیں

ا؎ ابن ماجہ ص ۳۱۰

کہ کسی طرح مسلمان قوم کا تعلق قرآن پاک سے منقطع کر دیا جائے مستشرقین کا فتنہ اسی مقصد کے لیے کام کر رہا ہے۔ امیر شکیب ارسلانؒ نے الحاضر العالم الاسلامی جو ان کی مشہور کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے۔ کہ یورپی عیسائیوں اور یہودیوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو مسخ کرنے اور قرآن پاک کی تردید میں چھ لاکھ کی تعداد میں کتابیں شائع کی ہیں۔ تاکہ مسلمان اسلام سے بدظن ہو جائیں۔ ان کا مقصد یہ ہے۔ کہ مسلمان اگر عیسائیت نہ بھی قبول کریں۔ تو کم از کم مسلمان کی حیثیت میں باقی نہ رہیں۔ مشنری سکول، ہسپتال وغیرہ سب اسی مقصد کے لیے چل رہے ہیں۔ لوگوں کو لالچ دیکر عیسائیت کی طرف مائل کیا جا رہا ہے۔ یہ اسی حسد کی بنا پر چاہتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کا تعلق اپنے نبی سے کٹ جائے۔ اور یہ قرآن پاک کی تعلیمات کو چھوڑ دیں۔

حدِ رجم پر اعتراضات

حدِ رجم کا انکار بھی یہودیت کا شاخسانہ ہے۔ اس شخص کی خباثت کی داد دو جس نے فیڈرل شریعت کورٹ میں دعویٰ دائر کیا ہے۔ کہ رجم کی سزا کو کالعدم قرار دیا جائے۔ کیونکہ بقول اس کے یہ شرعی حد نہیں ہے۔ مقصد یہ کہ لوگ شکوک و شبہات میں مبتلا ہو کر دین سے بیزار ہو جائیں۔ خارجیوں نے بھی یہی اعتراض کیا تھا۔ اور آج کے زمانے کے پرویزی اور چکڑالوی بھی اسی قماش سے ہیں۔ کہتے ہیں۔ کہ قرآن پاک میں رجم کی سزا نہیں ہے۔ بھئی! صحیح سنت میں تو موجود ہے۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں رجم کے متعدد کیس ہوئے۔ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں رجم کی سزا دی گئی۔ اگرچہ عام طور پہ رجم کی سزا اقرار جرم پہ ہی دی گئی۔ تاہم اکّے دُکّے ایسے واقعات بھی پیش آئے۔ جن میں گواہی کی بنیاد پہ رجم کی سزا دی گئی۔ اس زمانے میں کسی کو رجم کی سزا ملی ہو یا نہ۔ یہ الگ بات ہے۔ مگر اس کے شرعی حد ہوتے سے مجال انکار نہیں ہو سکتا۔

قرآن پاک کے خلاف سازش

مستشرقین جنہیں محقق اور ریسرچ سکالر کا نام دیا جاتا ہے۔ انہوں نے قرآن پاک اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی نکتہ چینی کی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے۔ کہ کسی طرح مسلمان اپنے دین سے بدظن ہو جائیں۔ گلیڈسٹون نے برطانیہ کی پارلیمنٹ میں برملا کہا تھا۔ کہ محمد کی کتاب قرآن اور ان کی تلوار انسانیت کی دشمن ہیں (العیاذ باللہ) اس نے قرآن پاک ہاتھ میں لیکر کہا تھا۔ جب تک یہ کتاب دنیا میں موجود ہے۔ یہ دنیا مہذب نہیں بن سکتی۔ لہذا

اس کی عزت و توقیر لوگوں کے دلوں سے مٹانا ہوگی۔ اس کا مطلب یہی تھا۔ کہ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے۔ جو فحاشی سے روکتی ہے۔ اور فحاشی اور عیاشی کے بغیر تہذیب نہیں آسکتی ان کے نزدیک انسان مہذب نہیں کہلا سکتا۔ لہذا ان کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے۔ کہ کسی طرح قرآن پاک کو دنیا سے محو کر دیا جائے۔

فرمایا بہت سے اہل کتاب یہ پسند کرتے ہیں کہ تمہیں کفر کی طرف پلٹا دیں۔ ایمان کے بعد، حسد کرتے ہوئے بعد اس کے کہ حق واضح ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود مسلمانوں کو تلقین کی جارہی ہے۔ کہ اہل کتاب کے خلاف کسی قسم کا انتقامی جذبہ ذہن میں نہیں رکھنا۔ بلکہ فَاعْفُوْا پس معاف کر دو۔ وَاصْفَحُوْا اور درگذر کرو حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ط یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لے آئے۔ گویا مسلمانوں کو انتقامی کارروائی کی بجائے حکم الٰہی کا انتظار کرنے کو کہا گیا تھا۔ آخر اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا۔ اور مدینہ طیبہ بلکہ پورے عرب کو یہودیوں اور نصرانیوں سے پاک کر دیا گیا۔ فرمایا اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پہ قدرت رکھتا ہے۔ وقت آنے پہ وہ ان بدبختوں سے مواخذہ کرے گا۔

نماز اور زکوٰۃ

اہل کتاب کی طرف سے چوکس رہنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے فرائض پہ کاربند رہنے کی تلقین بھی فرمائی۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ط نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔ تمہاری طاقت کا منبع یہی دو چیزیں ہیں۔ انہیں مضبوطی سے تھام لو۔ تمہاری تمام تر قوت کا دارومدار تعلق باللہ پہ ہے۔ اور نماز، زکوٰۃ اس کا مظہر ہے نماز کسی حالت میں بھی معاف نہیں، اسے وقت پہ ادا کرتے رہو۔ اور اگر صاحب نصاب ہو تو زکوٰۃ ادا کرو۔ بخل جیسی، قبیح بیماری کا یہ بہترین علاج ہے۔ اسے کبھی نظر انداز نہ کرو۔ غیر مسلم اقوام مادی ترقی میں پیش پیش ہیں۔ اس معاملہ میں وہ تمہیں اپنے برابر نہیں آنے دیں گی۔ اگر تم یہ ہدف قائم کرو کہ پچاس برس میں امریکہ کے برابر مادی ترقی حاصل کر لو گے، تو ممکن نہیں۔ کیونکہ اس وقت تک امریکہ تم سے پچاس سال مزید آگے نکل چکا ہوگا۔ لہذا تمہاری طاقت کا سرچشمہ مادی وسائل کی بجائے صلوٰۃ و زکوٰۃ ہے۔ انہیں کے ذریعے اندر ایمان اور روحانیت پیدا ہوگی۔ تعلق باللہ قائم ہوگا۔ جو طاقت کا اصل سرچشمہ ہے۔

نیکی کا بدلہ نیکی

فرمایا، یاد رکھو، وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ تم اپنے نفسوں کے لیے جو بھی بھلائی آگے بھیجو گے۔ کوئی نیکی، کوئی عمل، صدقہ خیرات کرو گے نماز ادا کرو گے، اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔ کہ وہ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتا۔ اس کا واضح اعلان ہے " مَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ " ایک ذرے کے برابر کیا ہوا عمل بھی ضائع نہیں ہو گا۔ بلکہ انسان اپنا ہر اچھا یا بُرا عمل قیامت کے دن دیکھ لے گا۔ یہاں بھی فرمایا۔ کہ جو کچھ تم اعمال کے ذریعے آگے بھیجو گے تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ اُسے اللہ کے ہاں پالو گے۔ ہر چیز کا نتیجہ سامنے آجائے گا۔ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر فعل کو دیکھ رہا ہے۔ کوئی چیز اس کی نظروں سے مخفی نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے۔ کہ تم کوئی کام کس نیت اور ارادے سے انجام دے رہے ہو۔

درس چہل و چہار ۴۴ (آیت ۱۱۱ تا ۱۱۲)

وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ
اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ
مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪
وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع ۱۳

ترجمہ: اور کہتے ہیں کہ ہرگز نہ داخل ہوگا جنت میں مگر وہ جو یہودی ہو یا نصرانی ہو۔ یہ ان کی خواہشات ہیں۔ اے پیغمبر! کہہ دیجئے، لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو (۱۱۱) کیوں نہیں۔ جس نے اپنی ذات کو اللہ کے سامنے جھکا دیا، اور وہ نیک کام کرنے والا ہو۔ پس اس کے لیے اس کے رب کے ہاں بدلہ ہے۔ اور ان لوگوں پر نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (۱۱۲)

ربط آیات

اہل کتاب کی خرابیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ انبیاء علیہم السلام سے فضول سوال کرتے تھے۔ اور پھر ان سے اختلاف بھی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو ان کی روش سے منع فرمایا۔ کہ تم یہودیوں والے کام نہ کرنا۔ اور ان کے بہکاوے میں آ کر دین میں شک نہ کرنے لگنا۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ اہل ایمان پھر کفر کی طرف پلٹ آئیں۔ اہل کتاب حاسد ہیں۔ اسی بنا پر وہ انبیاء علیہم السلام پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اور قرآن پاک میں نقص نکالتے ہیں۔ تاکہ مسلمان اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں۔ الغرض! بنی اسرائیل کی یہ خرابیاں "یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ" سے لے کر اگلے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، ان کی ملت اور خانہ کعبہ کے ذکر تک چلی گئی ہیں۔ ساتھ ساتھ اہل ایمان کو ان خرابیوں سے بچنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔

یہود و نصاریٰ

اہل کتاب میں یہودی اور نصرانی دونوں فرقے پائے جاتے ہیں۔ یہودیوں کی نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات کی

طرف منسوب کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ نہ ان کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کامل ایمان ہے اور نہ توراۃ کو اللہ تعالیٰ کی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے کتاب اللہ میں تحریف کر کے اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اس بات کا تذکرہ گذشتہ دروس میں آچکا ہے۔ آج کل یہودیوں کو صیہونی بھی کہا جاتا ہے۔ صیہون ایک پہاڑ کا نام ہے۔ جو بیت المقدس کے قریب واقع ہے۔ اسی نسبت سے انہیں صیہونی کہتے ہیں۔

نصاریٰ اپنی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی طرف کرتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی بستی کا نام ناصرہ تھا۔ جس کی وجہ سے یہ لوگ نصاریٰ کہلاتے ہیں۔ تاہم مسلمان مفسرین کرام[1] کہتے ہیں۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک موقع پر کہا تھا "مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ" یعنی اللہ کے راستے میں میری کون مدد کرے گا۔ تو حواریوں نے کہا تھا "نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ" ہم اللہ کے دین کی مدد کرنے والے ہیں۔ اس لحاظ سے انہیں نصرانی کہا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ نصرانی نہ تو اللہ کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں۔ اور نہ انجیل پر ایمان ہے انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو عبداللہ (اللہ کا بندہ) کہنے کی بجائے ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) کہا۔ بعض تین خداؤں میں انہیں تیسرا کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کر گیا تھا۔ سورۃ مائدہ میں وضاحت موجود ہے "لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ" یعنی وہ لوگ کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہی مسیح ہے جو تینوں میں تیسرا ہے — وہ قطعی طور پر ملعون ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہنے والے بھی کلمہ کفر ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو اولاد سے پاک ہے "سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ" اللہ تعالیٰ ایسی تمام شرکیہ چیزوں سے منزہ ہے۔ نصرانیوں نے انجیل کو بھی تحریف کے ذریعے بگاڑ دیا ہے۔ اب ایک کی بجائے ایک سو تیس انجیلیں بن چکی ہیں۔ عام مشہور چار انجیلیں یعنی یوحنا، متی، لوقا اور مرقس تو بائیبل کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس کے علاوہ ایک پانچویں انجیل برنباس بھی ہر جگہ دستیاب ہے

---

[1] تفسیر عزیزی صہ ۲۶۸ پارہ ۱، تفسیر ابن کثیر صہ ۱۰۳ ج ۱

اصلاً انجیل سریانی زبان میں نازل ہوئی تھی۔ مگر نصرانیوں نے اس کے تراجم کر کر کے اصل متن کو بالکل ضائع ہی کر دیا ہے۔ اس کے الفاظ تک اپنی حالت پر قائم نہیں ہے۔

نجات کا دارومدار

الغرض! یہود و نصاریٰ دونوں فرقوں کا یہ عقیدہ اور دعویٰ تھا کہ وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ یعنی صرف یہودی اور نصرانی ہی جنت میں جائیں گے باقی سب کے لیے جنت کے دروازے بند ہیں۔ وہاں کوئی نہیں جا سکتا۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے۔ کہ ہر دو فرقے آپس میں بھی متفق نہیں تھے۔ بلکہ یہودی کہتے تھے۔ کہ جو یہودی ہوگا۔ وہ جنتی ہے۔ اور نصاریٰ کہتے تھے جو ہماری پارٹی کا ممبر ہے۔ صرف وہی جنتی ہے۔ اس کے علاوہ جنت پر اور کسی کا حق نہیں ہے۔ اسی دعوے کے جواب میں اللہ جل شانہٗ نے فرمایا۔ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ یہ ان کی باطل خواہشات ہیں۔ وگرنہ اس دعوے کی حقیقت کچھ بھی نہیں گویا انہوں نے اپنی خواہشات کو عقیدے کا درجہ دے دیا۔ پہلے کسی درس میں بیان ہو چکا ہے کہ جب امت کا علم و عمل کا رشتہ پیغمبر سے کٹ جاتا ہے۔ تو امت کی خواہشات عقیدہ بن جاتی ہیں۔ اس سے پہلے یہودیوں کے ایک اور باطل عقیدے کا بھی ذکر آ چکا ہے۔ کہ کوئی اسرائیلی دوزخ میں نہیں جائے گا۔ اگر بالفرض چلا بھی گیا تو صرف گنتی ایام کے لیے جائے گا۔ جتنے دنوں ان کے آباؤ اجداد نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔ وہاں پر اللہ تعالے نے ان کے اس باطل عقیدے کو واضح کیا تھا۔ اور پوچھا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے کس نبی پر وحی کی تھی۔ کہ اسرائیلی جو چاہیں کرتے پھریں۔ وہ چند دن سے زیادہ دوزخ میں نہیں رہیں گے تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے۔

اس مقام پر بھی اللہ تعالے نے وہی بات دہرائی ہے۔ نبی علیہ السلام کو ارشاد ہوتا ہے قُلْ آپ ان کے دعوے کے جواب میں فرما دیجئے هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو تو کوئی دلیل لاؤ۔ برہان دلیل یا سند کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع براہین آتی ہے۔ اور دلیل بھی ایسی ہونی چاہیئے۔ جسے صحیح العقل آدمی تسلیم کرے۔ دعویٰ کسی بھی قسم کا ہو۔ جب تک اس کے پیچھے دلیل نہیں ہوگی۔ وہ باطل سمجھا جائے گا۔ اس لیے اللہ تعالے نے مشرکوں کے متعلق کہا لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ

عِنْدَ رَبِّہٖ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ پس ان کا حساب ان کے رب کے پاس جا کر ہی ہو گا۔ ایسے لوگوں کے پاس نہ کوئی نقلی دلیل ہوتی ہے اور نہ عقلی دلیل۔ زیادہ سے زیادہ یہ لوگ رواج کو بطور دلیل پیش کریں گے کہ ہمارے آباؤ اجداد یوں کرتے ہے۔ ہماری قوم کا یہ رواج تھا۔ ہمارے علاقے والے اس بات کو اپناتے تھے۔ برخلاف اس کے توحید کے ہزاروں کروڑوں دلائل آپ کے مشاہدہ کے لیے موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ یہود و نصاریٰ کا دعویٰ نجات غلط ہے۔ یہ محض مخصوص فرقہ کی بنیاد پر جنت میں نہیں جا سکتے۔ نجات کا یہ قانون ہرگز نہیں ہے۔

اتباع خداوندی

فرمایا بَلٰی کیوں نہیں یہ حرف ایجاب ہے۔ اور یہ اپنے سے پہلی بات کی نفی کرتا ہے پہلے دعویٰ تھا۔ یہود و نصاریٰ کے سوا جنت میں کوئی نہیں داخل ہو گا۔ فرمایا کیوں نہیں ہو گا۔ بلکہ جنت میں داخل ہو گا۔ مگر وہ مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ جس نے اپنے چہرے کو اللہ تعالےٰ کے تابع کر دیا۔ ذِکر چہرے کا ہے مگر مراد اس سے ذات ہے۔ کہ جس شخص نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دے دیا۔ وہ جنت میں ضرور داخل ہو گا۔ وَجْھَہٗ کا یہ معنیٰ دوسرے مقام پر بھی آتا ہے جیسے "کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ" ہر چیز فانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا۔ ذاتِ خداوندی حَیٌّ۔ قَیُّوْمٌ ہے۔ وہ دائم، قائم، ازلی اور ابدی ہے۔ اس کے علاوہ ہر چیز بالفعل فانی ہے فنا ہو چکی ہے۔ یا آئندہ فنا ہو جائے گی۔ قائم اور دائم ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔

مَنْ اَسْلَمَ جس نے تابع کر دیا۔ اسلام کا معنیٰ منقاد ہو جانا یا تابع ہو جانا۔ آگے آرہا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کو فرمایا۔ اَسْلِمْ لا یعنی مطیع ہو جاؤ۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا "اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" میں ظاہر و باطن طریقے سے اللہ رب العلمین کا فرمانبردار ہوں۔ یعنی میں اللہ تعالےٰ کے حکم کی تعمیل کے لیے ہر لمحہ تیار ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے وعدے کو سچ کر دکھایا۔ اللہ تعالےٰ نے حکم دیا۔ یہاں سے ہجرت کر کے فلسطین چلے جاؤ۔ آپ نے تعمیل کی۔ اللہ تعالےٰ نے کہا۔ خانہ کعبہ تعمیر کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا۔ حاضر ہوں۔ اللہ تعالےٰ نے حکم دیا بیوی بچوں کو وہیں

چھوڑ دو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسے ہی کیا۔ گویا انہوں نے "اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" میں نے جو اقرار کیا تھا اسے حرف بحرف پورا کر دکھایا۔

نیک نیتی

فرمایا جنت میں جانے کا معیار یہ ہے۔ مَنْ اَسْلَمَ یعنی جو اللہ تعالیٰ کا مطیع ہوگیا مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی تعمیل میں کمربستہ ہو جائے۔ اس کا اعتقاد درست ہو جائے۔ اس کی فکر پاک ہو جائے۔ اس کا ایمان مکمل ہو جائے جس کا تعلق نیت اور عقیدے سے ہے۔ ایمان کا تعلق چونکہ باطن سے ہے۔ اس لیے سب سے پہلے انسان کی باطنی طہارت کی ضرورت ہے اس کے قلب و روح میں اللہ تعالیٰ کی واحدنیت سرایت کر جائے۔ نہ اس کی ذات میں کوئی شریک ہے۔ اور نہ اس کی صفات میں کوئی شریک ہے۔ اگر دل کے کسی گوشے میں شرک کا معمولی سا شائبہ بھی موجود ہے تو ایسا شخص موحد نہیں ہو سکتا۔ وہ مشرک ہے یا منافق ہے یا شک کرنے والا ہے۔ بخاری اور مسلم شریف کی حدیث ہے[1] حضور علیہ السلام نے فرمایا اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ وَلٰکِنْ یَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری شکلوں اور رنگوں کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے کسی شخص کے اعمال کا دارومدار اس کی نیت پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ "فَادْعُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ" اللہ کو پکارو۔ خالص اسی کی اطاعت کرنے والے بن جاؤ۔ حدیث شریف میں ہے[2]۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ لہٰذا اپنے باطن کو درست کرو۔ جنت میں داخلے کے لیے یہ اولین شرط ہے۔

امام رازیؒ نے بنی اسرائیل کے ایک شخص کا واقعہ بیان کیا ہے[3]۔ کہتے ہیں۔ کہ ایک ایماندار آدمی بھوک میں مبتلا تھا۔ سفر پر جا رہا تھا۔ راستے میں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے نظر آئے۔ اس نے کہا، کاش میرے پاس ریت کے ان ٹیلوں کے برابر اناج ہوتا۔ تو میں سب بھوکوں میں تقسیم کر دیتا۔ چونکہ خود اس وقت بھوکا تھا۔ اسے بھوک کی تکلیف محسوس ہوئی تو اس نے دوسرے بھوکوں کو خیال میں لاتے ہوئے یہ بات کی۔ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی بات پسند

---

[1] مسلم صفحہ ۳۱۷ ج ۲، ابن ماجہ صفحہ ۳۰۶ [2] بخاری صفحہ ۲، مسلم صفحہ ۱۴۰ [3] تفسیر کبیر صفحہ ۴ ج ۴

آئی۔ چنانچہ اس وقت کے نبی پر وحی بھیجی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ اس نے تیری اس خالص نیت کو قبول کر کے تجھے ریت کے ٹیلوں کے برابر غلہ تقسیم کرنے کا ثواب عطا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تیرا یہ صدقہ قبول کر لیا ہے۔ جیسی تمہاری اچھی نیت تھی۔ ہم نے ویسا ہی اچھا اجر عطا کیا ہے

اعمال صالحہ

جنت میں داخلے کا جو اصول اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا۔ اس کا پہلا جزیہ تھا۔ کہ داخلے کا خواہشمند شخص اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو۔ اس کا دوسرا جزیہ یہ فرمایا وَھُوَ مُحْسِنٌ اور وہ نیکی کرنے والا ہو۔ مقصد یہ کہ جنت میں داخلہ کسی فرقہ یا جماعت کی بنیاد پر نہیں ہوگا۔ کہ وہ یہودی ہو یا عیسائی کہلاتا ہو۔ بلکہ نجات کا قانون اس مقام پر یہ فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو۔ اسکی نیت اور ارادہ درست ہو۔ اور اس کا عقیدہ صحیح ہو۔ اور پھر دوسرے نمبر پر وہ اعمال صالحہ کرنے والا ہو۔ ایسا شخص یقیناً جنت کا حقدار ہوگا۔ اور اس کو نجات حاصل ہو جائے گی۔

فرقہ بندی ذریعہ نجات نہیں ہے

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں[1]۔ کہ یاد رکھو نجات کا دار و مدار اکتساب پر ہے۔ نہ کہ انساب پر۔ نسب کے لحاظ سے کوئی کتنے ہی اونچے خاندان سے تعلق رکھتا ہو یا کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک اس کا باطنی طور پہ ایمان اور عقیدہ درست نہ ہو۔ اور ظاہری طور پہ اعمالِ صالحہ نہ انجام دیتا ہو۔ ہمارے ہاں بھی بہت سی فرقہ بندیاں پائی جاتی ہیں۔ بعض جاہل یا کم فہم لوگ کسی خاص فرقے یا گروہ کو ہی نجات یافتہ تصور کرتے ہیں۔ کہ فلاں مسلک والے جنت میں جائیں گے۔ دوسرے نہیں جائیں گے حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی ان میں کتنے لوگ ہیں جو ایک دوسرے کیساتھ تعصب رکھتے ہیں۔ بعض حنفی، حنابلہ کے ساتھ یا شافعی، مالکیوں کے ساتھ عناد رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ صرف ہم ہی جنت کے وارث ہیں، دوسرے اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح سلوک اور تصوف کے سلسلے ہیں۔ جیسے چشتی، قادری، سہروردی، نقشبندی وغیرہ۔ ان میں سے بھی بعض ایک دوسرے کے خلاف عناد رکھتے ہیں اور جنت کو صرف اپنی وراثت سمجھتے ہیں باقی سب لوگوں کو جہنمی خیال کرتے ہیں۔ یہ تو محض فروعی اختلافات ہیں بنیادی طور پہ چاروں مسالک یا سلسلہ ہائے تصوف میں کوئی اختلاف نہیں۔

---

[1] بیان القرآن ج ۱ ص ۶۲

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں[1] کہ یہ چیزیں فروعات دین میں سے ہیں۔ دین میں ان کی گنجائش موجود ہے۔ مگر اس کی بنا پر دوسرے فرقہ یا گروہ کو جہنمی قرار دینا جہالت محض ہے۔ دین میں جتنے مسلک اور جتنے سلوک ہیں۔ سب کا مقصد واحد ہے۔ اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی رضا اور اسکی خوشنودی۔ کوئی حنفی ہو یا شافعی، مالکی ہو یا حنبلی، چشتی ہو یا قادری منزلِ مقصود تو سب کی ایک ہی ہے۔ راستے مختلف ہیں۔ طریقہ تعلیم مختلف ہے۔ مگر مقصد تو مختلف نہیں۔ لہذا اپنے آپ کو جنتی اور دوسرے کو جہنمی کہنا بذاتِ خود گمراہی کی علامت ہے اس میں اور یہود و نصاریٰ کی گمراہی میں کیا فرق رہ گیا ہے۔ اس غلط فرقہ بندی نے مسلمانوں کو تباہ کیا ہے۔ فروعات میں اختلافِ رائے عین فطری امر ہے۔ اور اس کی گنجائش ہے۔ غور کرنے کی بات ہے۔ کہ دو ڈاکٹر یا حکیم ایک ہی قسم کے مریض کے لیے مختلف دوائیں تجویز کرتے ہیں۔ مگر کوئی نہیں کہتا کہ فلاں ڈاکٹر بیوقوف ہے۔ اور فلاں حکیم درست ہے۔ انہیں سب درست ہی مانتے ہیں۔ کیونکہ مقصد سب کا ایک ہی ہے۔ یعنی مریض کی صحت یابی مقصود ہے۔ دوا کوئی بھی تجویز کی جا سکتی ہے۔ جو اس کے مناسبِ حال ہو۔ لہذا دین کے معاملہ میں ایسا تعصب کیوں اختیار کیا جائے۔ کہ فلاں فرقہ ایسا ہے یا فلاں امام ایسا ہے۔ بھائی یہ سب ایک ہی اللہ تعالےٰ کو ماننے والے تو ہیں۔ ان کے متعلق کسی گروہ میں تعصب نہیں ہونا چاہیے۔

اب دیکھیے ملک میں فوجداری قانون رائج ہے۔ کسی ملزم کو ایک جج سزائے موت دیتا ہے۔ تو دوسرا اسی قانون کے مطابق اُسے بری کر دیتا ہے۔ مگر کبھی کسی نے کسی جج کو غلط نہیں کہا۔ کیونکہ قانون میں مختلف فیصلہ جات کی گنجائش موجود ہے۔ اسی طرح دین کے قانون کو ماننے والے سارے ہی ہیں۔ خواہ کوئی حنفی ہو یا شافعی، لہذا ان کے پیروکاروں میں بھی تعصب نہیں آنا چاہیئے۔ یہ کہنا کہ فلاں فرقے والے اس طرح نماز پڑھتے ہیں۔ ان کی نماز نہیں ہوتی یا وہ جہنمی ہیں۔ یہ بہت بری بات ہے۔ اور من حیث القوم مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہے۔ یہ یہودیت اور نصرانیت ہے۔ قرآن پاک نے اس کی مذمت بیان

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۴۷۰۔ پارہ ۱

فرمائی ہے۔

قانونِ نجات

الغرض! فرمایا قانونِ نجات یہ ہے۔ کہ جو شخص مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ جس نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے تابع بنا لیا۔ اور وہ نیک کام کرنے والا ہے۔ مجدد صاحبؒ فرماتے ہیں۔ کہ جب "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کا ذکر آتا ہے تو اس سے مراد بڑی بڑی چار عبادتیں ہیں۔ یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ اس کے بعد پانچویں درجے میں جہاد آتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے ساتھ دوسری نیکیاں بھی ہیں۔ اس کو یوں بیان فرمایا فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ "جو کوئی بھی نیک کام کرے گا۔" وَهُوَ مُؤْمِنٌ "بشرطیکہ وہ مومن ہو۔ اس کا عقیدہ صحیح ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے کسی عمل کی ناقدری نہیں فرمائیں گے۔ اپنے ہر کام کا بدلہ وہ پالے گا۔ ہاں! اگر ایمان ہی مفقود ہے۔ عقیدہ صحیح نہیں ہے۔ تو پہاڑوں جتنی بڑی بڑی نیکیاں بھی گرد و غبار کی طرح اُڑ جائیں گی۔ قیامت کے روز کچھ کام نہ آئیں گی "لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا" ان کی کمائی میں سے انہیں کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ ان کی نیکیاں گرد و غبار کی طرح اڑ جائیں گی۔ گویا کہ وہ راکھ کے ذرات تھے۔ جو آندھی کے آگے بالکل نہ ٹھہر سکے۔ دوسرے مقام پر آتا ہے۔" عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ "بڑے بڑے عامل، ریاضتیں اور محنتیں کرنے والے، کام کر کے تھک جانے والے ہوں گے۔ مگر قیامت کے روز" تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً "جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ وہ ایمان کی دولت سے محروم تھے۔ سب نیکیاں رائیگاں جائیں گی۔ بہر حال قانونِ نجات فرقہ بندی نہیں بلکہ اتباعِ خداوندی اور اعمالِ صالحہ ہیں۔

اجرِ عظیم

فرمایا جس نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے تابع کر لیا۔ اور پھر وہ نیکی کرنے والا بن گیا فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ پس ایسے شخص کے لیے اپنے رب کے ہاں اجر ہے۔ نیکی کا بدلہ اس کو ضرور ملے گا۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ ایسے اشخاص مستقبل میں کسی پریشانی میں مبتلا نہیں ہوں گے۔ نہ ان پہ کوئی خوف ہو گا۔ اور نہ وہ غمگین ہوں گے ظاہر ہے کہ دنیا میں انسان ہر وقت پریشان رہتا ہے۔ کم از کم موت کا ڈر تو اُسے ہر وقت لگا رہتا ہے۔ گویا موت ہر وقت اس کے پیشِ نظر ہے۔ پھر دولت اور صحت کا خوف مسلط رہتا ہے۔ پیا

نہیں یہ دولت ہمارے پاس رہے گی یا نہیں - پتا نہیں کل کو صحت بھی برقرار رہ سکے گی یا نہیں۔ تو اس قسم کے خوف انسان کے ہمیشہ دامن گیر رہتے ہیں۔ مگر جن کا عقیدہ صحیح ہوگا۔ جو اعمال اچھے کرنے والے ہوں گے۔ وہ ان تمام پریشانیوں سے محفوظ رہیں گے۔ انہیں نہ اپنے ماضی پر افسوس ہوگا اور نہ انہیں مستقبل کا کوئی خدشہ ہوگا۔ برخلاف اس کے جنہوں نے کوئی کمائی نہیں کی۔ زندگی کی پونجی کو ضائع کر دیا۔ وہ افسوس کریں گے۔ کہ ہم نے کتنی کوتاہی کی۔ اللہ تعالےٰ نے مہلت دی تھی۔ مگر ہم نے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ نہ عقیدہ درست کیا اور نہ نیکی کا کوئی کام کیا۔ ایمان سے محروم رہے۔ ایسے لوگ خوف اور پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔ اور اپنے کیے پر ہمیشہ افسوس کرتے رہیں گے۔

درس چہل و پنج ۴۵ (آیت ۱۱۳ تا ۱۱۵)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ
عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ
مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا
كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ
يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ۭ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ
اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۥ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ
فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۤ
فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

ترجمہ: یہودیوں نے کہا نصاریٰ کسی چیز پر نہیں ہیں۔ اور نصاریٰ نے کہا کہ یہودی کسی چیز پر نہیں ہیں (یعنی ان کا دین صحیح نہیں ہے) حالانکہ یہ کتاب پڑھتے ہیں اسی طریقے سے ان لوگوں نے کہی جو جانتے نہیں (جاہل ہیں) ان جیسی بات پس اللہ تعالیٰ ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کریگا۔ ان باتوں میں جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں ﴿۱۱۳﴾ اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے۔ جو اللہ کی مسجدوں سے منع کرتا ہے۔ کہ ان میں اللہ کا ذکر کیا جائے۔ اور ان کی بربادی میں کوشش کرتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں۔ کہ نہیں ہے ان کے لیے کہ داخل ہوں۔ ان گھروں میں مگر ڈرتے ہوئے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں رسوائی ہے۔ اور ان کے لیے آخرت میں عذاب عظیم ہے ﴿۱۱۴﴾ اللہ ہی کے لیے ہیں مشرق اور مغرب پس جدھر بھی تم منہ کرو۔ ادھر اللہ تعالیٰ کی توجہ ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ ﴿۱۱۵﴾

یہود و نصاریٰ آمنے سامنے

یہودیوں اور نصاریٰ کی منجملہ خرابیوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کہ ایک گروہ

دوسرے کو باطل قرار دیتا ہے۔ اور اپنے آپ کو راہ راست پر سمجھتا ہے۔ تیسرا گروہ مشرکین کا ہے جو یہود و نصاریٰ دونوں کو باطل کہہ کر اپنے آپکو صحیح العقیدہ سمجھتا ہے۔ تو گویا یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کا ابطال کرتے ہیں۔ ان آیات میں اسی چیز کو بیان کیا گیا ہے۔ "وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ" یہودی کہتے ہیں کہ نصرانی کسی چیز پر نہیں ہیں وَقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ" اور نصرانی کہتے ہیں۔ کہ یہودی کسی چیز پر نہیں ہیں۔ یعنی ان کا دین سچا نہیں ہے۔ اس طرح جب یہ اکٹھے ہوتے ہیں۔ تو آپس میں دست و گریبان ہوتے ہیں۔ یہودیوں کا اعتراض یہ ہے۔ کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالےٰ کا بیٹا کہہ کر کفر کیا۔ اور عیسائیوں کا نظریہ یہ ہے۔ کہ جب عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو یہودیوں نے نہ صرف ان کا انکار کیا۔ بلکہ انجیل کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ لہٰذا یہ گمراہ ہوئے۔ فرمایا یہ دونوں فرقے ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے ہیں۔ وَهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ" حالانکہ یہ دونوں گروہ ہی اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی توراۃ اور انجیل کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان میں اسقدر اختلاف پایا جاتا ہے۔

کتب سماویہ برحق ہیں

حقیقت یہ ہے۔ کہ توراۃ، انجیل، زبور، قرآن پاک اور دیگر صحائف سب کے سب برحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اصل دین الہٰی کتب کے ذریعے نازل فرمایا۔ مگر ان بدبختوں نے تحریف کر کے دین کو مسخ کر دیا تاہم اصل دین ان کی کتابوں میں اب بھی موجود ہے جنہیں یہ پڑھتے ہیں۔ لہٰذا کسی کتاب کا بالکل انکار کر دینا کہ اس میں کچھ بھی نہیں۔ انصاف کے خلاف ہے۔ اور اہل کتاب کی ہٹ دھرمی کی دلیل ہے۔ ہاں یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہودیوں کا اصل دین تو ٹھیک تھا۔ مگر انہوں نے خرابیاں پیدا کر دیں۔ یا نصاریٰ کا دین اور کتاب برحق ہے مگر ان کی تحریفات نے اسے کچھ اور بنا دیا ہے۔ ایک دوسرے مذہب کو بالکل ہی باطل قرار دینا درست نہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام پر الزام تراشی

جب قرآن پاک نازل ہوا تو اس نے توراۃ اور انجیل کی تصدیق کی کہ یہ دونوں آسمانی کتابیں ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ اس کے علاوہ تمام صحفِ سماویہ کی بھی تصدیق کی۔ البتہ قرآن پاک نے ان مقامات کی ضرور نشاندہی کی۔ جہاں جہاں سے یہ لوگ بھٹکے ہیں

اور جہاں جہاں انہوں نے کُتب میں تحریف کی ہے۔ پہلے گذر چکا ہے۔ کہ یہودیوں نے حضرت سلیمان علیہ السّلام کی طرف کفر کا کلمہ منسوب کیا۔ اور کہا کہ اُن کی سلطنت سحر پر قائم تھی۔ لہٰذا ہم بھی ان کی سنّت پر عمل کرتے ہوئے سحر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دعوے کی تردید کرتے ہوئے فرمایا۔ "وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ" یعنی سلیمان علیہ السلام نے جادو کر کے کفر کا ارتکاب نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے خود کفر کا ارتکاب کیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کے صاحبِ شریعت رسول تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے مثال حکومت عطا کی تھی۔ اُن سے سحر کی توقع کرنا بعید از قیاس ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی "رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ" یا اللہ! مجھے ایسی سلطنت عطا کر۔ جو میرے بعد کسی کو عطا نہ ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور آپ کے لیے ہوا اور جنّات کو مسخر کر دیا۔ مگر ان ظالموں نے سمجھا کہ یہ جادو کا اثر ہے۔ العیاذ باللہ۔

مشرکین کا نظریہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُدھر مشرکین کا حال بھی یہود و نصاریٰ سے کم نہیں۔ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ عرب کے مشرکین بھی وہی بات کرتے ہیں۔ جو اہلِ کتاب نے کی۔ یہ کہتے ہیں۔ کہ نہ یہود و نصاریٰ حق پر ہیں اور نہ مسلمان۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ کچھ بھی نہیں جانتے۔ یہ تو جاہلِ مطلق ہیں۔ نہ ان کے پاس کوئی کتاب ہے جس سے یہ راہنمائی حاصل کر سکیں۔ اور نہ ہی دو ہزار سال کے عرصہ میں ان کے پاس کوئی نبی آیا ہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد تقریباً ڈیڑھ ہزار سال تک عرب حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے دین پر قائم رہے۔ اس کے بعد ان میں بگاڑ پیدا ہونا شروع ہوا۔ اور پھر ایسا وقت بھی آیا کہ سب کے سب شرک کی طرف مائل ہو گئے۔ ہزاروں میں سے کوئی اکّا دکّا ہی موحد ملتا تھا۔ ورنہ سب دین سے ہٹ چکے تھے۔

آخری فیصلہ عدالتِ الٰہی میں ہوگا

الغرض! یہود، نصاریٰ اور مشرکین تینوں گروہوں نے ایک دوسرے کی تکذیب کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ جو کچھ چاہیے کہتے اور کرتے رہیں۔ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ کہ کون حق پر ہے۔ اور کون اصل دین سے پھر چکا ہے۔ ان کا فیصلہ ہر اس معاملہ میں ہو جائے گا۔

فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں فرمایا ان کے درمیان قطعی فیصلہ تو قیامت کو ہوگا۔ تاہم جہاں تک ہدایت اور گمراہی کا تعلق ہے۔ تو اس کے متعلق اسی سورۃ میں آگے آرہا ہے۔ "قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ" ہدایت اور گمراہی بالکل واضح ہو چکی ہیں۔

دنیا میں حق کے متلاشی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بے شمار ذرائع پیدا فرما دیئے ہیں۔ وہ حق و صداقت کی پہچان کر سکتا ہے۔ سورۃ انفال میں ہے۔ "وَیَحۡیٰی مَنۡ حَیَّ عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ" جو ہلاک ہوا وہ بھی واضح دلیل کے ساتھ اور جو زندہ ہے وہ بھی واضح دلیل کے ساتھ زندہ ہے حق و باطل کی تفریق ہو چکی ہے جنگ بدر کے مقتولین یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے پاس واضح دلیل نہیں آئی تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا نبی آیا، اللہ تعالیٰ کی کتاب آئی مگر انہوں نے انکار کر کے مقابلہ کیا اور ہلاک ہوئے۔

مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں باعتبار دلیل، عقل، دستور اور قانون، ہدایت اور گمراہی کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ اب کسی کا کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔ تاہم قطعی اور اٹل فیصلہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ہوگا۔ بخاری شریف میں حضرت علیؓ سے مروی ہے[1] اِنَّ اَوَّلَ مَنۡ یَّجۡثُوۡ بَیۡنَ یَدَیِ الرَّحۡمٰنِ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن میں گھٹنے ٹیک کر رحمٰن کے سامنے بیٹھوں گا اور درخواست کروں گا کہ اے پروردگار! آپ ان بدر والوں سے پوچھیں کہ یہ ہم سے کیوں لڑے تھے گویا اس دن حق و باطل کے تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کے دربار میں ہوں گے۔ اسی طرح ایک دوسرے کو باطل فرقہ کہنے والوں کا فیصلہ بھی اسی روز ہوگا۔

اسی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کی تفریق کے لیے تمام حجت پوری کر دی ہے امام بیضاویؒ "اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ" کی تفسیر میں فرماتے ہیں[2] کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و خرد عطا کی۔ انبیاء علیہم السلام معبوث فرمائے۔ کتابیں نازل فرمائیں اب کون سا عذر باقی رہ گیا ہے۔ قیامت کو کون کہے گا "مَا جَآءَنَا مِنۡۢ بَشِیۡرٍ وَّلَا نَذِیۡرٍ" کہ ہمارے پاس خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ اب تو بشیر و نذیر آچکے۔ لہٰذا قیامت کے دن کوئی عذر قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ حضرت زبیرؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا تھا۔

---

[1] بخاری صفحہ ۵۶۵ ج ۲ [2] تفسیر بیضاوی ج ۱ ص ۷

اَنَکُنَّ عَلَینَا الْخُصُومَۃُ حضرت! قیامت کو ہمارا اور ان کا جھگڑا دوبارہ قائم ہوگا۔ فرمایا[1] ہاں! جن تنازعات کا فیصلہ دنیا میں نہیں ہوا۔ ان کا فیصلہ رب العزت کی بارگاہ میں ضرور ہوگا۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ یہ تینوں فرقے یعنی یہود۔ نصاریٰ اور مشرک جو ایک دوسرے کو گمراہ کہتے ہیں۔ یہ خود سارے کے سارے گمراہ ہیں۔ یہودیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو ماننے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ انہیں دجال کہا۔ اور جب قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دنیا میں نزول فرمائیں گے۔ تو اصفہان کے ستر ہزار یہودی جن میں ان کے بڑے بڑے علماء بھی ہوں گے۔ اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے کی بجائے دجال کے پیچھے لگیں گے۔ اور اس کو مسیح سمجھیں گے۔ یہی لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کو (العیاذ باللہ) دجال سمجھ کر انہیں سولی پہ لٹکانے کیلئے لے گئے۔ ان کم بختوں کا یہ حال ہے۔

تحویلِ قبلہ

جب حضور علیہ السلام ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے۔ تو سولہ[16] یا سترہ[17] ماہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔ مقصد یہود کی دلجوئی تھی۔ تاکہ وہ مسلمانوں کے قریب ہوں اور دین کی طرف راغب ہوسکیں۔ تحویل قبلہ کی آیات قرآن پاک کے دوسرے پارہ کی ابتداء سے شروع ہوتی ہیں۔ مگر اس معاملے میں بھی یہودیوں نے ہٹ دھرمی کا ثبوت دیا۔ اپنے تعصب میں مبتلا رہے۔ اور مسلمانوں کے قریب نہ آئے۔ چونکہ حضور علیہ السلام کی دلی خواہش یہی تھی۔ کہ مسلمانوں کے لیے بیت اللہ قبلہ مقرر ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں تحویل قبلہ کا حکم دے دیا۔ کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں۔ بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں۔ اسی طرح یہودی اپنی ضد اور عناد کی وجہ سے اسلام سے اور دُور ہو گئے۔

عبادت میں رکاوٹ

الغرض! اللہ تعالیٰ نے ان برائیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ اس قدر عنادی ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو عبادت کرنے سے بھی روکتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِھَا ط اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوسکتا ہے۔ جو اللہ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے سے روکتا ہے اور ان کی بربادی کی کوشش کرتا ہے۔ حضرت مولانا شیخ الہندؒ

[1] ترمذی ص۴۶۶ تفسیر ابن کثیر ص۵۲ ج۴

فرماتے ہیں[1]۔ کہ اس آیت کے مصداق نصاریٰ ہیں، جنہوں نے یہود کا مقاتلہ کر کے توراۃ کو جلایا تھا۔ اور بیت المقدس کو ویران کیا تھا۔ یہ آیت مشرکین مکہ پر بھی صادق آتی ہے۔ جنہوں نے ۶ھ میں مسلمانوں کو حدیبیہ کے مقام پر روک لیا تھا۔ اور حرم پاک میں عمرہ ادا نہیں کرنے دیا تھا۔ حالانکہ مسلمان محض عمرے کی ادائیگی کے لیے آئے تھے۔ ان کا لڑائی کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ یہ تو اس وقت کے واقعات ہیں۔ یہ آیت آج بھی اُسی طرح نافذ ہے۔ جس طرح یہ اپنے نزول کے وقت تھی آج بھی جو کوئی اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے سے روکتا ہے۔ مسجد کی بربادی کا باعث بنتا ہے۔ وہ اس آیت کی رُو سے بہت بڑا ظالم ہے۔

یہودی اور نصرانی ہمیشہ ایک دوسرے کو مساجد میں جا کر عبادت کرنے سے روکتے رہے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے۔ کہ جب بھی یہود کو موقع ملا انہوں نے نصاریٰ کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ اور جب نصاریٰ کو غلبہ حاصل ہوا۔ تو ان ظالموں نے بیت المقدس کو اکھاڑ دیا۔ توراۃ کو نذرِ آتش کیا۔ اور عبادت خانوں کو برباد کیا۔ مشرکین مکہ نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا۔ مکی زندگی میں حضور علیہ السلام خانہ کعبہ میں نماز ادا نہیں کر سکتے تھے۔ مشرکین مسلمانوں کو سخت اذیتیں دیتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی پٹائی کا ذکر بخاری شریف میں موجود ہے[2]۔ ابوجہل کی حرکات کا ذکر خود قرآن پاک نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے[3]۔ "أَرَءَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ ﴿٩﴾ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ ﴿١٠﴾" کیا تم نے اس بدبخت شخص کو دیکھا، جو اللہ تعالیٰ کے بندے کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔

دوسرے مقام پر جھوٹے مدعی نبوت کو بڑا ظالم کہا گیا ہے۔ کہ اُس سے بڑا کون ظالم ہو سکتا ہے۔ جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ اُس سے بڑا کون ظالم ہے جس کے پاس خدا تعالیٰ کا نبی آئے، ہدایت کی بات پیش کرے اور وہ اس سے انکار کر دے۔ تاہم اس مقام پر ظالم کی تعریف یہ کی گئی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے گھر میں اس کی مساجد میں عبادت کرنے سے، نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔ یہ تو ظاہری رکاوٹ ہے۔ کہ کسی کو عبادت کرنے

---

[1] حاشیہ قرآن مترجم ص۲۲ مطبوعہ دار التصنیف کراچی [2] بخاری ص۵۴۵/۱ مسلم ص۲۹۷/۲ [3] بخاری ص۴/۲

سے روک دیا جائے۔ یہ عبادت خانے کی بربادی کے مصداق ہے۔ اس کے علاوہ ایک باطنی بربادی بھی ہے۔ کہ وہاں پر غیر اللہ کی پرستش کی جائے۔ بدعات کو فروغ دیا۔ ایسا کرنے سے بظاہر تو عبادت خانہ آباد ہوگا۔ مگر باطنی طور پر ہدایت سے خالی ہوگا اور یہ باطنی خرابی ہے۔

عبادت خانے قابلِ تعظیم ہیں

سورۃ حج میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عبادت خانہ یہود کا ہو یا نصاریٰ یا کسی اور کا۔ اسے[1] گرانے کا حکم نہیں ہے۔ مسلمانوں کی مساجد کا بھی یہی حکم ہے۔ ان کو گرانے یا ان کی بے حرمتی کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مگر دیکھ لیجئے ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے وقت کیا کچھ ہوا۔ مشرقی پنجاب میں پچاس ہزار مساجد کی بے حرمتی ہوئی۔ ہندوؤں اور سکھوں سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ ادھر مغربی پنجاب میں بھی یہی کچھ ہوا۔ کتنے مندر تھے جنہیں تباہ و برباد کر دیا گیا۔ دونوں فریقوں نے غلط کام کیا۔ عبادت خانے خواہ کسی سے متعلق ہوں۔ ان کی بے حرمتی نہیں ہونی چاہیئے۔

ظہور اسلام کے وقت جو عرب قبائل شرک سے تائب ہو کر ایمان کی دولت سے سرفراز ہوئے۔ انہوں نے اپنے مندر اور بت خانے خود گرا دیے تھے۔ اور وہاں پر مسجدیں تعمیر کی تھیں۔ یہاں تک تو درست ہے۔ کہ ان لوگوں نے اپنے ہی تعمیر کردہ معابد کی جگہ مسجدیں تعمیر کر لیں۔ عبادت خانے کی جگہ عبادت خانہ ہی تعمیر ہوا۔ تاہم مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں بھی غیر مسلم اقوام کی عبادت گاہوں کو نقصان نہیں پہنچایا۔ محمد بن قاسمؒ جب سندھ پر حملہ آور ہوا۔ تو ہندوؤں کے بعض مندروں کو نقصان پہنچا تھا۔ مسلمانوں نے خود اس نقصان کی تلافی کی۔ اور نقصان زدہ مندروں کو دوبارہ تعمیر کروایا۔ کیونکہ کسی کے عبادت خانے کو گرانے کا حکم ہرگز نہیں ہے۔

البتہ سلطان محمود غزنویؒ نے سومنات کے مندر کو گرا کر کوئی اچھا کام نہیں کیا تھا۔ وقتی طور پر وہاں مسجد بھی بنا دی۔ مگر وہ دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ ایک ہزار سال کے بعد ہندوؤں نے پھر وہاں پر مندر تعمیر کیا۔ راجندر پرشاد نے سوا لاکھ روپے کے عوض کابل سے مندر کا گیٹ بھی واپس منگوا کر اسی جگہ نصب کیا۔ جہاں سے اکھاڑا گیا تھا۔ ظاہر ہے۔ کہ غلط کام کا نتیجہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

ترکوں نے بھی اپنے دور میں ایا صوفیہ کا گرجا گرا کر وہاں مسجد تعمیر کر لی۔ جب انگریز

لہ سنن نسائی صـ ۱۱۴

کہ وہاں غلبہ حاصل ہوا۔ تو وہاں پر گرجا بنا۔ اب چیختے ہیں۔ کہ ہماری مسجد تھی۔ بہت بڑی لائبریری تھی۔ جو ضائع ہو گئی۔ مگر جس طرح تم نے کیا۔ اسی طرح کا جواب انہوں نے دیا۔ اب چیخنے چلانے کا کیا مطلب۔ ہاں اگر عیسائی خود مسلمان ہو کر اپنے گرجا کو مسجد میں تبدیل کر دیں۔ تو وہ جائز ہے۔ مگر کسی کے عبادت خانے کو زبردستی گرانا بالکل نامناسب ہے۔

مسجد کے آداب

جس طرح مسجد کا ظاہری طور پر پاک صاف رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح مسجد کو باطنی خرابی سے محفوظ رکھنا بھی اہل اسلام کی ذمہ داری ہے ——— باطنی خرابی یہ ہے۔ کہ مسجد کو اُس کے اصل مقصد کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ مسجد عبادتخانہ ہے۔ اس میں نماز، تلاوت، ذکر واذکار ہونا چاہیئے۔ نہ کہ دنیا کے دوسرے کاروبار۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے مسجد میں حد قائم کرنے سے منع فرمایا ہے[1]۔ مسجد میں کسی مقدمے کا فیصلہ تو ہو سکتا ہے۔ مگر ملزم کو سزا نہیں دی جا سکتی۔ کہ اس سے مسجد کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ مسجد میں لڑائی جھگڑا کرنا، فحش کلامی۔ گالی گلوچ کرنا، گندگی پھینکنا، تجارت یا لین دین کرنا۔ یہ سب مسجد کے آداب کے خلاف ہے حضور علیہ السلام نے گمشدہ چیز کا مسجد میں اعلان کرنے سے منع فرمایا[2]۔ بلکہ فرمایا کہ جو شخص مسجد میں گمشدگی کا اعلان کرے۔ اس کے حق میں یوں دعا کرو۔ کہ اللہ تعالیٰ تیری چیز تجھے واپس نہ لوٹائے[3]۔ تو نے آداب مسجد کا خیال نہیں رکھا۔ اسی طرح فرمایا[4]۔ کہ مسجد میں تجارت کرنے والے کے حق میں کہو۔ کہ اللہ تعالیٰ تجھے اس تجارت میں نفع نہ دے۔

مسجد میں شعر گوئی سے بھی منع کیا گیا ہے[5]۔ ہاں البتہ اگر کوئی اچھی بات کہتا ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتا ہے۔ تو جائز ہے۔ ایسی شعر گوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت حسانؓ بن ثابت سے منقول ہے[6]۔ موجودہ زمانے کی طرح مسجد میں ہر قسم کی شعر گوئی کی اجازت نہیں۔ جن میں عشقیہ غزلیں گائی جاتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تناشد الاشعار سے منع فرمایا۔

---

[1] ابوداؤد ص ۲۶۱ ج ۲ [2] ترمذی ص ۴۲ [3] مسلم ص ۲۱۰ ج ۱
[4] ترمذی ص ۲۱۰، دارمی ص ۲۶۶ ج ۱ [5] ترمذی ص ۴۲ [6]

مسجد کی بے ادبی کے بعض دوسرے ذرائع سے بھی منع کیا گیا ہے۔ مثلاً ابن ماجہ شریف کی روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[1] کہ چھوٹے بچوں یا کسی پاگل کو مسجد میں نہ آنے دو۔ وہ مسجد کی بےحرمتی کا باعث بن سکتے ہیں، چھوٹا بچہ پیشاب پاخانہ وغیرہ کرے گا۔ وہ ابھی شعور نہیں رکھتا ہاں جب بچہ پانچ سات سال کا ہو جائے تو مسجد میں آسکتا ہے۔

الغرض! فرمایا اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے منع کرتا ہے۔ اور مسجدوں کی بربادی کے لیے کوشش کرتا ہے۔ فرمایا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۚ ان لوگوں کا اصل میں حق ہی نہیں ہے کہ وہ مسجدوں میں داخل ہوں مگر خوف کھاتے ہوئے۔ یعنی کفار اس لائق ہی نہیں کہ مسجدوں میں داخل ہوں، سوائے اس کے کہ وہ خوفزدہ ہوں۔

خشوع وخضوع

اِلَّا خَآئِفِيْنَ کا مطلب یہ بھی ہے۔ کہ مسجد میں خشوع وخضوع کے علاوہ کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ آواز کو بلند کرنا قیامت کی نشانیوں میں سے بتایا گیا ہے[2]۔ مسجد میں چیخ و پکار اور ایسی ایسی دنیوی باتیں کرنے کی ممانعت ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے[3]۔ اِذَا مَرَرْتُمْ بِرِيَاضِ الْجَنَّةِ فَارْتَعُوْا جب تم جنّت کے باغوں میں جاؤ، تو وہاں چرچگ لیا کرو۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضور! اس سے کیا مراد ہے۔ فرمایا جب تم مسجد میں جاؤ تو وہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو۔ اس کی تسبیح وتہلیل بیان کرو۔ تلاوت کرو۔ درود پاک کا ورد کرو۔ معتکف ہو کر خاموشی سے بیٹھو۔ اگر اعتکاف کی نیت کر کے بالکل خاموش بھی بیٹھے گا۔ تو باہر کی باتوں اور کئی گناہوں سے بچے گا۔ اور اللہ تعالیٰ سے اجر بھی پائے گا۔ مگر لوگ اکثر ایسا نہیں کرتے، مسجد میں فضول گپیں مارتے ہیں۔ خشوع وخضوع سے محروم رہتے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے[4] کہ ایک وقت ایسا آئے گا۔ جب خشوع وخضوع اٹھ جائے گا۔ آپ ایک بڑی مسجد میں داخل ہوں گے، وہاں پانچسو آدمی موجود ہوں گے، مگر ان میں ایک

---

[1] ابن ماجہ ص۵۴، مجمع الزوائد ص۲۶/۲ بحوالہ طبرانی [2] ترمذی ص۳۲۲

[3] ترمذی ص۵۰۵ [4] سنن دارمی ص۷۵/۱

بھی ایسا نہیں ہو گا. جس کے چہرے پر خشوع و عاجزی کے آثار نظر آتے ہوں۔ سب فضول حرکات میں مصروف ہوں گے۔

فرمایا جو شخص مساجد میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے سے روکتا ہے۔ اور مسجد کی بربادی چاہتا ہے لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے۔ وَّلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ اور ان کے لیے آخرت میں بھی سخت عذاب ہو گا۔

استقبالِ قبلہ

اہل ایمان کو مکہ چھوڑنے کا بڑا دکھ تھا۔ پھر وہ بیت اللہ شریف کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دی۔ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ مشرق اور مغرب سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا تم جدھر بھی رخ کرو گے فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ تم اللہ کی توجہ اُدھر ہی پاؤ گے۔ لہٰذا تم کسی قسم کی گھبراہٹ محسوس نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ ہر وقت تمہارے ساتھ ہے۔

استقبال کعبہ کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ سفر کے دوران اندھیری رات یا طوفان باد و باران میں اگر قبلہ کا رُخ معلوم نہ ہوتا، تو ہر شخص جس طرف رُخ ہوتا اُسی طرح نماز ادا کر لیتا۔ ترمذی شریف میں آتا ہے[1] کہ ایسا ہی کوئی واقعہ صحابہ کرامؓ کو پیش آیا جب حضور علیہ السلام کو پتا چلا تو یہی آیت تلاوت فرمائی فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ یعنی تم نے جس طرف بھی رُخ کر کے نماز پڑھی ہے۔ سب کی نماز درست ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہے۔ اگر قبلہ کا رخ درست نہیں تھا۔ تب بھی نماز لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

جب کوئی آدمی سواری پر سفر کر رہا ہو۔ تو جس طرف بھی وہ جا رہا ہے اسی طرف نفلی نماز ادا کر سکتا ہے[2] صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں[3] کہ ایک موقع پر حضور علیہ السلام سفر پہ تھے۔ اگرچہ آپ کا رخ مبارک قبلہ کی طرف نہیں تھا۔ پھر بھی آپ نفلی نماز ادا کر لیتے تھے۔ تو ایسے ہی مواقع کے لیے فرمایا۔ کہ تمہارا رُخ جس طرف بھی ہو۔ اللہ تعالیٰ اُدھر ہی متوجہ ہے اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور سب کو جاننے والا ہے۔ وہ ہر شخص کو اس کے حالات کے مطابق بدلہ عطا فرمائے گا۔

---

[1] ترمذی صفحہ ۴۲ [2] ہدایہ صفحہ ۹۸/۱، درمختار صفحہ ۹۸/۱، قدوری صفحہ ۴۸ [3] ترمذی صفحہ ۴۱

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤی اَمْرًا
فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْلَا
یُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِیْنَاۤ اٰیَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ
مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ
یُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ
اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ ﴿۱۱۹﴾

ترجمہ: اور کہا اُن لوگوں نے کہ اللہ نے بیٹا بنالیا۔ پاک ہے اس کی ذات، بلکہ اُسی کے لیے ہے۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ سب اُسی کی اطاعت کرنے والے ہیں (۱۱۶) وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اور جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے۔ تو اُسے کہتا ہے۔ ہو جا۔ پس وہ ہو جاتی ہے (۱۱۷) اور کہا اُن لوگوں نے جو نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کیوں نہیں کلام کرتا۔ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ اسی طرح کہا اُن سے پہلے لوگوں نے ان کی بات کی طرح۔ ان کے دِل آپس میں مِلتے جلتے ہیں۔ تحقیق ہم نے ان لوگوں کے لیے آیات بیان کر دی ہیں۔ جو یقین رکھتے ہیں (۱۱۸) بے شک ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔ اور آپ سے دوزخ والوں کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا (۱۱۹)

اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے

اہل کتاب کے غلط عقائد کی بحث مسلسل چلی آرہی ہے۔ ان آیات میں ان کی ایک اور بدعقیدگی کا بیان ہے۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنالیا ہے۔ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا اس غلط عقیدے میں یہ تینوں گروہ شامل ہیں۔ یعنی

یہود، نصاریٰ اور مشرکین قَالُوا کی ضمیر ان تینوں کی طرف لوٹتی ہے۔ سورۃ توبہ میں موجود ہے
کہ یہودیوں کے ایک فرقہ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنایا ہے " وَقَالَتِ
الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ " اگرچہ تمام یہود کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ تاہم ایک گروہ ایسا ہے
جو اہلِ کتاب میں شامل ہے۔ مگر عقیدہ یہ رکھتا ہے۔ اسی طرح نصاریٰ کا عقیدہ تو واضح ہے۔
کہ یہ کھُل کر کہتے ہیں " اَلْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ " یعنی عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔
قرآن پاک نے یہ بات تصریح کے ساتھ بیان کی ہے۔ کسی مخلوق کو خدا کا بیٹا بنانا اتنا قبیح فعل
ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے، اس کے حکم سے زمین و آسمان پھٹ جائے۔ اور خدا تعالیٰ
کا قہر نازل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی بات منسوب کرنا بڑی بیہودہ بات ہے مشرکینِ
عرب کے متعلق تصریح موجود ہے۔ کہ وہ فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے " وَجَعَلُوا
الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا "

اس باطل عقیدے کے رد میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا سُبْحٰنَهٗ اللہ کی ذات پاک ہے
مبرا اور منزہ ہے۔ بیٹے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا دو وجوہ سے معیوب ہے۔ اگر بیٹا
غیر جنس کا ہو تو یہ انسان کے لیے عیب ہے۔ اور اگر ہم جنس ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے عیب ہے
کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، فردانیت اور یگانگت کے خلاف ہے۔

مخلوق کے لیے اولاد کا ہونا اس لیے معیوب نہیں۔ کہ مخلوق عاجز ہے۔ اسے اولاد کی
ضرورت ہے۔ خاص طور پر انسان اولاد کے بڑے مشتاق ہوتے ہیں اولاد کی عدم موجودگی
میں انہیں سلسلہ نسب منقطع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ آخری عمر میں خدمت سے
محروم ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے اللہ تعالیٰ تو اَحَد ہے۔ اس کی صفت تو غنی ہے۔
وہ صمد ہے: وہ ہر ایسی چیز سے بے نیاز ہے۔ لہذا اس کی طرف اولاد کی نسبت کرنا بہت
بُری بات ہے۔

یہ حقیقت بھی قابل غور ہے۔ کہ اولاد کی پیدائش اس کے باپ کے مادہ سے ہوتی ہے
جو اس کے جسم سے الگ ہو کر رحم مادر میں منتقل ہوتا ہے۔ اور پھر وہ بچے کی صورت میں ماں
کے جسم سے علیحدہ ہوتا ہے۔ تو اس قسم کی تولید کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا بہت

قبیح حرکت ہے۔ کیونکہ اللہ جل شانہٗ ہر ایسی چیز سے منزہ ہے۔ سُبْحٰنَہٗ سے یہی مراد ہے۔

تشبیہ اور شرک

جب انسان کے عقیدے میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی معرفت میں نقصان آتا ہے۔ تو اس کے نتیجے میں یا تو تشبیہ آتی ہے۔ یا شرک پیدا ہوتا ہے۔ تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ مخلوق کی صفت اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کی جائے۔ جیسے اولاد والا ہونا مخلوق کی صفت ہے اگر یہی صفت اللہ تعالیٰ میں ثابت کی جائے تو یہ تشبیہ کا ارتکاب ہو گا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی صفتِ مختصہ کو مخلوق میں ثابت کیا جائے، تو شرک ہو جائے گا۔ مثلاً قادرِ مطلق، علیمِ کُل اللہ تعالےٰ کی ذات ہے۔ اور اگر یہی صفت کسی مخلوق میں مانی جائے۔ تو شرک ہو گا۔ سُبْحٰنَہٗ کا لفظ اللہ تعالیٰ کی اسی پاکیزگی پر دلالت کرتا ہے۔

سُبْحٰنَہٗ کا معنیٰ

صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السلام سے سُبْحٰنَہٗ کا مطلب پوچھا تو آپ نے فرمایا[1]۔ تَنْزِیْہُ اللّٰہِ مِنْ کُلِّ سُوْءٍ ہر قسم کی برائی اور عیب سے پاکیزگی۔ کسی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے دریافت کیا کہ حضرت اَللّٰہُ اَکْبَرُ کا معنیٰ تو ہم جانتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بڑا ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا مطلب بھی سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں" اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا معنیٰ یہ ہے۔ کہ سب حمد و ثنا اور تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ حضرت سُبْحٰنَہٗ کا مطلب آپ سمجھا دیں۔ آپ نے جواب دیا۔ یہ کون سی مشکل بات ہے۔ سُبْحٰنَ اللّٰہِ ایک ایسا کلمہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف کے لیے منتخب فرمایا ہے اور فرشتوں کو بھی حکم دیا ہے۔ کہ اس کلمے کے ساتھ میری تعریف کیا کرو۔ الغرض! یہ چاروں کلمات یعنی اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور سُبْحٰنَ اللّٰہِ خدا تعالیٰ نے اپنی تعریف کے لیے مقرر فرمائے ہیں مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے۔ تمام تعریفیں اسی ذات کے لیے ہیں۔

مالک اور مملوک

فرمایا اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ بَلْ لَّہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ یعنی یہ تمام چیزیں مملوک ہیں اور اللہ جل شانہٗ ان کا مالک ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ اور انسان میں باپ اور بیٹے کی نسبت نہیں

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۴۲۲ پارہ ۱، در منثور صفحہ ۱۱۱ جلد ۱

ہے۔ بلکہ مالک اور مملوک کی نسبت ہے۔ اور پھر مالک بھی ایسا ہے، جسے ہر قسم کا اختیار حاصل ہے اور اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ سب اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ اس کے تکوینی حکم کی خلاف ورزی کی کسی میں مجال نہیں۔ وہ کسی کو بیمار کر دے۔ بیمار کو تندرست کر دے کسی پر موت طاری کر دے۔ اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ کائنات کی ہر چیز کو اس کی فرمانبرداری کرنا ہوگی۔

ہاں شریعت کے احکام ایسے ہیں، جسے انسان ٹال سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے نماز پڑھو، زکوٰۃ ادا کرو۔ جہاد کرو۔ انسان ان احکام پر عملدرآمد میں کوتاہی کر سکتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے تکوینی حکم کے سامنے سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ جب موت کے فرشتے آجاتے ہیں۔ تو پھر کون ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے حکم کو ٹال سکے۔ خود مرنے والا اور اس کے سارے حمایتی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا تکوینی حکم پورا ہو جاتا ہے۔ گویا یہاں پر اللہ تعالیٰ کی دو صفات کا ذکر ہوا۔ اوّل یہ کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ اور دوسری یہ کہ وہ ہر چیز کا متصرف بھی ہے۔ جو چاہے کرے اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی۔

صفتِ ابداع

اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی تیسری صفت ابداع کا ذکر بھی ہے۔ فرمایا بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وہ آسمانوں اور زمین کا ایجاد کرنے والا ہے۔ ابداع اس تخلیق کو کہتے ہیں۔ جس کا پہلے نمونہ موجود نہ ہو۔ کہ جسے دیکھ کر کوئی چیز تیار کی جا سکے۔ اور پھر موجد بھی ایسا ہے کہ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا جب کسی کام کے کرنے ـــــ کا فیصلہ کرتا ہے۔ فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ تو وہ کہتا ہے ہو جا فَيَكُوْنُ پس وہ ہو جاتی ہے۔ یہ کُن ایسا لفظ ہے۔ جس میں سرعت اور تیزی کا حکم پایا جاتا ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ کُن فرماتے ہیں۔ تو کسی چیز کے معرضِ وجود میں آنے کے لیے نہ کسی مادے کی ضرورت پڑتی ہے۔ نہ ڈیزائن مطلوب ہوتا ہے۔ اور نہ کسی کاریگر یا مددگار کی مدد درکار ہوتی ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم صادر ہوتے ہی کام ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ کُن کا لفظ بھی محض تعبیر کے لیے ہے۔ ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرما لیتے ہیں، کہ کون سی چیز کس سطح پر مطلوب ہے۔ تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف غلط نسبت

اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرنا سخت بے ادبی اور گستاخی ہے۔ یہ بے محل اور فضول بات ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اور منزہ ہے۔ اس کی چار صفات کا بیان بھی

ہو گیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے[1]۔ کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کَذَّبَنِی ابْنُ اٰدَمَ وَلَمْ یَکُنْ لَہٗ ذٰلِکَ انسان مجھ کو جھٹلاتا ہے۔ حالانکہ اس کے لیے یہ بات مناسب نہیں۔ اور انسان مجھ کو گالی دیتا ہے۔ حالانکہ یہ بھی اس کے مناسب حال نہیں۔ پھر فرمایا کہ فَاَمَّا تَکْذِیْبُہٗ اِیَّایَ اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ لَنْ یُّعِیْدَنِیْ کَمَا بَدَأَنِیْ انسان کہتا ہے کہ مجھے دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا۔ جس طرح کہ پہلی مرتبہ کیا۔ یعنی انسان قیامت کا منکر ہے یہ اللہ تعالیٰ کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ اور گالی اس لحاظ سے دیتا ہے۔ کہ وہ میری طرف اولاد کی نسبت کرتا ہے۔ حالانکہ نہ میری بیوی ہے اور نہ اولاد ہے۔ اور نہ ہی مجھے انکی ضرورت ہے۔ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنا لیا ہے۔ تو وہ گویا خدا تعالےٰ کو گالی دیتا ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ

ظاہر ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حقیقی بیٹا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو۔ تو وہ خدا کا جز ہو گا اگر خدا تعالیٰ کا جز مانا جائے گا۔ تو خدا تعالیٰ خود بھی حادث ہو گا۔ بسیط نہیں رہے گا۔ اسی طرح مجازاً بھی کسی کو خدا کا بیٹا نہیں کہہ سکتے۔ کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا اس قدر قرب حاصل کرلے کہ بیٹے کی طرح ہو جائے۔ بیٹا چونکہ متصرف ہوتا ہے۔ وہ باپ کی مرضی کے خلاف بھی کوئی کام کر سکتا ہے۔ بعض اوقات باپ کو مجبوراً بیٹے کی بات ماننا پڑتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی صفت تو یہ ہے کُلٌّ لَّہٗ قَانِتُوْنَ سب کے سب اُس کے مطیع ہیں۔ اُس پر کوئی بھی تصرف نہیں کر سکتا۔ لہٰذا یہ بات بھی غلط ہے۔ کہ کسی کو مقرب الٰہی ہونے کی بنا پر خدا تعالےٰ کا بیٹا تسلیم کر لیا جائے۔ جیسا کہ عیسائیوں میں یہ چیز پائی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے کلام کی خواہش

ایک اور غلط بات جو بعض لوگ کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ علم سے عاری، جاہل لوگ کہتے ہیں لَوْلَا یُکَلِّمُنَا اللّٰہُ اللہ تعالیٰ ہم سے براہ راست کلام کیوں نہیں کرتا۔ اَوْ تَاْتِیْنَآ اٰیَۃٌ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی، جس کی بنا پر ہم اللہ تعالیٰ کے نبی اور اس کی کتاب کی تصدیق کر سکیں۔ مفسرین کرام بیان کرتے ہیں[2]۔ کہ مشرکین میں

---

[1] بخاری صفحہ ۷۴۴ ج ۲
[2] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۱۶۱ ج ۱، درمنثور صفحہ ۱۱۰ ج ۱

سے ایک شخص رافع ابن حریملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگا۔ آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ تو آپ دعا کریں۔ کہ اللہ تعالیٰ ہم سے براہ راست کلام کرے یا وہ کوئی خاص نشانی ہمارے پاس بھیجے جسے دیکھ کر ہم تصدیق کریں۔ فرمایا یہ بیوقوفی اور حماقت کا سوال ہے۔ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِہِمۡ اس طرح کی باتیں تو ان سے پہلے لوگوں نے بھی کی تھیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بلکہ پرانا بیہودہ سوال ہے۔ آج کے دور کے کافر مشرک اور جاہل لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ کہ فلاں نشانی ہونی چاہیئے۔ یا اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کلام کیوں نہیں کرتا۔ فرمایا تَشَابَہَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ اس قماش کے تمام اگلے پچھلے لوگوں کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ اسی لیے تو وہ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ اور لایعنی سوال پیش کرتے ہیں۔

حضور علیہ السلام کے معجزات

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یہ لوگ کون سی نشانی طلب کرتے ہیں حالانکہ قَدۡ بَیَّنَّا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ہم نے تو یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے بے شمار نشانیاں یا معجزات دکھائے ہیں۔ کسی ایک آدھ نشانی کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دست مبارک پہ تقریباً تین ہزار معجزات ظاہر فرمائے۔ اور یہ سارے ان لوگوں کے سامنے ہیں۔ کیا شق القمر کا معجزہ کوئی ڈھکی چھپی بات ہے۔ کیا ان لوگوں نے کھجور کے خشک تنے کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ کی انگلیوں سے پانی کی نہریں جاری ہوجانا کس کے علم میں نہیں یہ سب کچھ ان لوگوں کے سامنے ہے۔ مگر یہ نشانیاں انہی لوگوں کو نظر آتی ہیں۔ جو یقین رکھتے ہیں اور جن کے دل میں ایمان کی دولت موجود ہے۔ وہ سمجھ چکے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں اور جن کے دل میں عناد ہے اس قسم کی بے معنی باتیں وہی کرتے ہیں۔ البتہ نبی کے دل میں تکلیف ہوگی۔ غم لاحق ہوگا۔ کہ اتنی واضح نشانیاں موجود ہونے کے باوجود یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی پہ اڑے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے براہ راست باتیں کرکے فرشتوں کی صف میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ یا اپنے آپ کو انبیاء علیہم السلام کے برابر سمجھتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ ان سے بات کرے۔ یہ سب ناجائز مطالبات ہیں

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے تسلی

جب کوئی شخص تمام تر نشانیاں دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لائے۔ تو یقیناً دل میں افسوس

پیدا ہو گا۔ حضور علیہ السلام کے ساتھ یہی معاملہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا "اے پیغمبر! ہم نے آپ کو حق کے ساتھ نبی اور رسول بنا کر بھیجا ہے۔ آپ اپنی امت کے لیے بشیر اور نذیر ہیں۔ یعنی آپ اہل ایمان کو جنت کی خوشخبری سناتے ہیں۔ اور منکرین کو دوزخ کی وعید بھی سناتے ہیں۔ جو لوگ آپ کا انکار کرتے ہیں۔ وہ لازماً اللہ تعالیٰ — کی گرفت میں آئیں گے۔ آپ ان کی حرکات پر غمگین نہ ہوں۔ اور نہ ہی ان کے دوزخ میں جانے پر کوئی قلق محسوس کریں۔ کیونکہ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ آپ سے دوزخیوں کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ کہ یہ لوگ جہنم میں کیوں گئے۔ بلکہ اُلٹا ان سے سوال ہو گا "مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ" اللہ تعالیٰ پوچھے گا۔ تمہاری جہنم رسید ہونے کی کیا وجہ تھی۔ پھر وہ خود ہی اس کا جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔ مسکین سے ہمدردی نہیں کرتے تھے۔ فضولیات میں لگے رہتے تھے۔ اور روزِ قیامت کی تکذیب کرتے تھے۔ لہٰذا آپ اُن کی حرکات سے دل برداشتہ نہ ہوں "اِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ" آپ کا کام صرف سمجھانا ہے باقی ان سے ہم خود نپٹ لیں گے۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ
اِنَّ ھُدَى اللّٰهِ ھُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَاۗءَھُمْ بَعْدَ
نصف منزل الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ
﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰھُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ
ع ۱۴ ۹ ۱۴ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾
يٰبَنِىْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ
وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ
عَنْ نَّفْسٍ شَـيْـــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ
وَّلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

ترجمہ: اور ہرگز راضی نہ ہونگے آپ سے یہودی اور نصرانی یہاں تک کہ آپ اُن کی ملّت کا اتباع کریں۔ آپ کہہ دیجئے بیشک اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ اور آپ نے اگر ان کی خواہشات کا اتباع کیا۔ بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے۔ تو نہیں ہوگا۔ آپ کے لیے اللہ کی طرف سے کوئی حمایتی اور مددگار ﴿۱۲۰﴾ جن کو ہم نے کتاب دی ہے۔ وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے۔ یہی لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو کوئی اس کے ساتھ کفر کرے گا پس یہی لوگ نقصان اٹھانیوالے ہیں ﴿۱۲۱﴾ اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمتیں یاد کرو، جو میں نے تم پر کیں۔ اور یہ بات کہ بیشک میں نے تم کو جہان والوں پر فضیلت بخشی ﴿۱۲۲﴾ اور ڈرو اس دن سے کہ نہ کام آئے گا کوئی نفس کسی کی طرف سے ذرا بھی۔ اور نہ قبول کیا جائے گا اُس سے بدلہ۔ اور نہ اُس کو سفارش فائدہ دیگی۔ اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ﴿۱۲۳﴾

گذشتہ سے پیوستہ

یہود و نصاریٰ کی خرابیاں مختلف انداز میں بیان ہو رہی ہیں۔ اس سے پیشتر اس بات کا ذکر بھی آچکا ہے۔ کہ اہل کتاب چاہتے ہیں۔ کہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، وہ بھی پہلے دین یعنی یہودیت یا نصرانیت کی طرف پلٹ آئیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ اہل ایمان کمزور ہو جائیں۔ اگرچہ اُن پر حق واضح ہو چکا ہے۔ تاہم وہ حسد کی بنا پر نبی آخر الزمان پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض باتوں میں موافقت بھی کرتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ شاید یہ لوگ ہمارے ہو کر ایمان لے آئیں۔ چنانچہ مسلمان بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ ہجرت کے بعد بھی سولہ ۱۶ سترہ ۱۷ ماہ تک قبلہ بیت المقدس ہی رہا۔ مگر بعد میں یہی معلوم ہوا۔ کہ مشرک تو نادانی کی وجہ سے حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور اہل کتاب حسد اور عناد کی بنا پر ایسا کرتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مشرک یا تو ختم ہو گئے یا ایمان قبول کر لیا۔ مگر یہود و نصاریٰ باطل پر اڑے رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو خبردار کیا ہے۔ کہ اہل کتاب سے آپ کوئی اُمید نہ رکھیں۔ یہ دیدہ و دانستہ حق کی مخالفت کر رہے ہیں۔

رضامندی کے لیے اہلِ کتاب کی شرط

اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى یہودی اور نصرانی آپ پر ہرگز راضی نہیں ہوں گے حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ جب تک کہ آپ اُن کی ملّت کا اتباع نہ کریں۔ اُن کا مذہب اختیار نہ کریں۔ اور اُن کا طریقہ نہ اپنائیں لفظ لَنْ تاکیدِ نفی کے لیے آتا ہے۔ یعنی ہرگز راضی نہیں ہوں گے اہلِ کتاب کو حق بات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ تو مسلمانوں کو اپنے دین سے منحرف کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خود ہدایت قبول نہیں کریں گے۔ اہلِ کتاب کی جملہ خرابیاں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آخری بات کی۔ کہ آپ ان سے کوئی امید وابستہ نہ کریں کہ شاید یہ ایمان لے آئیں گے۔ بلکہ یہ تو اُلٹا مسلمانوں کو اپنے دین پر لانا چاہتے ہیں۔ جو کہ ناممکن ہے۔

ہدایت الٰہی ہی اصل ہدایت ہے

فرمایا یہ لوگ جس ملّت پر آپ کو لانا چاہتے ہیں۔ وہ اُن کی خود ساختہ بات ہے قُلْ آپ اُن سے فرما دیجئے اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے اگر آپ ہدایت الٰہی کو چھوڑ کر اُن کی ملّت کا اتباع کریں گے تو یہ ہوا کی پیروی بن جائیگی۔ جو کہ ہدایت کی ضد ہے۔ اور اگر حق واضح ہونے اور علم آجانے کے بعد آپ اُن کی خواہشات کا

اتباع کرنے لگیں وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ اللہ کی طرف سے آپ کا کوئی حمایتی ہو گا اور نہ مددگار۔ یعنی اے نبی علیہ السلام اور اہلِ ایمان اب تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہدایت آچکی ہے۔ اگر اس کو چھوڑ کر اہلِ کتاب کی خواہشات کے پیچھے چلنے لگے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کی گرفت بھی آسکتی ہے۔ اگرچہ یہ آپ سے قطعاً ممکن نہیں کہ حق کو ترک کر دیں تاہم قانون کے طور پر اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی۔ کہ اصل ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے۔ اُسی کی پیروی کرنا ہے۔ اور کسی دوسری چیز کے پیچھے نہیں چلنا۔ یہ قاعدہ سب کے لیے ہے۔ اور اس سے کوئی بھی بری الذمہ نہیں۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا "لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ" اگر آپ سے بھی شرک سرزد ہو گیا، تو آپ کے بھی سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ اور آپ نقصان اٹھانے والوں میں ہوں گے۔ یہ اصول صرف حضور علیہ السلام کے لیے ہی نہ تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام پر یہی وحی بھیجی۔ کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ لہٰذا آپ حق کی پیروی کرتے رہیں۔ اور اہلِ کتاب کی خواہشات کی طرف توجہ نہ دیں۔

یہود و نصاریٰ کا دین اصلاً تو کتابِ الٰہی کے ذریعے ہی نازل ہوا تھا۔ اور وہ برحق تھا۔ مگر اب اُن کی ملت تحریف کی وجہ سے بگڑ چکی تھی۔ لہٰذا اب وہ قابلِ اتباع نہیں رہی۔ بلکہ اب تو آخری نبی کا دین غالب آئے گا۔ وہی قابلِ اتباع ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا "هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَي الدِّيْنِ كُلِّهٖ" خدا تعالیٰ وہ رحیم و کریم ذات ہے۔ جس نے اپنے آخری نبی کو سچا دین دے کر بھیجا ہے۔ تاکہ اس دین کو باقی ادیان پر غالب کر دے جب مقصد رسالت دیگر ادیان پر غالب ٹھہرا تو یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ علم اور حق کی آمد کے بعد اہلِ کتاب کی خواہشات کی پیروی کی جائے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے[ل] کہ کسریٰ کی ہلاکت کے بعد کوئی دوسرا کسریٰ پیدا نہیں ہو گا۔ اور قیصر کی ہلاکت کے بعد کوئی دوسرا قیصر نہیں ہو گا۔ مگر رومی یعنی عیسائی

ل ترمذی ص۳۲۲، مسلم ص ۳۹۶/۲

نزولِ مسیح علیہ السلام تک باقی رہیں گے۔ اور تم ان تمام سے بادست وگریبان رہو گے۔ کبھی ان کو غلبہ حاصل ہوگا۔ اور کبھی تم غالب آؤ گے۔ گویا یہ لوگ قربِ قیامت تک باطل پہ ڈٹے رہیں گے۔ لہذا ان سے قبولِ حق کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔

اہلِ کتاب میں سے اہلِ ایمان

اس مقام پہ اللہ تعالٰے نے ایک اصولی بات بیان فرمائی ہے۔ کہ جب کسی قوم کی برائی بیان کی جاتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس قوم کے سو فیصد لوگ ایسے ہی ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ ان کی اکثریت ان صفات کی حامل ہے۔ ان میں بعض اچھے بھی ہو سکتے ہیں۔ یہاں پہ یہی چیز بتائی جا رہی ہے۔ کہ اگرچہ اہلِ کتاب کی اکثریت ایسی ہے۔ جو اپنی ہٹ دھرمی پہ ڈٹی ہوئی ہے، تاہم اُن میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ جنہیں ہم نے کتاب عطا کی ہے۔ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ جو اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے۔ اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں توراۃ اور انجیل پہ ایمان رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ جو لوگ سابقہ کُتبِ سماویہ پر صحیح معنوں میں ایمان رکھیں گے۔ وہ نبی آخر الزمان کا انکار کیسے کر سکتے ہیں۔ کیونکہ توراۃ و انجیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی واضح نشانیاں موجود ہیں۔ اور جو حضور علیہ السلام پر ایمان لائے گا۔ وہ قرآن پہ بھی ایمان لائے گا۔ یہ ساری کی ساری کتابیں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں اور ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ مسلمان تو تمام کُتبِ سماویہ پہ ایمان رکھتے ہیں۔ مگر یہ کم بخت قرآن پاک پر ایمان نہیں لاتے۔ بہرحال فرمایا۔ کہ اہلِ کتاب سارے کے سارے بے ایمان نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بھی ایسے ہیں جو کتاب کو صحیح طور پہ پڑھتے ہیں۔ لہذا ایسے لوگ ایمان دار ہیں۔

حقِ تلاوت

تلاوت کا حق ادا کرنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس کے احکام پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ جو شخص زبانی تلاوت تو کرے مگر اس کے احکام کی پرواہ نہ کرے یا اس کے احکام کو توڑ موڑ کر پیش کرے یا اس کی غلط تاویل کرے۔ جیسا کہ اہلِ کتاب کرتے تھے۔ تو ایسے شخص نے تلاوت کا حق ادا نہیں کیا۔ قرآن پاک کی تلاوت میں بھی یہی اصول کار فرما ہے مستدرک حاکم کی روایت میں آتا ہے۔[1]

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۴۲۳ پارہ ۱، در منثور ص ۱۱۱ ج ۱

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ حق تلاوت یہ ہے کہ کتاب کی حلال کردہ چیز کو حلال اور حرام کردہ چیز کو حرام سمجھے۔ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے۔ اُس شخص کا کوئی ایمان نہیں مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهٗ جس نے قرآن پاک کی حرام کردہ چیز کو حلال سمجھ لیا۔ لہذا لازم ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے حلال و حرام کی پوری پوری پاسداری کی جائے۔ یہودیوں کی طرح اس کے الفاظ اور کلمات میں تحریف نہ کی جائے۔ کتاب الٰہی کے محکم اور متشابہات تمام آیات پر ایمان ہونا چاہیئے محکمات میں مستحبات بھی آتی ہیں۔ ان پہ بھی یقین ہونا چاہیئے۔ اور عمل کرنا چاہیئے۔ یہ حق تلاوت ہے۔ ایمان لانے کے بعد احکام کا اتباع بھی ضروری ہے۔ اگر عمل نہیں کرتا تو اس نے حق تلاوت ادا نہیں کیا۔

منکرین کیلیے خسارہ

فرمایا وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ کفر کرے گا۔ یعنی اس کی تلاوت کا حق ادا نہیں کرے گا۔ اس کے احکام کو چھپائے گا۔ اس کی غلط تاویلیں کرے گا۔ جیساکہ یہودی کرتے تھے فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ پس یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں اس دنیا میں تو شاید سزا سے بچ جائیں گے۔ مگر ان کا انجام کار بُرا ہوگا۔ اور آخرت میں یہ "لازماً" خسارہ اپانے والوں میں ہوں گے۔ اُس وقت انہیں معلوم ہوگا۔ کہ انہوں نے احکام میں تحریف کرکے اور کتمانِ حق کے ذریعہ کتنا نقصان دِہ سودا کیا تھا۔

حق و باطل کی پہچان

اہلِ کتاب کے دو گروہوں کا ذکر ہوا۔ ایک گروہ وہ ہے جس کی برائیاں مسلسل بیان ہو رہی ہیں اور جو اپنی ضد و عناد کی وجہ سے ایمان سے محروم ہوا۔ دوسرا وہ گروہ ہے۔ جو کتاب کو صحیح طریقے سے پڑھتا ہے۔ اور پھر اس میں تحریف کرنے کی بجائے اس کے احکام پر ایمان لاتا ہے۔ انہیں لوگوں میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ ہیں۔ یہودی عالم تھے۔ مگر منصف مزاج تھے حضور علیہ السلام سے پہلی ملاقات میں ہی ایمان قبول کر لیا۔ یہ بار بار کہتے تھے۔ کہ مجھے یقین ہے۔ کہ آپ ہی اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ جن کی بشارت کُتبِ سابقہ میں آچکی ہے۔ ان کی اکثریت متعصب تھی۔ جنہوں نے ایمان قبول نہیں کیا اور آج تک اسی ڈگر پہ چلتے آ رہے

ا ترمذی ص۴۱۴

ہیں۔ ان میں سے کوئی اکّا دکّا ایسا نکلتا ہے۔ جو تعصب کو بالائے طاق رکھ کر کتاب کا مطالعہ کرتا ہے۔ اور پھر حق کو قبول کرتا ہے۔

انہی میں ایک حق پرست محمد اسد (لیوپولڈ) ہیں۔ یہ بھی یہودی عالم تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انگریزی زبان میں روڈ ٹو مکہ (ROAD TO MAKKAH) یعنی مکہ کی طرف سڑک انہیں کی کتاب ہے انہوں نے ایک اور کتاب اسلام ایٹ کراس روڈ (ISLAM AT CROSS ROAD) یعنی اسلام چوراستے پر بھی لکھی ہے۔ بڑے سمجھدار اور تجربہ کار ہیں۔ کچھ عرصہ پاکستان میں بھی قیام کیا ہے۔ آجکل اُدھر یورپ میں ہی کہیں مقیم ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمان کی دولت سے نوازا۔ محمد پکھتال عیسائی دانشور تھے۔ انہوں نے قرآن پاک کا مستند ترجمہ کیا ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ اسی طرح ملکہ وکٹوریہ اول کے زمانے میں مسٹر کویلم تھے۔ آپ کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے۔ وہ وضوء کے طریقہ سے متاثر ہوئے۔ اور کہا کہ یہ طریقہ یقیناً ایک سچے مذہب کا ہی ہو سکتا ہے۔ اُس نے اپنے خاندان کے اسی اشخاص کو مسلمان بنایا۔ عیسائی بڑے ناراض ہوئے۔ تاہم وہ اپنا کام کر گیا۔ بلکہ اُس نے عیسائیوں کو ہمیشہ مناظرہ کی دعوت دی۔ پیشے کے لحاظ سے بیرسٹر تھا۔ کوئی اس کے مقابلے پر نہیں آتا تھا اس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔

الغرض! یہود و نصاریٰ کی اکثریت عنادی رہی ہے۔ ان میں سے بہت کم لوگ ایمان لائے۔ یہ لوگ سازشی ہیں۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق ہمیشہ غلط پراپگنڈا کر کے لوگوں کو بدظن کرتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ رہی ہے۔ کہ کوئی مسلمان یہودی یا عیسائی نہ بھی بن سکے تو کوئی بات نہیں۔ اُسے کم از کم مسلمان نہیں رہنا چاہیئے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے۔ کہ مسلمان کو بے دین ضرور بنا دیں۔ اپنے دین پر اس کا عقیدہ متزلزل کر دیں۔ اور اس طرح ان کا رشتہ اپنے پیغمبر کے ساتھ کٹ جائے۔ یہ ان کی سازش ہے۔ جس کا شکار مسلمان ہر دور میں ہوتے رہے ہیں۔

بنی اسرائیل پر انعامات

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی تقریباً چالیس برائیوں کی نشاندہی کے بعد انہیں آخر میں ناصحانہ انداز میں انعامات یاد کرائے۔ اور فرمایا یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا اے بنی اسرائیل یاد کرو نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ میری اُن نعمتوں کو جو میں نے تم پر انعام کیں۔

وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ اور میں نے تمہیں جہان والوں پر فضیلت دی۔ بنی اسرائیل پر انعامات اور ان کی فضیلت کا تذکرہ ان دروس میں تفصیلاً آچکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک مرتبہ پھر یاد دہانی کرائی۔ مگر یہ ایسی ناشکر گذار قوم ہے۔ کہ حسد کی آگ میں جل کر تمام احسانات فراموش کر گئی۔

قیامت کا نقشہ

فرمایا اے بنی اسرائیل! تم نہ سمجھنا کہ ان تمام برائیوں کے باوجود تم آخرت میں کسی نہ کسی طریقے سے سرخرو ہو جاؤ گے۔ وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا اس دن سے ڈرو جس دن کوئی کسی کے کچھ کام نہ آسکے گا۔ اُس دن انسان کے بچاؤ کے تمام ذرائع خواہ وہ قوت کے ذرائع ہوں یا گریہ وزاری کے سب ناکام ہو جائیں گے۔ وَلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ اور نہ اس سے بدلہ قبول کیا جائے گا۔ دنیا میں تو مال یا جان یا کسی فدیہ کے بدلے کوئی جان چھڑائی جا سکتی ہے۔ مگر قیامت کے دن مجرم سے کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی۔ صرف اسکی اپنی جان ہی قابلِ مواخذہ ہوگی۔ فرمایا وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ اس دن کسی کی سفارش بھی سود مند نہیں ہوگی۔ اس دن کوئی کسی بدبخت کی سفارش بھی نہیں کرے گا۔ تمہارا یہ عقیدہ باطل ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تمہیں دوزخ میں گرنے سے بچا لیں گے۔ سفارش تو ایماندار کی ہو سکتی ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت سے۔ جس سفارش کے زعم میں اے بنی اسرائیل! تم مبتلا ہو، اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے اب بھی سمجھ جاؤ۔ اور ایمان قبول کر لو۔

فرمایا جب اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آجائے گا تو پھر وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ان کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ اللہ رب العزت کی عدالت میں ٹھیک ٹھیک فیصلے ہوں گے۔ اُن فیصلوں کو بدل کر مجرمین کی مدد کرنے والی کوئی ہستی نہیں ہوگی۔ اگلی آیات میں ملت ابراہیمی کی تاسیس سے شروع کر کے حضور علیہ السلام کی نبوت اور آپ کی صداقت کا بیان ہے۔

صبر کیا۔ مگر جس وقت ہمیں رعتوں کے ساتھ آزمایا گیا ہم صبر نہ کر سکے گویا ابتلیٰ کا معنیٰ آزمائش ہے۔

یہاں پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ آزماتا تو وہ ہے۔ جسے کسی کی اہلیت یا کارکردگی کا علم نہ ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ تو علیم کل ہے۔ وہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے بھی جانتا تھا کہ آپ کس حیثیت اور قدر و منزلت کے نبی ہوں گے۔ اور پھر جس قدر بھی آپ میں اوصاف پائے جاتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی کے عطا کردہ تھے۔ تو ان حالات میں خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کا کیا مطلب؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ آزمائش کی غرض وغایت یہ بھی ہوتی ہے کہ کسی کو آزمائش میں ڈال کر اس کی حیثیت کو دوسروں پر واضح کیا جائے۔ امتحان لینے والے کو تو علم ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت کیا ہے مگر دوسرے لوگ اس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ لہذا امتحان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے امتحان کی یہی غرض و غایت ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام دنیا والوں پر ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ کہ جس ہستی کو میں نے اپنا خلیل منتخب کیا ہے۔ اس میں کیا خوبیاں ہیں۔ جن کی بنا پر انہیں بلند مقام حاصل ہوا ہے۔ الغرض اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے۔ وہ چاہے تو انبیاء علیہم السلام کا امتحان لے لے۔ اور نہ چاہے تو ایک گنہگار کو معاف کر دے۔ بہر حال یہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائشوں کا ذکر ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وطن مالوف

حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل کے مقام اُر میں پیدا ہوئے جو موجودہ بغداد سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اُس زمانے میں بابل آشوریوں کا دار السلطنت اور بڑا متمدن ملک تھا۔ یہ شہر کلدانیوں کا پایۂ تخت بھی رہا۔ مگر زمانے کی دست برد کے آگے ٹھہر نہ سکا۔ اور تباہ و برباد ہو گیا اب اس کے کھنڈرات سے اس زمانے کی اشیا نکال نکال کر انہیں عجائب گھروں میں تبدیل کر رہے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح کے کھنڈرات ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں ٹیکسلا کے کھنڈرات ہیں۔ اسی طرح کے بعض مقامات سندھ میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں کے کھنڈرات سے پرانی تہذیبوں کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وطن مالوف بابل تھا۔ جس کے اب کھنڈرات ہی باقی رہ گئے ہیں۔ مگر اپنے زمانے میں یہ بہت بڑا شہر اور تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔

---

[1] معالم التنزیل صفحہ ۴۸ جلد ۱، تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۴۳۶ پارہ ۱

پہلی آزمائش قوم سے مقابلہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مختلف آزمائشوں کے لیے یہاں پر کلمٰت کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ جمع کا صیغہ ہے۔ تاہم مبہم ہے۔ مفسرین کرام بہت سی آزمائشوں کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ کی آزمائش کا پہلا مرحلہ اس وقت شروع ہوتا ہے۔ جب آپ نے ہوش و حواس سنبھالا اور ارد گرد کے ماحول مطالعہ کیا۔ قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں آپ کے جو واقعات بیان ہوئے ہیں۔ ان کے مطابق سب سے پہلے آپ کی اپنے والد، قوم اور بادشاہِ وقت کے ساتھ کشمکش پیدا ہوئی۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کو اوائلِ عمر میں ہی رشد و ہدایت سے نوازا تھا۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ "وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ رُشۡدَهٗ" ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو سمجھ عطا کی۔ چنانچہ آپ نے اپنے مشرکانہ ماحول کا یہ اثر لیا کہ آپ شرک اور کفر سے متنفر ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے کفر و شرک کی مذمت بیان کرنا شروع کی۔ خاندان، قوم اور بادشاہ سب آپ کے دشمن ہو گئے۔ یہاں تو معمولی تنازعہ ہو جائے تو لوگ بھاگ جاتے ہیں۔ مگر آپ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ اور آپ پچاس ساٹھ سال تک اپنے ماحول کے سامنے سینہ سپر رہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کے عبادت خانہ میں جا کر سارے بتوں کو توڑ دیا۔ تو آپ کے خلاف ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک مخالف تو پہلے ہی تھے اب انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے بتوں کی توہین ابراہیم علیہ السلام کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ بادشاہ قوم کے ساتھ تھا۔ لہٰذا فیصلہ یہ ہوا۔ "حَرِّقُوۡهُ وَانۡصُرُوۡۤا اٰلِهَتَكُمۡ" یعنی ہمارے معبودوں کو جو نقصان پہنچایا گیا۔ اس کی تلافی صرف اسی طرح ہو سکتی ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ چنانچہ جیسا کہ واقعات بیان ہوئے ہیں۔ اس فیصلہ پر عملدرآمد کے لیے بہت بڑی مقدار میں ایندھن جمع کیا گیا۔ اور پھر اُسے ایک کھائی میں اچھی طرح جلا کر منجنیق کے ذریعے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میں پھینک دیا گیا ان حالات میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام آزمائش میں پورے اترے انہوں نے آگ میں ڈالے جانے کے وقت بھی کوئی جزع فزع نہیں کی۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر معافی کی کوئی درخواست تک پیش نہیں کی۔ بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے آگ میں ڈالے جانے کو قبول کر لیا۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ "اَرَادُوۡا بِهٖ كَيۡدًا فَجَعَلۡنٰهُمُ الۡاَخۡسَرِيۡنَ" وہ ایک داؤ کھیلنا چاہتے تھے۔ کسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صفحہ ہستی سے ناپید کر دیا جائے۔ مگر اللہ تعالےٰ

درس چہل و ہشت ۴۸ (آیت ۱۲۴)

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۗ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۗ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۗ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

ترجمہ:۔ اور اس وقت کو دھیان میں لاؤ، جب آزمایا ابراہیم (علیہ السلام) کو اس کے رب نے چند باتوں کے ساتھ۔ پس انہوں نے ان باتوں کو پورا کر دیا۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا میں تمہیں لوگوں کے لیے پیشوا بنانے والا ہوں۔ (ابراہیم علیہ السلام) نے کہا کہ میری اولاد میں سے بھی (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا۔ میرا وعدہ ظالموں کے لیے نہیں ہے ﴿۱۲۴﴾

گذشتہ دروس پر ایک نظر

سورۃ بقرہ کی ابتداء میں قرآن پاک کے کتاب ہدایت ہونے کا بیان تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے تین گروہوں کا ذکر کیا۔ پہلا گروہ ہدایت کو قبول کرنے والوں کا دوسرا منکرین کا اور تیسرا منافقین کا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع سے اپنی توحید کا اقرار اور اپنی عبادت کے لیے کہا۔ پھر قرآن پاک کی صداقت اور حقانیت کو بیان فرمایا۔ اس کے ساتھ پیغمبر علیہ السلام کی نبوت اور آپ کی صداقت کا ذکر کیا۔ اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ نے آگے تخلیق آدم علیہ السلام اور پھر اُن کی خلافتِ ارضی کا ذکر کیا۔ جو اللہ تعالیٰ کی حکمت میں طے ہو چکا تھا۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ جو کہ اپنے زمانے میں ایک عظیم قوم تھی جسے اُس وقت اقوام عالم پر فضیلت حاصل تھی۔ اس کے بعد ان خرابیوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر آتا ہے۔ جو بنی اسرائیل میں پیدا ہو چکی تھیں۔ اگرچہ بنی اسرائیل کی خرابیاں لاتعداد ہیں مگر ان آیات میں ان کی چالیس کے قریب خرابیاں بیان ہوئی ہیں۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کیا اور فرمایا اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو اور ان کی ناقدری نہ کرو۔ فرمایا " وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ " اس کتاب پر ایمان لاؤ جس کو میں نے سب سے آخر میں نازل کیا ہے اور وہ سابقہ کتب کی مصدق ہے۔

پہلی آزمائش
قوم سے مقابلہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مختلف آزمائشوں کے لیے یہاں پر کلمٰت کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ جمع کا صیغہ ہے۔ تاہم مبہم ہے۔ مفسرین کرام بہت سی آزمائشوں کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ کی آزمائش کا پہلا مرحلہ اس وقت شروع ہوتا ہے۔ جب آپ نے ہوش و حواس سنبھالا اور ارد گرد کے ماحول مطالعہ کیا۔ قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں آپ کے جو واقعات بیان ہوئے ہیں۔ ان کے مطابق سب سے پہلے آپ کی اپنے والد، قوم اور بادشاہِ وقت کے ساتھ کشمکش پیدا ہوئی۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کو اوائل عمر میں ہی رشد و ہدایت سے نوازا تھا۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ "ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو سمجھ عطا کی۔ چنانچہ آپ نے اپنے مشرکانہ ماحول کا یہ اثر لیا کہ آپ شرک اور کفر سے متنفر ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے کفر و شرک کی مذمت بیان کرنا شروع کی۔ خاندان، قوم اور بادشاہ سب آپ کے دشمن ہو گئے۔ یہاں تو معمولی تنازعہ ہو جائے تو لوگ بھاگ جاتے ہیں۔ مگر آپ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ اور آپ پچاس ساٹھ سال تک اپنے ماحول کے سامنے سینہ سپر رہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کے عبادت خانہ میں جا کر سارے بتوں کو توڑ دیا۔ تو آپ کے خلاف ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک مخالف تو پہلے ہی تھے اب انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے بتوں کی توہین ابراہیم علیہ السلام کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ بادشاہ قوم کے ساتھ تھا۔ لہٰذا فیصلہ یہ ہوا۔ حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ" یعنی ہمارے معبودوں کو جو نقصان پہنچایا گیا۔ اس کی تلافی صرف اسی طرح ہو سکتی ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ چنانچہ جیسا کہ واقعات بیان ہوئے ہیں۔ اس فیصلہ پر عملدرآمد کے لیے بہت بڑی مقدار میں ایندھن جمع کیا گیا۔ اور پھر اُسے ایک کھائی میں اچھی طرح جلا کر منجنیق کے ذریعے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میں پھینک دیا گیا ان حالات میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام آزمائش میں پورے اترے انہوں نے آگ میں ڈالے جاتے وقت بھی کوئی جزع فزع نہیں کی۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر معافی کی کوئی درخواست تک پیش نہیں کی۔ بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے آگ میں ڈالے جانے کو قبول کر لیا۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ" وہ ایک داؤ کھیلنا چاہتے تھے۔ کسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صفحۂ ہستی سے ناپید کر دیا جائے۔ مگر اللہ تعالےٰ

نے فرمایا کہ ہم نے اُن بدبختوں کو ہی گھاٹے والا بنایا۔ یعنی اُن سب کو ناکام کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپکو ثابت قدم رکھا۔ اور آپ اس امتحان میں کامیاب و کامران ہوئے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بعض باتوں میں آزمایا فَاَتَمَّهُنَّ تو آپ ان آزمائشوں میں پورے اُترے۔ یہ آپ کی پہلی بڑی آزمائش تھی۔

دوسری آزمائش وطن سے ہجرت

اتنی بڑی آزمائش دیکھنے کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم آپ پر ایمان نہ لائی۔ بلکہ آپ کو ایک دوسرے امتحان سے گذرنا پڑا۔ آپ کا خاندان ایک بیوی حضرت سارہ اور بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام پر مشتمل تھا۔ لوط علیہ السلام بچپن ہی سے آپ کی تحویل میں تھے۔ اور آپ پر یقین بھی رکھتے تھے۔ اتنی بڑی متمدن سلطنت میں کوئی دوسرا شخص ایمان نہیں لایا۔ اگرچہ قوم پہلے منصوبے میں ناکام ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جان کے دشمن تھے۔ اور آپ کے قتل کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہجرت کا حکم دیا۔ یہ آپ کی دوسری آزمائش تھی۔ ہجرت کرنا یعنی وطن اور گھر بار چھوڑنا بڑا مشکل کام ہے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ تو نبی اس کی تعمیل میں ذرا تامل نہیں کرتا۔ بلکہ نبی کے ساتھ اگر اہل ایمان کو بھی ہجرت کا حکم دیا جائے تو وہ اس کٹھن گھاٹی کو عبور کر لیتے ہیں۔ ہمارے نبی آخر الزمان علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ کی ہجرت ایک اہم تاریخی واقعہ ہے۔ اسی لیے تو "وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ" کہہ کر ان کی تعریف فرمائی۔

الغرض حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالےٰ کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے ہجرت کے لیے تیار ہو گئے۔ اور فرمایا "اِنِّىْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّىْ" میں اللہ کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔ چنانچہ آپ نے بیوی اور بھتیجے کے ہمراہ بابل اور عراق کو چھوڑا۔ آپ کو مصر کے راستے سے شام اور فلسطین پر پہنچنے کا حکم تھا۔ راستے میں شرق اُردن کے علاقے میں بحر میت آتا ہے۔ اس کے کنارے پر بڑے متمدن لوگ آباد تھے۔ انہوں نے اعلیٰ درجے کا نظام حکومت قائم کر رکھا تھا۔ اس مقام پر حضرت لوط علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ تم یہیں قیام کرو۔ اور ان لوگوں کو دین حق کی دعوت دو۔ چنانچہ آپ وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیوی بچے کے ہمراہ آگے شام، فلسطین اور پھر مصر تک چلے گئے۔ مصر میں آپ کو ایک اور آزمائش

سے دوچار ہونا پڑا۔ جب وہاں کے ظالم حاکم نے آپ کی بیوی حضرت سارہؓ کو قبضہ میں کرنا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ثابت قدم رکھا۔ اور اس جابر حاکم سے نجات دلائی۔

تیسری آزمائش بیوی بچے سے جدائی

مصر کے حاکم نے حضرت سارہؓ کو ایک لونڈی دی تھی۔ اگرچہ وہ لونڈی نہیں تھی مگر اس وقت وہ لونڈی کی حیثیت میں تھی۔ حضرت سارہؓ نے ہاجرہ لونڈی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بخش دی۔ اور اس طرح وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی بن گئی۔ شام و فلسطین کے قیام کے دوران حضرت ہاجرہؓ سے بچہ پیدا ہوا۔ جس کا نام نامی اسمٰعیل (علیہ السلام) رکھا گیا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ابھی شیر خوارگی کی عمر میں تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا۔ کہ اے ابراہیم! اس بچے اور اس کی ماں کو عرب کے دور دراز بیابان وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ آؤ۔ آپ نے حکم کی تعمیل میں بیوی اور بچے کو ہمراہ لیا۔ اور موجودہ مکہ معظمہ والے مقام پر پہنچے۔ جو کہ اس وقت بے آب و گیاہ وادی تھی۔ اس مختصر قافلے کے ساتھ کوئی سامان بھی نہیں تھا۔ ایک مشکیزے میں تھوڑا سا پانی اور کچھ کھجوریں تھیں۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے لخت جگر اور بیوی کے پاس چھوڑ کر چلے آئے۔ یہ سارے واقعات آپ سنتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کبھی کبھی جاتے اور اپنے بیوی بچے کی خبر گیری کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بیابان وادی میں زمزم جیسے بہترین پانی کا انتظام فرمادیا۔ پھر وہاں بنو جرہم قبیلہ کے لوگ آباد ہو گئے۔ اور اس طرح وہ ویران اور غیر آباد جگہ بستی میں تبدیل ہو گئی۔

چوتھی آزمائش بیٹے کی قربانی

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایک اور بڑی آزمائش آئی۔ جب حضرت اسمٰعیل بارہ تیرہ سال کے ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آگیا۔ کہ اس بچے کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دو۔ اس واقعہ کی تفصیل بھی قرآن پاک کے مختلف مقامات پر آئی ہے۔ آپ کو بار بار خواب آیا۔ آخر آپ نے اس کا ذکر بچے سے کیا۔ بچہ بڑا صابر تھا۔ اس نے جواب دیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر دیں۔ چنانچہ آپ اس کے لیے تیار ہو گئے۔ حتیٰ کہ بیٹے کی گردن پر چھری چلا دی۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی۔ کہ اس نے قربانی بھی قبول کر لی اور بچہ بھی صحیح سلامت بچ گیا۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جان، مال، اولاد ہر طریقے سے آزمایا اور آپ اس آزمائش میں پورے اترے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس ثابت قدمی پر جو انعامات عطا کیے۔ ان کا ذکر بھی قرآن پاک میں آتا ہے۔

احکام القرآن

احکام القرآن کے نام سے بہت سے بزرگوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں حلال و حرام سے متعلق قرآنی احکام کی تشریح کی گئی ہے۔ سب سے پہلی تفسیر امام ابوبکر جصاصؒ نے کی ہے۔ یہ حنفی امام ہیں ان کا زمانہ چوتھی صدی ہجری ہے۔ ان کے بعد پانچویں صدی میں امام ابوبکر بن العربیؒ ہوئے ہیں آپ کا تعلق مالکی مسلک سے ہے۔ اور آپ کا وطن مالوف اندلس تھا۔ آپ بھی بہت بڑے مفسر قرآن تھے۔ حضرت امام شافعیؒ کی احکام القرآن موجود ہے۔ اگرچہ انہوں نے خود یہ کتاب نہیں لکھی۔ مگر امام بیہقیؒ نے اُن کی کتابوں سے متعلقہ تفسیری آیات کو منتخب کر کے علیحدہ کتابی صورت دی ہے۔ آپ چوتھی صدی ہجری کے محدث اور امام ہیں۔ کشف اور سلوک کے بہت بڑے امام شیخ ابن عربیؒ ساتویں صدی میں ہوئے ہیں۔ انہوں نے بھی احکام القرآن کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ انہوں نے حلال و حرام کے مسائل کی بجائے تصوف پر زیادہ مسائل جمع کیے ہیں۔ موجودہ دور میں مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کو بھی احکام القرآن تالیف کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ آپ نے اپنے بعض شاگردوں اور مریدوں کو اس کام کی تکمیل کے لیے کہا۔ چنانچہ احکام القرآن کا ایک حصہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اور دوسرا مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے تالیف کیا اور ایک حصہ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ابھی بقایا ہیں۔ جن کی تکمیل نہیں ہو سکی۔

امتحان میں کامیابی

الغرض امام ابوبکر بن العربیؒ نے اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھا ہے[1] کہ سورۃ نجم کی آیت "وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ" کا یہی مطلب ہے۔ کیا تم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خبر نہیں پہنچی۔ جنہوں نے پورا پورا کر دکھایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی حکم آیا۔ انہوں نے پورا کیا۔ اور اس طرح ہر آزمائش پر پورے اُترے۔ آپ نے اپنا سارا مال مہمانوں اور محتاجوں کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ آپ اکیلے کھانا نہیں کھایا کرتے تھے۔ جب تک کوئی مہمان نہ شامل ہو جاتا۔ آپ نے اپنے آپ کو آگ میں ڈالے جانے کے وقت بھی ذرا پس و پیش نہ کیا۔ اپنے قلب ہمیشہ رحمان کے سامنے رکھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے وقف کر دیا اور آپ ہر امتحان میں کامیاب ہوئے۔

---

[1] احکام القرآن ص ۲۷ ج ۱

حضرت ابراہیم علیہ السلام امام الناس ہیں

حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ مبارک ہستی ہیں۔ کہ جب ان امتحانوں میں کامیاب ہوئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے خوش ہو کر یہ انعام مرحمت فرمایا قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط میں تمہیں لوگوں کا امام یعنی پیشوا بنانے والا ہوں۔ امام وہ ہوتا ہے جس کی اقوال و افعال میں اقتدار کی جائے۔ اس لحاظ سے تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امت کے امام ہوتے ہیں وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا جو ہمارے حکم سے امت کی راہنمائی کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کا ذکر خیر ہو رہا ہے، وہ تو ملّت حنیفیہ کے بہت بڑے امام ہیں۔ آپ کا لقب ابوالانبیاء ہے۔ آپ تمام بعد میں آنے والے انبیاء علیہم السلام کے باپ اور جدامجد ہیں۔ الغرض تمام آزمائشوں میں سے گذرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مژدہ سنایا کہ اے ابراہیم! میں تجھے لوگوں کا امام یعنی پیشوا بناتا ہوں۔

ظالم محروم ہے

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے امامت کا انعام پایا۔ تو فوراً درخواست پیش کر دی۔ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ عرض کیا، مولا کریم! جس طرح تو نے مجھے منصب امامت سے نوازا ہے۔ کیا یہ سلسلہ میری اولاد میں بھی جاری رہے گا، کیا میری اولاد بھی اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا منصب امامت صرف اہل ایمان کے لیے ہے۔ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ فرمایا میرا یہ وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ ظالم اس قابل نہیں ہوتا کہ اُسے منصب امامت عطا کیا جائے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے حصے میں آتا ہے۔ اور یہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو چیز عطا ہوئی۔ وہ نبوّت ہے۔ فقہاء، محدثین متکلمین وغیرہ فرماتے ہیں۔ کہ اگر کسی شخص نے آنکھ جھپکنے کے وقت کی مقدار بھی کفر یا شرک کیا ہو تو وہ عہدہ نبوت کا مستحق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو اس قدر پاک رکھتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے علاوہ خلافت اور حکومت والے جو امام ہیں۔ ان میں سے بھی جو کوئی ظالم ہے۔ اس آیت کی رُو سے حکومت کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک امامت کے قابل وہی لوگ ہیں جو عدل و انصاف کو سربلند رکھنے والے ہیں۔ کوئی بھی ظالم پیشوائی کے لائق نہیں ہے۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

ترجمہ: اور اس بات کو دھیان میں لاؤ جب کہ ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے لیے رجوع اور امن کی جگہ بنایا۔ اور ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑا ہونے کی جگہ کو مصلیٰ یعنی نماز کی جگہ بنالو۔ اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل (علیہما السلام) کی طرف حکم بھیجا۔ کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک وصاف رکھو ﴿۱۲۵﴾ اور اس بات کو یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے رب! اس شہر کو امن والا بنا دے اور یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں سے روزی دے۔ جو کوئی اُن میں سے ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا اور جس شخص نے کفر کیا میں اُسے تھوڑے دن تک فائدہ پہنچاؤں گا۔ پھر اُسے کشاں کشاں دوزخ کے عذاب کی طرف لے جاؤں گا۔ اور وہ لوٹ کر جانے کی بہت بُری جگہ ہے ﴿۱۲۶﴾

گزشتہ سے پیوستہ

بنی اسرائیل کی خرابیوں کے تذکرہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت کا ذکر کیا ہے۔ قرآن پاک کی حقانیت بھی بیان ہوئی ہے۔ مگر اس سلسلہ کی بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے شروع ہوئی۔ کیونکہ اگلی آیات میں اس دعا کا

ذکر ہے۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق کی تھی۔ گویا اس سارے سلسلہ کی بنیاد تو وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ مگر پہلے تمہیداً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت اور پیشوائی کا ذکر فرمایا ہے آپ پہ آنے والی آزمائش کا ذکر آیا۔ اور پھر اُن تمام امتحانوں میں آپ کی کامیابی کا بیان بھی آیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو امامتِ عامہ بھی عطا فرمائی۔ "اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے متعلق بھی دعا کی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ "میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ وہ منصبِ امامت کے اہل نہیں ہوں گے معلوم ہوا کہ امامت میں سے حصہ اس کو ملے گا۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے نیک اور صالح ہوگا۔ اور کفر و شرک کا مرتکب اس عہدہ سے محروم رہے گا۔

شیعہ امامیہ کا غلط استدلال

شیعہ امامیہ نے اس آیت سے بہت غلط استدلال کیا ہے۔ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت پہ اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے۔ کہ آپ صاحبان (نعوذ باللہ) امامت کے اہل نہیں تھے۔ کیونکہ زندگی کے پہلے حصہ میں وہ کفر و شرک کے مرتکب ہوئے تھے۔ اور ایمان بعد میں لائے۔ برخلاف اس کے حضرت علی رضی اللہ عنہ اوائل عمر سے ہی مومن تھے، لہٰذا خلافت کے اہل وہ تھے۔ شیعہ حضرات نے یہ غلط استدلال کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ابتداء میں کفار میں شامل تھے۔ اسی طرح خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سَیْفٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰهِ، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، حضرت عباس رضی اللہ عنہ، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور حضرت عقیل رضی اللہ عنہ اور آپ کے دیگر چچازاد وغیرہ سب کے سب ابتدائے نبوت کے زمانہ میں اُسی سوسائٹی کا حصہ تھے۔ جو مشرکینِ مکہ کی سوسائٹی تھی۔ مگر جوں جوں اللہ تعالیٰ ان کو سمجھ عطا کرتا رہا۔ یہ اصحاب ایمان کی دولت سے مشرف ہوتے رہے۔ اور اپنے کفر و شرک پر مبنی سابقہ عقائد سے تائب ہو گئے۔ اس ضمن میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے[1]۔ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ، گناہ سے توبہ کرنے والا بالکل اسی طرح ہو جاتا ہے۔ گویا کہ اس نے کوئی گناہ

---

[1] ابن ماجہ ص ۳۱۳

کیا ہی نہیں۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی ارشاد ہے[1]۔ اَلْاِسْلَامُ یَھْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَہٗ اسلام لانے کے بعد مومن کے سابقہ تمام گناہ مٹ جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے تمام صحابہ کرام اسلام کی دولت سے مالا مال ہو کر سابقہ تمام گناہوں سے پاک و صاف ہو گئے۔ لہٰذا اس کے باوجود ان پہ کفر و شرک کا الزام لگانا قبیح حرکت ہے۔ اور مذکورہ آیت کریمہ سے غلط استدلال ہے۔

بیت اللہ مقام ثواب و امن

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کا تذکرہ بیان فرمایا۔ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا اس بات کو خیال میں رکھو جب ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے لیے مثابہ اور امن والا بنایا۔ بیت اللہ سے مراد خانہ کعبہ ہے۔ اور مثابہ کے دو معنے آتے ہیں۔ پہلا معنی لوٹنے کی جگہ ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگ یہاں بار بار آتے ہیں۔ لوگوں کا ذوق و شوق انہیں دنیا کے کونے کونے سے اللہ تعالیٰ کی عبادت و زیارت کے لیے کھینچ کھینچ کر لاتا ہے۔ وہاں پہ ایک مرتبہ پہنچ جانے والا سیراب نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا ذوق و شوق اور بڑھ جاتا ہے۔ اور اس کی خواہش ہوتی ہے۔ کہ کسی طرح وہ پھر واپس پہنچ جائے۔ مَثَابَةً کا یہی معنیٰ ہے۔ اور اس ضمن میں تعلیم بھی یہی دی گئی ہے کہ حاجی طوافِ وداع کے وقت یہ دعا مانگے۔ اے اللہ! یہ میرا آخری عہد نہ ہو بلکہ مجھے پھر بھی موقعہ دے کہ میں تیرے گھر کی زیارت کروں۔ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کو "ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ" یعنی دنیا بھر کے لیے ہدایت کا مرکز بنایا ہے۔ سورۃ آلِ عمران میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

مَثَابَةً کا دوسرا معنیٰ ثواب کی جگہ ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ اس مقدس مقام پہ جس قدر ثواب حاصل ہوتا ہے۔ وہ کسی دوسری جگہ پہ نہیں ملتا۔ ابن ماجہ شریف کی روایت میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان موجود ہے[2]۔ مسجد حرام یعنی حرم شریف میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب دوسری جگہ پہ ایک لاکھ نماز کے ثواب کے برابر ہوتا ہے اور جو شخص بیت المقدس یا مسجد نبوی میں ایک نماز ادا کرتا ہے۔ پچاس ہزار نمازوں کا ثواب پاتا ہے۔ بہر حال یہاں پہ مثابة کے دونوں معنیٰ ہیں یعنی مرکز ہدایت اور ثواب کی جگہ۔

---

[1] مسلم ص۷۶ ج۱ [2] جامع صغیر ص۲۲۵ ج۱ بحوالہ طبرانی عن ابی الدرداءؓ حلیۃ الاولیاء عن انسؓ زجاجۃ المصابیح ص۲۰۵ ج۱ بحوالہ ابن ماجہ

اور یہ بھی فرمایا کہ ہم نے بیت اللہ شریف کو امن والی جگہ بنایا۔ ظاہر ہے۔ جو شخص ایمان کی حالت میں پہنچ جاتا ہے۔ اُسے آخرت کے عذاب سے امن مل جاتا ہے۔ اور ظاہری طور پر بھی جو کوئی احرام کی حالت میں وہاں جاتا ہے۔ اس کو پناہ حاصل ہو جاتی ہے۔ دوسرے مقام پہ فرمایا "مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا"

ہمارے امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ اگر کوئی مجرم حرم میں داخل ہو جائے۔ تو اس کے خلاف تعزیری کارروائی حرم میں بھی جائز ہے۔ اُسے حرم سے باہر نکالا جائے گا۔ اور پھر حد جاری کر دی جائے گی۔ بعض دوسرے آئمہ فرماتے ہیں[1]۔ کہ اگر کوئی قاتل جیسا بڑا مجرم بھی حرم میں داخل ہو جائے تو اُسے وہاں کچھ نہ کہو ہاں اس کا دانہ پانی بند کر دو۔ جب مجبور ہو کر خود ہی حدودِ حرم سے باہر آئے تو اس پہ حد جاری کر دی جائے۔ گویا یہ مقام ظاہری طور پہ بھی گہوارۂ امن ہے۔

مقامِ ابراہیم

بیت اللہ شریف کے ضمن میں مقامِ ابراہیم کا ذکر فرماتے ہوئے فرمایا۔ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى "اور ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو ——— نماز کی جگہ بناؤ۔ مقامِ ابراہیم سے مراد کوئی کمرہ نہیں ہے۔ جہاں آپ نماز ادا فرمایا کرتے تھے بلکہ یہ وہ پتھر ہے جس پہ کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کی تھی۔ آپ کے پاؤں مبارک کے نشانات اس پتھر پہ اب بھی موجود ہیں۔ یہی وہ پتھر ہے جس پہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کھڑے ہو کر حج کا اعلان کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا "وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ"۔ اے ابراہیم! لوگوں میں اعلان کر دو کہ اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر ہو چکا ہے۔ اس کا حج کرنے کے لیے آؤ۔ تفسیر مدارک میں آتا ہے[2]۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا۔ پروردگار! میری آواز کون سُنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا! تمہارا کام اعلان کرنا ہے۔ میں اس آواز کو تمام نسلِ انسانی کی پشتوں تک پہنچا دوں گا۔ جن کی قسمت میں بیت اللہ کا حج مقدر ہے۔ اُن تک آپ کی آواز پہنچے گی۔ بہرحال مقامِ ابراہیم وہ پتھر ہے۔ جس کے متعلق فرمایا کہ اس کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ۔

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۴۵۲ پارہ ۱ [1]

[2] تفسیر مدارک ص ۹۸ ج ۳

حضرت عمرؓ کی فضیلت کے باب میں حدیث شریف میں آتا ہے[1] کہ آپ نے خواہش ظاہر کی تھی۔ کہ کاش یہاں پر نماز پڑھنے کا حکم ہو۔ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھِیْمَ مُصَلًّی اتاری۔

مقام ابراہیم تقریباً چودہ انچ مربع چھوٹا سا پتھر ہے۔ جو کہ بیت اللہ شریف کے قریب ہی تعمیر کعبہ کے وقت سے پڑا ہے۔ اور یہ حضرت مسیح علیہ السلام سے بھی دو ہزار سال پہلے کی بات ہے ظاہر ہے کہ اس چھوٹے سے پتھر کو مُصَلّٰی بنا کر اس کے اُوپر تو نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔ تاہم اس سے مراد یہ ہے۔ کہ پتھر کے قرب و جوار میں نماز ادا کی جائے۔ چنانچہ ہر طواف کرنے والا طواف کے سات چکر پورے کرنے کے بعد دو رکعت مقام ابراہیم کے قریب ادا کرتا ہے۔ اگر اس کے بالکل قریب جگہ نہ ملے تو پیچھے کہیں بھی دو رکعت واجب الطواف ادا کر لیے جاتے ہیں۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک طواف کے دو رکعت واجب ہیں۔ جب کہ دوسرے آئمہ کرام اُسے سنّت کہتے ہیں[2]۔ بہر حال اس مقام پہ نماز پڑھنے کی بہت زیادہ فضیلت ہے پہلے یہ پتھر ایک چبوترے پر رکھا ہوا تھا۔

مگر موجودہ حکومت نے مقام ابراہیم کے چبوترے اور زمزم کے چبوترے کو ہٹا دیا ہے۔ اور اب مقام ابراہیم شیشے کے ایک خول میں بند کر دیا گیا ہے۔ اور اس کے اوپر پیتل کی خوبصورت جالی لگا دی گئی ہے۔ اور اس طرح پتھر کی دوہری حفاظت کا بندوبست کر دیا گیا ہے تاکہ اگر کسی وجہ سے ایک خول کو نقصان پہنچے تو کم از کم دوسرا تو قائم رہے۔ حکومت سعودیہ نے لاکھوں ریال کے خرچ سے حفاظت کا یہ انتظام کیا ہے۔ اب مقام ابراہیم دور سے تو نظر نہیں آتا۔ مگر جالی کے قریب کھڑے ہو کر دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے۔ کہ اس پہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کے نشان موجود ہیں۔ یہ پورا ڈھانچہ باب رحمت سے تھوڑے فاصلے پہ مطاف میں رکھا ہوا۔ عام ایام میں تو مطوفین مقام ابراہیم اور بیت اللہ شریف کے درمیان ہی چلتے ہیں مگر ایام حج میں جوں جوں رش بڑھتا ہے۔ مقام ابراہیم طواف کرنے والوں کے درمیان میں آجاتا

---

[1] مسلم صفحہ ۲۷۶ ج ۲، ترمذی صفحہ ۴۲۱

[2] ہدایہ صفحہ ۱۷۹ ج ۱، شرح نقایہ صفحہ ۱۹۷ ج ۱

ہے۔ اور لوگ اس کے دونوں طرف سے گزرتے رہتے ہیں

بیت اللہ شریف کی صفائی

مقام ابراہیم کے تذکرے کے بعد پھر بیت اللہ شریف کے متعلق اللہ تعالٰے نے ارشاد فرمایا وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کو حکم بھیجا اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ میرے گھر کو پاک صاف رکھیں طواف کرنے والوں کے لیے وَالْعَاكِفِينَ اور اعتکاف بیٹھنے والوں کے لیے وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ۔ اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔ پاک و صاف رکھنا دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ یعنی ظاہری پاکیزگی اور باطنی پاکیزگی۔ چونکہ حج و عمرہ کے لیے دور دراز سے لوگ وہاں پہنچتے ہیں۔ اس لیے ان کی سہولت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے ظاہری صفائی کا مطلب یہ ہے۔ کہ حرم پاک کو ہر قسم کی غلاظت بدبو وغیرہ سے پاک رکھا جائے۔ کیونکہ لوگ وہاں عبادت کے لیے آتے ہیں۔ وہاں اعتکاف بیٹھتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں اور دیگر وظائف میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ تم دونوں باپ بیٹا میرے مہمانوں کی خاطر اس گھر کو ہمیشہ پاک صاف رکھو۔

مساجد کی صفائی

جس طرح بیت اللہ شریف کی پاکیزگی قائم رکھنے کا حکم ہے۔ اسی طرح عام مساجد کو بھی ہر قسم کی آلودگی سے پاک و صاف رکھنا ضروری ہے۔ سورۃ نور میں ارشاد ہے فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ "ان گھروں میں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بلند رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اور وہاں اس کا نام ذکر کرنے کو کہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے[1]۔ فَنَظِّفُوا اگر تم نے گھر میں بھی کوئی جگہ نماز کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ تو اس کو بھی پاک صاف رکھو۔ ظاہر طور پر وہاں کوئی کوڑا کباڑ یا گندگی نہیں رہنی چاہیئے۔

مساجد کی باطنی صفائی کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہاں پر کوئی مشرکانہ حرکت نہ کی جائے اور نہ ہی وہاں پر دنیوی باتیں کی جائیں۔ جس طرح بدن کی طہارت ضروری ہے۔ اسی طرح عقل اور دل کی طہارت بھی ضروری ہے۔ اگر دل کے کسی کونے میں شرک و نفاق کا کوئی شائبہ بھی ہو گا تو پورے کا پورا انسان ناپاک ہو گا۔ اسی لیے ارشاد ربانی ہے "إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ"

---

[1] ترمذی صفحہ ۱۱۰، ابوداؤد صفحہ ۶۶ جلد ۱ ابن ماجہ صفحہ ۵۵

یعنی مشرکین پلید ہیں۔ ان کے دلوں پہ شرک کی نجاست پڑی ہوئی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے۔ کہ دل و دماغ کفر، شرک، بدعت اور دیگر خرافات سے پاک ہو۔ اور عقیدہ توحید پہ صحیح طریقے سے ایمان ہو۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ ملّت کی پاکیزگی بھی ضروری ہے۔ ہماری ملت میں کفر، شرک اور بدعات کی جو گندگی سرایت کر چکی ہے۔ اس سے پیچھا چھڑانا بھی ضروری ہے۔ گندے عقائد نے پوری ملت کو ناپاک کر رکھا ہے۔ لہٰذا انفرادی طہارت کے ساتھ ساتھ اجتماعی پاکیزگی کی بھی ضرورت ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خصوصیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بہت سی خصوصیات ہیں۔ صحیح احادیث میں آیا ہے[2]۔ کہ آپ سب سے پہلے شخص اَوَّلُ مَنِ اخْتَتَنَ ہیں جنہوں نے ختنہ کیا۔ تفسیری روایتوں میں یہ بھی آتا ہے[3] کہ انبیاء علیہم السلام مختون پیدا ہوتے ہیں۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام ایسے نہیں ہوئے۔ انہیں اسّی[4] سال کی عمر میں ختنہ کا حکم ہوا۔ چنانچہ قدوم کے مقام پر انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے سنّتِ تطہیر ادا کی۔ اب حکم یہ ہے کہ جو شخص مسلمان ہو جائے اُسے چاہیئے کہ یہ سنّت ادا کرے، خواہ عمر کے کسی حصے میں ہو سکے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہ سب سے پہلے انسان ہیں جن کی داڑھی میں سفید بال نکلنے شروع ہوئے۔ آپ سے پہلے کسی انسان کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ سب کی داڑھی سیاہ ہی رہا کرتی تھی[5]۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام جوانی سے نکل کر بڑھاپے میں داخل ہوئے۔ تو سفیدی دیکھ کر عرض کیا۔ مولا کریم! یہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ وقار ہے۔ آپ نے پھر عرض کیا۔ اے اللہ! زِدْنِیْ وَقَارًا میری اس عزت کو اور بڑھا دے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اللہ کریم کی وحی آئی[6] کہ اے ابراہیم! اَنْتَ اَکْرَمُ اَھْلِ الْاَرْضِ اِلَیَّ آپ میرے نزدیک روئے زمین کے تمام انسانوں سے برگزیدہ ہیں، جب آپ نماز ادا کرتے وقت حالتِ سجدہ میں ہوتے ہیں تو آپ کا ستر نہیں کھلنا چاہیئے۔ چنانچہ سب سے

---

[1] الہام الرحمان فی تفسیر القرآن ص۸۶ ج۱ [2] بخاری ص۴۷۳ ج۱ مسلم ص۲۶۵ ج۲ [3] تفسیر عزیزی ص۴۳۹ پ

[4] تفسیر عزیزی فارسی ص۴۳۹ پ۱ بحوالہ بیہقی [5] تفسیر عزیزی فارسی ص۴۳۹ پ۱ [6] تفسیر عزیزی فارسی ص۴۳۹ پ۱

پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پاجامہ پہنا۔ اگرچہ تہبند پہننا بھی درست ہے۔ تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[1] پاجامہ بھی پہنا کرو۔ اور تہبند بھی باندھا کرو۔ یہود تہبند نہ باندھتے تھے۔ آپ نے دونوں چیزوں کی اجازت فرمائی۔ آپ نے پاجامے کی تعریف فرمائی ہے۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہننے کا ذکر کسی صحیح حدیث میں نہیں ملتا۔ تاہم پاجامہ خریدنے کا ذکر آتا ہے[1]۔

ابن ابی شیبہ کی روایت میں آتا ہے[2]۔ کہ منبر پر کھڑے ہو کر سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خطبہ دیا۔ اور دیلمی کی روایت میں ہے[4]۔ کہ مہمانوں کی خاطر سب سے پہلے آپ نے نان شیرمال تیار کیا۔ یہ کھانا دودھ اور نان کے مرکب سے تیار کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں برصغیر میں حیدرآباد دکن اور لکھنؤ والے بڑے شوق سے تیار کرتے ہیں۔ اور مہمانوں کو پیش کرتے ہیں۔ بڑی لذیذ چیز ہے اسی طرح معانقے کا طریقہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جاری ہوا۔ جب کوئی شخص باہر سے آتا تو آپ اس سے گلے ملتے۔

معانقے کا پس منظر

کہتے ہیں کہ بیت المقدس کے قریب حضرت ابراہیم علیہ السلام جانوروں کی چراگاہ کی تلاش میں کسی پہاڑ کے اندر تک چلے گئے۔ انہوں نے ایک مقام پر نہایت غمناک آواز سنی۔ کوئی شخص نہایت خشوع و خضوع سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا تھا۔ آپ اُدھر متوجہ ہوئے۔ تو دیکھا۔ کہ ایک ضعیف العمر شخص اپنے حال میں محو ہے۔ آپ نے اس بوڑھے شخص سے دریافت کیا۔ کہ تم کس کو یاد کر رہے ہو۔ اُس نے کہا اللہ تعالیٰ کو۔ آپ نے پوچھا تمہارا اللہ کہاں ہے۔ اُس نے جواب دیا آسمان پر ہے۔ فرمایا زمین پر بھی وہی خدا ہے۔ پھر آپ نے پوچھا تمہارا قبلہ کدھر ہے۔ تو بوڑھے نے بیت اللہ شریف کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے پوچھا تمہارا ٹھکانا کہاں ہے۔ اُس نے جواب دیا نیچے اسی غار میں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بوڑھے کا ٹھکانا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ تو بوڑھے نے کہا کہ وہاں جانا محال ہے۔ کیونکہ راستے میں گہری ندی پڑتی ہے۔ جسے عبور نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تم کیسے پہنچ جاتے ہو۔ تو اُس نے جواب دیا خرقِ عادت

---

[1] زاد المعاد جلد ۲ صفحہ ۳۵ / ۱۷
[2] ابن ماجہ صفحہ ۲۵۶
[3] تفسیر عزیزی (فارسی) پارہ ۱ صفحہ ۴۳۱
[4] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۴۳۱ پارہ ۱

کے طور پر چلا جاتا ہوں۔ یہ ایک کرامت ہے۔ جس کی وجہ سے میں خشک پاؤں ندی کو عبور کر لیتا ہوں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا چلو ہم بھی اسی طریقے سے چلتے ہیں۔ جو خدا تمہارے لیے پانی کو مسخر کرتا ہے۔ وہ میرے لیے بھی کرے گا۔ چنانچہ دونوں چل پڑے۔ غار میں اُترے تو آگے ندی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُسے عبور کر لیا۔ اور آپ کے پاؤں تک نہیں بھیگے۔ پانی کے نیچے آپ اُس شخص کے عبادتخانے میں پہنچے تو دیکھا کہ اس کی نشاندھی کے عبادت خانے کا رُخ واقعی بیت اللہ شریف کی طرف تھا۔ آپ بہت خوش ہوئے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں یہ خدا پرست انسان ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا، اے بزرگ یہ بتاؤ کہ سب سے خوفناک دن کون سا ہے۔ تو اس نے جواب دیا کہ جس دن اللہ تعالیٰ کرسی عدالت پر بیٹھے گا۔ اور نبی اور اللہ تعالےٰ کے سب مقرب لرزرہے ہوں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ دعا کرو کہ اللہ تعالےٰ ہم دونوں کو اس دن کے خطرات سے محفوظ رکھے۔ بوڑھا کہنے لگا۔ کہ مجھے دعا کرتے ہوئے تین سال ہوگئے ہیں مگر میری دعا قبول نہیں ہوئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا کہ تمہاری دعا کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں اس پہاڑ میں گیا۔ تو مجھے ایک نوجوان ملا جس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اُس سے پوچھا تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ اُس نے جواب دیا۔ کہ اللہ تعالےٰ کے دوست ابراہیم علیہ السلام کے جانوروں کے لیے چراگاہ تلاش کر رہا ہوں۔ بوڑھا کہتا ہے کہ اس دن سے میں یہ دعا مانگ رہا ہوں کہ اے مولا کریم! اگر دنیا میں تیرا کوئی خلیل ابراہیم علیہ السلام بھی ہے۔ تو مجھے اس کی زیارت نصیب فرما۔ مگر آج تک میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا بڑے میاں! اللہ تعالیٰ نے تیری دعا قبول فرمالی ہے اٹھو اور میرے ساتھ معانقہ کرو۔ چنانچہ معانقے کا طریقہ وہاں سے جاری ہوا۔[1]

حج کی فضیلت

بیت اللہ شریف کی تعمیر کا تذکرہ آگے آئے گا۔ پہلے کعبۃ اللہ اور حج کی فضیلت کے متعلق کچھ بیان ہوگا۔ صحیح احادیث میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے[2]۔ کہ جس شخص نے اللہ تعالےٰ کی رضا اور اس کے حکم کی تعمیل میں حج کیا۔ تو وہ گناہوں سے اس طرح پاک لوٹتا ہے۔ گویا کہ

---

[1] تفسیر درمنثور صفحہ ۱۹ جلد ۱، تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۴۴۲ پارہ ۱۵   [2] بخاری صفحہ ۲۰۶ جلد ۱، مسلم صفحہ ۴۳۶ جلد ۱

وہ آج ہی پیدا ہوا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے[1] کہ بیت اللہ شریف پر ہر روز ایک سو بیس رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ ان میں سے ساٹھ طواف کرنے والوں پر، چالیس دیگر عبادت کرنے والوں پر اور بیس اُن لوگوں پر نازل ہوتی ہیں۔ جو بیت اللہ شریف کی طرف دیکھتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[2]۔ اَلنَّظْرُ اِلَی الْکَعْبَۃِ عِبَادَۃٌ یعنی بیت اللہ شریف کی طرف دیکھنا بھی عبادت ہے۔ البتہ طواف کے دوران کعبہ کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے۔ بلکہ طواف سے فارغ ہو کر نہایت ذوق و شوق اور محبت سے بیت اللہ شریف کی طرف دیکھنا چاہیئے۔ صحیح روایت میں[3] آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ حجرِ اسود جنت کے یاقوتوں میں سے ایک یاقوت ہے۔ یہ پتھر بہشت سے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے نور کو مٹا دیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو سورج کی طرح یہ مشرق و مغرب کو روشن کرتا۔

طواف کا اجر و ثواب

تاریخ ازرقی میں آتا ہے۔ کہ طواف کی نیت سے گھر سے چلنے والا شخص ایسا ہے۔ جیسے کہ وہ دریائے رحمت میں چلنا شروع کر دیتا ہے۔ جب مطاف میں پہنچتا ہے۔ تو گویا رحمت کے دریا میں غوطے لگاتا ہے۔ اور جب طواف شروع کرتا ہے۔ تو ہر قدم اٹھانے کے عوض اُسے پانچسو نیکیاں مل جاتی ہیں۔ اور جب قدم نیچے رکھتا ہے۔ تو ہر قدم کے بدلے پانچسو گناہ مٹ جاتے ہیں۔ اور جب وہ شخص طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم تک آتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے کہتے ہیں۔ کہ اے بندے! تیرے سابقہ گناہ تو دُھل گئے۔ اب آئندہ زندگی میں محتاط رہو۔ اعمالِ صالحہ انجام دیتے رہو۔ اور نئے سرے سے اچھی زندگی کا آغاز کرو۔

حرم پاک

حرم پاک کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے[4]۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرمت والا خطہ بنایا ہے۔ کسی کے لیے اس میں لڑائی کرنا حلال نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ فتح مکہ کے دن تھوڑی دیر کے لیے صرف میرے لیے حرم میں لڑائی حلال ہوئی تھی۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد حرم شریف میں لڑائی قطعاً حرام ہے۔ یہ خطہ ہمیشہ محترم ہے اور امن والا شہر ہے۔ چنانچہ یہاں پر

---

[1] [2] کنز العمال ج ۱۴ ص ۱۸۲

[3] کنز العمال ج ۱۲ ص ۱۸۶، ۱۸۸ [4] مسلم ج ۱ ص ۴۳۷

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ اور جب ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا اے مولا کریم! اس شہر کو امن والا بنا دے۔ دوسرے مقام پہ "هٰذَا الْبَلَدَ" کا لفظ آتا ہے۔ گویا یہ ابھی کھلی جگہ ہے شہر آباد نہیں ہوا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کی حرمت کی دعا کر رہے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آتا ہے[1]۔ زمین و آسمان کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے بیت اللہ شریف والی زمین کو اللہ تعالیٰ نے تیار کیا۔ اس مقام پہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے عبادت کرتے تھے۔ وہاں پر ایک پروہ سا اٹھا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ کو پوری دنیا کا مرکز قرار دیا۔ اور پھر اسی جگہ سے تمام زمین کو پھیلایا گیا۔ گویا یہ مقام ساری زمین کا وسط (وسط البلاد) ہے۔ بیجوریؒ نے اپنی شرح شمائل میں لکھا ہے۔ جس شخص کو نکسیر پھوٹتی ہو۔ اس کی پیشانی پہ لکھ دیا جائے اَلْمَكَّةُ وَسْطُ الْبِلَادِ وَاللّٰهُ رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ تو اس کی نکسیر بند ہو جائے گی۔

فرمایا اے اللہ اس شہر کو امن کا گہوارہ بنا دے۔ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے روزی دے۔ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ جو کوئی اللہ اور آخرت پہ ایمان لائے قَالَ وَمَنْ كَفَرَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس نے کفر کیا فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا اسے تھوڑا فائدہ پہنچاؤں گا۔ ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ پھر اسے کشاں کشاں دوزخ کی طرف لیجاؤں گا۔ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے تھوڑے فائدہ سے مراد یہ ہے۔ کہ دنیا کی زندگی میں تو ممکن ہے کہ کافر بھی آرام سے رہیں۔ لیکن اس کے بعد انہیں بہرحال دوزخ میں جانا ہوگا۔ مگر اہل ایمان کو دونوں چیزیں حاصل ہوں گی دنیا میں امن بھی نصیب ہوگا۔ اور آخرت میں نجات بھی حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو قبول فرمایا۔ چنانچہ حرم پاک اور شہر مکہ کی خیر و برکات کا سلسلہ جاری ہے اور قیامت تک قائم رہے گا

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۴۵۶ پ ۱، تفسیر ابن کثیر ص ۱۷۹ ج ۱ عن ابن عباسؓ

درس پنجاہ ۵۰ (آیت ۱۲۷ تا ۱۲۸)

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

ترجمہ:۔ اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم اور اسمٰعیل (علیہما السلام) بیت اللہ شریف کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ اور دونوں کہتے تھے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم سے قبول فرما بیشک تو سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۱۲۷﴾ اے پروردگار! بنا دے ہم دونوں کو اپنی فرمانبرداری کرنے والے۔ اور بنا دے ہماری اولاد میں سے بھی ایک اپنی فرمانبردار امت۔ اور بتلا ہم کو ہمارے احکام۔ اور ہمارے اوپر رجوع فرما مہربانی کے ساتھ۔ بے شک تو ہی رجوع فرمانے والا اور انتہا مہربان ہے ﴿۱۲۸﴾

ربطِ آیات

اس آیت کا تعلق سابقہ درس کی آیت مبارکہ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ کے ساتھ ہے۔ وہاں پر تھا کہ اُس بات کو یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے رجوع کی جگہ، امر کز ہدایت اور جائے امن بنایا۔ اس کے ساتھ مقام ابراہیم کا ذکر ہوا۔ بیت اللہ شریف کو پاک وصاف رکھنے کا حکم ہوا۔ وہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ذکر بھی تھا۔ جس میں اہالیان شہر مکہ کے لیے پھلوں کی روزی طلب کی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو شرف قبولیت بخشا جسے ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔

تاریخ کعبہ

آیت زیر درس میں بیت اللہ شریف کی تعمیر کا ذکر ہے۔ یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فضائل میں سے ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی تعمیر آپ کے ہاتھوں سے کرائی چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ وہ کتنی مبارک گھڑی تھی جب ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام یعنی باپ بیٹا اپنے

مبارک ہاتھوں سے بیت اللہ شریف کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ بعض دوسری احادیث میں آتا ہے[1] کہ بیت اللہ شریف کی.... ابتدائی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے کی تھی۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں آتا ہے[2]۔ کہ حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا، تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ کہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے اولین گھر کی تعمیر کا ذکر آیت پاک "اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا" میں آیا ہے۔ اس آیت میں لفظ بکہ استعمال ہوا ہے۔ مگر بکہ اور مکہ ہم معنی الفاظ ہیں۔ توراۃ میں بکہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ اسے اُمّ القریٰ بھی کہتے ہیں۔ گویا دنیا میں اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلے تعمیر ہونے والا گھر بیت اللہ شریف ہے۔

صحابہ کرامؓ نے عرض کیا، حضور! اس کے بعد کون سا گھر تعمیر ہوا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا، بیت المقدس۔ نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ بیت اللہ اور بیت المقدس کی تعمیرات میں چالیس[4] سال کا وقفہ ہے۔ یہاں پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں تو بہت زیادہ فرق ہے۔ پھر دونوں گھروں کی تعمیر میں صرف چالیس[4] سال کے وقفہ کا کیا مطلب؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں[3]۔ کہ اس تعمیر سے مراد حضرت ابراہیم اور حضرت داؤد علیہما السلام والی تعمیرات مراد نہیں بلکہ ان دونوں گھروں کی اولین تعمیرات مراد ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں انجام پائیں۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کا طوفان آیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی سیلاب آئے۔ جن میں بیت اللہ شریف کی عمارت بہ گئی۔ اور وہاں پر صرف ایک ٹیلہ سا باقی رہ گیا، عمارت منہدم ہوگئی۔ پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی دوبارہ تعمیر کا حکم دیا۔

قرآن پاک کے لفظ قَوَاعِدَ سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ یہ اس عمارت کی اولین تعمیر نہیں تھی۔ بلکہ یہ عمارت اپنی اصل بنیادوں پر دوبارہ اٹھائی جا رہی تھی۔ چونکہ اس وقت عمارت کے کوئی نشانات باقی نہ تھے۔ صرف ایک ٹیلہ سا باقی تھا۔ تو عمارت کی اصل بنیادوں کی نشاندہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بادل کا ایک ٹکڑا بھیجا، جس نے اُس اصل جگہ پر سایہ کرکے اس کا تعین کردیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ بیت اللہ شریف کا اصل مقام یہ ہے چنانچہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۲۸۳ ج ۱، [2] مسند احمد ص ۱۵۰ ج ۵، [3] معالم التنزیل ص ۵۱ ج ۳، تفسیر طبری ص ۵۴۶ ج ۱

آپ نے اُسی جگہ پر دوبارہ تعمیر شروع کی۔ اُس وقت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر مبارک چودہ[۱۴] سال کی تھی۔

خبرگیری کیلیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آمد و رفت

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سارہؓ شام و فلسطین میں تھے۔ جب کہ حضرت ہاجرہؓ اور اسمٰعیل علیہ السلام حجاز میں تھے۔ آپ ایک سال یا دو سال میں ایک مرتبہ آکر بیوی بچّے کی خبر گیری کرتے۔ تاہم آپ کی بیوی سارہؓ کی یہ شرط تھی۔ کہ آپ بیوی بچے کی خبر گیری کے لیے قلیل وقت کے لیے جا سکتے ہیں۔ ان کے پاس رات کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس عرصہ میں حضرت ہاجرہؓ کا انتقال ہوگیا۔ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے قبیلہ بنو جرہم میں نکاح کر لیا۔ روایات میں آتا ہے۔ کہ ایک مرتبہ حضرت ابراھیم علیہ السلام بیٹے کی خبر گیری کے لیے آئے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام گھر پر موجود نہیں تھے۔ انہوں نے ان کی بیوی سے دریافت کیا۔ تو اُس نے بتایا۔ کہ کہیں شکار کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ آپ نے گذران اوقات کے بارہ میں پوچھا تو اُس عورت نے کہا۔ کہ ذریعہ معاش کوئی نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے گذر اوقات ہو رہا ہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کوئی کام نہیں کرتے۔ اس لیے فاقے آتے ہیں۔ یہ شکایت سُن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ کہ جب تیرا شوہر آئے تو اُسے میرا سلام کہنا اور ساتھ یہ پیغام بھی دینا۔ کہ وہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل دیں۔ جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام شکار سے واپس آئے تو انہیں باپ کی آمد کی خیر و برکت معلوم ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے بیوی کے بتانے سے پہلے خود ہی پوچھ لیا کہ میرے بعد کون آیا تھا۔ بیوی نے بتایا کہ ایک بوڑھا آدمی آیا تھا۔ اُس نے حال احوال پوچھا تو میں نے سب احوال بتا دیے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے پھر دریافت کیا۔ کہ وہ کوئی پیغام بھی دے گئے ہیں۔ تو بیوی نے کہا، کہ ہاں۔ وہ کہہ گئے ہیں۔ کہ اپنے گھر کی چوکھٹ تبدیل کر دو۔ آپ پیغام کا مطلب سمجھ گئے۔ چنانچہ بیوی کو الگ کر دیا۔ اور بتایا کہ اب میں تمہیں گھر میں نہیں رکھ سکتا۔

اس کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام نے دوسرا نکاح کیا۔ کئی سال بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام

---

[۱] بخاری ص۴۷۵/۱۶۷۰

دوبارہ تشریف لائے۔ اتفاق سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پھر گھر میں موجود نہیں تھے۔ اُن کی بیوی موجود تھی۔ آپ نے اُس سے گھر کے حالات دریافت کیے۔ اُس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے گھر کے حالات بہت اچھے ہیں۔ میرا خاوند بھی بڑا اچھا آدمی ہے۔ نیک سیرت اور عبادت گذار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رزق بھی وافر دیا ہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام شکار بھی کرتے ہیں گذر اوقات بھی بڑی اچھی ہو رہی ہے۔ اس عورت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سواری سے اترنے کی درخواست کی۔ تاکہ آپ کی خاطر تواضع کر سکے۔ مگر آپ نے کہا۔ کہ میں نے ٹھہرنا نہیں ہے ہاں جب تمہارا خاوند آئے۔ تو اُسے میرا یہ پیغام دینا کہ تمہارے مکان کی چوکھٹ بہت اچھی ہے اسے تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ یہ پیغام دے کر چلے گئے۔ جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام گھر واپس آئے۔ تو بیوی نے پیغام دیا۔ آپ نے فرمایا وہ میرے باپ تھے۔ اور یہ پیغام دے گئے ہیں کہ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں۔

تعمیرِ کعبہ

یہ واقعہ بھی تفسیری روایتوں میں موجود ہے[1]۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تیسری مرتبہ مکہ معظمہ آنے کا ارادہ کیا۔ تو اپنی بیوی حضرت سارہؓ سے طے کر لیا۔ کہ اس دفعہ میں کچھ عرصہ وہاں ٹھہروں گا۔ چنانچہ یہ ان ایام کا ذکر ہے۔ کہ آپ کو بیت اللہ شریف کی تعمیر کا حکم ہوا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ خانہ کعبہ کی اصل بنیادوں کی نشاندھی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بادل کے ایک ٹکڑے کو مامور کیا۔ اور اس طرح باپ بیٹے نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر دیواریں چنیں اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام آپ کے لیے گارا اور پتھر لاتے رہے۔ اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کی تعمیر کے بعد جب یہ عمارت طوفانِ نوح کی نذر ہو گئی تو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے ہاتھوں دوبارہ تعمیر ہوئی۔ کہتے ہیں کہ یہ عمارت ذی قعدہ میں شروع ہو کر ذی الحجہ میں تقریباً ایک ماہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

تعمیرِ کعبہ کے مختلف ادوار

بیت اللہ شریف کی تعمیر مذکور کے بعد دوبارہ تعمیر قصی بن کلاب کے زمانے میں ہوئی جو حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد تھے۔ حضور علیہ السلام کے اپنے زمانہ مبارک

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۴۷۷ پارہ ۱

میں بیت اللہ شریف کی عمارت پھر بوسیدہ ہو چکی تھی۔ چنانچہ قریش مکہ نے چندہ جمع کر کے بیت اللہ شریف کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک پینتیس ۳۵ برس تھی۔ گویا یہ تعمیر آپ کی بعثت سے پانچ برس قبل ہوئی۔ کہتے ہیں۔ کہ رؤسا مکہ نے طے کر لیا تھا کہ اس مقدس تعمیر میں ناپاک مال استعمال نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ پاک وصاف اور حلال مال سے جو چندہ جمع ہوا وہ پوری عمارت کی تعمیر کے لیے ناکافی تھا۔ لہٰذا حطیم والا تین ہاتھ کا حصہ چھوڑ کر باقی جگہ پہ بیت اللہ تعمیر کر لیا گیا۔ اسی موقع پر حجر اسود کی تنصیب کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا فیصلہ حضور علیہ السلام کے مبارک ہاتھوں سے اس طرح کروایا کہ سارے لوگ خوش ہو گئے

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ نبوت میں بیت اللہ شریف کی تجدید نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ تو سرمایہ کی کمی تھی۔ اور دوسری یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[1]۔ کہ اگر میں اس کو دوبارہ تعمیر کرتا۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرز پہ کرتا۔ اور اس وقت عمارت میں تغیر و تبدل کرنا مناسب نہیں تھا۔ یزید کی وفات کے بعد حجاز میں نو سال تک حکومت حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس رہی، حجاز، مکہ، مدینہ اور طائف وغیرہ آپ ہی کے زیر نگرانی تھے۔ اس زمانہ میں آپ نے بیت اللہ شریف کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اور آپ نے یہ عمارت ابراہیمی بنیادوں پہ قائم کی یعنی حطیم کو خانہ کعبہ میں داخل کر لیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت کے بعد حجاج بن یوسف نے عبدالملک بن مروان کے حکم پہ عمارت کی تجدید کی اور حطیم کو پھر باہر نکال دیا۔

ہارون الرشید نے اپنے زمانے میں حطیم کو پھر شامل کر کے از سر نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت امام مالکؒ نے اُسے ایسا نہ کرنے کی درخواست کی[2]۔ آپ کا نظریہ یہ تھا کہ ایسا کرنے سے یہ مقدس گھر آئندہ آنے والوں کے لیے کھلونا بن جائے گا۔ چنانچہ ہارون الرشید نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے بعد ترکوں کے عہد میں سلطان مراد خان کے زمانے میں بیت اللہ شریف کی تعمیر کی تجدید ہوئی۔ یہ ۱۰۴۰ھ کا واقعہ ہے۔ موجودہ عمارت وہی ترکوں کی تعمیر کردہ ہے۔ اب تک بیت اللہ کی عمارت میں کوئی تبدیل و تغیر نہیں ہوا۔ البتہ موجودہ سعودی حکومت کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے۔ کہ انہوں نے بھاری رقوم خرچ کر کے حرم پاک کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ اور زائرین کے آرام و سہولت کے لیے بڑے

---

[1] بخاری صفحہ ۲۱۴/۱، مسلم صفحہ ۴۲۹/۱
[2] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۴۷۹ پارہ ۱، ابن کثیر صفحہ ۱۸۳/۱

بڑے ــــ منصوبوں پر کام کیا ہے۔

دعا کی قبولیت

الغرض جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو ساتھ ساتھ نہایت مخلصانہ انداز میں دُعا بھی کر رہے تھے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۔ اے ہمارے پروردگار ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ بیشک تو سُننے والا اور جاننے والا ہے۔ تو دعا کو سُنتا بھی ہے۔ اور ہمارے اخلاص کو بھی جانتا ہے۔ لہذا ہمارے عمل کو قبول فرمالے۔

ظاہر ہے کہ قبولیت کے بغیر ہر عمل بیکار محض ہے۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے۔ کہ ہمارا عمل قبول ہو جائے۔ ہر مومن کی بھی یہی تمنا ہوتی ہے۔ کہ اس کی نیکی بارگاہِ ربّ العزّت میں مقبول ہو جائے۔ حضرت ابو درداءؓ کی روایت میں آتا ہے[۱] کہ اگر مجھے علم ہو جائے کہ میری دو رکعت نماز قبول ہو گئی ہے۔ تو میں اس کے بدلے میں دنیا وما فیہا کی ہر چیز کو ٹھکرا دوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قبولیت کا جو معیار مقرر فرمایا ہے وہ بہت بلند ہے "اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ" یاد رکھو! اللہ تعالیٰ متقیوں کے اعمال کو ہی قبول کرتا ہے۔ نیکی اُسی کی قبول ہو گی۔ جس کا دِل تقویٰ سے معمور ہے۔ اگر تقویٰ سے خالی ہے، دِل میں کفر، شرک، نفاق اور ریاکاری بھری ہوئی ہے۔ تو کوئی عمل بھی قبول نہیں ہو گا۔ قبولیت کا معیار خلوص اور تقویٰ ہے۔

اس وقت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اگرچہ چودہ سال کے بچے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے نیکی اور تقویٰ کی دولت ابتدائے زندگی سے ہی ودیعت کر دی تھی۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں باپ بیٹا کے عمل کو شرفِ قبولیت بخشا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام بڑے ہو کر "رَسُولًا نَّبِيًّا" بنے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف سورتوں میں آپ کی تعریف کی ہے۔ آپ صاحبِ شریعت رسول ہوئے ہیں۔ تاریخی روایتوں سے پتہ چلتا ہے[۲] کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی متعدد بیویاں اور بارہ بیٹے تھے۔ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ایک بیٹے کی نسل سے اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے خاندان پیدا کیے۔ آپ کا سب سے بڑا بیٹا نابت تھا، اور سب سے چھوٹا قیدار تھا آپ کے

۱ے تفسیر ابن کثیر ص ۲۴۳ ج ۲

۲ے معالم التنزیل ص ۵۳ ج ۱، تفسیر عزیزی فارسی ص ۴۵۱ پارہ ۱

بعد بیت اللہ شریف کی تولیت آپ کے بڑے بیٹے نابت کو ہی ملی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں باپ بیٹے کو اتنی فضیلت بخشی۔

قبولیت نماز کی شرائط

ترمذی شریف کی حدیث میں نبی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے[1] ـــــ لَا تُقْبَلُ صَلٰوةٌ بِغَيْرِ طُهُوْرٍ یعنی اللہ تعالیٰ طہارت کے بغیر کسی نماز کو قبول نہیں فرماتے۔ گویا نماز کی قبولیت کے لیے طہارت بمنزلہ شرط کے ہے۔ پاکیزگی کے بغیر کتنی نمازیں پڑھو قیام کرو، رکوع و سجود کرو، کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح دیگر نیکیوں کی شرط بھی ایمان اور اخلاص ہے۔ اس کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں۔ اسی طرح بعض برائیاں ایسی ہیں جن کے ارتکاب سے نیکیاں مردود ہو جاتی ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے[2]۔ کہ ایک مرتبہ شراب نوشی کرنے والے کی چالیس دن تک نماز قبول نہیں ہوتی۔ اگر توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں۔ ورنہ قانون یہی ہے۔ فرمایا جو غلام اپنے مالک کی مرضی کے خلاف بھاگ جائے، وہ جب تک واپس نہ آئے، اس کی کوئی نماز قبول نہیں ہوتی، کیونکہ اس نے مالک کو دھوکا دیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں آتا ہے[3]۔ کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اَخْلِصْ فِیْ دِیْنِكَ يَكْفِيْكَ قَلِيْلٌ مِّنَ الْعَمَلِ دین میں اخلاص پیدا کرلو تو پھر تمہارا تھوڑا عمل بھی کفایت کر جائے گا۔ اسی واسطے قرآن پاک میں آتا ہے "مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اور اخلاص ایک ایسی نعمت ہے۔ جو توحید کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں[4]۔ اگر انسان میں خلوص موجود ہے۔ اس کا عقیدہ توحید پہ ہے، فکر درست ہے، تو پھر اس کے اعمال بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری

بیت اللہ شریف کی تعمیر کے تذکرہ کے بعد امت مسلمہ کی تاسیس اور پھر نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی دعا ہے۔ یہی مرکزی مضمون ہے۔ جو اگلی آیت میں آ رہا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی درخواست پیش کی۔ گویا نبی علیہ السلام کے ظہور

---

[1] ترمذی ص۲۶ [2] ترمذی ص۲۷۹

[3] جامع صغیر مع شرح فیض القدیر ص۲۱۶ ج۱ [4] احکام القرآن ص۲۷۴ ج۲

سے ہزاروں سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ کے لیے دعا کی۔ اور دعا کے پہلے حصے میں عرض کیا رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ اے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا لے۔ کہ ہم دونوں ہر حالت میں تیری اطاعت کرنے والے بن جائیں۔ انبیاء علیہم السلام کی ہمیشہ یہی دعا رہی "تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَّأَلْحِقْنِي بِالصّٰلِحِيْنَ" اے اللہ! ہماری موت فرمانبرداری کی حالت میں آئے۔ اور جب وصیت کرتے ہیں تو فرماتے ہیں "فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ" کوشش کرو بھائی! کہ تمہارا خاتمہ اسلام اور فرمانبرداری کی حالت میں ہو۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام نے بھی یہی دعا کی۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ اے اللہ! ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ممکن ہے۔ دوسری جگہ موجود ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابراہیم! "اَسْلِمْ" فرمانبردار ہو جاؤ۔ آپ نے جواب دیا "اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" میں رب العالمین کا مطیع ہو گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بعض امتحانوں کے بعد ابراہیم علیہ السلام کو امامت عطا کی۔

امت مسلمہ کی تاسیس

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے اپنے لیے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی دعا مانگی۔ اور پھر اپنی اولاد کے متعلق عرض کیا "وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ" اور ہماری اولاد میں سے ایک فرمانبردار امت پیدا فرما۔ یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے۔ کہ جس وقت یہ دعا کی گئی، اس وقت حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام ہی موجود تھے۔ لہذا امت مسلمہ کی دعا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے حق میں جاتی ہے۔ کیونکہ حضرت اسحٰق علیہ السلام تو اس وقت تک ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ اسی مقام پر یہود و نصاریٰ دھوکا کھاتے ہیں۔ اور حضور علیہ السلام کی رسالت کا انکار کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے۔ کہ یہ دعا حضرت اسحٰق علیہ السلام کے حق میں ہے۔ اور امتِ مسلمہ بھی آپ ہی کی قوم ہے۔ حالانکہ تاریخی شواہد سے واضح ہو رہا ہے۔ کہ امتِ مسلمہ کا تعلق حضرت اسمٰعیل کی اولاد سے ہے۔ جو اس وقت موجود تھے۔ اور دعا میں شامل تھے۔ چنانچہ یہ قبولیتِ دعا کا نتیجہ تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری نبی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے مبعوث فرمایا۔

مناسک حج کی تعلیم

دعا کے دوسرے حصے میں باپ بیٹے نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا

اے پروردگار! ہم کو ہمارے مناسک حج بھی بتلا دے۔ مناسک نسک کی جمع ہے۔ جس کا لفظی معنی دھونا ہے۔ اسی لیے عربی والے کپڑا دھونے کو نسک الثوب بولتے ہیں۔ نسک قربانی کو بھی کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے عبادت و ریاضت کو نسک کہتے ہیں۔ اور عابد کو ناسک اور عبادت گاہ یا قربانی کی جگہ کو منسک کہتے ہیں۔ گو یا معنی یہی نکلتا ہے۔ کہ جس طرح دھونے سے کپڑا میل کچیل سے پاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قربانی اور عبادت سے انسان کے گناہ دھل جاتے ہیں۔

جب خانہ کعبہ کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ تو جیسا کہ گذشتہ درس میں ذکر آ چکا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اعلان حج کا حکم صادر فرمایا۔ تو ضروری تھا۔ کہ جس حج کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس کا طریقہ اور احکام بھی معلوم ہونے چاہئیں۔ اسی لیے باپ اور بیٹا دعا کرتے ہیں۔ کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ارکانِ حج بھی سکھلا دے۔ تاکہ جو لوگ اس ارادے سے آئیں وہ تیرے احکام کے مطابق اس فریضہ کو ادا کر سکیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات کے میدان میں اونٹ کی سواری پر خطبہ ارشاد فرمایا۔ یَآیُّھَا النَّاسُ خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِکَکُمْ اے لوگو! مجھ سے احکامِ حج اچھی طرح سیکھ لو لَعَلِّیْ لَا اَرَاکُمْ بَعْدَ عَامِیْ ھٰذَا شاید اس سال کے بعد تمہارے ساتھ ملاقات نہ ہو سکے۔ اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ آپ اس حج کے بعد دوبارہ مکہ مکرمہ نہ آ سکے۔ اور تین ماہ بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ غرض مناسک سے حج کا طریقہ اور اس کے احکام مراد ہیں۔ جن کے مطابق قیامت تک آنے والے لوگ حج کرتے رہیں گے۔

لفظ اَرِنَا رؤیت یا رائی سے ہے۔ اس کا مصدر رائی بھی آتا ہے۔ اگر رویت مصدر لیا جائے تو اس کا معنی آنکھ سے دیکھنا ہے۔ اے اللہ! ہمیں مناسک حج دکھا دے۔ اور رائی مصدر ہو تو اس کا معنی دل سے جاننا ہوگا۔ "اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ" سے رویت قلبی مراد ہے تو یہاں بھی اَرِنَا کا معنی یہ ہوگا۔ کہ ہمیں مناسک حج کا علم عطا فرما۔ وَتُبْ عَلَیْنَا اور ہماری

لہ مسلم ص ۴۱۹ / ۱۲۰

توبہ قبول فرما، مہربانی کے ساتھ ہم پر رجوع فرما۔ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ بیشک تو ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔ یعنی مہربانی کے ساتھ رجوع کرنے والا ہے۔ تو از حد مہربان ہے۔

باپ اور بیٹے کی دعا کے دو حصے مکمل ہوئے۔ تیسرے حصے میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی درخواست کی گئی ہے۔ جو اگلے درس میں آئے گی۔

درس پنجاہ و یک ۵۱ (آیت ۱۲۹)

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ
يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۗ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ
۱۵ ع ۸ ۱۵ الْحَكِيمُ ع ﴿۱۲۹﴾

ترجمہ:۔ اے ہمارے پروردگار! ان کے اندر انہیں میں سے ایک رسول بھیج، جو ان پر تیری آیتیں تلاوت کرے، اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے۔ اور انکو پاک کرے۔ بیشک تو زبردست اور حکمت والا ہے ﴿۱۲۹﴾

گذشتہ سے پیوستہ

جس وقت حضرت ابراہیم اور اسمعیل علیہما السلام خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔ تو ساتھ ساتھ دعا بھی مانگ رہے تھے۔ دعا کے بعض حصے گذشتہ درس میں بیان ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے عرض کیا "رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا" اے ہمارے پروردگار! ہم سے یہ عمل قبول فرمائے۔ "اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ" تو سنتا بھی ہے اور ہر شخص کی نیت اور ارادے کو بھی جانتا ہے دونوں باپ بیٹے نے اپنی عاجزی کا اظہار کیا، اور عرض کیا کہ ہمارے اس عمل کا مقصد محض تیری رضا ہے۔ لہذا تو ہم سے یہ عمل قبول کر لے۔

دعا کے دوسرے حصے میں عرض کیا "رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ" اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا لے۔ "وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ" اور ہماری اولاد میں سے ایک ایسی جماعت بنا جو تیری فرمانبردار ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ اور حضرت ابراہیم اور اسمعیل علیہما السلام کی اولاد میں امت مسلمہ پیدا کی۔ بنیادی طور تو اس امت مسلمہ میں عرب ہی شامل ہوئے۔ جو کہ اسمٰعیلی نسل کے قریش تھے۔ اس کے بعد انصار مدینہ نمیں شامل ہوئے۔ اور پھر جو لوگ بھی ان کے ساتھ ملتے رہے۔ وہ سب اس امت میں شامل ہیں۔ اس دعائے ابراہیمی کا نتیجہ کئی ہزار سال بعد نکلا جب اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔

دعا کے تیسرے حصہ میں عرض کیا " وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا " اور ہمیں مناسک حج بھی سکھا دے تاکہ ہمارے بعد آنے والے بھی اسی طریقے کے مطابق بیت اللہ شریف کا حج کرتے رہیں ۔ نیز یہ دُعا کی " وَتُبْ عَلَیْنَا ج ۔ اے اللہ! ہماری توبہ قبول فرما لے کیونکہ " اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ " تو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ دعا کر رہے تھے اور صاحبزادے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام آمین کہہ کر دعا میں شامل تھے ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کیلئے دُعا

حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی دعا کا چوتھا جز یہ تھا ۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ " اے ہمارے پروردگار! ان کے اندر انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرما ۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُمّت مسلمہ کی درخواست پہلے اور رسول کی بعثت کی دعا بعد میں کیوں کی ۔ اس کا جواب یہ ہے ۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُمت مسلمہ کی درخواست اپنی اولاد میں سے کی تھی ۔ ظاہر ہے ۔ کہ قریش عرب حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی اولاد میں سے ہی ہیں ۔ جنہوں نے اُمت مسلمہ کی داغ بیل ڈالی ۔ پھر ان کے ساتھ انصار مدینہ شامل ہوئے ۔ اور پھر باقی اقوام عالم کو اُمّت مسلمہ کی رکنیت حاصل ہوئی ۔ چونکہ نبی آخر الزمان علیہ السلام کی بعثت امت مسلمہ ہی سے مطلوب تھی ۔ اس لیے امت کا ذکر پہلے کیا اور بعثت نبوی کا بعد میں کیا ۔ سورۃ جمعہ میں اسی قسم کا ذکر ملتا ہے ۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے احسان جتلاتے ہوئے فرمایا " هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ " اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے ۔ جس نے عرب کے ناخواندہ لوگوں میں اپنا رسول بھیجا ۔ ظاہر ہے کہ عرب کے اکثر لوگ لکھنے پڑھنے سے عاری تھے ۔ کوئی اکا دُکا آدمی ہی نوشت و خواند سے واقف تھا ۔ لہٰذا اس مقام پر اُمّیین کا ذکر کیا مگر مخاطب وہی قریش ہیں ۔ جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے تھے ۔

عظیم الشان رسول

لفظ رَسُوْلًا اسم نکرہ ہے ۔ اور اس سے عظمت کا اظہار ہوتا ہے لہٰذا اس کا معنیٰ صرف رسول نہیں ۔ بلکہ عظیم الشان رسول ہوگا ۔ دوسری آیات میں بھی یہ لفظ نکرہ کے طور پر ہی استعمال ہوا ہے ۔ جیسے " بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ " اس میں مِنْهُمْ کی قید سے بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُمت مسلمہ میں سے ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرمایا ہے ۔

گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد میں سے اُمت مسلمہ بنائی۔ اور پھر اُن میں سے الرَّسُوْل نہیں بلکہ رَسُوْلًا یعنی نہایت عظمت والا رسول مبعوث فرمایا۔

یہ ایک عام سنت اللہ بھی ہے۔ کہ ہر نبی اپنی قوم میں سے مبعوث ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق ایسا ہی مذکور ہے۔ مثلاً عاد، ثمود، صالح علیہ السلام کی قوم قوم ابراہیم، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی قومیں، غرضیکہ ہر نبی اپنی ہی قوم میں ہوا ہے کہیں باہر سے نہیں آیا۔ چنانچہ نبی آخر الزمان علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے ان کی اپنی ہی قوم قریش میں سے مبعوث فرمایا۔ ایسا ہونا منطقی طور پر ضروری بھی ہے۔ کیونکہ اپنی ہی قوم میں سے ہونے کی وجہ سے نبی کے اخلاق و اطوار کو ہر شخص جانتا اور پہچانتا ہے۔ اور اس کے اخلاص کی بنا پر نبوت کی تصدیق کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کی بعثت کی سعادت بھی آپ کی اپنی قوم کو حاصل ہوئی۔

نبی انسان ہی ہوتا ہے

چونکہ نبی اپنی ہی قوم میں سے ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اُسی جنس میں سے یعنی انسان ہوتا ہے کہ انسانوں کی طرف مبعوث ہونے والا نبی انسان ہی ہوگا۔ کسی غیر نسل سے نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو، تو امت کو نبی کے اتباع میں سخت دشواری پیش آسکتی ہے۔ یا بعض معاملات میں اتباع ناممکن بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کسی فرشتے یا جن کو انسانوں کی طرف نبی مبعوث کیا جائے۔ تو نسل ہی مختلف ہوگی۔ نبی اور امت کے مادہ تخلیق میں فرق ہوگا۔ ان کی بود و باش اور عادات و خصائل میں فرق ہوگا۔ ان کی ضروریات مختلف ہوں گی۔ لہٰذا نبی کا اتباع کیسے ممکن ہوگا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ نبی کا اپنی قوم کی جنس سے ہونا کوئی عار کی بات بھی نہیں ہے۔ علم عقائد والے نبی کی تعریف یہ لکھتے ہیں[1] اَلرَّسُوْلُ اِنْسَانٌ بَعَثَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی اِلَی الْخَلْقِ لِتَبْلِیْغِ الْاَحْکَامِ یعنی نبی وہ انسان ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ لوگوں کی طرف احکام شرعیہ پہنچانے پر مقرر کرتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کام کے لیے جس انسان کو منتخب فرماتے ہیں۔ اس پر وحی نازل فرماتے ہیں اور اس کی شان کو بلند فرماتے ہیں۔ لوگوں نے خواہ مخواہ باطل عقائد وضع کر لیے ہیں کہ نبی کو انسان کہنے سے اس کی نعوذ باللہ توہین ہو جاتی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں بلکہ نبی کا انسان ہونا تو انسانیت

---

[1] شرح عقائد طبع ملتان صہ ۱۴ و خیالی صہ ۲ طبع لکھنؤ

کی عظمت پہ دلالت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو کہا "اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ" میں بشر کو مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں۔ اس میں تحقیر کی کون سی بات ہے۔ نہ معلوم لوگوں نے یہ کیسے سمجھ لیا ہے کہ نبی کو بشر کہنے سے نبی کی توہین ہو جائے گی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نبی ایک عام انسان کی طرح نہیں ہوتا۔ جس میں ہر نیک و بد شامل ہوتا ہے۔ بلکہ نبی کو تمام امت پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ معصوم ہوتا ہے۔ البتہ جہاں تک انسانیت یا بشریت کا تعلق ہے۔ قرآن پاک نے بار بار اس کی تصدیق کی ہے "قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" اللہ تعالیٰ نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلان بشریت کرایا ہے۔ دوسری جگہ آپ ہی کی زبان سے کہلوایا "هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا" آپ فرما دیجئے کہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک انسان ہوں اور اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ نہ میں عالم الغیب ہوں، نہ مختار کل ہوں۔ نہ میرے قبضے میں خزانے ہیں۔ نہ تمہاری فرمائش پوری کرنا میرے بس میں ہے۔ میں تو اللہ تعالیٰ کا رسول اور انسان ہوں۔

حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام بھی یہی کہتے رہے ہیں۔ کہ میں بھی تمہاری طرح انسان اور بشر ہوں۔ جس طرح تم کسی کی اولاد ہو اسی طرح میرے بھی ماں باپ ہیں جس طرح تمہاری نسل سے تمہاری اولاد ہے۔ اسی طرح میری بھی ہے۔ تمہاری بھی ضروریات زندگی ہیں اور میری بھی ہیں۔ باقی انسانوں پہ پیش آنے والی واردات بیماری، صحت وغیرہ انبیاء علیہم السلام پہ بھی وارد ہوتے ہیں۔ تمام طبعی امور حتیٰ کہ موت و حیات بھی سب پہ طاری ہوتی ہے۔ البتہ فرمایا کہ نبی کو امت پر فضیلت ہے۔ "یُوْحٰۤی اِلَیَّ" مجھ پہ وحی نازل ہوتی ہے۔ اور یہ بہت بڑی عزت و اکرام والی چیز ہے۔ جو اُسے حاصل ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ اس کام کے لیے منتخب کر لے۔ اس سے زیادہ فضیلت والی اور کوئی چیز نہیں۔ غرضیکہ انبیاء کرام علیہم السلام بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ مگر انسانیت میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ انسان کہنے میں ان کی توہین نہیں ہوتی۔ بلکہ انسان تو وہ ہستی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق پر فضیلت بخشی۔ اسی لیے تو فرمایا "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ" ہم نے آدم کے بیٹے یعنی انسان کو عزت بخشی۔

کوئی امتی نبی کی شان کو نہیں پہنچ سکتا

امتی خواہ کتنا بھی نیک کار، صالح اور پاکباز ہو۔ وہ معصوم نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ عام انسان تو گنہگار ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف نبی ہمیشہ معصوم ہوتا ہے۔ اس صفت کے بغیر نبی، نبی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس میں معصومیت مفقود ہو تو اس کا اتباع ممکن نہیں لہٰذا کوئی بدترین شخص بھی نبی کی توہین نہیں کر سکتا۔ وہ تو معصوم ہے۔ اگر کوئی شخص نبی کے درجے میں برابری کا دعوے کرے تو وہ مومن نہیں رہتا۔ مگر ہمارے ہی بھائیوں نے نبی کو انسانیت کے دائرے سے خارج کر کے نُورٌ مِّنْ نُّوْرِ اللّٰہِ کا خطاب دے دیا۔ بھائی یہ تو عیسائیوں والا عقیدہ ہے "وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا" اللہ کے لیے اُسی کے بندوں میں جزو بنا لیا اور مشرک ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ تو خالق ہے۔ باقی سب مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو عورت کے بطن سے پیدا کیا ہے۔ یہ اس کی کمالِ صنعت کا ظہور ہے۔ اس کو خدا کا جزو بنانا سخت بے ادبی اور گستاخی ہے۔ انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی فضیلت عطا کی ہے۔

تلاوتِ قرآن پاک

فرمایا اے ہمارے رب (امت مسلمہ میں انہی میں سے ایک رسول بھیج یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ جو اُن پر تیری آیات تلاوت کرے۔ آیت سے مرادِ احکام یا فرمان ہے جو نبی پر نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ مولا کریم! جس عظیم الشان نبی کی بعثت کی دعا کر رہا ہوں اس کا پہلا فرض یہ ہو۔ کہ وہ تیری آیتیں اُن کو پڑھ کر سنائے اور انہیں تیرے احکام سے آگاہ کرے۔ کیونکہ نبی کیلیے اللہ تعالیٰ کا عام حکم ہے "یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ" یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی حکم آپ پر نازل ہو آپ اُسے آگے اُمت تک پہنچا دیں۔

تلاوت کے دو مفہوم ہوتے ہیں۔ اس کا پہلا مقصد احکام کو دوسروں تک پہنچانا یا دوسروں کو تعلیم دینا ہوتا ہے۔ اور اس کا دوسرا مقصد خود اپنی ذات کے لیے تلاوت ہے جس طرح ہم قرآن پاک کو کلامِ الٰہی ہونے کی وجہ سے ثواب کے لیے پڑھتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ جس قدر بار بار تلاوت کرے گا۔ اتنا ہی ثواب کا حقدار ہوگا۔ خود لفظ قرآن کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ کتاب جو بار بار بکثرت پڑھی جائے۔

نزولِ وحی

اللہ تعالیٰ کی آیات جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے ، وہ وحی کے ذریعے حضور علیہ السلام کی ذات والاصفات پر نازل ہوتی تھیں ۔ جب آپ پر وحی نازل ہوتی ، تو آپ گھر سے باہر تشریف لاتے اور کاتبانِ وحی میں سے جو بھی قریب ہوتا اُسے طلب فرماتے اور حکم کرتے کہ اس آیت یا سورۃ کو فلاں مقام پر لکھ لو تو وہ لکھ لیتے ۔ بعض اوقات آپ عام مجلس میں تشریف لاتے اور اعلان فرماتے ۔ کہ ابھی ابھی اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا ہے ۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ مجمع عام میں تشریف فرما ہوتے اور آپ پر وحی کی کیفیات طاری ہو جاتیں ۔ آپ کا چہرہ متغیر ہو جاتا اور پھر تھوڑی دیر بعد آپ ارشاد فرماتے کہ یہ وحی نازل ہوئی ہے ۔ پھر آپ حضرت زیدؓ ، حضرت علیؓ ، حضرت عثمانؓ یا جو بھی کاتب مل جاتا اُسے تحریر کروا دیتے ۔

کتاب کی تعلیم

پہلی بات تو یہ تھی ۔ کہ وہ عظیم الشان رسول تیری آیات کی تلاوت کرے گا ۔ اب دوسری بات یہ بتائی ۔ کہ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ کہ وہ رسول اُمت کو کتاب کی تعلیم دے گا کسی کتاب کو صرف پڑھ کر سنا دینا اور چیز ہے ۔ اور اس کی تعلیم دینا دوسری بات ہے ۔ یہاں پر کتاب کی تعلیم کا ذکر ہے ۔ اور علم محنت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا ۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں[1] اِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ علم خود بخود حاصل نہیں ہوتا ۔ بلکہ سیکھنے سے آتا ہے ۔ اور جو لوگ خود بخود سیکھتے ہیں ۔ استاد کی مدد حاصل نہیں کرتے ۔ صرف کتابیں پڑھ کر عالم بننا چاہتے ہیں ، وہ علم میں کچے رہتے ہیں اور ان میں اکثر گمراہ ہوتے ہیں ۔ ان میں کما حقہٗ علم کی پختگی نہیں آتی ۔ علم حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت درکار ہوتی ہے ۔ سلفِ صالحین نے حصولِ علم میں جس قدر سختیں کی ہیں اس کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں ۔ کہ میں سولہ سال تک اس حالت میں رہا کہ رات کو پیاس لگتی تھی تو رات بھر ایک پیالہ پانی بھی نہیں پیتا تھا ۔ کہ کہیں مطالعہ میں غفلت نہ آ جائے ۔ اگر غنودگی طاری ہو گئی تو مطالعہ ادھورا رہ جائے گا ۔ چالیس چالیس سال تک لوگوں نے اتنی بڑی بڑی محنت کی ہے ۔ تب جا کر علم حاصل ہوا ہے ۔

بہرحال تعلیم ایک اہم چیز ہے ۔ اس کے بغیر انسان میں کمال پیدا نہیں ہوتا ۔ بلکہ وہ

---

[1] بخاری صہ ۱۶ ج ۱

استاد کی مدد سے سیکھنا پڑتا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1] کہ دنیا کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ یا اعلیٰ سے اعلیٰ پیشہ ہو، جب تک کوئی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کرے گا علم و فن حاصل نہیں کر سکتا۔ لوہار ہو یا درزی، ڈاکٹر ہو یا انجینیر اُسے ماہر فن کی صحبت حاصل کرنا ہوگی۔ اس کے بغیر وہ اپنے فن میں کامل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح یہ تعلیم جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے بھیجی ہے۔ سب سے زیادہ دقیق ہے۔ یہ بغیر استاد کے کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسی کوشش کرنے والے منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکیں گے بلکہ گمراہ ہو جائیں گے۔ لہٰذا وحی کی تعلیم کے لیے پیغمبر کی ضرورت ہے۔ اور اس لحاظ سے آپ کی ایک صفت مُعلّم بھی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے۔ وہاں پہ دو گروہ اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ایک گروہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والوں کا تھا۔ جو ذکر میں مشغول تھا۔ اور دوسرا گروہ تعلیم و تعلم کا کام کر رہا تھا۔ حضور علیہ السلام اس دوسرے گروہ میں تشریف فرما ہوئے اور فرمایا[2] اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا یعنی مجھے اللہ تعالیٰ نے معلم بنا کر بھیجا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہی دعا کی تھی وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ یا اللہ! ان میں ایسا نبی بھیج، جو انہیں کتاب کی تعلیم دے۔

تعلیم کتاب کے سلسلے میں بعض اوقات الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ صحابہ کرامؓ صاحب لسان تھے۔ عربی ان کی مادری زبان تھی۔ اس کے باوجود بعض اُمور کے سمجھنے میں دقت پیش آتی تھی۔ اس سورۃ بقرہ میں خیط اسود اور خیط ابیض کا ذکر آتا ہے۔ عدیؓ بن حاتم اس کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ حالانکہ خالص عرب اور پھر شاعر بھی تھے۔ زبان پر عبور حاصل ہونے کے باوجود وہ ان الفاظ کے مفہوم تک نہ پہنچ سکے۔ آپ خیط ابیض اور خیط اسود کو سفید و سیاہ رسی سمجھتے رہے حالانکہ اس سے مراد دن اور رات ہے۔ اسی طرح ظلم کا معنیٰ سمجھنے میں بھی صحابہ کرامؓ کو غلطی ہوئی اور پریشان ہو گئے۔ حضور علیہ السلام نے وضاحت فرمائی کہ یہاں پہ ظلم سے مراد شرک ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ " شرک بہت بڑا ظلم ہے خود قرآن پاک میں تصریح موجود ہے۔ غرض!

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صـ ۵۲ جـ ۱ [2] ابن ماجہ صـ ۲۱

اس قسم کے نکات تعلیم کے ذریعے حل ہوتے ہیں۔ کہیں کسی حکم کو خاص کرنا ہوتا ہے۔ کسی کی عمومیت بیان کرنی ہوتی ہے۔ جو کہ اُستاد کے بغیر ممکن نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی حکمت میں یہ بات بیان ہوئی ہے[1] کہ بعض چیزیں بیّنات کے قبیلے سے ہوتی ہیں۔ انسان ذرا سی توجہ کرے، تو آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ اور بعض ایسی ہوتی ہیں۔ جن کو آسانی سے سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔ جیسے فرمایا "هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ" وہ ذاتِ خداوندی جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا۔ یہاں پر ہدایت اور دینِ حق کو سمجھنے کے لیے استاذ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ ایسی معمولی چیز نہیں ہے جو ادنیٰ توجہ سے معلوم ہو جائے۔ اس لیے فرمایا کہ اے اللہ! انہیں میں سے رسول بھیج جو انہیں کتاب کی تعلیم دے۔

حکمت کی تعلیم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری دعا یہ تھی وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ایسا رسول مبعوث فرمایا جو کتاب کے علاوہ انہیں حکمت کی تعلیم بھی دے۔ حکمت کی تشریح میں مفسرین کرام کے بہت سے اقوال ہیں۔ بعض فرماتے ہیں[2] کہ حکمت سے مراد انوار قلوب یا باطنی باتوں کا جاننا ہے۔ بعض دوسرے حضرات فرماتے ہیں۔ کہ حکمت عقل کی دلیل اور دل کی بصیرت کا نام ہے۔ حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں[3] مَعْرِفَةُ الدِّيْنِ وَالْفِقْهُ فِيْهِ وَ الْاِتِّبَاعُ لَهٗ یعنی حکمت نام ہے دین کی معرفت، اس کی سمجھ اور اس کے اتباع کا۔ عام طور پر حکیم کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے۔ مَنْ اَتْقَنَ الْعِلْمَ وَالْعَمَلَ حکیم وہ ہے جس نے علم اور عمل میں پختگی حاصل کر لی۔ ڈاکٹر کا معنی ماہر فی الفن ہے۔ خواہ وہ بے عمل ہو۔ مگر حکیم وہ ہوگا جو علم اور عمل میں مساوی ہوگا۔

بعض فرماتے ہیں[4] کہ شریعت الٰہیہ میں جتنی مصلحتیں اور دین کے جتنے احکام ہیں ان کو پہچاننے کا نام حکمت ہے۔ حق اور باطل کے درمیان امتیاز کرنا بھی حکمت کہلاتا ہے۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنّت کو بھی حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض کہتے

ا ۔ ۔ ۔ ۲ روح المعانی ص۳۸۷ ج۱

۳ تفسیر کبیر ص۷۴ ج۴ ۴ تفسیر کبیر ص۷۴ ج۴

ہیں۔ کہ تمام چیزوں کو ان کی حقیقت کے ساتھ جاننے کا نام حکمت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے[1] اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا اے اللہ! ہمیں حق کو سمجھنے کی توفیق عطا کر۔ ایسا نہ ہو کہ ہم باطل کو حق سمجھنے لگیں۔ بزرگان دین کی دعا میں آتا ہے۔ کہ ہمیں چیزیں اس طرح دکھا۔ جس طرح وہ واقعہ میں ہیں۔ بسا اوقات آدمی کسی چیز کو سمجھتا کچھ ہے مگر حقیقت میں کچھ اور ہوتا ہے۔ امام ابن درید جو کہ لغت کے امام ہیں وہ فرماتے ہیں۔ کہ ہر وہ چیز جو تمہارے لیے نصیحت کا باعث بنے۔ یا تمہیں برائی پہ زجر کرے یا کسی قبیح کام سے روکے یا کسی بزرگی کے کام کی طرف دعوت دے، وہ سب حکمت ہے۔ امام راغبؒ جو لغت اور تفسیر کے امام ہیں فرماتے ہیں اَلْحِکْمَۃُ اِصَابَۃُ الْحَقِّ بِالْعِلْمِ وَالْعَقْلِ حق کو علم اور عقل کے ذریعے پالینا حکمت ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ قول اور عمل میں برابری کا نام حکمت ہے۔

امام بیضاویؒ اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں[2]۔ کہ ایسی چیز جس کے ذریعے انسان کے نفس کی تکمیل ہوتی ہو۔ حکمت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے[3]۔ رَاْسُ الْحِکْمَۃِ مَخَافَۃُ اللّٰہِ یعنی حکمت کی جڑ اور بنیاد اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔ جس انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہو جائے۔ سمجھ لو کہ اس میں حکمت کی بنیاد قائم ہو گئی ہے۔ حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے[4]۔ مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰہِ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا جس نے چالیس دن تک اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جَرَتْ یَنَابِیْعُ الْحِکْمَۃِ مِنْ قَلْبِہٖ عَلٰی لِسَانِہٖ حکمت کی سوتیں اس کے دل کی طرف سے اس کی زبان پر جاری ہو جائیں گی۔

بعض محققین کہتے ہیں۔ حکمت نام ہے مَعْرِفَۃُ اَفْضَلِ الْاَشْیَاءِ بِاَفْضَلِ الْعُلُوْمِ افضل چیز کو افضل علم کے ساتھ جاننے کا نام حکمت ہے۔ ظاہر ہے کہ سب سے افضل چیز اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات ہیں۔ اور سب سے افضل وہ علم ہے جس سے انسان کو حضورِ قلب حاصل ہو جائے۔ اگر اس کے دل میں ایسی کیفیت پیدا ہو جائے تو وہ خدا تعالیٰ کی

---

[1] ـــ [2] تفسیر بیضاوی ص ۱۸۰ ج ۱

[3] کنز العمال ص ۸۲ ج ۳ [4] جامع صغیر مع شرح فیض القدیر ص ۴۳ ج ۶

ذات اور اس کی صفات کو پہچان لے گا اور سمجھا جائے گا کہ یہ شخص حکیم ہے۔ تاہم عام فہم معنی میں حکمت دانشوری، سمجھ اور پتے کی باتوں کو کہتے ہیں ایسی باتیں احکام ہوتے ہیں۔ ان کی مصلحتیں اور ان کے اسرار بھی ہوتے ہیں۔ ان کے غوامض ہوتے ہیں۔ اس میں سنت بھی شامل ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تمام باتیں سکھائی ہیں اس لیے فرمایا وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وہ رسول جو لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

تزکیہ نفس

دعا کا چوتھا جزو تھا وَيُزَكِّيهِمْ اور ان کو پاک کردے۔ یہ لفظ بڑے دُور رس معانی کا حامل ہے۔ پاکیزگی سے مراد یہ ہے۔ کہ اُن سے تمام رذائل دُور ہو جائیں۔ اور تمام فضائل ان میں پیدا ہو جائیں۔ رذائل میں نفاق، بداخلاقی، گندگی، معاصی، بداعمالی، اور دیگر تمام شریر چیزیں آتی ہیں جن میں سب سے پاکیزگی مطلوب و مقصود ہے۔ تزکیہ اسی کو کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام نے اس موقع پر یہ بات سمجھائی کہ کسی قوم میں فوز و فلاح اور سعادت تزکیہ کے بغیر نہیں آسکتی۔ لہٰذا انہوں نے امتِ مسلمہ کے لیے تزکیہ کی دعا کی۔ اور پھر آپ کی دُعا کا اثر بھی دیکھیے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مخاطبین کی جہالت مثالی تھی۔ ان کی خباثت، جہالت اور ہٹ دھرمی سب کچھ عیاں ہے۔ مگر اس تزکیہ کی بدولت کیسے کیسے جلیل القدر لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے تن من دھن ہر چیز دین پر قربان کر دی۔ ایک دوسرے مقام پر تزکیہ کو یوں بیان فرمایا "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً" ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ وصول کریں "تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ" وہ ظاہری اور باطنی ہر دو پہلوؤں سے پاک ہو جائیں گے۔ غرضیکہ تزکیہ سے مراد ظاہری پاکیزگی بھی ہے۔ اور باطن کی پاکیزگی بھی ہے۔ اسی لیے فرمایا۔ اے اللہ! ان میں ایسا رسول بھیج جو تیری آیات پڑھ کر سنائے۔ انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

بیعت اور تزکیہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا آخری حصہ تزکیہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی لیے اس کو دُعا کے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔ بزرگانِ دین کی بیعت حصول تزکیہ کا ایک ذریعہ ہے جو کہ حضرت علیؓ سے چلا آرہا ہے۔ بزرگانِ دین مرید کو وظیفہ بتاتے ہیں، عبادت و ریاضت کا طریقہ سکھاتے ہیں۔ اور ضروری پرہیز بھی بتاتے ہیں۔ تاکہ مرید برائیوں سے پاک ہو جائے اور اس میں خوبیاں اجاگر ہو جائیں۔ مگر آج پیری مریدی ایک پیشہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ بیعت ایک

رسمی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ فاسق فاجر، بے نماز، بٹیر اور کتّے پالنے والے گدی نشین ہیں۔ اور وہ جہلاء سے بیعت لے رہے ہیں۔ نہ پیر کو احکامِ الٰہی کا علم ہے۔ نہ مرید کے پلّے کچھ پڑتا ہے۔ بس چند رسوم ادا کر کے پیری مریدی کے بندھن میں بندھ گئے۔ نہ پیر نے تربیت کی، نہ حلال و حرام کی تمیز سکھائی، تو تزکیہ کیسے ہو گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نبی نے جن لوگوں سے بیعت لی تھی۔ اس کا کوئی مقصد تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں نبی علیہ السلام کو ارشاد فرمایا۔ کہ ان لوگوں سے ان شرائط پر بیعت لیں کہ کفر و شرک کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ گناہ کی باتوں سے پرہیز کریں گے چوری نہیں کریں گے۔ بدکاری نہیں کریں گے۔ کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے وغیرہ وغیرہ۔ فرمایا اگر ان شرائط کے مطابق مرد اور عورتیں بیعت کریں۔ تو ان کی بیعت لیں اور جو ان شرائط کو پورا نہ کریں ان سے بیعت نہ لیں۔ مگر آج حالت یہ ہو چکی ہے۔ کہ بیعت بھی ہو رہی ہے۔ اور کفر، شرک، بدعات کی بھی فراوانی ہے۔ کوئی پیر مرید سے نہیں پوچھتا کہ کیا کر رہے ہو۔ قبریں پکی بن رہی ہیں، گنبد تعمیر ہو رہے ہیں۔ ان پر قوالی ہو رہی ہے۔ گانے گائے جاتے ہیں۔ قبروں پر چادریں چڑھتی ہیں، سجدے ہوتے ہیں۔ بتایئے اب تزکیہ کہاں سے آئے گا۔ بزرگانِ دین نے ان باتوں کا حکم نہیں دیا تھا۔ انہوں نے تو اپنے لیے جھونپڑا بھی پسند نہ کیا۔ اس دنیا کی پوری زندگی مسافر کی طرح گذار دی۔ مگر آج ان کی قبروں پر عالیشان گنبد بنائے جاتے ہیں۔ لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ جن بزرگوں کی تعلیم یہ تھی کہ مرد کے لیے سونا اور ریشم حرام ہے۔ انکی قبروں پر سونے کے دروازے اور ریشم کی چادریں چڑھائی جا رہی ہیں۔ کیا وہ بزرگ ان خرافات سے بیزار نہیں ہوتے ہوں گے۔ وہ تو ساری عمر ایمان کی دعوت دیتے رہے، کفر و شرک سے بیزاری کا اظہار کرتے رہے، مگر ہم ان کے بعد کیا کر رہے ہیں۔ غرضیکہ پیغمبر کا ایک فریضہ یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کرتا ہے۔

حضور علیہ السلام کے پاس ایک شخص آیا۔ حضور! میں نے فلاں جگہ پر جانور ذبح کرنے کی منّت مانی ہے۔ کیا اُسے پورا کر دوں۔ آپ نے پوچھا۔ اس جگہ کبھی کوئی بُت تو نہیں تھا۔ یا کسی زمانے میں وہاں کوئی بزرگ تو نہیں بیٹھا تھا۔ لوگوں نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے وہاں پر جانور ذبح کرنے کی اجازت دے دی[1]۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ زمانہ جاہلیت

---

[1] ابوداؤد ص ۱۱۳ ج ۲

میں وہاں کوئی مقام ہو جس کی پوجا ہوتی ہو۔ کوئی بزرگ کسی درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ تو درخت کی پوجا ہونے لگی۔ آپ نے اس قدر احتیاط فرمائی۔

اختتام دعا

الغرض! حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام نے دعا کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی تعریف فرمائی۔ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَكِیۡمُ اے مولا کریم! وہی کمالِ قدرت کا مالک ہے۔ عزیز کا معنیٰ غالب ہے۔ یعنی ہر چیز پر تیرا ہی غلبہ ہے۔ اور حکیم سے مراد۔ کمالِ حکمت کا مالک بھی تو ہی ہے۔ تیرے سب امور حکمت اور مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہماری دعا کو قبول فرما اور امتِ مسلمہ قائم کر اور پھر ان میں عالیشان رسول بھیج جو تیری آیات پڑھے۔ انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ
اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٣٠﴾
اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٣١﴾
وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ
اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٣٢﴾ ۭ
اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ
لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ
وَاِلٰهَ اٰبَاۗىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰــهًا وَّاحِدًا ښ
وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٣﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ
وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْــَٔــلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٤﴾

ترجمہ: اور نہیں اعراض کرتا ابراہیم (علیہ السلام) کی ملّت سے مگر وہ شخص جس نے اپنے نفس کو بیوقوف بنا لیا۔ اور البتہ تحقیق ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو لپند فرمایا دنیا میں اور بیشک وہ آخرت میں البتہ نیکوکاروں میں شمار ہوگا ﴿۱۳۰﴾ جب اُس کے رب نے فرمایا فرمانبردار ہو جاؤ۔ تو اُس نے کہا میں فرمانبردار ہو چکا ہوں رب العلمین کے لیے ﴿۱۳۱﴾ اور ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے بیٹوں کو اس ملّت پر قائم رہنے کی وصیت کی۔ اور یعقوب (علیہ السلام) نے بھی۔ اور کہا اے میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دین کو چن لیا ہے۔ پس تم نہ مرو، مگر اس حالت میں کہ تم فرمانبرداری کرنے والے ﴿۱۳۲﴾ کیا تم حاضر تھے جب یعقوب (علیہ السلام) کو موت آ گئی تھی۔ جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا، تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے۔ تو انہوں نے کہا۔ کہ ہم عبادت کریں گے تیرے معبود کی اور تیرے آباؤ اجداد، ابراہیم، اسمٰعیل، اور اسحٰق (علیہم السلام)

کے معبود کی۔ وہی ایک معبود ہے اور ہم اس کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں (۱۳۳) یہ ایک جماعت ہے، جو گذر چکی ہے۔ اس کے لیے وہی کچھ ہے جو اُس نے کیا۔ اور تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا، جو تم نے کمایا۔ اور تم سے اُن باتوں کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا جو کچھ وہ کرتے تھے (۱۳۴)

گذشتہ سے پیوستہ

اللہ تعالیٰ نے پہلے بیت اللہ شریف کی بنیاد اور اس کی تعمیر کا ذکر فرمایا۔ اور پھر اسی ضمن میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی دعا کا ذکر تھا۔ دعا میں سب سے پہلے عمل کی قبولیت اور اور پھر اطاعت اور فرمانبرداری کی توفیق طلب کی گئی تھی۔ اس کے بعد دونوں باپ بیٹے کی اولاد میں سے اُمت مسلمہ کے قیام اور پھر اُن میں سے ایک عظیم الشان رسول کی بعثت کی دعا تھی۔ اور پھر اُن فرائض کا ذکر تھا جو آخری رسول انجام دے گا۔

یہاں پر مرکزی نکتہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہی ہے۔ کیونکہ اہل کتاب آپ کی رسالت کا انکار کرتے تھے۔ یہ مرکزی مضمون آگے دُور تک جائے گا۔ ابتداء میں حضرت خلیل علیہ السلام کی دعا کا ذکر ہے۔ اور پھر اس دُعا کے مصداق کا بیان ہے۔ تو جیسا کہ دعائے خلیل سے ظاہر ہے۔ کہ وہ ذات والاصفات صرف حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ہو سکتی ہے آپ ہی حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ کا خاندان قریش اُسی نسل سے ہی چلا آرہا تھا۔ انہیں میں اللہ تعالیٰ نے اُمت مسلمہ کا قیام فرمایا۔ اور دُعا کے مطابق انہیں میں نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے آثار

آپ کی بعثت کے متعلق مسند احمد میں آتا ہے[1]۔ کہ کسی نے پوچھا حضور! آپ کی ابتداء کیسے ہوئی۔ آپ نے ارشاد فرمایا اَنَا دَعْوَةُ اِلٰی اِبْرٰهِیْمَ وَرُءْیَا اُمِّیْ وَبَشَارَةُ عِیْسٰی یعنی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا، اپنی ماں کے خواب اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا مصداق ہوں۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اُسی دُعا کا ذکر ہے۔ جو گذشتہ درس میں گذر چکی ہے "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ" یعنی اے اللہ! ان میں انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرما۔

حضور علیہ السلام کی والدہ ماجدہ نے آپ کی پیدائش سے پہلے خواب دیکھا تھا[2]۔ کہ ان کے پہلو

---

[1] مسند احمد ص۱۲۷ ج۴، فتح الباری ص۳۹۴ ج۶ [2] مسند احمد ص۱۲۷ ج۴، فتح الباری ص۳۹۴ ج۶، طبقات ابن سعد ص۱۰۲ ج۱

سے ایک ایسی روشنی نکلی ہے۔ جس سے شام اور بصریٰ کے محلات روشن ہوگئے ہیں۔ یہاں تک کہ اونٹوں کی گردنیں نظر آرہی ہیں۔ اس حدیث کی ترجمانی مولانا الطاف حسین حالیؒ نے اپنی طویل نظم مدوجزر اسلام میں خوب کی ہے۔ ؎

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا　　　دعائے خلیل و نوید مسیحا

جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا تعلق ہے۔ قرآن پاک نے اس کو بھی واضح کر دیا ہے۔ آپ نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کہ میں تمہاری طرف رسول مبعوث ہوا ہوں۔ میں اپنے سے پہلی کتاب توراۃ کی تصدیق کرنے والا ہوں " وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ " اور اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دینے والا ہوں۔ جن کا نام نامی اور اسم گرامی احمد ہوگا۔ عبرانی اور سریانی زبان میں احمد کو فارقلیط کہا گیا ہے جس کا معنیٰ دنیا بھر کا تعریف کیا ہوا۔

شاعری میں مولانا الطاف حسین حالی پانی پتیؒ، غالب کے شاگرد تھے اور علوم دینیہ میں حضرت مولانا شاہ اسحٰقؒ صاحبؒ کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آپ زیر تعلیم تھے مگر اس ہنگامے کی وجہ سے اپنی تعلیم کو جاری نہ رکھ سکے۔ آپ کا شمار قومی شاعروں میں ہوتا ہے۔ آپ نے اسلام کے عروج و زوال کی داستان نہایت مؤثر انداز میں نظم کی صورت میں پیش کی ہے۔ آج کل لوگ میلاد خوانی کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کی مدح کے نام پر کفریہ اور شرکیہ کلمات کہہ جاتے ہیں۔ ایسی تمام نعتوں کے مقابلے میں مولانا حالیؒ کا یہ ایک ہی شعر کافی ہے۔ حدیث کے مضمون کو ایک شعر میں کمال طریقے سے سمو کر حضور علیہ السلام کی تعریف کی ہے۔

آیت کا شان نزول

تفسیر معالم التنزیل میں شان نزول اس طرح بیان کیا گیا ہے[1]۔ کہ یہودی علماء میں سے حضرت عبداللہ بن سلامؓ کو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے کی توفیق عطا فرمائی۔ آپ کے بھائی کے دو بیٹے بھی صاحب علم تھے۔ آپ نے اُن سے کہا۔ کہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ کہ توراۃ میں یہ بیان موجود ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، میں بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل میں ایک نبی مبعوث کرونگا۔

---

[1] معالم التنزیل ص۵۲ ج۱ تفسیر ابوالسعود ص۱۲۶ ج۱

جس کا نام احمد ہو گا۔ اور جو شخص اس پر ایمان لائے گا، ہدایت پا جائے گا۔ اور جو اس کا انکار کریگا وہ ملعون ہو گا۔ چنانچہ اُن دو بھائیوں میں سے ایک بھائی مسلمان ہو گیا اور دوسرا یہودیت پر قائم رہا۔ آیات زیر درس میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ملت ابراہیمی سے اعراض

فرمایا وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ اور نہیں اعراض کرتا ملت ابراہیمی سے مگر وہ شخص جس نے اپنے نفس کو بیوقوف بنالیا۔ یعنی ایسا کام وہی کر سکتا ہے جو پرلے درجہ کا بیوقوف ہو۔ اپنی عقل و خرد کو بروئے کار نہ لاتا ہو۔ ورنہ عقلمند شخص جس کی اپنی کوئی رائے ہو۔ وہ ملت ابراہیمی سے اعراض نہیں کر سکتا۔

دین، ملت اور شریعت

دین، ملت اور شریعت تین مختلف چیزیں ہیں۔ دین تمام انبیاء علیہم السلام کی مشترک میراث ہے۔ قرآن پاک کے دوسرے مقام پر آتا ہے شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ "یعنی ہم نے آپ کی طرف وہی دین نازل کیا جو نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کی طرف نازل کیا۔ دین ایک بنیادی عقیدہ ہوتا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی رہا ہے۔ اسمیں اولین چیز توحید ہے۔ اسکے بعد فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور قیامت پر ایمان ہے۔ یہ ایسے بنیادی عقاید ہیں۔ جن میں کسی زمانے میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا

ملت میں موٹے موٹے اصول اور کلیات ہوتے ہیں۔ مختلف انبیاء علیہم السلام کی ملت میں بھی بہت حد تک اشتراک ہوتا ہے اور ملت کبھی منسوخ نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1] کہ بعض کلیات ہر ملت میں قائم رہے ہیں۔ مثلاً طہارت، خدا کے سامنے عاجزی، سماحت و فیاضی، عدل و انصاف، تہذیب نفس وغیرہ یہ ایسی چیزیں ہیں۔ جو تمام ملل میں قدر مشترک رہی ہیں۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام اور حضور علیہ السلام کی گویا ایک ہی ملت ہے۔ اسے ملت اسلامیہ کہہ لیں یا ملت ابراہیمی، مطلب ایک ہی ہے۔ اور اس آخری دور میں حضور علیہ السلام کا اتباع ہی ملت ابراہیمی کا اتباع ہے۔ جو شخص نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی ملت کا فرد نہیں ہے۔ اسکی طرف سے ملت ابراہیمی سے تعلق کا دعویٰ باطل ہے۔ ایسا شخص گمراہ ہو گا۔ چنانچہ اس وقت

ملہ حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۵۳ ج ۱ سمعات صفحہ ۸۹

یہودی اور نصرانی دونوں ملعون گروہ ہیں۔

ہر نبی کی شریعت مختلف ہوتی ہے۔ شریعت میں مسائل کی جزئیات ہوتی ہیں۔ جو مکان و زمان کی مناسبت سے بدلتی رہتی ہیں۔ اسی لیے فرمایا "لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا" ہم نے ہر امت کے لیے جُدا جُدا شریعت بنائی ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشادِ گرامی ہے نَحْنُ مَعْشَرُ الْأَنْبِيَاءِ أَوْلَادُ عَلَّاتٍ دِينُنَا وَاحِدٌ ہم انبیاء علیہم السلام کا گروہ علاتی بھائی ہیں، مگر ہمارا دین ایک ہی ہے۔ علاتی بھائی وہ ہوتے ہیں جن کا باپ ایک ہو اور مائیں مختلف ہوں۔ حضور علیہ السلام نے اس مثال سے یہ بات سمجھائی کہ دین ایک بنیادی چیز ہے۔ جو کہ غیر تغیر پذیر ہے۔ مگر شرائع یعنی جزیات مختلف زمانوں میں بدلتی رہتی ہیں۔ جیسے حلال وحرام کے مسائل ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں دو سگی بہنیں بیک وقت ایک مرد کے نکاح میں آسکتی تھیں۔ ہماری شریعت میں یہ ناجائز ہے۔ ان کی شریعت میں اونٹ کا گوشت کھانا جائز نہیں تھا۔ مگر ہماری شریعت میں جائز ہے۔ مقصد یہ کہ شریعت ایک تغیر پذیر چیز ہے۔ ملت کے بڑے بڑے اصول مشترک ہوتے ہیں۔ اور دین بالکل غیر تغیر پذیر ہے۔ یہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مرتبہ ذیشان

ملتِ ابراہیمی کے تذکرہ کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہاں پر تعریف بیان فرمائی ہے۔ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں نبوت و رسالت اور امامت و پیشوائی کے لیے منتخب فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دنیا میں درجہ کمال تک پہنچایا اور آپ کو عزت اور شرف عطا کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے منتخب شدہ برگزیدہ انسان تھے وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ اور آخرت میں وہ نیکوکاروں میں شمار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دنیا اور آخرت ہر دو مقام میں بزرگی عطا فرمائی۔ لہٰذا ان کے طریقے سے انحراف کرنے والا ملعون کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فرمانبرداری

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نبوت و امامت جیسے منصب جلیلہ پر فائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ جب ان کے رب نے ان سے کہا کہ فرمانبردار ہو جاؤ تو قَالَ أَسْلَمْتُ

ل تفسیر ابن کثیر ص ۱۸۶ ج ۱

لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ انہوں نے کہا میں ہمہ تن جان و مال، ظاہر و باطن میں ربّ العلمین کا فرمانبردار ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنا ملّت کا اولین اصول ہے۔ اُمت کا یہ فرض ہے۔ کہ ہر آنے والے نبی کا اتباع کرے۔ فرمانبرداری کی یہی شان ہے۔ ملّت ابراہیمی میں جب بگاڑ پیدا ہوا تو یہودیت اور نصرانیت پیدا ہوئی۔ اسی لیے ان دو گروہوں کی مذمت کی گئی ہے۔ حقیقت میں ملّت ابراہیمی ہی ملّت اسلامیہ ہے۔ جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کاربند تھے۔ اور جس پر حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام بھی کاربند رہے۔ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی ارشاد ہوا "اَنِ اتَّبِعْ مِلَّۃَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا" لہٰذا حضور علیہ السلام کا اتباع ہی حقیقت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملّت کا اتباع ہے۔ جو شخص پہلے نبی کی اطاعت کا دعویدار ہو۔ اور آخری نبی کا انکار کرے، وہ ملّت ابراہیمی کا پیروکار کیسے ہو سکتا ہے۔ بنی اسرائیل کو سمجھایا جا رہا ہے۔ کہ وہ ہٹ دھرمی چھوڑ کر دین اسلام کو قبول کر لیں۔

حضرت ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام کی وصیت

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو اسی ملّتِ اسلامیہ پر کاربند رہنے کی وصیت کی۔ وَوَصّٰی بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ[1] حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کتنے بیٹے تھے۔ اس میں مختلف روایات ہیں[2]۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ چار[4] بیٹے تھے۔ بعض نے سات[7] اور بعض نے چودہ[14] لکھے ہیں۔ آپ کی متعدد بیویاں تھیں۔ اور مدین، مدائن، اسمٰعیل اور اسحاق سب ابراہیم علیہ السلام کے فرزند تھے۔ اسی طرح یعقوب علیہ السلام کے بھی بارہ بیٹے تھے، تو ان دونوں جلیل القدر انبیاء کرام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّیْنَ اے بیٹو! بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دینِ اسلام کو منتخب فرمایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے۔ اسی پر کاربند رہنا۔ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ اور تمہاری موت صرف اسی حالت میں آنی چاہیئے کہ تم فرمانبرداری کرنے والے ہو۔ یعنی دینِ اسلام پر قائم ہو۔ مقصد یہ تھا کہ موت ایک غیر اختیاری چیز ہے۔ پتا نہیں کس وقت وارد ہو جائے۔ لہٰذا تمہارا ہر لمحہ اطاعت خداوندی میں دینِ اسلام پر گذرنا چاہیئے۔ یعنی مرتے دم تک ملّت اسلامیہ پر قائم رہو جو حضور نبی کریم علیہ السلام

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۴۹۱ پارہ ۱ ۔ [2] ج ۱ صفحہ ۱۳۷ ۔ در منثور صفحہ ۱۳۹ ج ۱

کا ارشادِ گرامی ہے۔ مَنْ مَاتَ عَلٰی شَیْءٍ بَعَثَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ جو شخص جس عقیدے پر مرے گا اسی پر قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔ لہٰذا تمہاری موت دینِ حق پر آنی چاہیئے۔ تاکہ روزِ محشر یہی دین لے کر اٹھو۔

یہودیوں کے لٹریچر میں اس وصیت کے ضمن میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کا بھی ذکر ہے۔ کہ انہوں نے بھی اپنی اولاد کو ایسی ہی وصیت کی تھی۔ جب ان کا وقت موعود آپہنچا، تو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلا کر کہا کہ میں تم کو اس خدا کا واسطہ دیتا ہوں، جس کی صفاتِ عالیہ علیم، قیوم اور عزیز ہے۔ اور جو آسمان و زمین کے درمیان ہر چیز کا خالق ہے۔ تم اسی خدا کا خوف رکھنا اور اسی کی عبادت کرنا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی وقتِ آخر اپنے بیٹوں کو پاس بلا کر کہا۔ مجھے خدشہ ہے۔ کہ تم میں سے کوئی بت پرستی اور شرک کی طرف میلان رکھتا ہے۔ تو بیٹوں نے جواب دیا۔ سن اے اسرائیل! اے ہمارے باپ! ہمارا خدا وہی ہے جو لم یزل ہے۔ اور جس طرح ایک خدا تعالیٰ پر تیرا ایمان ہے۔ اسی طرح ایک خدا پر ہمارا بھی ایمان ہے۔ بہرحال یہ حضرت ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام کی وصیت کا ذکر تھا۔ جو اس آیت میں بیان ہوا۔

اگلی آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت کا بطورِ خاص ذکر فرمایا۔ یہود و نصاریٰ کو یاد دہانی کرائی جا رہی ہے۔ کہ تمہارا یہ دعویٰ باطل ہے۔ کہ تم ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام کو ماننے والے ہو۔ انہوں نے یہودیت یا نصرانیت کی تعلیم نہیں دی تھی۔ ان کی تعلیم تو واضح طور پر توحید پر مبنی تھی۔ فرمایا اس واقعہ کو یاد کرو اَمْ کُنْتُمْ شُھَدَآءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ کیا تم اس وقت موجود تھے۔ جب یعقوب علیہ السلام کے پاس موت آئی۔ اِذْ قَالَ لِبَنِیْہِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا، تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے یہودیوں کی روایت میں یہ بھی موجود ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا مجھے شبہ ہے کہ تم میں کوئی شرک کی طرف میلان

---

[1] جامع صغیر مع شرح فیض القدیر صفحہ ۲۲۶ ج ۶ بحوالہ مسند احمد و مستدرک حاکم عن جابر رضؓ

نہ رکھتا ہو۔ تو بیٹوں نے بیک آواز جواب دیا قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ ہم تیرے معبود کی عبادت کریں گے وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اور تمہارے آباؤ اجداد اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق علیہم السلام کے معبود کی عبادت کریں گے۔ اِلٰهًا وَّاحِدًا جو ایک ہی معبود ہے۔ ہم صرف اُسی کی عبادت کریں گے۔ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ اور ہم صرف اسی کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔ یہ سب باتیں حضرت یعقوب علیہ السلام کے دم واپسین کے وقت کی ہیں۔ جو اپنی اولاد کو دین توحید اور ملت ابراہیمی پر کاربند رہنے کی تلقین فرما رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان تمام واقعات کے پیش نظر یہود و نصاریٰ کے لیے ملتِ ابراہیمی سے انحراف کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ان میں ذرا بھی انصاف کا مادہ موجود ہو۔ اور وہ تعصب کی عینک اتار کر دیکھیں تو انہیں حضور علیہ السلام پر ایمان لانا ہوگا۔ کیونکہ آپ ہی ملتِ ابراہیمی کے سچے پیروکار اور سچے جانشین ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے اس دعوے کی تردید فرمائی ہے۔ کہ وہ ملت ابراہیمی پر ہیں۔ آگے سورۃ آل عمران میں آئے گا۔ کہ اے بنی اسرائیل! اگر تمہارا دعوے یہ ہے۔ کہ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر ہو۔ تو نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا پڑے گا۔ آپ کے بغیر سب ادیان باطل ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف تمہاری جھوٹی نسبت کچھ مفید نہ ہوگی۔

ہر امت اپنے افعال کی ذمہ دار ہے

ان جلیل القدر پیغمبروں حضرت ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد کی توحید پر پختگی کے بعد فرمایا۔ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی، وہ دین توحید پر قائم رہی لَهَا مَا كَسَبَتْ انہیں کے لیے ہے جو کچھ انہوں نے کیا۔ یعنی ان کے عقیدہ اور اعمال و افعال کا اجر ان کو ملے گا وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ اور تمہارے لیے وہ ہوگا جو تم کماؤ گے۔ اگر تم بھی ان کے طریقے پر چلتے ہوئے دین اسلام اور ملت ابراہیمی کا دامن تھام لو گے۔ تو مراد کو پہنچو گے۔ اور اگر اپنی ضد اور عناد پر قائم رہے۔ تو ملت ابراہیمی سے خالی خولی نسبت کچھ کام نہ آئے گی اور تمہارے عقیدے اور اعمال کے مطابق ہی تمہیں بدلہ دیا جائے گا۔ امام غزالیؒ نے بڑی عمدہ مثال دی ہے۔ کہتے ہیں۔ کہ اگر بیٹا بھوکا یا پیاسا ہو اور باپ کھا پی لے۔ تو بیٹے کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کی بھوک اور پیاس رفع نہیں ہوگی،

جب تک وہ خود نہیں کھائے پیئے گا۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ کے آباؤ اجداد کا دین اسلام پر قائم ہونا انہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ جب تک یہ خود ہٹ دھرمی چھوڑ کر ملّت ابراہیمی کو نہ اپنالیں۔ فرمایا وَلَا تُسْئَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے آباؤ اجداد کا دین کیا تھا۔ وہ کیا کرتے تھے، بلکہ تمہیں خود اُن کی صحیح سمتوں میں پیروی کرنا ہوگی۔ تمہارے اعمال کی بازپرس تمہیں سے ہوگی۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ
حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ
اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَ
يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ
مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ
﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ
وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِىْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫
وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

ترجمہ: اور (یہود و نصاریٰ) کہتے ہیں۔ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ، ہدایت پا جاؤ گے اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے ہرگز نہیں، بلکہ ہم ملّتِ ابراہیمی کی پیروی کریں گے جو ایک طرف کو جھکنے والے (یکسو) تھے۔ اور شرک کرنے والوں میں نہیں تھے ﴿۱۳۵﴾ (اے ایمان والو) کہہ دو ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس چیز پر جو ہماری طرف اتاری گئی ہے۔ اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق، یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد پر اتاری گئی ہے (اور ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر) جو موسیٰ، عیسیٰ (علیہم السلام) اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی ہے۔ ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور ہم اسی پروردگار کی پیروی کرنے والے ہیں ﴿۱۳۶﴾ پس اگر یہ لوگ ایمان لے آئیں جیسا کہ تم ایمان لائے ہو، تو تحقیق یہ ہدایت پا جائیں گے۔ اور اگر انہوں نے روگردانی کی پس بیشک وہ مخالفت میں ہیں۔ پس عنقریب اللہ تعالےٰ کفایت کرے گا آپ کے لیے ان سے۔ اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۱۳۷﴾ (ہم نے)

اللہ کا رنگ اختیار کیا ہے۔ اور کون زیادہ بہتر ہے اللہ سے باعتبار رنگ کے
اور ہم اسی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے ہیں (۱۳۸)

گذشتہ سے پیوستہ

یہود و نصاریٰ اور مشرکین تینوں گروہ ملتِ ابراہیمی کے مخالف تھے۔ خصوصاً اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ اپنی یہودیت اور نصرانیت کو ہی ملتِ ابراہیمی خیال کرتے تھے، اور دوسروں کو بھی یہی چیز اختیار کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ مدینہ طیبہ کے اطراف میں رہنے والے یہودیوں میں ایک بڑا عالم عبداللہ بن صوریا مشہور رہا تھا۔ اس نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دی کہ آپ یہودیت اختیار کر لیں، ہدایت پا جائیں گے۔ دلیل اس کی بھی یہی تھی کہ وہی اصل ابراہیمی طریقے پر قائم ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ دعویٰ غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہودیت تورات کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اور نصرانیت انجیل کی مسخ شدہ صورت۔ انہوں نے آسمانی کتابوں میں شرک کی آمیزش کر کے اپنے مذہب کو باطل کر لیا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف خالی نسبت پر ہی اتراتے رہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے باطل عقائد کا رد فرمایا ہے

راہ ہدایت

اہل کتاب کا باطل کی طرف دعوت دینے کا طریقہ یہ تھا کہ وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ــــــ وہ کہتے تھے کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ، ہدایت پا جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت کو رد فرماتے ہوئے نبی علیہ السلام کو ارشاد فرمایا کہ اہل کتاب کی دعوت کے جواب میں، قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ط آپ ان کو کہہ دیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کہ ہم تمہارا باطل مذہب اختیار کر لیں۔ اور اگر اس میں بگاڑ نہ بھی پیدا ہوا ہو تو بھی تورات اور انجیل تو منسوخ ہو چکی ہے۔ اب قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ جو کہ پہلی کتابوں کی ناسخ ہے لہٰذا اب تورات و انجیل پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ یہودیت کا باطل طریقہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایجاد ہوا موجودہ یہودیت ــــ ہرگز ان کا طریقہ نہیں جسے اختیار کیا جا سکے۔ اسی طرح موجودہ نصرانیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دو سو سال بعد ایجاد ہوئی ہے۔ موجودہ نصرانیت کا پیش کردہ عقیدہ تثلیث ہرگز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم نہیں ہے۔ لہٰذا یہ دونوں مذہب کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں ہیں۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ تمہارا طریقہ ابراہیمی نہیں ہے۔ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ط ہم تو اصل ملت ابراہیمی کی پیروی کریں گے۔ اس حقیقی ملت کو اختیار کرتے ہی پر آمادہ

رہیں گے۔ پہلی آیتوں میں گزر چکا ہے کہ صحیح ملتِ ابراہیمی ہی ملتِ اسلامیہ ہے۔ "وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ إِبْرٰهٖمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ط" اور اس ملت سے انحراف تو کوئی بے وقوف ہی کر سکتا ہے۔ اور ان کا طریقہ تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا طریقہ ہے۔ اور اس آخری دور میں شریعتِ محمدیہ ہی ملتِ ابراہیمی کی اصل جانشین ہے۔ لہٰذا ہم تو اس ملت کا اتباع کریں گے جو حضرت ابراہیم حنیف علیہ السلام کی ملت ہے۔ اور یہ اب شریعتِ محمدی کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔

لفظ حنیف کا معنی

حنیف عربی زبان میں اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کے پاؤں میں کجی ہو۔ اور وہ چلتے وقت ایک طرف کو مائل ہو جاتا ہو۔ اس کو احنف بھی کہتے ہیں۔ لفظ حنیف اسی مادے سے ہے اور اس کا معنی ہے، ہر طرف سے کٹ کر ایک طرف لگنے والا یعنی یکسو۔ اور اصطلاحاً حنیف اس شخص کو کہتے ہیں۔ جو ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ "حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ" حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق بھی یہی آیا ہے۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ آپ شرک کرنے والوں میں نہ تھے۔ مگر جس یہودیت اور نصرانیت کی دعوت تم دے رہے ہو، وہ تو شرک سے آلودہ ہے۔ تم تو عقیدہ الوہیت کے قائل ہو جس میں تشبیہ پائی جاتی ہے۔ لہٰذا ہم تمہارا مشرکانہ دین قبول نہیں کر سکتے بلکہ ہم تو ملتِ ابراہیمی کا اتباع کریں گے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے اور شرک سے پاک تھے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ حنیف وہ شخص ہوگا۔ جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا قائل ہو۔ حج کرنے والا ہو، نماز میں بیت اللہ شریف کی طرف رخ کرنے والا ہو، ختنہ کرنے والا ہو۔ اور محرماتِ نکاح کو حرام سمجھتا ہو۔ شاہ عبد العزیزؒ نے اپنی تفسیر میں ملتِ ابراہیمی کی چالیس خصوصیات بیان کی ہیں[2]۔ جو اسلام میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں پر حج کرنے والے سے مراد ایسا شخص ہے، جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو مانتا ہو۔ بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ آپ فرما دیں کہ ہم تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت

۱؎ فتح الرحمان ص۵۶ مطبع ہاشمی، الفوز الکبیر ص۳، تفسیر ابن کثیر ص۱۸۶ و ۱۸۷ ج۱، معالم التنزیل ص۹۲ ج۱،

۲؎ تفسیر عزیزی فارسی ص۴۹۳، ۴۹۵ پارہ ۱

کا اتباع کیسے کریں گے، تمہاری خود ساختہ یہودیت اور نصرانیت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

فرمایا کہ آپ اُن کو اصل ملّتِ ابراہیمی کی تشریح بھی کر دیں۔ قُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ یعنی یوں کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر، یعنی ہماری جڑ بنیاد ہی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہے۔ ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ حلال و حرام میں کسی چیز میں اس کا شریک نہیں بناتے۔ برخلاف اس کے بنی اسرائیل نے حلال و حرام کا منصب پادریوں کے سپرد کر رکھا ہے۔ جسے پادری حلال کر دے وہ حلال ہے۔ اور جس چیز کو پادری حرام قرار دے دے، وہ حرام ہو جاتی ہے، حالانکہ تحلیل و تحریم تو اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ یہ منصب اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ ہاں جب نبی کسی چیز کی حلت و حرمت کا فتویٰ دیتا ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کے حلال و حرام کردہ حکم کے مطابق ایسا کرتا ہے خود اپنی مرضی سے کسی چیز کو حلال و حرام قرار نہیں دیتا۔ یہودی چونکہ حلال و حرام کا اختیار اپنے احبار اور رہبان کو سونپتے ہیں۔ اس لیے وہ تحلیل و تحریم میں شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔

کتابوں پر ایمان

اہل ایمان کو خطاب ہو رہا ہے کہ ایمان باللہ کے بعد تمام کُتبِ سماویہ پر ایمان لانے کا بھی اعلان کر دو وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا ہم اس کتاب پر ایمان لائے ہیں، جو ہماری طرف نازل کی گئی یعنی قرآن پاک وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلٰۤى اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ اور جو کچھ نازل کیا گیا ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر مکمل آسمانی کتابیں تو چار ہیں۔ ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام پر چھوٹے چھوٹے صحیفے بھی نازل فرمائے۔ چنانچہ قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحائف کا ذکر آتا ہے۔ یہاں پر انہی صحائف کا ذکر ہے۔ کہ جس طرح دیگر کتب سماویہ پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح صحائف آسمانی پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے۔ کہ اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولین اولاد میں سے چار انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے بعد بے شمار انبیاء کرام مبعوث فرمائے۔ لہٰذا ان سب پر اور ان پر نازل ہونے والی ہر چیز پر ایمان لانا اہل ایمان کا شیوہ ہے۔

علماء کرام، طلباء عظام اور عوام الناس کے لیے گرانقدر علمی تحفہ

شمائل ترمذی

مع اردو ترجمہ و شرح

افادات

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی مدظلہ

مرتب

الحاج لعل دین ایم اے علوم اسلامیہ

مقدمہ، اضافہ، حاشیہ

مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی

یہ کتاب حضور ﷺ کے شمائل و خصائل کے شعبہ میں امام ترمذیؒ کی مشہور زمانہ تصنیف ہے جو کہ مدارس میں درس نظامی کے نصاب میں بھی داخل ہے اس کتاب کے کل چھپن ابواب ہیں جن میں سے ابتدائی پچیس ابواب کی شرح نہایت دلنشین اور اچھوتے انداز میں منظر عام پر آگئی ہے۔ کتاب کی احادیث پر اعراب، سلیس اردو ترجمہ، عمدہ تشریح اور حواشی میں رواۃ کے اسماء و کنی، القاب، سن موالید ووفیات کے علاوہ بہت سے علمی، تحقیقی مواد پر مشتمل و محتوی ہے۔ عمدہ کتابت، نفیس طباعت اور معیاری جلد بندی کے ساتھ ۵۰۸ صفحات پر مشتمل جلد اول کی قیمت صرف ۱۳۰ روپے ہے باقی ابواب کی شرح انشاء اللہ العزیز جلد دوم میں شائع ہوگی۔

ناشر: مکتبہ دروس القرآن، فاروق گنج گوجرانوالہ پاکستان

معالم العرفان فی دروس القرآن

افادات

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی صاحب

ریکارڈنگ

بلال احمد ناگی صاحب

مرتب

الحاج لعل دین صاحب (ایم۔اے علوم اسلامیہ)

زیر انتظام

انجمن محبان اشاعت قرآن

صدر انجمن

شیخ محمد یعقوب عاجز

جنرل سیکرٹری

بابو غلام حیدر صاحب

خزانچی

محمود انور بٹ ایڈووکیٹ

ناظم مکتبہ (مکتبہ دروس القرآن)

محمد منیر صاحب Ph:221943

مکتبہ دروس القرآن گوجرانوالہ

فرمایا ہمارا اُن کتابوں پر بھی ایمان ہے وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو عطا کی گئیں۔ یعنی توراۃ اور انجیل وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ اور اُس چیز پر بھی ایمان لائے جو دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی۔ غرضیکہ یہ ایک قاعدہ کلیہ آگیا کہ اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان پر جس وقت اور جو کچھ اپنے نبیوں کے ذریعے بھیجا ہے۔ سب پر ایمان لانا لازم ہے۔

ابن ابی حاتم کی روایت میں آتا ہے[1]۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جہاں تک ایمان لانے کا تعلق ہے۔ تم زبور، توراۃ اور انجیل پر ایمان رکھو مگر وَلْیَسَعْکُمُ الْقُرْاٰنُ عمل کرنے کے لیے تمہارے لیے قرآن پاک کافی ہے۔ یعنی سابقہ کتب پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن پاک نے سابقہ کُتب کے احکام کو منسوخ کر دیا ہے۔ اب قابلِ عمل احکام صرف قرآن کریم کے ہیں۔

امام شافعیؒ کا قول ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے کل ایک سو چار کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ ان میں چار تو بڑی عظیم کتابیں ہیں۔ یعنی زبور، توراۃ، انجیل اور قرآن کریم اور سو چھوٹی کتابیں صحیفے ہیں۔ جو حضرت آدم، شیث، ادریس، نوح، ابراہیم علیہم السلام اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے۔ ایسے ہی صحیفوں کا ذکر حضرت یونس، حضرت ایوب، حضرت سلیمان علیہم السلام اور دیگر کئی انبیاء کرام کے ساتھ بھی آتا ہے۔ موجودہ مجموعہ کتب مقدسہ جسے بائیبل کہتے ہیں، اس میں ۳۹ صحائف شامل ہیں۔ ان کتابوں اور صحائف میں اگرچہ بہت کچھ تحریف و تنسیخ ہو چکی ہے۔ تاہم یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں۔ اور ہمارا ان سب پر ایمان ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بذریعہ وحی انبیاء کرام پر نازل فرمائے۔

رسولوں پر ایمان

آگے اس بات کا اقرار ہے لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ہمارا ان تمام رسولوں پر بھی مکمل ایمان ہے۔ جن پر کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے۔ بلکہ اُن انبیاء کرام پر بھی ایمان ہے جن پر کوئی باقاعدہ کتاب نازل نہیں ہوئی۔ اور ہم اُن کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ایمان مکمل اسی صورت میں ہوتا ہے۔ جب تمام انبیاء علیہم السلام پر بلا تفریق ایمان ہو

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۱۸۷ ج ۱ بحوالہ ابن ابی حاتم

کسی پر ایمان لانا اور کسی پر نہ لانا ۔ یہ تو کفر کے مترادف ہے ۔ بنی اسرائیل اسی وجہ سے گمراہ ہوئے کہ وہ بعض انبیاء کرام علیہم السلام پر تو ایمان لائے مگر نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا ۔ دیکھو ! اہل اسلام تمام سابقہ انبیاء کرام پر یعنی حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام و دیگر سب پر ایمان رکھنے کے ساتھ نبی آخر الزمان علیہ السلام پر بھی ایمان لائے ہیں ۔ مگر یہود و نصاریٰ آخری نبی کے منکر ہیں ۔ اس لیے یہ کافر ٹھہرے ہیں ۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ کا مطلب یہ ہے ۔ کہ ہمارا تمام انبیاء کرام پر یکساں ایمان ہے ۔ ہم کسی میں بھی تفریق نہیں رکھتے ۔ جو انبیاء کرام جس قوم کی طرف اور جس زمانے میں بھی مبعوث ہوئے اگرچہ ہم انہیں جانتے نہیں مگر ان کی بعثت کے یکساں طور پر قائل ہیں ۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ۔ کہ اہل ایمان ! تمہارے برحق ہونے کی نشانی یہ ہے ۔ کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نبیوں اور اس کی تمام کتابوں کو برحق مانتے ہو ۔ اور ان میں کوئی تفریق روا نہیں رکھتے ۔ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ اور ہم اسی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں جس نے تمام انبیاء اور کتابیں نازل فرمائیں ۔ اور یہی ملتِ ابراہیمی کا اصول ہے ۔

معیارِ حق

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ کو معیارِ حق قرار دیا ۔ اور فرمایا فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ اگر یہ کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں ۔ جس طرح تم ایمان لائے ہو فَقَدِ اهْتَدَوْا تو یہ بھی ہدایت پا جائیں گے گویا نزول قرآن کے زمانہ میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین صحابہؓ معیار قرار پائے ۔ مگر بعد میں آنے والوں کے لیے بھی لازم ہے ۔ کہ وہ بھی انہیں کا طریقہ اختیار کریں ۔ وہ بھی اسی معیار پر پرکھے جائیں گے ۔ چونکہ اس زمانے کے یہود و نصاریٰ صحابہؓ کے معیار پر پورے نہ اترے ۔ وہ اس طرح تمام انبیاء کرام اور تمام کتابوں پر ایمان نہ لائے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ ایمان لائے تھے ۔ لہٰذا وہ مردود ہوئے ۔ آج بھی جو کوئی صحابہ کرامؓ کے طریقے کے خلاف کرے گا ۔ گمراہ ہو گا ۔ اسی لیے تو حضور علیہ السلام نے ناجی گروہ کے متعلق فرمایا[1] مَآ اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِیْ

۱؎ ترمذی ص ۳۷۹

یعنی نجات یافتہ وہی لوگ ہوں جو میرے اور میرے صحابہؓ کے طریقے پر ہوں گے۔ باقی سب گمراہ ہوں گے۔ صحابہؓ میں سے آپ نے خلفائے راشدین المہدیینؓ کا خاص طور پر ذکر فرمایا[1] کیونکہ ان کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے تمام خطۂ زمین پر دین کو استحکام بخشا۔ واقعہ جنگ صفین تک کوئی طاقت ایسی نہ تھی۔ جو مسلمانوں سے ٹکرا سکے۔ سب مغلوب ہو چکے تھے۔ نہ صرف دلیل سے بلکہ سیاسی طور پر اسلام غالب آچکا تھا۔ یہ تو حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے مابین چپقلش کی وجہ سے حالات نے پلٹا کھایا، ورنہ پچاس سال تک اسلام ہر طرح سے غالب رہا۔

الغرض! یہود و نصاریٰ کو فرمایا کہ تمہارا دین اور تمہارا ایمان درست نہیں ہے ہدایت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔ کہ تم بھی دینِ حق پر اسی طرح ایمان لے آؤ، جس طرح اہل ایمان لاتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں کرو گے۔ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر اڑے رہو گے تو ہدایت نہیں پا سکو گے۔

اہل ایمان کی کامیابی

فرمایا اگر یہ مکمل ایمان لانے کی بجائے وَاِنْ تَوَلَّوْا اگر یہ روگردانی کریں گے فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ج تو یہ محض ضد اور اختلاف میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ نہ تو منصف مزاج ہیں اور نہ ہی حقیقت کے طلبگار ہیں۔ آپ اپنا کام کرتے جائیں۔ ان کی پروا نہ کریں فَسَیَکْفِیْکَهُمُ اللّٰهُ ج ان کی طرف سے ہر شر و فساد کے جواب میں اللہ تعالیٰ آپ کی کفایت کرے گا۔ آپ کو ان کی شرارتوں اور حیلہ سازیوں سے محفوظ رکھے گا۔ اور جو لوگ آپ کے متبع ہیں۔ وہ بھی مامون ہوں گے۔ "اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ" آپ کے دشمن ہی ذلیل و خوار ہوں گے۔ آپ اور آپ کے ساتھی بالآخر کامیاب و کامران ہوں گے۔ چنانچہ اہل کتاب نے دیکھ لیا۔ کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اسلام پورے عرب اور پھر آدھی دنیا تک پھیل گیا۔ وہی اہل کتاب جو آپ کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرتے تھے۔ انہیں مدینہ طیبہ اور دیگر قلعوں سے نکلنا پڑا۔

ملوکیت کی خرابیاں

صحابہ کرامؓ نے جو معیار قائم کیا تھا۔ وہ بڑے اونچے درجے کا معیار تھا۔ اور اس پر کاربند رہنا بھی آسان نہیں تھا۔ چنانچہ بعد میں آنے والے لوگ اس معیار کو قائم نہ رکھ سکے اور خلافت کی بجائے

---

[1] ترمذی ص۳۸۳

ملوکیت کا راستہ اختیار کر لیا۔ خلافتِ راشدہ کے طریقے کو پسِ پشت ڈال دیا اور عیاشی و فحاشی والا طریقہ اختیار کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بنی اسرائیل کی طرح یہ بھی ذلیل ہوئے۔ یہ درست ہے۔ کہ بعد میں کچھ اچھے لوگ بھی آئے اور اسلام کو وقتی طور پر تقویت بھی حاصل ہوئی۔ مگر بحیثیتِ مجموعی بگاڑ پیدا ہوتا چلا گیا۔ اور ملوکیت اور ڈکٹیٹر شپ آگئی اور ہر صاحبِ اقتدار اپنی من مانی کرنے لگا۔ چوہدری افضل حق رح ہماری قوم کے بڑے مدبر انسان ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب میں بڑے دکھ کے ساتھ ایک جملہ لکھا ہے۔ کہتے ہیں۔ کہ جب بنی امیہ کا دور آیا تو انہوں نے خلافتِ راشدہ کے نفیس فرش کی جگہ شہنشاہیت کا ٹاٹ بچھا دیا۔ واقعہ بھی یہی ہے۔ کہ جو معیارِ حق صحابہؓ نے قائم کیا تھا اس میں زوال آگیا۔ اور امت میں اتفاق و اتحاد کا دامن تار تار ہو گیا۔ جنگ اُحد میں اگرچہ شکست کا سامنا کرنا پڑا مگر صحابہ کرامؓ نے " وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ " پر عمل کر کے نہ صرف اس شکست کو برداشت کیا، بلکہ اپنے اتحاد کو اور مضبوط کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ پھر کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑا۔ بلکہ تھوڑے ہی عرصہ میں اسلام عرب سے نکل کر دور دور تک پھیل گیا۔

امام ابوبکر جصاص رح فرماتے ہیں۔[1] کہ جس معاملہ میں وحی کے ذریعے راہنمائی نہ کی گئی ہو، اس معاملے میں نبی کے لیے بھی واجب ہے۔ کہ وہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرے۔ مگر ملوکیت کے راستے پر چل نکلنے والے صاحبِ اقتدار لوگوں کو اپنی من مانی کرنے کا کہاں حق پہنچتا ہے۔ ایسے لوگ تو ابلیس کے راستے پر چلنے والے ہیں۔ کابل، مصر اور بخارا وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں وہاں کے ملوک نے کس قدر ظلم کیے۔ اسلام کے صحیح طریقے کو چھوڑ کر باطل طریقے پر چل نکلے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر صدیوں سے زوال چھایا ہوا ہے۔ الغرض! اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ ایمان کو فرمایا۔ کہ اگر کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ اپنی ضد پر اڑے رہیں، تو آپ گھبرائیں نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارا حامی و ناصر ہو گا۔ ان کے مقابلے میں وہ تمہارے لیے کفایت کرے گا۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ وہ ہر ایک کی دعا کو سنتا اور ہر چیز کو جانتا ہے۔ اس سے کچھ مخفی نہیں۔

---

[1] احکام القرآن صبے ۱۴۱ / ۲

صبغة الله

فرمایا یہ آپ کو یہودیت اور نصرانیت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ آپ انہیں فرمائیے کہ صِبْغَةَ اللّٰهِ ج ہم نے تو اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ تمہاری باطل یہودیت اور نصرانیت سے ہمارا کیا تعلق۔؟ اور اللہ تعالیٰ کے رنگ سے مراد کوئی روائتی رنگ از قسم سُرخ نیلا یا پیلا نہیں بلکہ توحید اور اخلاص کا رنگ ہے۔ یہ وہ رنگ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے انسان کے چہرے پر نمایاں ہوتا ہے۔ یہ رنگ ان کے اقوال و افعال اور اعمال و کردار کی وجہ سے اور چمکتا ہے۔ ہم نے یہ رنگ اختیار کیا ہے۔ یہ یہودیت اور نصرانیت والا رنگ نہیں، جو کہ کپڑوں اور جسم پر لگا کر عیسائیت میں پختگی کا اظہار کرتے ہیں۔

فرمایا وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ز اور اللہ کے رنگ سے اچھا کون سا رنگ ہوگا۔ جو کہ توحید، عبادت، ریاضت، دیانت اور ایمان کا رنگ ہے۔ یہ ملّت ابراہیمی کا رنگ ہے، جو صرف اہل ایمان کو حاصل ہے۔ جو اس ملّت پر صحیح معنوں میں کاربند ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گذار ہیں۔ جس نے ہمیں اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ اس لیے ہم اسی اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں۔ ہم کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہیں کرتے۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ وَھُوَ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا
وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ ۚ وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ لا اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ
اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ کَانُوْا
ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰہُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ
مِمَّنْ کَتَمَ شَھَادَۃً عِنْدَہٗ مِنَ اللّٰہِ ؕ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ لا تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ
مَّا کَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۶/۱۲/۱۶

ترجمہ :- اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے (اہل کتاب سے) کیا تم ہمارے ساتھ اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہو۔ حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب بھی ہے۔ اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں۔ اور تمہارے لیے تمہارے اعمال۔ اور ہم اسی کے لیے اخلاص کرنے والے ہیں ﴿۱۳۹﴾ کیا تم یوں کہتے ہو کہ (حضرت) ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے، آپ فرمائیے کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ۔ اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا۔ جو اس گواہی کو چھپاتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پاس ہے۔ اور اللہ ان کاموں سے غافل نہیں ہے، جو تم کرتے ہو ﴿۱۴۰﴾ یہ ایک جماعت ہے جو گذر چکی۔ اس کے لیے وہی کچھ ہے، جو اس نے کمایا۔ اور تمہارے لیے وہ کچھ ہے، جو تم نے کمایا۔ اور تم سے ان کاموں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا، جو وہ کرتے تھے ﴿۱۴۱﴾

گذشتہ سے پیوستہ

گذشتہ درس میں یہ بیان ہو چکا ہے۔ کہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں کو اپنے باطل مذہب کی طرف دعوت دیتے تھے۔ کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے کہلوایا کہ ہم تو ملتِ ابراہیمی کے پیرو کار ہیں اور اسی پر کاربند رہیں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے۔ اور شرک کرنے والوں میں نہیں تھے۔ اس کے بعد ملّتِ اسلام اور ملّتِ ابراہیم کا اہم اصول اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری بیان کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان سے فرمایا کہ تم اعلان کر دو کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کی توحید اور اس کی کتاب کو مانتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف نازل کی ہے۔ اور ان صحائف کو بھی مانتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد کی طرف نازل فرمائے۔ ہمارا اُس شریعت اور دین پر بھی ایمان ہے۔ جو حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو دیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو جو چیز بھی عطا کی گئی، ہمارا اُس پر ایمان ہے۔ اور ہم تفریق بین الرسل نہیں کرتے کہ کسی کو مان لیا اور کسی کو نہ مانا، بلکہ سب کو یکساں طور پر اللہ تعالیٰ کے رسول تسلیم کرتے ہیں۔ اور تمام کتبِ سماویہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ البتہ عمل کے لیے صرف قرآن پاک کو کافی پاتے ہیں۔

حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ بھی اسی اصول پر عمل درآمد کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ اگر یہود و نصاریٰ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں۔ جس طرح صحابہؓ ایمان لائے ہیں، تو وہ بھی ہدایت پا جائیں گے۔ اگر مخالفت کریں تو یہ اُن کی ضد اور ہٹ دھرمی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اہلِ ایمان کو تسلی دی کہ اہلِ کتاب کے شر سے خائف نہ ہوں۔ آپ کے لیے اللہ تعالےٰ کفایت کرے گا۔ پھر فرمایا کہ یہودیت یا نصرانیت کا رنگ پکڑنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کرو۔ اور وہ دینِ توحید اور ملّتِ ابراہیمی والا رنگ ہے۔ آخر میں اہلِ ایمان سے کہلوایا کہ ہم اُسی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے ہیں۔ جس کی وحدت کا اقرار کر چکے ہیں۔

اہلِ کتاب کے ساتھ جھگڑا

آیت زیرِ درس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کے ساتھ مقاطعہ کی بنیاد رکھی ہے۔ کیونکہ اُن کے ساتھ مصالحت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ پیغمبر علیہ السلام سے خطاب کیا۔ قُلْ آپ ان اہلِ کتاب سے کہہ دیں اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ کیا تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو۔ کیا بنائے مخاصمت اللہ کی وحدانیت، اس کا دین یا اس کی عبادت ہے۔ بلکہ جھگڑے کی بنیاد یہ ہے۔ کہ اہلِ کتاب اس زعم میں مبتلا تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ اُن پر بڑا مہربان ہے اُس کی تمام نوازشیں انہیں کے لیے ہیں۔ لہٰذا آخری نبی بھی بنو اسحاق میں سے ہی آنا چاہیئے۔ تاکہ ان کے خاندان کی برتری قائم رہے۔ اسی لیے وہ حضور خاتم النّبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و

رسالت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ حالانکہ گذشتہ آیات میں گذر چکا ہے۔ کہ وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ”اللہ جسے چاہتا ہے۔ اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے

______ کسی ایک فرد یا قوم نے ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔ کہ خدا تعالےٰ کی رحمتیں صرف انہیں کے لیے ہیں۔ اسی چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کہلوایا کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو۔ وَھُوَ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب بھی۔ اس میں جھگڑے کی کون سی بات ہے۔ اگر اس نے ایک زمانے میں کسی ایک خاندان کو برتری عطا کی ہے۔ تو دوسرے زمانے میں دوسرے خاندان کو شرف بخشا ہے۔ کیونکہ وہ ساری مخلوق کا رب ہے اس کی نظر میں سب برابر ہیں۔ وہ سب کا مالک ہے۔ لہٰذا تمہیں آپس میں مخاصمت نہیں پیدا کرنی چاہیئے۔ اور اگر تم نے ضرور جھگڑا ہی کرنا ہے۔ تو وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ یعنی ہم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں۔ اور تم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو۔ وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ اور ہم تو صرف اسی خالق و مالک کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔

اخلاص فی الدین

اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری ہی ملتِ ابراہیم علیہ السلام کا بنیادی اصول ہے۔ تم باطل نظریات کی طرف دعوت دیتے ہو۔ یعنی یہودیت یا نصرانیت کو اختیار کیا جائے۔ یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت لامحدود ہے۔ وہ جسے چاہے اپنی رحمت سے فیضیاب کرے کسی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں۔ بحمد اللہ ہم نے ایمان قبول کر کے اپنے اندر اخلاص پیدا کیا ہے۔ اور صحیح معنوں میں ملتِ ابراہیمی میں شامل ہوئے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے[1] اَخْلِصْ فِیْ دِیْنِکَ یَکْفِیْکَ قَلِیْلٌ مِّنَ الْعَمَلِ یعنی اپنے دین میں اخلاص پیدا کرو۔ تمہارا تھوڑا عمل بھی کفایت کر جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صرف مخلص عمل ہی قابل

لہ فیض القدیر ص ۲۱۶ ج ۱ بحوالہ مستدرک عن معاذؓ

قبول ہوتا ہے۔ ریاکاری اور دکھاوے کا عمل ہمیشہ مردود ہوتا ہے۔ اہلِ کتاب کے عقائد اخلاص سے خالی ہیں۔ وہ ضدی اور عنادی ہیں۔ لہٰذا ہماری ان سے مصالحت نہیں ہو سکتی۔ مشرکین کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا "لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ" یعنی تمہارے لیے تمہارا دین ہے۔ اور ہمارے لیے ہمارا دین۔ اب صلح کی گنجائش نہیں۔ یہاں بھی اہلِ کتاب کو فرمایا کہ تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں اور ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں گویا یہ ایک چیلنج ہے کہ آئندہ جہاد کرنا پڑے گا۔ اس کے بغیر کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ گیا۔

انبیائے سابقین کا عقیدہ

اہلِ کتاب کا دعویٰ تھا۔ کہ پہلے جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائے ہیں۔ وہ سب کے سب انہیں کے عقیدہ پر یہودی یا نصرانی تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ان کے اس غلط دعویٰ کا جواب دے رہے ہیں۔ اَمْ تَقُوْلُوْنَ کیا تم یہ کہتے ہو اِنَّ اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ کَانُوْا ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی کہ حضرت ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ۔ اے پیغمبر! آپ ان سے فرما دیں۔ کہ اس دعوے کے متعلق ءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰہُ کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے۔ کہ انبیائے سابقین کس طریقے پر تھے۔ فرمایا یہ حضرات نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ تو حنیف تھے۔ یعنی خالص اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والے تھے۔

تمہاری یہ یہودیت یا نصرانیت تو توراۃ اور انجیل کے بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ اور انبیائے متعلقین سے صدیوں بعد کی پیداوار ہے۔ ان کا ان باطل عقائد کے ساتھ کیا تعلق وہ تو خالص ملتِ اسلامیہ پر کاربند تھے۔ اور اسی کی تبلیغ کرتے رہے خاص طور پر جد الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق تو پہلے بھی کسی درس میں آچکا ہے "مَا کَانَ اِبْرٰھِیْمُ یَھُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰکِنْ کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ" یعنی آپ تو حنیف اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار تھے۔ آپ مشرکین میں سے قطعاً نہیں تھے۔ لہٰذا ان کی نسبت یہودیت یا نصرانیت کی طرف کرنا نہایت ہی قبیح حرکت ہے۔ بھلا اللہ تعالیٰ کے نبی یہودیت اور نصرانیت کا باطل طریقہ کیسے اپنا سکتے ہیں۔ جو انکارِ نبوت، عقیدہ تشبیہ، اور تفریق بین الانبیاء والا طریقہ ہے۔ ایسے باطل عقائد تمہیں مبارک ہوں۔ انبیائے سابقین ان سے بری تھے۔

کتمانِ شہادت ظلم ہے

آگے اہلِ کتاب کی ایک اور زیادتی کو بیان فرمایا۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ اس شخص سے بڑھکر کون ظالم ہوگا۔ جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے گواہی موجود ہو۔ اور وہ اُسے چھپائے۔ یہ گواہی کون سی تھی۔ جسے بنی اسرائیل چھپاتے تھے۔ یہ گواہی حضور علیہ السلام کی بعثت، قرآن پاک کی حقانیت اور آخری امت کے بارے میں تھی۔ آگے آئے گا کہ بنی اسرائیل الیاجان بوجھ کر کرتے تھے "يَعْرِفُونَهٗ كَمَا يَعْرِفُونَ اَبْنَآءَهُمْ" یہ لوگ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح پہچانتے تھے۔ جس طرح اپنے بیٹوں کو، مگر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ تورات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے متعلق واضح پیشین گوئیاں موجود تھیں۔ مگر یہ لوگ عناد اور حسد کی وجہ سے آپ کو آخری نبی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ گویا تورات نے جو گواہی پیش کی تھی اور جو خود ان کے پاس موجود تھی۔ اُسے چھپاتے تھے۔ انہیں کے متعلق فرمایا۔ کہ اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوسکتا ہے۔ جو اپنے پاس موجود شہادت کو چھپا جائے۔

شہادۃ کا چھپانا ویسے بھی گناہ ہے۔ "وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ" شہادت کو چھپانے والے کا دل گنہگار ہے۔ بلکہ صحیح گواہی دینا تو ضروری ہوجاتا ہے خاص طور پر جب کہ وہ دین کے متعلق ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ" اللہ تعالیٰ کے لیے شہادۃ کو قائم کرو۔ اس کو چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ ورنہ ظالموں میں شمار ہوگے۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کی طرف سے کتمانِ شہادت کو سورۃ اعراف میں یوں بیان فرمایا "يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ" اس نبی اُمّی کی پیشن گوئیاں اور حال تورات اور انجیل میں ان کے پاس لکھا ہوا موجود ہے۔ مگر یہ حق بات کو چھپا لیتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی قبیح حرکات کا علم نہیں بلکہ وہ تو ہر چیز کو جانتا ہے۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ وہ غافل نہیں ہے۔ تمہاری تمام کاروائی کو جانتا ہے۔ اور مناسب وقت پر تم سے مواخذہ کرے گا

جھوٹی نسبت مفید نہیں

یہ آیت گذشتہ پیوستہ درس میں بھی آچکی ہے۔ یہاں اس کو دہرایا جارہا ہے

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ یہ ایک امت تھی جو گذر چکی، اس کے لیے وہی کچھ ہے جو اس امت نے کمایا اور تمہارے لیے وہ ہے جو تم نے کمایا وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ تم سے ان کے بارے میں سوال نہیں کیا جائیگا کہ وہ کیا کرتے رہے، بلکہ تم اپنے کردار کے ذمہ دار ہو، وہ اپنے افعال کے ذمہ دار ہیں۔ مطلب یہ کہ اے اہل کتاب اگرچہ تم اپنی نسبت انبیاء علیہم السلام کی طرف کرتے ہو۔ مگر تم ان کے عقیدے پر قائم نہیں رہ سکے۔ لہذا تمہاری یہ جھوٹی نسبت کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ ان کے عقیدے اور اعمال بیشک درست تھے لیکن وہ تمہارے کسی کام نہیں آسکتے تمہیں اپنے افعال کی خود جوابدہی کرنا ہوگی۔

ملّتِ ابراہیمی کا ایک اہم ترین اصول " وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى " ہے۔ یعنی کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک[1] بھی ہے لَا يَجْنِي عَلَيْكَ وَلَا تَجْنِي عَلَيْهِ باپ اور بیٹے کے متعلق فرمایا کہ باپ کا گناہ بیٹے کی گردن پر نہیں ہوگا۔ اور نہ بیٹے کی زیادتی پر باپ کو پکڑا جائے گا۔ ہر کوئی اپنے کام کا ذمہ دار ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام کی طرف محض نسبت کر لینا کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ جب تک ان کی پوری پوری اتباع نہیں کی جائے گی۔

اہل اسلام کے لیے لمحہ فکریہ

مفسرین کرام فرماتے ہیں[2]۔ کہ آیت تِلْكَ اُمَّةٌ کا دہرایا جانا خاص مقصد کی بناء پر ہے صرف اہل کتاب کے لیے تو یہ آیت ایک دفعہ ہی کافی تھی۔ اب جو دوسری دفعہ اس کا تکرار کیا گیا ہے تو اس سے مراد اہل اسلام کی تنبیہ ہے۔ کہ اہل کتاب کی طرح وہ بھی خالی نسبت پر تکیہ لگا کر نہ بیٹھے رہیں۔ بلکہ وہ اپنے عقائد اور اعمال کو پاک کریں۔ اللہ تعالیٰ اور نبی علیہ السلام کے احکام کی پابندی کریں۔ تو ان کے لیے بھی راہِ نجات کھل سکتی ہے۔ اپنے اعمال کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ آج کل کے پیرزادوں، امیرزادوں، گدی نشینوں کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے۔ کہ وہ اپنے آپ کا محاسبہ کریں۔ آباؤ اجداد کی خالی نسبت کسی کام نہیں آئیگی۔ باپ نیک و صالح تھا تو اس کا عمل اس کے ساتھ ہے بیٹے کو اپنی جوابدہی خود کرنا ہوگی۔ نسبت تو جب مفید ہوگی جب بزرگوں کے خصائص سے حصہ پایا ہو۔

---

[1] شمائل مع ترمذی ص۵۷۱

[2] تفسیر عزیزی فارسی ص۵۱۰ پارہ ۲

اماموں کے ساتھ نسبت کرنا بھی اسی قبیل سے ہے۔ یہی حال مشائخ طریقت کا ہے۔ اپنی نسبت بلند خانوادوں کی طرف کرتے ہیں مگر ان کی ایک خوبی بھی نہیں پائی جاتی۔ آج چشتیہ اور قادریہ سلسلہ کی طرف نسبت کرنے والے کتنی لغویات میں ملوث ہیں۔ کیا شیخ عبدالقادر جیلانی رح کا یہی طریقہ تھا۔ ان کی کتابیں موجود ہیں۔ ان کے مواعظ اور دیگر تصنیفات ہیں۔ ایک ایک لفظ سے ایمان اور حقیقت ٹپک رہی ہے۔ کفر اور شرک سے بیزاری کا اظہار ہو رہا ہے مگر ان کی طرف نسبت کرنے والے کفر، شرک اور بدعت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کے عُرس منائے جا رہے ہیں، اُن کی قبروں پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ رسومات باطلہ کا دور دورہ ہے۔ مگر نسبت اُن کی طرف ہے۔ ایسی نسبت کیا فائدہ دے گی۔

چشتی اپنے آپ کو خواجہ معین الدین چشتی رح سے منسوب کرتے ہیں۔ اس ملک میں خواجہ معین الدین چشتی رح، خواجہ فرید الدین شکر گنج رح، خواجہ نظام الدین اولیا رح جیسے مشائخ کے ذریعے اسلام کی آبیاری ہوئی۔ ان کے ذریعے برصغیر کے کتنے لوگوں کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ کتنے لوگوں کا تعلق باللہ قائم ہوا۔ ایسے بزرگوں کا اس خطہ ارضی پر کتنا احسان ہے۔ مگر آج انہیں کے پیروکار چشتیہ خاندان کی طرف نسبت کرنے والے راگ، رنگ اور گانے بجانے میں مشغول ہیں۔ قوالی کا نام دے کر کتنی ہی رسوم باطلہ کو اپنایا جا رہا ہے۔ مگر جیسا کہ بیان ہو چکا۔ یہ خالی نسبت کام نہیں آئے گی جب تک ان بزرگوں کے نقش قدم پر نہ چلیں گے۔ اسی چیز کو یہودیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اہلِ ایمان کو سمجھایا گیا ہے۔ کہ وہ بھی یہودیوں کے راستے پر نہ چل نکلیں۔ بلکہ اپنے اندر حقیقی ایمان پیدا کریں۔

ہمارے ہاں امام ابو حنیفہ رح کی طرف نسبت کر کے حنفی کہلانے والے لوگوں کی اکثریت ہے مگر ان میں سے کتنے ہیں، جو صحیح معنوں میں امام صاحب رح کے طریقے پر چل رہے ہیں۔ محض حنفی کہلانے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا جب تک آپ کا اتباع نہ ہوگا، اسی طرح امام شافعی رح کی طرف نسبت کرنے والے ہیں۔ وہ بھی اپنے طریقہ پر قائم نہیں ہیں۔ دل میں تعصب بھرا ہوا ہے۔ لاکھ شافعی کہلائیں، کچھ فائدہ نہیں۔ اس قسم کی خالی نسبت تو وہی یہودیوں والی نسبت ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خبردار کیا ہے۔ کہ ایمان لانے کے باوجود یہودیت کا راستہ

اختیار نہ کریں۔ اور صحیح معنوں میں ملّتِ ابراہیمی اور شریعت محمدی پر قائم رہیں۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان والوں کا نام لے لے کر فرمایا۔ اے بنی ہاشم، اے بنی عبدالمطلب خبردار! ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن لوگ اعمال لے کر آئیں۔ اور تم محض خاندانی تعلق اور رشتہ داری لے کر آؤ۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں تمہیں نہیں بچا سکوں گا۔ آج اپنی فکر کر لو۔ اَنۡقِذُوۡا اَنۡفُسَکُمۡ مِنَ النَّارِ اپنی جانوں کو دوزخ سے بچالو۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ ایمان کو درست کرو۔ اعمال صالحہ کی دولت حاصل کرو۔ اس طرح تم کو آخرت میں درجات نصیب ہوں گے

فرمایا یہ امّت ہے جو گذر چکی۔ جو کچھ اس امت نے کمایا وہ اس کے لیے ہے اور جو تم نے کمایا وہ تمہارے لیے ہے۔ تم سے ان کے اعمال کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا۔ کہ وہ کیا کرتے تھے۔ بلکہ تمہاری باز پرس تمہارے اعمال کی وجہ سے ہوگی۔ تم سے سوال ہوگا۔ کہ تم نیکی اور توحید پہ کار بند تھے یا نہیں۔ تم شرک، بدعات اور رسومات باطلہ سے بچ سکے یا نہیں۔ تم توحید کی دعوت دیتے تھے یا شرکیہ افعال کی طرف بلاتے تھے۔ تم نیکی اختیار کرتے تھے یا لڑائی جھگڑے میں مصروف رہے۔ آج اپنا محاسبہ کر لو۔ قیامت کے دن تمہارے کاموں کے متعلق تم سے پوچھا جائیگا۔

تفسیر ابن کثیر صفحہ ۲۵۰ ج ۳ بحوالہ مسند احمد و مسلم صفحہ ۱۱۴ ج ۱